Khali Ghar front side of book
copied from web

Urdufans.com

back side of book

○ سیدپور کا جن بہت خوش تھا اور کیوں نہ ہوتا پریوں جیسی ایک حسین ترین لڑکی اس کے گھر میں تھی۔ پر فضا مقام تھا یخ بستہ ہوائیں تھیں، چاندنی راتیں تھیں، خوشبوئیں تھیں، ریشمیں بدن کی مہک تھی، کیا نہیں تھا، سب کچھ تھا یہاں۔

○ اگر یہی زندگی ہے تو پھر موت کیا ہوگی۔ اب یہ سب کچھ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا دیکھو میں انسان ہوں مجھ پر رحم کرو یہ بھڑکتے شعلے، یہ دہکتا تندور، میری تو روح تک جھلس گئی ہے مجھے معاف کر دو، مجھے جانے دو، دیکھو میرا شوہر مجھے لینے آ پہنچا ہے۔

○ بیس سال بعد اس نے اپنی بیٹی کو پہلی اور آخری بار دیکھنے کی خواہش کی ہے تو ہمیں مرنے سے پہلے اس کی آخری خواہش پوری کرنا ہوگی۔

○ راشدہ نے جو منظر دیکھا، اسے دیکھ کر وہ کانپ اٹھی، ایک کالا بلا علیم کے پاؤں چاٹ رہا تھا اور وہ کالے بلے کو پر کیف نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

○ کیا تم لوگوں نے مجھے پانی کا بلبلہ سمجھ لیا ہے کہ پھونک مارو گے اور میں ہوا میں تحلیل ہو جاؤں گا میں بہت زبردست جن ہوں، میرے راستے سے ہٹ جاؤ، ورنہ وہ تباہی پھیلے گی کہ دنیا دیکھے گی۔

○ اس ناول کا مرکزی خیال سچا ہے باقی کہانی کا تانا بانا مصنف کی تخلیق ہے اور تخلیق بھی ایسی کہ اس پر سچ کا گماں ہو۔

○ رات کے وقت، گھر میں تنہا ہونے کی صورت میں، یہ ناول ہرگز مت پڑھیے۔

Urdufans.com
copied from web

فرنگا بازار لاہور

پیش لفظ

"خالی گھر" کا چھٹا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ مسلسل کئی ایڈیشنوں کی اشاعت اس ناول کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ اب تک اس کی تیرہ ہزار کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں اور اس تازہ ایڈیشن سے یہ تعداد سولہ ہزار ہو جائے گی۔ قارئین کی طرف سے اس پذیرائی کا شکریہ۔

"خالی گھر" میں ایک جن کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ایک زبردست جن جو ایک خوبصورت لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو کر اس پر اپنا تسلط جما لیتا ہے اور لڑکی کے شوہر کو اس کے پاس تک پھٹکنے نہیں دیتا۔ وہ لڑکی کو اس کے گھر سے نکال لے جاتا ہے اور پھر ایک پر فضا مقام پر جہاں یخ بستہ ہوائیں چلتی تھیں، جہاں چاندنی راتیں تھیں اور خوشبوئیں تھیں، وہاں اس لڑکی کو قید کر دیتا ہے۔ لڑکی دہائی دیتی ہے، تڑپتی ہے، اپنے شوہر کے پاس جانے کے لئے التجائیں کرتی ہے لیکن سب بے سود..... پھر اس لڑکی کی اس ظالم جن سے کس طرح جان چھٹی اور اسے کیسے رہائی نصیب ہوئی.....؟ یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی معلوم ہو گا۔

جنوں کے وجود کے سب قائل ہیں۔ یہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں البتہ ان کی غذا انسانوں سے مختلف ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہڈیاں شوق سے کھاتے ہیں اور خود کو کسی بھی شکل میں بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ شیطان اعظم ابلیس بھی جنوں میں سے تھا۔ یہاں جنات پر کوئی علمی یا تحقیقی بحث کرنا مقصود نہیں ہے اور نہ ہی اس کتاب کا تعلق علمی مباحث سے ہے۔ یہ ایک ناول ہے، ایک داستان ہے، ایک افسانہ ہے جو انوار علیگی کی تخلیق ہے۔

انوار علیگی اب تک چھ ناول لکھ چکے ہیں۔ سفید محل، ریچھ کے اسرار، خالی گھر، ہوشربا، طاغوت اور ہزار داستان یہ سارے ناول "اخبار جہاں" میں سلسلہ وار شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ یہ ناول ایک انوکھے انداز کے ہیں اور یہی انداز اب انوار علیگی کی پہچان بن گیا ہے۔ وہ اس قدر ڈوب کر لکھتے ہیں کہ قاری ان کی کہانی حقیقت سمجھ کر پڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ ایسے واقعات ہیں جو ماضی میں بھی ہوئے ہیں اور موجودہ دور میں بھی ہوتے رہتے ہیں۔ دراصل یہ وہ قصے ہیں جو سینہ بہ سینہ چلتے ہیں اور "خالی گھر" میں شاید پہلی بار قلم بند کئے گئے ہیں۔

"خالی گھر" انوار علیگی کا ایک منفرد ناول ہے اور ایسے ناول کبھی کبھی لکھے جاتے ہیں۔

میر جاوید رحمٰن

Urdufans.com

دسمبر کی ٹھٹھرتی رات تھی..... چاندنی چٹکی ہوئی تھی..... گہری کہر نے چودھویں کے چاند کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا..... دور تک پُرہیبت سناٹا طاری تھا..... جنگل بھی جیسے سو گیا تھا..... بستی کے گھروں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا..... جلتے چراغ ٹمٹما کر بجھ گئے تھے..... لالٹین دھندلا گئی تھی..... لوگ لحافوں میں گھسے دن کی نا آسودہ زندگی کو آسودگی بخش رہے تھے..... وہ پُرکیف خواب دیکھنے میں مشغول تھے۔

وقتِ بارہ کا عمل ہوگا۔

بستی کے باہر جنگل میں، جہاں سے ریل کی پٹڑی گزرتی تھی، ایک نالے کی پلیا پر کالا بلا بیٹھا تھا۔ اس ٹھٹھرتی رات میں یہ واحد جانور تھا جو جاگ رہا تھا، نہ صرف جاگ رہا تھا بلکہ اگلے پاؤں پھیلائے اس طرح اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے دسمبر کی رات نہ ہو، مارچ کی کوئی رات ہو..... خوشگوار اور ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو، چاند پورے شباب پر ہو اور دور تک پُرکیف چاندنی برس رہی ہو۔

اس کالے بلّے کو قطعاً سردی نہیں لگ رہی تھی جبکہ جنگل کے دوسرے جانور اپنے اپنے ٹھکانوں میں سکڑے سمٹے سو رہے تھے۔

سب سو رہے تھے، پوری فضا پر نیند طاری تھی۔ چاند بھی کہر میں ڈوبا ہوا اونگھ رہا تھا۔

لیکن وہ کالا بلّا، اپنے اگلے دونوں پاؤں بڑے مزے سے چاٹ رہا تھا، جیسے اس کے پاؤں پر شہد لگا ہو..... اس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں ریل کی پٹڑی پر جمی ہوئی تھیں اور کان کچھ سننے کی کوشش کر رہے تھے۔

تب کہیں دور سے اسے وہ آواز سنائی دی جس کا وہ منتظر تھا۔

وہ ایک ایکسپریس ٹرین تھی۔ ابھی وہ دور تھی۔ اس کی دھیمی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ پھر اس کی آواز بڑھتی گئی اور اچانک اس پُرہیبت سناٹے میں چیخ گونجی۔ یہ ٹرین کی سیٹی کی آواز تھی۔ پھر کہر میں ڈوبا ہوا، ایک روشنی کا دھبّہ سا دکھائی دینے لگا۔

ٹرین نزدیک سے نزدیک تر ہوتی جا رہی تھی..... ٹرین کی دھڑدھڑاہٹ اور انجن کی پیشانی پر لگی روشنی، دونوں صاف سنائی اور دکھائی دے رہی تھی۔

چند لمحوں میں گاڑی اس چھوٹی سی پلیا سے گزرنے والی تھی، تب وہ کالا بلا غرّا کر کھڑا ہو گیا، اس نے اپنی نظریں انجن پر گاڑ دیں۔

اسی وقت ٹرین کو بریک لگنے شروع ہو گئے۔ ڈرائیور کو کئی انسان، سفید چادروں میں لپٹے ہونے نظر

Urdufans.com

آئے تھے۔ وہ برابر برابر پٹری پر سر رکھے لیٹے ہوئے تھے..... وہ اسے اچانک ہی دکھائی دیئے تھے۔ کہرا اتنی گہری تھی کہ قریب کی چیز بھی دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ ڈرائیور کو جب یہ انسان پٹری پر لیٹے ہوئے نظر آئے تو گاڑی ان کے سر پر پہنچ چکی تھی..... دنیا کی کوئی طاقت انہیں اب ٹرین کے نیچے آنے سے نہیں بچا سکتی تھی۔ پھر بھی ڈرائیور نے ایمرجنسی بریک لگائے..... گاڑی رکتے رکتے بھی ان سفید لاشوں سے گزر گئی۔

گاڑی کی آخری بوگی پلیا کے سامنے رکی..... کالے بلّے نے پلیا سے چھلانگ لگائی اور گارڈ کے کمپارٹمنٹ کی طرف منہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ گارڈ اشرف احمد جو اونگھ گیا تھا، گاڑی کے رکتے ہی چونک گیا۔ اس نے کھڑکی کو اٹھا کر دیکھا، دور تک کسی اسٹیشن کے آثار نہ تھے اس کے حساب سے ابھی اسٹیشن آنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پھر یہ گاڑی کہاں رک گئی۔

اشرف احمد نے جلدی سے اپنی ٹوپی سر پر رکھی، لائٹ اٹھا کر دروازہ کھولا اور دروازہ کھول کر اس نے باہر جھانکا..... چاندنی رات کے باوجود اسے کہر کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا، وہ اپنے ڈبے سے نیچے اترا تاکہ ڈرائیور کے پاس جا کر صورت حال معلوم کرے۔

ابھی اس نے آخری سیڑھی پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں "میاؤں" کی آواز آئی۔ اشرف احمد کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس ٹھٹھرتی رات میں یہ بلّی کہاں سے آگئی، یہ وقت زیادہ سوچنے کا نہ تھا..... اس نے لائٹ کا رخ کالے بلّے کی طرف کیا..... اور اس پر سرسری سی نگاہ ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا..... اس وقت اس کے سر پر یہ فکر سوار تھی کہ گاڑی کیوں رکی۔

گارڈ کے آگے جانے کے بعد، کالے بلّے نے ایک چھلانگ لگائی اور گارڈ کے ڈبے میں داخل ہو گیا۔

اشرف احمد بڑے دل گردے کا آدمی تھا لیکن اسے آگے جاتے ہوئے اچانک خوف سا محسوس ہوا اس کی ریڑھ کی ہڈی میں جیسے سنسناہٹ سی پھیل گئی۔ چند قدم آگے بڑھانے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، اس جگہ لائٹ ڈالی جہاں "بلّی" دکھائی دی تھی، مگر اب وہاں کچھ نہ تھا۔

پھر وہ اپنے خوف کو جھٹک کر تیز تیز انجن کی طرف بڑھنے لگا ابھی اشرف احمد دور نہ گیا تھا کہ اسے سامنے سے کوئی ٹارچ لئے بھاگتا ہوا نظر آیا..... وہ انجن ڈرائیور صادق حسین تھا وہ ٹارچ کی روشنی ٹرین کے نیچے ڈالتا ہوا تیزی سے بھاگا آرہا تھا..... گارڈ اشرف احمد کو دیکھ کر رک گیا۔

"کیا ہوا؟" اشرف احمد نے صادق حسین کو پہچان کر پوچھا۔ "کیا کسی نے زنجیر کھینچی ہے۔"

"نہیں، سر گاڑی میں نے خود روکی ہے۔" صادق حسین نے ہانپتے اور کانپتے ہوئے کہا۔

"کیوں خیر تو ہے؟" اشرف احمد کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"خیر نہیں ہے سر، مجھے یقین ہے، وہ سب مر گئے ہوں گے۔" صادق حسین بہت پریشان تھا۔

"کون مر گئے ہوں گے، یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" اشرف احمد نے گھبرا کر پوچھا۔

"میرے ساتھ آجائیے، آگے چل کر دیکھتے ہیں۔" صادق حسین، اشرف احمد کے ڈبے کی سمت بڑھتے ہوئے بولا۔

Urdufans.com

"پر ہوا کیا، کچھ بتاؤ تو۔" اشرف احمد نے پوچھا۔

"سر خدا کی قسم میں نے جان بوجھ کر انہیں نہیں مارا، وہ لوگ مجھے اچانک نظر آئے تھے اور جب نظر آئے، اس وقت گاڑی ان کے سروں پر پہنچ چکی تھی....." صادق حسین اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔

"کون تھے وہ لوگ۔ اس ٹھٹھرتی رات میں، ایسے جنگل میں وہ کیا کر رہے تھے۔" اشرف احمد اس کے ساتھ ساتھ گاڑی کے نیچے پڑیوں پر روشنی ڈالتا تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

"وہ کئی تھے اور سفید چادروں میں لپٹے ہوئے، سر پڑی پر رکھے لیٹے تھے..... بس میں نے اتنا ہی دیکھا تھا۔" صادق حسین نے بتایا۔

اب اشرف احمد کا ڈبہ آ چکا تھا..... اب تک انہیں کچھ نظر نہ آیا تھا۔

"صادق، یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔" اشرف احمد نے پٹڑیوں پر دور تک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"سر، تھوڑا سا آگے بڑھ کر اور دیکھ لیں۔" صادق حسین نے کہا۔

تب آگے بڑھ کر اشرف احمد نے صادق حسین کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ "یار، خدا کا کچھ خوف کھاؤ..... اس سردی میں کون پٹڑی پر سر رکھ کر لیٹے گا اور وہ بھی سفید چادروں میں..... اگر کسی کو خودکشی کرنا ہی تھی تو اسے ٹرین کی ضرورت نہ تھی..... اس جنگل میں بندہ لیٹے لیٹے ہی اللہ کو پیارا ہو سکتا ہے۔"

"سر، میں سچ کہتا ہوں، میں نے ان آنکھوں سے چار پانچ آدمیوں کو پٹڑی پر سر رکھے لیٹے ہوئے دیکھا تھا..... تب ہی تو میں نے گاڑی کو بریک لگائے تھے۔" صادق حسین نے بڑے یقین سے کہا۔

"اچھا، اب جو حماقت ہونا تھی وہ ہو گئی، گاڑی چلاؤ..... اور یہ دس منٹ تم نے جو برباد کئے ہیں..... اسے برابر کرو، گاڑی کو اسٹیشن پر رائٹ ٹائم پہنچنا چاہئے۔" یہ کہہ کر اشرف احمد ڈبے میں چڑھ گیا۔

صادق حسین نادم ہوتا ہوا، انجن کی طرف بڑھا..... اسے اپنی نظروں پر بڑا غصہ آ رہا تھا..... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس نے دیکھا کیا تھا..... یہاں سے وہاں تک اسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی تھی جو انسانوں کا روپ دھار لیتی۔

بہرحال وہ فریب نظر کا شکار ہوا تھا..... یہ بات اس کی سمجھ میں اچھی طرح آ گئی تھی۔

گاڑی رکنے کے بعد جب اسٹیشن آنے کے کوئی آثار پیدا نہ ہوئے..... تو کئی مسافروں نے ٹھنڈی ہوا کی پروا کئے بغیر کھڑکیاں اٹھائیں۔ باہر انہیں پُرہیبت سناٹے اور دھند کے سوا کچھ نظر نہ آیا..... وہ حیران رہ گئے کہ جنگل میں آخر گاڑی کس لئے رکی۔

کسی نے کہا "یار، کہیں ڈاکو نہ آ گئے ہوں۔"

کوئی بولا..... "کیا پتہ کسی نے زنجیر ہی کھینچی ہو۔"

ایک مسافر نے جو کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا، اس نے ڈرائیور صادق حسین کو ٹارچ لئے گزرتے

Urdufans.com

دیکھا تو سمجھا، گارڈ ہے، وہ اس سے مخاطب ہوا۔

"گارڈ صاحب کیا ہوا؟"

"بھائی ابھی تو کچھ نہیں ہوا۔"

"پھر گاڑی کیوں رکی ہوئی ہے؟"

"میں اسے ابھی چلاتا ہوں جاکر، آپ فوراً کھڑکی بند کرلیں۔" صادق حسین یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

صادق حسین کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ مسافر خوفزدہ ہوگیا، اس نے فوراً کھڑکی بند کرلی۔

چند منٹوں کے بعد گاڑی نے حرکت کی اور پھر اس نے بہت جلد رفتار پکڑلی..... صادق حسین نے ٹرین کی اسپیڈ بڑھاکر اگلے اسٹیشن پر رائٹ ٹائم پہنچادیا۔

گاڑی کے پلیٹ فارم پر رکتے ہی گارڈ اشرف احمد اپنے ڈبے سے باہر آیا۔ سردی اپنے عروج پر تھی۔ اشرف احمد کے دانت بج رہے تھے۔ اس اسٹیشن پر گاڑی دس منٹ ٹھہرتی تھی۔ اس نے سوچا چل کر چائے کے اسٹال پر چائے پی جائے۔

گارڈ کے اترنے کے بعد وہ کالا بلّا بھی ڈبے سے باہر آیا..... گارڈ کا ڈبہ پلیٹ فارم سے پیچھے تھا۔ کالے بلّے نے ڈبے سے زمین پر چھلانگ لگائی۔

چھلانگ لگاتے ہی جیسے وہ فضا میں تحلیل ہوگیا، وہ زمین پر نہیں گرا..... ہاں، البتہ ایک لحیم شحیم شخص کمبل اوڑھے پلیٹ فارم کی طرف چلتا ہوا نظر آرہا تھا۔

اس اسٹیشن پر چند مسافر بھی ڈبے سے باہر آئے..... یہ زیادہ تر چائے کی فکر میں ہی اترے تھے۔ ایک دو مونگ پھلی کے ٹھیلے کی طرف بھی بڑھے۔

اس لحیم شحیم شخص نے پلیٹ فارم پر آکر گاڑی کے ڈبے پر نظر ڈالی..... اس ڈبے کا دروازہ کھلا ہوا تھا..... وہ پورے اطمینان سے ڈبے میں داخل ہوگیا اور ایک مناسب جگہ دیکھ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے کمبل اس طرح اوڑھا ہوا تھا کہ اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ بس ناک اور منہ کا تھوڑا سا حصہ نظر آرہا تھا..... وہ اپنی چال ڈھال اور لباس سے کوئی مزدور دکھائی دے رہا تھا..... کسی مسافر نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

یہ دراز قد، لمبا چوڑا آدمی جس ڈبے میں چڑھا تھا، اس سے ملحق بوگی میں ایک بارات جارہی تھی۔ بوگی ریزرو تھی..... اس میں باراتیوں کے علاوہ کوئی مسافر نہ تھا..... راستے میں بہت سے مسافروں نے بوگی خالی دیکھ کر اس میں چڑھنے کی کوشش کی تھی تو انہیں بڑی مشکل سے رد کا گیا تھا۔ اب بھی بڑے اسٹیشن پر کچھ مسافر ادھر آنے کی کوشش کرتے تھے، اب ان لوگوں نے بوگی کے دروازے اندر سے بند کرلئے تھے..... کوئی کتنا ہی دروازہ پیٹتا یہ نہ کھولتے۔

بوگی میں خوب ہنگامہ ہورہا تھا..... باراتی اپنی اپنی پسند کی ٹولی بنائے بیٹھے تھے۔ لڑکے تاش کھیلنے میں مشغول تھے۔ لڑکیاں گانوں میں مصروف تھیں۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ پوری رات کوئی سوئے گا نہیں۔ یوں ٹرین میں ویسے بھی نیند کہاں آتی ہے لیکن کچھ نیند کے رسیا ایسے بھی تھے جنہیں سولی پر بھی نیند آجاتی تھی۔ جب ایسے لوگ سونے کی کوشش کرتے تو انہیں فوراً اٹھادیا جاتا۔ ان کے اوپر سے کمبل کھینچ لیا

Urdufans.com

جاتا..... یا لڑکیوں سے ڈھولک لے کر ان کے کان پر بجائی جاتی تو وہ بیچارہ کھسیا کر اٹھ جاتا اور کہتا.....

"میں سو تھوڑا ہی رہا تھا، میں تو ایسے ہی لیٹا تھا۔"

لڑکوں نے ایک بندے کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ پوری بوگی میں گھوم پھر کر دیکھے اور اسے جہاں بھی کوئی سوتا ہوا آدمی نظر آئے فوراً "تھانے" میں آکر اطلاع دے۔

اس بارات کے معرلوگ یعنی دولہا کے ابا، تایا، چچا اور ماموں وغیرہ یا ان لوگوں کے ہم عمر دوست بوگی کے ایک کونے میں اپنی محفل جمائے ہوئے تھے۔

قصے، کہانیاں چل رہی تھیں۔ آپ بیتی اور جگ بیتیاں سنائی جارہی تھیں پھر طے ہوا کہ ہر شخص اپنی زندگی کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ سنائے پھر باری باری ہوتے ہوتے جنات پر ٹھہری۔

"سب سے پہلے میں آپ کو ایک واقعہ نہیں دو واقعات سناؤں گا۔" فرقان ماموں نے اپنے گرد اچھی طرح کمبل لپیٹتے ہوئے کہا۔ "یہ دونوں واقعات سچے ہیں، میں بذات خود ان کا شاہد ہوں۔"

"ماموں، کیا آپ نے جن دیکھے ہیں۔" دولہا اکبر نے پوچھا۔ اکبر کو قصے کہانیوں سے بہت دلچسپی تھی، اس لئے جب اسے معلوم ہوا کہ بڑوں کی محفل میں قصے کہانیاں چل رہی ہیں اور قصے بھی جنات کے تو وہ فوراً چھوٹوں کی محفل چھوڑ کر ادھر آگیا۔

"ہاں، اکبر نہ صرف میں نے جن دیکھے ہیں بلکہ میں نے ان کی آواز بھی سنی ہے۔" فرقان ماموں گویا ہوئے۔ یہ علی گڑھ کی بات ہے اور ان دنوں کا ذکر جب میری عمر چودہ پندرہ سال ہوگی۔ ہمارے محلے کے ایک بزرگ صوفی امجد حسین فجر کے وقت گلی کے لوگوں کو نماز کیلئے بیدار کرنے آیا کرتے تھے۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ جس گھر کے سامنے پہنچتے پہلے اس گھر کے دروازے پر ڈنڈے برساتے، پھر اس گھر کے مکین کا نام لے کر پکارتے۔ "ارے، خواجہ صاحب اٹھ جاؤ، نماز کا وقت ہوگیا۔" اور جب تک اندر سے آواز نہ آجاتی کہ اچھا صوفی صاحب اٹھ گیا، اس وقت تک وہ آگے نہ بڑھتے صوفی امجد کو معلوم تھا کہ اس محلے کے کتنے لوگ نماز پڑھتے ہیں، جو نماز پڑھنے کے عادی نہ تھے، بخشتے وہ انہیں بھی نہ تھے۔ ان کا دروازہ بھی اس وقت تک پیٹے جاتے جب تک جواب نہ مل جاتا، نیند تو ان کی خراب ہوتی تھی لیکن وہ صوفی صاحب کا بگاڑ کچھ نہیں سکتے تھے بس لحاف میں تلملا کر رہ جاتے۔ صوفی امجد کو سب سے زیادہ ڈاکٹر طارق کو اٹھانے میں دقت پیش آتی تھی۔ ڈاکٹر طارق بھی بڑے مزے کی چیز تھے۔ پتہ نہیں انہیں کیا بیماری تھی کہ وہ بیٹھے بیٹھے سوجاتے تھے۔ مریض کی نبض پر ان کا ہاتھ ہے، مریض بڑی شدومد سے اپنا حال بیان کررہا ہے اور ڈاکٹر طارق کی گردن جھکتی چلی جارہی ہے، مریض سمجھ رہا ہے کہ وہ نبض پر ہاتھ رکھے بڑے توجہ سے ان کا حال سن رہے ہیں لیکن وہ حال سے بے خبر کسی اور دنیا میں پہنچے ہوئے ہوتے۔ مریض چونکتا اس وقت تھا جب ڈاکٹر صاحب کی گرفت نبض پر ڈھیلی پڑ جاتی اور ان کا ہاتھ بے جان ہو کر نیچے ڈھلک جاتا اور ڈاکٹر صاحب کے خراٹے سنائی دینے لگتے۔ مریض بیچارہ انہیں ہلا ڈاکٹر صاحب چونک کر اٹھتے اور اس سے پوچھتے "اچھا بیٹا تو بتاؤ کھانسی تو نہیں۔" بیچارہ مریض پھر سے شروع ہوجاتا۔ ان ڈاکٹر صاحب کے خراٹے بڑے مشہور تھے ان کا گھر ہمارے گھر کے سامنے تھا۔ وہ خراٹے اتنی زور سے لیتے تھے کہ ہمارے گھر تک ان کی آواز آتی بلکہ پوری گلی میں ان کے خراٹے گونجتے ان ڈاکٹر

Urdufans.com

طارق کو صوفی امجد کو اٹھانے میں بڑی دقت پیش آتی کیونکہ دروازہ پیٹے جانے کی آواز اور خود ان کی آواز، ڈاکٹر طارق کے خراٹوں میں دب جاتی۔ صوفی امجد، بیچارے اٹھا اٹھا کر تنگ آجاتے تب کہیں جاکر ڈاکٹر طارق کی مریل سی آواز آتی "اچھا، صوفی صاحب شکریہ۔" ان کی آواز سن کر صوفی صاحب کہتے دیکھو، دوبارہ نہ سوجانا یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے۔

"کیا، وہ اٹھ کر دوبارہ سوجاتے تھے۔" اکبر نے پوچھا۔

"ہاں، کبھی کبھی ایسا بھی ہوجاتا تھا۔" فرقان ماموں نے جواب دیا۔ "صوفی صاحب جب لوگوں کو اٹھا کر واپس آتے تو ڈاکٹر طارق کا دروازہ ایک مرتبہ اور بجا کر گزر جاتے۔ صوفی صاحب کے علاوہ ایک پارٹی اور نمازیوں کو اٹھانے آتی تھی۔ یہ لوگ صوفی صاحب سے بہت پہلے آتے تھے۔ اس وقت گہرا اندھیرا چھایا ہوا ہوتا تھا۔ یہ لوگ ڈھولک کی تھاپ پر کچھ گاتے ہوئے گزر جاتے وہ کیا گاتے تھے یہ سمجھ میں نہ آتا آوازوں سے محسوس ہوتا کہ تین چار آدمی ہیں۔ یہ لوگ گاتے بجاتے تیزی سے گلی سے گزر جاتے یہ کون لوگ تھے، کسی کو معلوم نہ تھا۔ محلے کے سب لوگ انہیں فقیر ہی سمجھتے تھے۔ میں ان دنوں آٹھویں یا نویں میں پڑھتا ہوں گا۔ میرے ہم عمر لڑکوں نے ایک دن پروگرام بنایا کہ ہمیں بھی محلے کے لوگوں کو اٹھانے کیلئے کچھ کرنا چاہئے۔ ڈھولک کہیں سے ملنا تو مشکل تھی، لہٰذا یہ پروگرام بنا کہ ٹین کے کنستر سے ڈھولک کا کام لیا جائے اور کوئی قوالی گاتے ہوئے گلیوں سے گزر جائیں۔ خیر صبح کو جب میری ڈھولک اور گانے کی آواز سے آنکھ کھلی تو میں خاموشی سے اوپر سے اتر آیا اور دروازے کی کنڈی کھول کر چپ چاپ ان لوگوں کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے گھر کا دروازہ نہ کھولا تھا، دروازے کے پیچھے چھپا کھڑا تھا، میرا پروگرام یہ تھا کہ میرے دوست جیسے ہی قریب آئیں گے میں فوراً دروازہ کھول کر شور مچا کر ان کے سامنے آجاؤں گا میں انہیں دہشت زدہ کرنا چاہتا تھا وہ لوگ گاتے بجاتے جیسے ہی میرے گھر کے سامنے آئے میں نے تیزی سے دروازہ کھولا اور چیخ مار کر ان لوگوں کے اوپر کود گیا ان لوگوں کے اوپر کودتے ہی گانے بجانے کی آواز بند ہوگئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ٹیپ کو ہائی اسپیڈ پر چلا دیا گیا ہو۔ بس "بس چیں، چوں، چاں" کی سی آوازیں سنائی دیں۔ میرے دوست بڑے شرارتی تھے میں نے سوچا کہ یہ خود ڈرنے کے بجائے مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گلی میں گہرا اندھیرا تھا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا میں نے انہیں پکڑنے کیلئے ایسے ہی ادھر اُدھر ہاتھ چلائے تو میرے کانوں میں ایک اجنبی آواز پڑی۔

"ہم وہ نہیں ہیں، تمہارے دوست پیچھے آرہے ہیں۔"

اس آواز کو سن کر مجھے احساس ہوا کہ میں غلطی پر ہوں میرے دوست ابھی نہیں آئے تھے، میں نے فقیروں کی ٹولی کو اپنے دوست سمجھ کر انہیں ڈرا دیا تھا۔ میں گلی کی اس سمت بڑھا جدھر سے ان لوگوں نے آنا تھا چند منٹوں کے بعد میں نے گلی کے اگلے سرے پر پھر گانے بجانے کی آوازیں سنیں، اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ یہ فقیروں کی ٹولی نہیں تھی، میرے اپنے ہی دوست تھے اور مجھے جل دے گئے تھے۔ مجھے ان کی اس شرارت پر بڑا غصہ آیا۔ میں فوراً واپس آیا اور پھر دوڑتا ہوا ان کے نزدیک پہنچا میرے قریب پہنچتے ہی وہ پھر ایک دم خاموش ہوگئے میں نے غصے میں کہا۔

"یار، قیصر مجھے پریشان مت کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

Urdufans.com

"اچھا تم مانو گے نہیں آجاؤ پھر ہمارے ساتھ۔"

گانے بجانے کی پھر آواز آنے لگی۔ یہ آواز ذرا فاصلے سے آرہی تھی میں پھر ان کے پیچھے بھاگا اب مجھے آواز آگیا تھا کہ اس مرتبہ نہیں چھوڑوں گا۔ ان میں سے کسی ایک کو قابو کرلوں گا۔ میں جیسے ہی نزدیک پہنچا گانا بجانا پھر بند ہوگیا اور آواز آئی۔ "یہ ایسے نہیں مانے گا۔ اسے پکڑ کر اٹھاؤ۔"

پھر مجھے بازوؤں سے دو لوگوں نے پکڑ لیا اور تیزی سے مجھے بھگا کر لے چلے کہ مجھے یہ احساس ہوا کہ جیسے میں اڑ رہا ہوں۔ میرے گھر سے کافی آگے انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں غائب ہوگئے ہیں اب دور تک کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ میں نے سوچا۔ شاید مسجد پہنچ گئے ہوں گے۔ مسجد نزدیک ہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا مسجد میں پہنچا۔ مسجد کے دروازے میں بلب جل رہا تھا میں نے دروازے میں کھڑے ہو کر مسجد کے اندر دیکھا وہ بہت چھوٹی سی مسجد تھی، اس میں مشکل سے چالیس پچاس نمازیوں کی گنجائش ہوگی۔ مسجد خالی پڑی تھی۔ میں واپس ہونے لگا تو میں نے مسجد کے پیش امام مولوی مختار کو دروازے کی طرف آتے دیکھا میں فوراً رک گیا۔ میں نے سوچا کہ مولوی مختار سے پوچھ لوں کہ یہاں میرے دوست تو نہیں آئے۔ مولوی صاحب نزدیک آئے تو میں نے دیکھا کہ وہ کچھ غصے میں ہیں میرے کچھ سوال کرنے سے پہلے ہی بولے "جاؤ، گھر ابھی ہماری نماز ہو رہی ہے۔"

ان کے غصے سے ڈر کر، میں وہاں سے بھاگ آیا اور سیدھا اپنے گھر آکر سو گیا۔ صبح جب اسکول جانے کیلئے قیصر میرے گھر آیا تو میں نے دروازے سے نکلتے ہی اس سے شکایت کی۔

"یار تم لوگ عجیب ہو مجھے چھوڑ کر تم لوگ کہاں چلے گئے تھے۔ مجھے اگر اپنے ساتھ نہیں لے جانا تھا تو مجھ سے ساتھ چلنے کے لئے کیوں کہا تھا۔"

قیصر میری بات سن کر حیران رہ گیا بولا۔ "فرقان، ہم لوگ صبح آئے کب؟ میں حمید کے گھر گیا تو وہ اٹھا ہی نہیں۔ آوازیں دے دے کر تھک گیا۔ اس کے بعد راشد کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ رات کو بخار ہوگیا تھا۔ بس پھر میں کیا کرتا بور ہوگیا تمہارے گھر بھی نہ آیا میں جاکر خاموشی سے سو گیا۔"

"قیصر جھوٹ مت بولو۔" یہ کہہ کر میں نے تفصیل سے پورا واقعہ سنایا اور آخر میں کہا "میں نے تم لوگوں کو مسجد تک جاکر تلاش کیا۔"

"خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں بول رہا چلو راشد کے گھر چلو۔ وہاں تمہیں معلوم ہو جائے گا۔"

قیصر ٹھیک کہہ رہا تھا اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس بات کی تصدیق راشد اور حمید سے مل کر ہوگئی اب میں بڑا پریشان ہوا کہ وہ لوگ کون تھے جن سے فجر کے وقت میری ملاقات ہوئی تھی۔

اسکول سے آکر میں نے کھانا وانا کھایا اور پھر ظہر کی نماز پڑھنے چلا گیا۔ مسجد پہنچا تو وہاں امامت محلے کے ایک بزرگ نے کی۔ نماز سے فارغ ہو کر میں نے ایک نمازی سے مولوی مختار کے بارے میں پوچھا۔

"مولوی صاحب کہاں ہیں۔"

اس نمازی نے بتایا "مولوی مختار بیمار ہیں۔"

"بیمار ہیں۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "صبح تو میں نے انہیں مسجد میں دیکھا تھا۔"

"صبح تم نے کیسے مسجد میں دیکھ لیا جبکہ وہ صبح مسجد آئے نہیں۔ صبح چوہدری صاحب نے نماز پڑھائی

Urdufans.com

تھی۔"

اب میں بڑا چکرایا مولوی مختار اگر مسجد آئے نہیں تو صبح میں نے کس کو دیکھا تھا۔ انہوں نے بڑے غصے سے کہا تھا۔ "جاؤ گھر، ابھی ہماری نماز ہو رہی ہے۔" تو وہ نماز کس کی ہو رہی تھی۔

فرقان ماموں جب یہ واقعہ سنا کر خاموش ہوئے تو سب کے چہرے پر یہ سوال تھا کہ وہ نماز کس کی ہو رہی تھی۔ وہ اگر لڑکے نہیں تھے تو پھر کون تھے۔

"فرقان ماموں، وہ کون تھے؟" اکبر نے پوچھا۔

"وہ جن تھے!" فرقان ماموں نے اپنے گرد کمبل کو اچھی طرح لپیٹتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے مسجد میں مولوی مختار کی صورت میں جو شخص آپ کے سامنے آیا وہ بھی جن تھا۔"

"بے شک، کیونکہ مولوی مختار اس صبح بیمار تھے وہ گھر سے نماز پڑھانے نکلے ہی نہیں۔" فرقان ماموں نے کہا۔

"کیا جن بھی نماز پڑھتے ہیں۔" اکبر نے پوچھا۔

"ہاں، کیوں نہیں، انسانوں کی طرح جن بھی مسلمان ہوتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں۔"

"ماموں، آپ نے بتایا کہ جب آپ دروازہ کھول کر اچانک باہر آئے تو آپ نے چوں، چاں، کی آوازیں سنیں وہ کیا تھیں۔" اکبر نے سوال کیا۔

"میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ جنوں کی زبان تھی۔ ان کے بولنے کا انداز بالکل اسی طرح کا تھا جیسے ٹیپ کو ہائی اسپیڈ میں چلا دیا جائے تو آواز سمجھ میں نہیں آتی۔ بس چوں، چاں کی سی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔" فرقان ماموں نے کہا۔

"اچھا ماموں، اب دوسرا واقعہ سنائیں۔" اکبر پرشوق لہجے میں بولا۔

"دوسرا واقعہ، یونیورسٹی کے زمانے کا ہے۔" فرقان ماموں نے کہنا شروع کیا۔ "اس وقت ہم نئے نئے یونیورسٹی میں داخل ہوئے تھے ہمارے گھر سے یونیورسٹی کوئی ایک میل کے فاصلے پر ہوگی۔ ہم اس وقت پیدل آیا جایا کرتے۔ سائیکل ہمارے پاس ایک دو سال کے بعد آئی۔ یونیورسٹی سے واپسی پر ہماری چار پانچ لڑکوں کی ٹولی ہوتی تھی۔ ہم راستے بھر شرارتیں کرتے آتے۔ علی گڑھ میں نئی بستی کے نام سے ایک محلہ ہے اس کے پاس ایک مسجد تھی اس مسجد میں ایک تہہ خانہ تھا ہم جب بھی وہاں سے گزرتے تو میری خواہش ہوتی کہ اس تہہ خانے کے اندر جا کر دیکھوں ایک دن ہم ایک گرگٹ کا پیچھا کرتے مسجد کے قریب پہنچ گئے۔ گرگٹ تہہ خانے کے روشن دان میں غائب ہو گیا میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ تہہ خانے کے اندر جاؤں یا نہ جاؤں کہ مجھے تہہ خانے کی سیڑھیوں سے باہر آتا سرور نظر آیا۔ اس نے مجھے اشارے سے بلا کر کہا۔ "آؤ فرقان اندر چل کر تہہ خانہ دیکھو گے۔"

"ہاں، کیوں نہیں،" یہ کہہ کر میں سرور کے پیچھے چلا جو اب واپس ہو کر سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

وہ سرد کا وقت تھا تہہ خانے کی ابتدائی سیڑھیوں پر روشنی تھی، میں تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا روشنی غائب ہوتی گئی۔ سرور اتنی تیزی سے سیڑھیاں اترا تھا میں چاہتا تھا کہ اسے پکڑ

Urdufans.com

لوں تاکہ تہہ خانے میں مجھے ڈر نہ لگے۔ میں نے تہہ خانے کی آخری سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ میں نے اندر کچھ ہیولے سے دیکھے یہ ہیولے محرابوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ جب میں سیڑھیاں اتر رہا تھا تو میرے کانوں میں آوازیں آرہی تھیں۔

"ارے، یہ کون آرہا ہے۔"

"یہ تو انسان کا بچہ معلوم ہوتا ہے۔"

"اسے کون لایا یہاں۔"

"یہ (کوئی نام لیا گیا، جواب مجھے یاد نہیں) کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔"

سرور کا دور تک پتہ نہ تھا۔ تہہ خانے میں اندھیرا تھا۔ بس اندر سے آوازیں آرہی تھیں۔

"ارے بھاگو یہاں سے، تمہارے ساتھی چلے گئے۔" پھر کسی نے کہا۔ یہ آواز سرور کی ہر گز نہ تھی۔

اب اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ مجھے بے حد ڈر لگا۔ میں الٹے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ باہر آکر دیکھا تو میرے سارے ساتھی غائب تھے۔ میں نے دوڑ لگائی لیکن مجھے راستے میں کوئی نہ ملا یہاں تک کہ میرا گھر آگیا اور میں گھر میں داخل ہو گیا۔

دوسرے دن یونیورسٹی پہنچ کر میں نے اپنے ساتھیوں سے شکایت کی کہ تم لوگ مجھے چھوڑ کر اتنی جلدی کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میری شکایت سن کر انہوں نے الٹا مجھے ڈانٹا اور پوچھا کہ ہم تو کتنی دیر تک تمہارا انتظار کرتے رہے تم خود ہی غائب ہو گئے تھے۔

میں نے سرور سے کہا۔ "سرور، میں کہاں غائب ہوا تھا۔ تم تو میرے ساتھ تھے۔ تم ہی تو مجھے تہہ خانے میں لے گئے تھے۔"

سرور نے میری شکل دیکھی اور ہنس کر بولا۔ "واہ بھئی، میں کب تمہیں تہہ خانے میں لے گیا تھا کیا بے پر کی اڑا رہے ہو۔"

"سرور کیا تم وہ نہیں تھے۔ تم وہ نہیں تھے تو پھر وہ کون تھا جو مجھے تہہ خانے میں لے گیا تھا؟"

"کون بھئی، کس کی بات کر رہے ہو؟" سرور نے پوچھا۔

جواب میں میں نے اپنے دوستوں کو ساری روداد سنا دی۔ میری بات سن کر سب پریشان ہو گئے اور ہم سب نے طے کر لیا کہ آئندہ اس مسجد کے احاطے میں نہیں جائیں گے۔ اس تہہ خانے میں دراصل جن رہتے تھے۔ ہم لوگ روزانہ مسجد کے قریب سے گزرتے تھے اور کبھی کبھی مسجد کے اندر بھی چلے جاتے تھے۔ میں جب اندر جاتا تو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ تہہ خانے کو اندر سے دیکھوں۔ اس دن بھی جب ہم گرگٹ کے تعاقب میں مسجد کے اندر چلے گئے تھے تو میرے دل میں یہ خواہش موجود تھی۔ بس اسی وقت کسی جن کے بچے نے سرور کی شکل اختیار کر لی اور وہ شرارتی بچہ مجھے اندر لے گیا۔"

ماموں فرقان نے اپنا قصہ ختم کیا تو چند لمحوں کیلئے خاموشی چھائی رہی۔ بس گاڑی چلنے کی آواز آرہی تھی یا لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے۔

Urdufans.com

کہتے ہیں جب بھی کسی محفل میں جنات کا ذکر ہوتا ہے تو وہاں آس پاس ہی کوئی جن ضرور موجود ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بات صحیح نہ ہو، محض لوگوں کا خیال ہو لیکن اس وقت یہ بات بالکل صحیح تھی۔ اس بوگی میں جنات کا ذکر ہو رہا تھا تو برابر کی بوگی میں ایک جن موجود تھا۔

وہ لمبا چوڑا آدمی، کمبل اوڑھے بڑی خاموشی سے گاڑی کے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس بوگی میں ٹکٹ کلکٹر لوگوں کے ٹکٹ چیک کر رہا تھا۔ ٹکٹ چیک کرتے کرتے وہ اس لمبے چوڑے آدمی کے نزدیک آیا اور بولا۔ "اپنا ٹکٹ دکھاؤ۔"

اس لمبے چوڑے آدمی نے جیسے سنا ہی نہیں، خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

تب کلکٹر نے اس کے کمبل کا کونا پکڑ کر ہلایا اور کہا "بھئی، ٹکٹ دکھاؤ۔"

اب اس لمبے چوڑے آدمی نے اپنا سر اٹھایا اور خالی خالی نظروں سے ٹکٹ کلکٹر کو دیکھا۔ زبان پھر بھی نہ ہلائی۔

"میری شکل کیا دیکھ رہے ہو، جلدی سے ٹکٹ دکھاؤ۔" ٹکٹ کلکٹر نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا۔

"ٹکٹ!" اس لمبے چوڑے آدمی نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں بھئی ٹکٹ، کیا تم نے کبھی ٹکٹ نہیں دیکھا؟"

"نا جی، مجھے تو نہیں معلوم کہ ٹکٹ کیا ہوتا ہے، میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ذرا دکھائیں تو کیسا ہوتا ہے ٹکٹ؟" اس کے لہجے میں بڑی معصومیت تھی۔

ٹکٹ کلکٹر کو یہ سن کر غصہ بھی آیا، ہنسی بھی آئی کہ کس دیہاتی سے پالا پڑ گیا۔ اس نے برابر بیٹھے ایک مسافر سے کہا جس کا ٹکٹ وہ ابھی چیک کر چکا تھا۔

"ذرا اپنا ٹکٹ انہیں دکھانا۔" اب وہ تفریح کے موڈ میں آ گیا تھا۔

"اچھا جی۔" اس مسافر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن ٹکٹ نہ تھا۔ پھر اس مسافر نے اپنی ساری جیبیں ٹٹول لیں لیکن ٹکٹ نہ ملا۔

"پتہ نہیں جی کدھر گیا۔ ابھی تو میں نے جیب میں ہی رکھا تھا۔" مسافر بولا۔

اس مسافر سے مایوس ہو کر ٹکٹ کلکٹر نے ایک اور مسافر سے کہا۔ "آپ اپنا ٹکٹ دکھائیں۔"

اس مسافر نے بھی اپنی جیبیں ٹٹولیں لیکن ٹکٹ اسے بھی نہ ملا۔

اس طرح ایک ایک کر کے ٹکٹ کلکٹر نے سب مسافروں سے پوچھ ڈالا لیکن کسی کی بھی جیب سے ٹکٹ نہ نکلا۔ وہ جس سے بھی ٹکٹ کیلئے کہتا، وہ مسافر بس اپنی جیبیں ٹٹول کر رہ جاتا۔

پھر ٹکٹ کلکٹر کو خیال آیا کہ اس کی جیب میں بھی کچھ ٹکٹ پڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پھر ایک ایک کر کے سب جیبیں دیکھ ڈالیں لیکن ٹکٹ نہ ملنے تھے نہ ملے۔

ٹکٹ کلکٹر کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ ایسی صورت حال کبھی پیدا نہ ہوئی تھی کہ پوری بوگی میں ایک مسافر کے پاس بھی ٹکٹ نہ تھا جبکہ کچھ دیر پہلے سب نے اپنے اپنے ٹکٹ دکھائے تھے۔

"کیا ہوا جی، آپ نے مجھے ٹکٹ دکھایا نہیں۔" اس لمبے چوڑے آدمی نے اپنے چہرے سے کمبل ہٹاتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ کسی چھپکلی کی طرح بالکل زرد تھا۔ ٹکٹ کلکٹر نے فوراً اس کے چہرے سے

Urdufans.com

نظریں ہٹالیں۔ اس کا چہرہ دیکھ کر جانے کیوں اسے خوف سامحسوس ہوا۔
"ٹھہرو میں دوسری بوگی میں سے ٹکٹ لے کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر ٹکٹ کلکٹر دوسری بوگی میں چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد وہ لمبا چوڑا آدمی بھی اٹھا اور مسافروں نے اسے دروازے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ پانچ منٹ بعد وہ ٹکٹ کلکٹر واپس آیا اس کے ہاتھ میں کئی ٹکٹ تھے لیکن اس لمبے چوڑے آدمی کی جگہ خالی تھی۔
"کدھر گیا یہ؟" ٹکٹ کلکٹر نے اس کے قریب بیٹھے ہوئے مسافر سے پوچھا۔
"وہ جی دروازے کی طرف گیا تھا۔" اس نے بتایا۔
ٹکٹ کلکٹر دروازے کی طرف آیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے ٹوائلٹ کا دروازہ کھولا، وہاں بھی کوئی نہ تھا۔

گاڑی برق رفتاری سے چل رہی تھی۔ چلتی گاڑی سے اترنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔
ٹکٹ کلکٹر نے برابر کی بوگی بھی چھان ماری مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ پھر ٹکٹ کلکٹر واپس آیا۔ اب وہ اس بوگی میں آیا جس میں بارات سفر کر رہی تھی۔ یہ بوگی اس سے ملحق تھی جس میں وہ لمبا چوڑا آدمی بیٹھا تھا۔ ٹکٹ کلکٹر نے سوچا ہو سکتا ہے وہ پیچھے والی بوگی میں نہ گیا ہو آگے والی بوگی میں گیا ہو۔
جب وہ اس بارات والی بوگی میں آیا تو ماموں فرقان اپنا قصہ ختم کر چکے تھے اور سب دم بخود بیٹھے تھے۔ ٹکٹ کلکٹر نے اس لمبے چوڑے آدمی کے بارے میں ان لوگوں سے استفسار کیا۔
"نہیں جناب ادھر کوئی ایسا آدمی نہیں آیا۔" ماموں فرقان نے ٹکٹ کلکٹر کو بتایا۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا وہ اتنی سی دیر میں کہاں غائب ہو گیا۔"
"کیوں کیا ہوا کوئی خاص مسئلہ ہو گیا؟"
"بڑا خاص مسئلہ ہے جناب میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔" ٹکٹ کلکٹر نے پڑھے لکھے آدمی دیکھ کر سوچا کہ ان لوگوں کو وہ تفصیل سے اس آدمی کے بارے میں بتائے۔ ان لوگوں نے ٹکٹ کلکٹر کو اپنے درمیان جگہ دے دی۔
تب ٹکٹ کلکٹر نے جو اس پر گزری تھی کہہ سنائی۔
اس کا قصہ سن کر سب کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔
"آپ نے اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی تو نہیں کی۔" کچھ دیر کے بعد ماموں فرقان نے پوچھا۔
"نہیں، میں نے اس سے صرف ٹکٹ ہی مانگا تھا۔ جب اس نے کہا کہ کیسا ہوتا ہے ٹکٹ ذرا دکھاؤ تو میں نے اس کے برابر والے مسافر سے ٹکٹ مانگا۔ پھر میں پوری بوگی کے مسافروں سے ٹکٹ مانگتا چلا گیا لیکن کسی کے پاس ٹکٹ نہ ملا حتیٰ کہ جو ٹکٹ میری جیب میں پڑے ہوئے تھے وہ بھی غائب ہو گئے تھے۔"

"پھر آپ ایک دوسری بوگی میں ٹکٹ لینے چلے گئے اور جب وہاں سے ٹکٹ لے کر آئے تو وہ آدمی غائب تھا۔" فرقان ماموں نے کہا۔ "یہ اچھا ہوا کہ آپ نے اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی ورنہ

مشکل میں پڑ جاتے۔"

"کیوں ماموں کیا ہو جاتا؟" اس مرتبہ اکبر بولا۔

"جانے کیا ہو جاتا۔" ماموں فرقان بولے۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا جی۔" ٹکٹ کلکٹر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"آپ کو کچھ اندازہ ہوا کہ وہ کون تھا؟" ماموں فرقان نے سوال کیا۔

"نہیں جی۔" ٹکٹ کلکٹر نے کہا۔

"وہ جن تھا۔" ماموں فرقان نے بڑے اطمینان سے کہا۔ اس انکشاف پر سارے باراتیوں کی سٹی گم ہو گئی۔ ٹکٹ کلکٹر کے جسم میں اچانک سردی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ کپکپانے لگا۔ اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔ "جن۔"

پھر یہ خبر بڑی تیزی سے گاڑی میں پھیل گئی کہ گاڑی میں جن آ گیا ہے۔

"گاڑی میں جن" اس خبر کو جو بھی سنتا کپکپا کر رہ جاتا۔

یہ خبر ایک مسافر سے دوسرے مسافر پھر ایک بوگی سے دوسری بوگی میں یہاں تک کہ گارڈ تک پہنچ گئی۔

گاڑی اپنی برق رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔ سردی نے اور شدت اختیار کر لی تھی۔

اس زرد رو آدمی کو پوری گاڑی میں تلاش کر لیا گیا تھا لیکن وہ کہیں نہ ملا تھا۔ جتنے مسافر بھی کمبل اوڑھے بیٹھے یا لیٹے تھے ان سب کے چہرے اچھی طرح دیکھ لئے گئے تھے لیکن اس چھپکلی جیسی رنگت والے پُراسرار آدمی کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ریلوے پولیس کا عملہ جو اس گاڑی کے ساتھ چل رہا تھا اس نے ٹکٹ کلکٹر کے ساتھ اچھی طرح ایک ایک ڈبہ، ایک ایک مسافر چیک کر لیا تھا لیکن وہ پُراسرار بندہ ہاتھ نہ آیا تھا۔

بارات والی بوگی میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ خواتین گانا بھول گئی تھیں اور کمبلوں اور لحافوں میں گھسی ایک دوسرے سے چپٹی ہوئی تھیں۔

بوگی کے دروازے تو بند تھے ہی اب وہ دروازے بھی بند کر لئے گئے تھے جو ایک بوگی کو دوسری سے ملاتے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد ایک بڑا اسٹیشن آنے والا تھا۔ لڑکوں نے بھی تاش کھیلنے بند کر دیئے تھے اور اب بستروں میں گھسے بیٹھے تھے۔

رات کے تین بجے تھے گاڑی کسی سنسناتی گولی کی طرح اڑی جا رہی تھی۔

راشدہ ٹوائلٹ جانے کیلئے بے چین ہو رہی تھی۔ راشدہ دولہا اکبر کی چھوٹی بہن تھی۔ وہ بیس بائیس سال کی ایک پُرکشش لڑکی تھی۔ اس نے اپنی امی سے کہا۔

"امی میرے ساتھ ٹوائلٹ چلیں، میں اکیلی نہیں جا سکتی، مجھے خوف آ رہا ہے۔"

"ارے خوف کس بات کا۔" راشدہ کی امی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ ماموں فرقان کو تو ہر جگہ جن نظر آتے ہیں۔ لوگ چاند پر پہنچ چکے ہیں اور ہم لوگ ابھی تک جن بھوتوں کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔"

راشدہ کی امی ٹوائلٹ تک اس کے ساتھ گئیں پھر انہوں نے ٹوائلٹ کا دروازہ کھولا اور بولیں "جاؤ"۔

Urdufans.com

"امی آپ یہیں کھڑی رہیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر راشدہ ٹوائلٹ میں داخل ہوگئی اور دروازہ بند کرلیا۔

دروازہ بند کئے ایک لمحہ بھی نہ ہوا تھا کہ راشدہ بُری طرح چیخنے ہوئی ٹوائلٹ سے نکل آئی۔ راشدہ کی چیخ سن کر امی بھی بدحواس ہوگئیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر راشدہ کو تھام لیا اور پریشان ہوکر بولیں۔ "اری کیا ہوا؟"

"امی۔" راشدہ ٹوائلٹ سے کچھ اس طرح چیختی ہوئی نکلی جیسے اس نے کوئی بہت خوفناک چیز دیکھ لی ہو۔ اس کی گگھی بندھی ہوئی تھی بولنا محال تھا۔ آواز حلق میں پھنس رہی تھی وہ بمشکل بولی۔ "امی، وہ"

"اری، کیا وہ، کیا اندر کوئی چھپکلی ہے۔" راشدہ کی امی نے ذرا اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "اچھا میرا گلا تو چھوڑ تو مجھ سے اس طرح چمٹ گئی ہے جیسے اندر سچ مچ جن دیکھ لیا ہو۔"

راشدہ چھپکلی سے بہت ڈرتی تھی۔ باورچی خانے میں کام کرتے ہوئے اگر اسے کہیں چھپکلی نظر آجاتی تو وہ کچھ اس طرح چیخ مار کر وہاں سے نکلتی کہ گھر والے دہل کر رہ جاتے اس کی امی کو راشدہ کی ان چیخوں پر بڑا غصہ آتا تھا۔ وہ جھنجلا کر کہتیں۔

"راشدہ آخر تو کب بڑی ہوگی ڈھونگ کی ڈھونگ ہوگئی لیکن تو نے چھپکلیوں سے ڈرنا نہیں چھوڑا۔ آخر تو اس بے ضرر جانور سے اتنا کیوں ڈرتی ہے۔ اری جھاڑو اٹھا اور اسے مار دے اگر مارنے کی تجھ میں ہمت نہیں ہے تو کسی بہن بھائی کو آکر بتادے وہ مار دے گا۔ تجھے آخر اس قدر چیخنے چلانے اور اچھلنے کودنے کی ضرورت کیا۔"

امی اسے نصیحتیں کرتی رہتیں، اسے ڈانٹ پلاتی رہتیں لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلتا۔ اسے جہاں کہیں بھی چھپکلی نظر آتی وہ ایک زوردار چیخ مارتی اور دس گز دور جا کھڑی ہوتی۔ اس وقت بھی جب راشدہ چیختی ہوئی ٹوائلٹ سے نکلی تھی تو اس کی امی نے یہی سمجھا تھا کہ اس نے اندر کوئی چھپکلی دیکھ لی ہے۔

راشدہ کی امی نے راشدہ کو ایک جھٹکے سے خود سے الگ کیا اور ٹوائلٹ کی طرف بڑھیں۔

"امی، اندر نہ جائیں، وہاں ایک خوفناک کالا بلّا ہے۔" راشدہ نے امی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اری، کیا بکواس کر رہی ہے جب میں نے دروازہ کھولا تھا تو وہاں کچھ نہ تھا۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولیں۔

"وہ دروازے کے پیچھے چھپا ہوا تھا، آپ نے پورا دروازہ کب کھولا تھا۔"

"اب تو لیموں سے بھی ڈرنے لگی ہے۔" راشدہ کی امی کو غصہ آگیا۔ "تو نے ٹوائلٹ جانا ہے تو جا ورنہ میں واپس جارہی ہوں۔"

"امی، وہ بہت خوفناک ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر اس طرح غرایا کہ آپ کو کیا بتاؤں۔" راشدہ کا وہ منظر یاد کر کے دل دھک دھک کرنے لگا۔

"اری، تو میرا ہاتھ چھوڑ۔ میں دیکھتی ہوں۔" یہ کہہ کر امی نے راشدہ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ٹوائلٹ کے دروازے کو ایک مرتبہ پھر کھولا ابھی انہوں نے دروازہ تھوڑا سا ہی کھولا تھا کہ اندر سے کسی بے

کے غرانے کی آواز آئی۔ اس آواز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ راشدہ کی امی جو خاندان بھر میں بڑی نڈر مشہور تھیں، اس آواز کو سن کر، ایک لمحے کو لرز کر رہ گئیں۔

وہ کافی ہمت والی اور نڈر خاتون تھیں۔ انہوں نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور دروازے کو زور سے دھکا دے کر کھول دیا۔ دروازہ دھاڑ سے دیوار سے جا لگا۔

کالا بلا غراتا ہوا باہر آیا اور اس نے دروازے پر رک کر راشدہ کی امی کو دیکھا۔

اس کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں اور پورا جسم کوئلے کی طرح سیاہ تھا۔ وہ بڑا جسیم بلا تھا اس کی جسامت کسی چھوٹے تیندوے سے کم نہ تھی۔

راشدہ کی امی نے فوراً اس پر سے نظریں ہٹالیں اور اس کے سامنے سے ہٹ گئیں تاکہ وہ ٹوائلٹ سے باہر نکل جائے۔ راشدہ کا اس بلے کو دیکھ کر دم نکلا جا رہا تھا، وہ امی کے پیچھے دبکی ہوئی تھی اور تھر تھر کانپ رہی تھی۔

کالا بلا انہیں دیکھ کر ایک بار پھر غرایا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

باہر نکلتے ہوئے راشدہ کی ٹانگوں سے ٹکرایا، راشدہ چیخ مار کر امی کی گردن میں جھول گئی۔ راشدہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی ٹانگوں سے کوئی لوہے کی چیز ٹکراتی ہوئی نکل گئی ہو۔

امی نے اس کالے بلے کو بوگی کے اندر جاتے دیکھا، پھر انہوں نے مڑ کر راشدہ سے کہا۔ "جاؤ اب ٹوائلٹ ہو آؤ۔"

"امی مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے آپ یہیں کھڑی رہیں۔"

"ہاں، میں یہیں کھڑی ہوں، تم جلدی سے فارغ ہو کر آؤ۔"

راشدہ لرزتی ہوئی اندر گئی اس نے دروازہ اندر سے بند کیا مگر چٹخنی نہ لگائی اسے کھلا چھوڑ دیا تاکہ یہاں سے باہر نکلنے میں کوئی وقت پیش نہ آئے۔

تین چار منٹ کے بعد وہ باہر نکلی۔ امی کو دروازے پر دیکھ کر اسے اطمینان ہوا۔ اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ "امی، چلیں۔"

راشدہ اور اس کی امی ایک ساتھ ہی کمبل میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کمبل سکڑا ہوا سیٹ پر پڑا تھا راشدہ نے بیٹھنے کیلئے جیسے ہی کمبل اٹھایا تو اس کی فلک شگاف چیخیں بوگی میں بلند ہونے لگیں وہ کچھ اس طرح ہڑبڑا کر پیچھے ہٹی کہ اگر امی برتھ کی زنجیر نہ تھام لیتی تو زمین پر جا گرتیں۔

وہ کالا بلا کمبل کے اندر بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ کمبل کے اٹھاتے ہی اس نے زمین پر چھلانگ لگائی اور برتھ کے نیچے چلا گیا۔

راشدہ کی چیخیں سن کر برابر کے پارٹیشن سے اکبر نے اوپر کی برتھ سے چھلانگ لگائی اور خواتین والے حصے میں آگیا۔ "کیا ہوا؟" اس نے امی سے پوچھا۔

"جانے کہاں سے کمبخت ایک بلا آگیا ہے، ابھی ٹوائلٹ میں تھا وہاں سے بھگایا تو ہمارے کمبل میں گھس کر بیٹھ گیا۔" امی نے بتایا۔ "اب کمبل سے نکل کر برتھ کے نیچے جا گھسا ہے۔"

جن کی خبر نے پہلے ہی خواتین میں دہشت پھیلائی ہوئی تھی ساری خواتین اپنے اپنے کونوں میں بیٹھی یا لیٹی تھیں۔ راشدہ کی دلدوز چیخوں اور کالے بلے کی آمد نے انہیں اور خوفزدہ کر دیا۔ ساری خواتین نے

اپنے آپ کو لحافوں اور کمبلوں میں اچھی طرح چھپا لیا تھا۔ اکبر نے برتھ کے نیچے جھانک کر تیے کی خبر پاکر خاندان اور کنی لڑکے بھی اٹھ کر ادھر آ گئے تھے۔ اکبر نے برتھ کے نیچے جھانک کر دیکھا برتھ کے نیچے بالکا اندھیرا تھا اس بلکے اندھیرے میں اسے ایک کونے میں تیے کی لال لال آنکھیں دہکتی ہوئی نظر آئیں۔ پھر اس نے غرانے کی آواز سنی۔

اکبر نے قریب ہی پڑا ہوا اونچی ایڑی کا سینڈل اٹھایا اور جھک کر اس کالے بلے کے دے مارا۔ وہ سینڈل اس کے سر پر لگا کالا بلا برتھ کے نیچے سے غراتا ہوا بھاگا اور اب سامنے والی سیٹ کے نیچے گھس گیا۔

"کدھر گیا۔" اکبر نے اب دوسرا جوتا ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"ادھر سیٹ کے نیچے۔" ایک لڑکے نے بتایا۔

اکبر نے اس مرتبہ جھانک کر دیکھنے کے بجائے اندازے سے جوتا پھینک کر مارا اس کی کالی دُم سیٹ سے باہر نکلی ہوئی تھی اس مرتبہ جوتا کالے بلے کے پیٹ پر پڑا وہ وہاں سے پھر غراتا ہوا نکلا اور اس مرتبہ لڑکوں والے حصے میں ایک برتھ کے نیچے چلا گیا۔

بوگی میں بلے کی آمد سے اچھی خاصی کھلبلی مچ گئی تھی وہ بلا جوتا کھا کر ایک سیٹ سے نکل کر دوسری سیٹ کے نیچے چلا جاتا۔

بوگی میں مسلسل "کدھر گیا" "کدھر گیا" کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ شور سن کر فرقان ماموں اٹھ کر اپنے پارٹیشن سے باہر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ باہر گھمسان کا رن پڑا ہے۔ ہر لڑکے کے ہاتھ میں ایک جوتا اور نظریں زمین پر تھیں۔

"کیا ہوا بھئی۔" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"ایک بلے نے پریشان کر رکھا ہے ماموں۔" اکبر نے کہا۔ "ادھر سے مارتے ہیں تو ادھر گھس جاتا ہے۔ وہاں سے بھگاتے ہیں تو ادھر آ جاتا ہے۔"

"مارو نہیں اسے۔" ماموں فرقان نے ہدایت کی۔ "ایسے ہی گھیر کر باہر نکال دو۔" پھر انہیں خیال آیا کہ ڈبے کے تمام دروازے بند ہیں۔ گاڑی چل رہی ہے۔ ایسے میں اسے باہر نکالنا ممکن نہ تھا پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ "ایسا کرو۔ ٹوائلٹ کا دروازہ کھول دو اور اسے اس میں بند کر کے باہر سے دروازہ بند کر دو۔"

ماموں فرقان کی یہ تجویز اچھی تھی۔ سارے لڑکے اس کالے بلے کو مارنے پر تلے ہوئے تھے کسی نے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بارے میں غور نہ کیا تھا اس سے چھٹکارا ماموں فرقان کی تجویز پر عمل کر کے ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔

تب اکبر نے اپنے خاندان کے لڑکوں اور دوستوں کو اس طرح کھڑا کیا کہ بلا سیٹ کے نیچے سے نکلے تو اس کا رخ ٹوائلٹ کی طرف ہو جائے۔ کچھ دیر کی محنت کے بعد اکبر اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس کالے بلے کو ٹوائلٹ میں گھسانے میں کامیاب ہو گیا۔

بلے کے ٹوائلٹ میں جاتے ہی اکبر نے اس کا دروازہ بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ اس بوگی میں سارے اپنے ہی لوگ تھے اس لئے یہ خطرہ نہ تھا کہ کوئی ٹوائلٹ کا دروازہ کھول دے گا۔ بوگی کے تمام

لوگوں کو بتا دیا گیا کہ اس ٹوائلٹ میں بلّا بند ہے لہٰذا دوسرا ٹوائلٹ استعمال کریں لڑکوں کا خیال تھا کہ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکتے ہی اس بلّے کو دروازہ کھول کر باہر نکال دیں گے۔

لیکن ہوا یہ کہ کئی اسٹیشن آئے اور چلے گئے لیکن اس بلّے کو ٹوائلٹ سے باہر نکالنے کے لئے کوئی نہ اٹھا۔ اصل میں بات یہ تھی کہ رات اپنی بکھری زلفوں کو سمیٹ رہی تھی۔ صبح ہونے کو تھی۔ رات بھر باراتیوں نے اودھم مچایا تھا اب سب نیند کی لپیٹ میں تھے اور لحافوں اور کمبلوں میں دبکے نیند کے مزے لے رہے تھے۔

صبح کے وقت گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی۔ راشدہ کی امی کی آنکھ کھلی تو انہوں نے راشدہ کو اٹھایا پھر ایک ایک کر کے سارے باراتی جاگ گئے۔

اکبر کو فوراً بلّے کا خیال آیا۔ وہ اپنی برتھ سے نیچے کودا اور ٹوائلٹ کی طرف چلا اس کے ساتھ خاندان کے ایک دو لڑکے بھی ہو گئے ٹوائلٹ کا دروازہ کھولنے سے پہلے اکبر نے بوگی کا دروازہ کھولا تاکہ بلّا ٹوائلٹ سے باہر آئے تو سیدھا دروازے سے پلیٹ فارم پر چلا جائے۔

اکبر نے ٹوائلٹ کا دروازہ کھولا اس کا خیال تھا کہ دروازہ کھلتے ہی وہ کالا بلّا فوراً باہر آئے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ تب اکبر نے ٹوائلٹ میں جھانک کر دیکھا۔

اندر کوئی نہ تھا۔ ٹوائلٹ خالی پڑا تھا۔

"یار کدھر گیا۔" اکبر نے اپنے چچازاد بھائی سے مخاطب ہو کر کہا۔

ابھی اس کا چچازاد بھائی جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اندر سے غرانے کی آواز آئی وہ کالا بلّا ٹنکی کے اوپر بیٹھا ہوا تھا اس نے وہاں سے چھلانگ لگائی اور سیدھا اکبر کے کندھے پر سوار ہو گیا۔

اس کالے بلّے میں اتنا وزن تھا کہ اکبر کھڑا نہ رہ سکا وہ فوراً فرش پر بیٹھ گیا۔ تب بلّے نے کھلے دروازے سے چھلانگ لگائی اور پلیٹ فارم پر پہنچ گیا۔

اکبر فوراً اٹھ کر کھڑا ہوا اور اپنے کندھے سہلانے لگا۔ "یار یہ کیا چیز تھی۔" اس نے اپنے چچازاد بھائی کو مخاطب کیا۔

"بھائی، وہ چیز نہیں، بلا تھا، بلا۔"

"یار، اتنا وزنی بلا، جب وہ میرے کندھے پر آیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دو من کی بوری میرے کندھے پر لاد دی گئی ہو۔"

"اتنا وزن تھا اس میں۔" چچازاد بھائی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "بلّا تھا یا کوئی گدھا تھا۔"

"اللہ جانے کیا چیز تھی۔ اتنا وزنی بلّا میں نے کہیں نہیں دیکھا۔"

"وہ گیا کدھر۔" اس کے چچازاد بھائی نے دروازے سے باہر جھانکا لیکن دور تک اسے بلّے نام کی کوئی چیز نہ دکھائی دی۔

"چل یار، فرقان ماموں کو چل کر بتاتے ہیں۔" اکبر نے کہا اور پھر وہ بوگی کا دروازہ بند کر کے فرقان ماموں کے پارٹیشن کی طرف چلے۔

فرقان ماموں جو کھڑکی سے باہر گزرتے پلیٹ فارم کو دیکھ رہے تھے اکبر کی آواز سن کر انہوں نے اپنا

Urdufans.com

رخ ادھر پھیرا اور بولے۔ "ہاں، بھئی، اکبر بلّے کو آزاد کر دیا۔"

"ماموں مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ وہ بلّا جانے کیا چیز تھا۔" اکبر کے لہجے میں خوف تھا۔

"کیوں کیا ہوا۔" ماموں فرقان نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ماموں اس بلّے کی جسامت تو کسی کتے سے کم نہ تھی لیکن اس کا وزن بھی کسی گدھے کے برابر تھا۔ ماموں میرے کندھے اب تک دکھ رہے ہیں۔" یہ کہہ کر اکبر نے ساری تفصیل بتا دی۔

"اچھا۔" فرقان ماموں نے یہ سن کر ایک گہرا سانس لیا اور پھر بولے۔ "ذرا ادھر آؤ۔"

اکبر ان کے قریب چلا گیا۔ فرقان ماموں نے اس کے کندھے کو سونگھ کر دیکھا۔ پھر اس کی قمیض ہٹا کر کندھا دیکھا اس کے کندھے پر گردن کے نیچے ایک ہلکا سا خراش کا نشان تھا جیسے وہاں اس بلّے کا ناخن لگا ہو کھال چھل گئی تھی اور خون کی ایک باریک لکیر بن گئی تھی۔

"اکبر، تمہیں ایسے ہی وہم ہو رہا ہے ایک بلّے میں بھلا اتنا وزن کیسے ہو سکتا ہے۔ اصل میں وہ تمہارے اوپر کود اس انداز میں ہو گا کہ تم توازن برقرار نہ رکھ سکے۔" فرقان ماموں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن خود ان کے چہرے پر فکر کی لکیر گہری ہوتی جا رہی تھی۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ اکبر جس کی شادی ہونے جا رہی تھی کسی ڈر، خوف میں مبتلا ہو جائے۔ اب وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ وہ کالا بلّا کیا شے تھا وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ وہ بغیر کوئی نقصان پہنچائے اس بوگی سے چلا گیا تھا جبکہ ان لڑکوں نے اس کی جوتوں سے خوب پٹائی بھی کی تھی اسے ایک جگہ چین سے نہ بیٹھنے دیا تھا۔

فرقان ماموں بڑے جہاندیدہ آدمی تھے۔ ساٹھ باسٹھ سال کے ہوں گے لیکن دیکھنے میں پچاس سے زیادہ کے نہ لگتے تھے۔ کسرتی بدن کے مالک تھے، خوب چاق و چوبند تھے۔ وہ مشکل سے ہی بیمار ہوتے تھے۔ بیمار ہوتے تو کبھی ڈاکٹر، حکیم کے پاس نہ جاتے ٹوٹے ٹوٹکوں سے اپنا علاج خود ہی کر لیتے۔

فرقان ماموں، جگت ماموں تھے۔ کیا چھوٹا، کیا بڑا سب انہیں ماموں کہتے تھے۔ چھوٹے بچے تو خیر انہیں کہتے ہی ماموں تھے لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ ان بچوں کے دادا بھی انہیں ماموں کہہ کر پکارتے تھے۔ فرقان ماموں مست ملنگ آدمی تھے اپنے سے بڑوں کے "ماموں" کہنے پر کبھی ناراض نہ ہوتے وہ روزے نماز کے پابند تھے۔ کچھ عملیات سے بھی واقف تھے۔ جھاڑ پھونک بھی کر لیا کرتے تھے لیکن یہ عملیات، یہ جھاڑ پھونک صرف خاندان تک محدود تھا۔ کراچی کی ایک پُررونق مارکیٹ میں ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ علی گڑھ میں ان کا تالوں کا کارخانہ تھا۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے یہاں بھی تالے بنانے کی کوشش کی لیکن کاریگروں کی عدم دستیابی کی بناء پر انہوں نے اپنا کارخانہ بند کر دیا اور کپڑے کی دکان کھول لی۔ کل کی وہی دکان جو شروع میں ایک چھوٹی سی دکان پر مشتمل تھی اب چار دکانوں تک وسعت اختیار کر گئی تھی۔ نیک نیت آدمی تھے اس لئے پُرسکون اور خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ ہر شخص کے دکھ سکھ میں کام آنا ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ خاندان کی کوئی تقریب ان کے بغیر پھیکی رہتی تھی وہ باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ بچوں میں بچے بن جاتے بڑوں میں بڑے ہو جاتے۔ قصے، کہانیاں انہیں بہت یاد تھیں۔ جنوں سے انہیں بچپن سے دلچسپی تھی۔ علی گڑھ میں جس گھر میں ان کا بچپن اور جوانی گزری تھی اس گھر میں بھی اثر تھا۔

گرمیوں کے دن میں، جب وہ کھلی چھت پر سونے کیلئے لیٹتے تو کبھی کبھی انہیں ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی سایہ سا ان کے اوپر سے گزر گیا ہے۔ چاندنی راتوں میں خاص طور پر ایسا ہوتا۔ ایک دن رات کو دو بجے کے قریب انہوں نے پھڑپھڑاہٹ کی آواز سنی۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کبوتر چھت سے اڑ کر گیا ہو ان کا گھر تین منزلوں پر مشتمل تھا۔ گھر والوں کی رہائش زیادہ تر دوسری منزل پر تھی۔ نیچے والا گھر تقریباً خالی پڑا رہتا تھا۔ کوئی مہمان وغیرہ آجاتا تو آباد ہوتا یا کوئی ملنے جلنے والا آجاتا تو کچھ دیر کیلئے بیٹھک آباد ہو جاتی۔ ہاں، گرمیوں کے دنوں میں، گھر والے دوپہر کو نیچے والے گھر میں آجاتے کیونکہ نیچے کا گھر، علی گڑھ کی جھلسانے دینے والی گرمی اور آگ اگل دینے والی لُو میں گوشۂ عافیت سمجھا جاتا۔

اس سفید داڑھی والے آدمی کو فرقان ماموں نے کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ دوپہر کو سوتے سوتے اچانک ان کی آنکھ کھل جاتی تو وہ شخص ان کی پائنتی پر بیٹھا نظر آتا۔ وہ کوئی لمبا چوڑا آدمی تھا اندھیرے کمرے میں وہ صاف نظر آتا۔ اس کا سیدھا ہاتھ کندھے تک اٹھا ہوتا اور انگلیاں اس طرح مڑی ہوئی ہوتیں جیسے کوئی پنجہ لڑانے کیلئے ہاتھ بڑھائے وہ ہمیشہ ایک ہی حالت میں نظر آتا تھا۔ خاموش بیٹھا ہوا، ہاتھ اوپر اٹھائے۔ اسے دیکھ کر ماموں فرقان کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ ان میں بھاگنے یا چیخنے کی ہمت بھی نہ رہتی جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا۔ جب وہ پوری طرح جاگ جاتے۔ وہ آدمی ہمیشہ نیم غنودگی کی حالت میں نظر آتا تھا تو وہ اٹھ کر فوراً کھڑکی کھولتے روشنی ہوتے ہی وہاں کچھ نہ رہتا۔ اس پُراسرار آدمی نے انہیں کبھی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

اس پُراسرار آدمی کے علاوہ اس نیچے والے گھر میں انہیں چھوٹے چھوٹے آدمی بھی نظر آتے تھے وہ رات کو اپنے والد کے کسی مہمان یا اپنے دوست کو بیٹھک میں بٹھانے کیلئے نیچے والے گھر میں جاتے تو کبھی کبھی انہیں اندھیرے میں وہ بونے بھی دکھائی دیتے جو انہیں دیکھ کر ادھر اُدھر چھپ جاتے۔ ان بونے آدمیوں کو انہوں نے کئی مرتبہ جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا ان بونوں نے بھی کبھی انہیں کوئی نقصان نہ پہنچایا تھا۔ اب فرقان ماموں نے دو تہرہ یہ بنا لیا تھا کہ انہیں اگر نیچے جاکر بیٹھک کھولنا ہوتی تو نیچے والے گھر کا تالا کھول کر وہ چند لمحے توقف کرتے پھر دروازہ کھول کر اندر جاتے تاکہ وہ بونے تالا کھولنے کی آواز سن کر ادھر اُدھر چھپ جائیں۔

یہ گھر بہت پرانا تھا۔ یہ گھر فرقان ماموں کے دادا نے بنایا تھا۔ کہتے تھے اس زمانے میں دور تک کوئی آبادی نہ تھی۔ بس چاروں طرف کھیت ہی کھیت تھے۔ قریب ہی ایک قبرستان بھی تھا پھر آہستہ آہستہ رسل گنج کے اس علاقے پر آبادی ابھرنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ آبادی سارے کھیتوں کو نگل گئی بس قبرستان باقی رہ گیا۔

فرقان ماموں کو اپنے والد کے بجائے اپنے دادا سے لگاؤ زیادہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد سرکاری ملازم تھے اور زیادہ تر دوروں پر رہتے تھے جبکہ دادا ریٹائر زندگی گزار رہے تھے۔ وہ ہمہ وقت گھر پر ہوتے۔ دادا کو بھی فرقان ماموں سے بہت محبت تھی۔ وہ انہیں ہر وقت اپنے ساتھ لگائے رکھتے تھے۔ گھر سے باہر جاتے تو فرقان ماموں ان کے ساتھ انگلی پکڑے چلے جا رہے ہیں۔ دادا انہیں اپنے سینے پر بٹھائے ہوئے ہیں۔ ماموں فرقان نے قرآن شریف اپنے دادا سے ہی پڑھا تھا۔ ان کے دادا ریلوے میں گارڈ تھے۔ انہیں پریوں، فتنوں سے بڑی دلچسپی تھی جب تک وہ زندہ رہے۔ گھر میں عجیب عجیب قسم

Urdufans.com

کے لوگ آتے رہے۔ کبھی گھر کے آنگن میں قوالیاں ہو رہی ہیں۔ کبھی وظیفے وظائف پڑھے جا رہے ہیں۔ فرقان ماموں کا بچپن اسی فضا میں گزرا۔ انہیں بھی وظیفے وظائف اور عملیات سے دلچسپی ہو گئی۔ فرقان ماموں کے دادا جنات کے بہت سے قصے سناتے تھے انہی میں ایک قصہ دادی کا بھی تھا۔ یہ قصہ ان کی شادی سے پہلے کا تھا شادی کے بعد بھی دادی پر کچھ عرصہ اثر رہا جسے دادا نے ایک مشہور عامل سے دور کروایا۔

ہوا یہ کہ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ دادی چھت پر نہا رہی تھیں کہ یکایک ان کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا پھر جب آنکھوں کا اندھیرا دور ہوا تو انہوں نے اپنے سر پر لاکھوں کبوتر اڑتے دیکھے یہ کبوتر اتنی تعداد میں تھے کہ دوپہر ہونے کے باوجود سورج ان اڑتے کبوتروں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔

اس منظر کی دہشت سے دادی اپنے ہوش گنوا بیٹھیں جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے خود کو اپنی چارپائی پر پایا۔ پھر انہیں خیال آیا کہ وہ تو چھت پر نہا رہی تھیں۔ انہوں نے گھبرا کر اپنے جسم کو دیکھا۔ وہاں کپڑے موجود تھے اور سامنے ان کی والدہ بیٹھی تھیں۔

انہوں نے دادی کو بتایا کہ جب تم بہت دیر تک اوپر سے نہا کر نہیں اتریں تو مجھے تشویش ہوئی پہلے تو میں نے نیچے سے ہی تمہیں آوازیں دیں لیکن تم نے کوئی جواب نہ دیا۔ تمہارا جواب نہ پا کر، میں اور پریشان ہو گئی۔ جلدی سے بھاگی ہوئی اوپر آئی تو دیکھا تم بیہوش پڑی ہو میں نے نیچے سے فوراً رفیقہ اور سلطانہ کو آواز دی ان کی مدد سے تمہاری حالت درست کی پھر تمہیں کچھ ہوش آیا تو ہم تمہیں نیچے اتار لائے۔ نیچے آکر تم پھر بیہوش ہو گئیں۔ اب تمہیں دوبارہ ہوش آیا ہے۔ آخر تمہیں کیا ہوا تھا۔ میں نے تمہیں ہزار مرتبہ منع کیا ہے کہ اوپر چھت پر جا کر نہ نہایا کرو اور وہ بھی بھری دوپہر میں، لیکن تم باز ہی نہیں آتیں۔"

دادی نے اپنی والدہ کو ساری تفصیل بتادی کہ نہاتے نہاتے ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا، چند دنوں دادی ٹھیک رہیں۔ گھر والوں نے بھی اس واقعہ کو بھلا دیا لیکن پھر ایک دن اچانک ان کی حالت بگڑ گئی۔ انہوں نے بیٹھے بیٹھے جھومنا شروع کر دیا۔ دادی کے بال بہت لمبے اور ریشم کی طرح نرم ملائم تھے۔ ان کی چوٹی گھٹنوں سے نیچے لہراتی رہتی۔ انہوں نے بیٹھے بیٹھے جب جھومنا شروع کیا تو ان کی چوٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ سر کی جنبش کے ساتھ ایک دائرے میں گھوم رہی تھی پھر وہ چوٹی خود بخود کھلنا شروع ہوئی چند منٹوں میں ان کے بال بالکل کھل گئے اور ان کا چہرہ بالوں سے ڈھک گیا لیکن جھومنا ابھی تک جاری تھا۔

بچے خوفزدہ ہو کر کمرے سے باہر بھاگ گئے تھے۔ دادی کی چھوٹی بہن رفیقہ بھی اس منظر کی تاب نہ لا سکی تھی۔ البتہ رفیقہ سے بڑی بہن سلطانہ کمرے میں ٹھہری رہی۔ دادی کی والدہ بھی موجود تھیں۔ اس وقت گھر پر کوئی مرد نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ کیا کرتا۔

جب دادی کو جھومتے ہوئے کافی دیر ہو گئی تو ان کی والدہ آگے بڑھیں اور انہوں نے دادی کے قریب بیٹھ کر انہیں اپنے بازوؤں میں لینا چاہا تو دادی نے انہیں ایک جھٹکا دے کر الگ کر دیا اور بہت غصے سے بولیں۔ "کیا کرتی ہے۔ الگ ہٹ دیکھتی نہیں ہے کہ ہم آئے ہوئے ہیں۔"

یہ دادی کی آواز نہ تھی، یہ کوئی مردانہ آواز تھی۔ دادی کی آواز کے ساتھ شکل بھی بدل گئی تھی۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ منہ بُری طرح پھٹا ہوا تھا۔

دادی کے منہ سے جو مردانہ آواز سنی تو ان کی بہن سلطانہ اٹھ کر بھاگیں اب کمرے میں دادی کی والدہ رہ گئیں۔

"تو بیٹھی یہاں کیا کر رہی ہے تو بھی جا اور اس وقت تک اندر نہ آنا جب تک ہم یہاں ہیں۔" دادی نے غصے سے کہا۔

دادی کی والدہ نے دادی کا نام لے کر پکارا۔ "کلثوم۔"

اپنا نام سن کر دادی نے گردن گھما کر اپنی والدہ کو دیکھا ان کی شکل دیکھ کر والدہ کو پسینہ آگیا۔ وہ دادی کی شکل نہ تھی وہ جانے کس خبیث کی شکل تھی۔

دادی کی والدہ کو خوفزدہ دیکھ کر دادی نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔

"جا۔ بڑھیا جا۔ ہمیں اکیلا چھوڑ دے۔"

دادی کی والدہ کو اگرچہ خوف محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئیں تب دادی نے اپنی والدہ کی چوٹی پکڑی اور کھڑی ہو گئیں۔ پھر انہوں نے اپنی والدہ کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ دروازے میں جا کر گریں۔

اس زمانے میں دادی جان دھان پان سی لڑکی تھیں جبکہ ان کی والدہ بھاری بھرکم خاتون تھیں لیکن دادی نے اپنی والدہ کو جس آسانی سے دروازے کی طرف دھکا دیا تھا اس سے ان کی بے پناہ طاقت کا اندازہ ہوتا تھا۔ ان کی والدہ کمرے سے دوسری بہنوں کو بلانے کیلئے نکلیں تو دادی نے جلدی سے آگے بڑھ کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

دادی کی والدہ اور ان کی بہنوں نے بہتیرا دروازہ کھٹکھٹایا مگر انہوں نے نہ کھولا۔ کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ پھر دادی نے دو تین گھنٹے بعد دروازہ کھولا اور مسکراتی ہوئی باہر آئیں۔ والدہ نے جب ان سے پوچھا۔ "کلثوم، تمہیں کیا ہو گیا تھا۔"

تو انہوں نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "اماں، مجھے کیا ہوتا ہے میں تو کمرے میں سو رہی تھی۔"

"اری تجھے کچھ یاد نہیں۔" دادی کی والدہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"کیا ہوا، آخر کچھ بتائیں تو۔" اپنی والدہ کی بات سن کر دادی خود بھی پریشان ہو گئیں۔ "تو نے مجھے دھکا دیا تھا اتنی جان تجھ میں کہاں سے آگئی تھی۔" ان کی والدہ نے پوچھا۔

"اماں، میں نے آپ کو دھکا دیا تھا۔" دادی الجھن میں پڑ گئیں۔ "میں تمہیں دھکا دوں گی، دوزخ کماؤں گی۔"

"تیری شکل بھی بدل گئی تھی، تیری آواز بھی مردانہ ہو گئی تھی۔" دادی کی اماں بولیں۔

"نہیں اماں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" دادی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"تیری بندھی ہوئی چوٹی خود بخود کھل گئی تھی۔" دادی کی والدہ نے مزید انکشاف کیا۔

یہ سن کر دادی نے اپنی چوٹی پیچھے سے آگے کی اور والدہ کو دکھا کر بولیں۔ "اماں، یہ تو بندھی ہے۔"

"تو نے بعد میں باندھ لی ہوگی۔"

"اماں، یہ چوٹی میں نے صبح باندھی تھی اس کے بعد میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔" دادی نے بتایا۔

غرض، دادی کو کچھ بھی یاد نہ تھا۔ ان پر کیا گزری تھی، انہیں کچھ پتہ نہ تھا۔

بس پھر اسی طرح چلتا رہا۔ دادی کچھ دن ٹھیک رہتیں پھر بیٹھے بیٹھے جھومنے لگتیں اور پھر غیر ارادی طور پر ان سے جو حرکات سرزد ہوتیں وہ ہوش آنے کے بعد یاد نہ رہتیں۔

ایک دن دادی چولہے کے پاس بیٹھی تھیں کہ بیٹھے بیٹھے جھومنے لگیں دادی کی والدہ روٹی پکانے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے دادی کو جو جھومتے دیکھا تو فوراً روٹیاں چھوڑ کر انہیں چولہے کے پاس سے اٹھانے لگیں۔ انہیں خطرہ تھا کہ کہیں ان کے بال چولہے کی آگ کی لپیٹ میں نہ آجائیں ابھی دادی کی والدہ نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دادی غرا کر بولیں۔

"اپنے گندے ہاتھ پرے رکھ، تجھے معلوم نہیں کہ ہم آگئے ہیں۔"

"آپ اندر چلیں جی۔" والدہ نے بڑے احترام کے ساتھ کہا۔ "کمرے میں بیٹھیں، یہاں بچی جل نہ جائے۔"

"ہمارے ہوتے ہوئے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اے بڑھیا، یہ بتا کیا تو بین سنے گی۔" دادی نے مسکراتے ہوئے والدہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں، سنوں گی، کیوں نہیں سنوں گی لیکن یہاں تو کوئی بین نہیں ہے۔" دادی کی اماں بولیں۔

"بین نہیں ہے۔" دادی نے والدہ کا مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ "یہ جو ہے۔"

"یہ تو پھکنی ہے۔"

"اری، تو کیا جانے یہ کیا ہے، لا ادھر دے مجھے۔" یہ کہہ کر دادی نے اپنی والدہ سے پھکنی چھین لی۔

پھر دادی نے اس پھکنی کو دونوں ہاتھوں میں لے کر منہ میں دبائی اور جب پھونک ماری تو وہ بالکل سپیرے کی بین کی طرح بج اٹھی۔ دادی بہت دیر تک اس پھکنی کو بین بنائے بجاتی رہیں۔

پورا گھر اکٹھا ہو گیا، بین کی آواز سن کر پاس پڑوس کے لوگ بھی آگئے لیکن انہیں کسی کی پروا نہ تھی وہ اپنی دھن میں مگن بین بجائے جا رہی تھیں۔

پھر ایک گھنٹے تک مسلسل بین بجانے کے بعد وہ تھک کر زمین پر لیٹ گئیں اور بیہوش ہو گئیں اور جب دو گھنٹے کے بعد وہ ہوش میں آئیں تو انہیں کچھ یاد نہ تھا۔

دادی کی والدہ نے کہا بھی۔ "اری کلثوم تو نے بڑی اچھی بین بجائی تھی، ذرا اب تو بجا کر دکھا۔"

تو یہ سن کر دادی ہنسنے لگیں۔ "اماں، اب تم بھی مذاق کرنے لگی ہو۔"

دادی کو کیا پتہ تھا کہ اماں کے دل پر کیا بیت رہی ہے وہ مذاق کر رہی تھیں یا مسکرا کر اپنے آنسو پی رہی تھیں۔ دادی کی ماں کو دادی کی شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ دادا سے ان کا نکاح ہو چکا تھا۔ صرف رخصتی باقی تھی اور رخصتی سے پہلے ہی ان پر سایہ ہو گیا تھا۔ یہ والدین کیلئے ایسا غم تھا جس کا کوئی مداوا

تھا۔

دادی کبھی بالکل ٹھیک ہوجاتیں، پندرہ پندرہ دن تک ان پر کوئی دورہ نہ پڑتا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے کبھی ان پر کوئی اثر ہوا ہی نہ ہو لیکن پھر اچانک ایک ایسا وقت آتا کہ دادی اپنے آپے میں نہ رہتیں اور وہ کر گزرتیں جس کی ایک ہوشمند انسان سے توقع نہیں کی جاسکتی۔

دادی کے والد مسلسل ان کا علاج کروا رہے تھے جہاں بھی کسی پیر، فقیر کا پتہ چلتا، وہ اس کی خدمت میں پہنچ جاتے۔ اس روحانی علاج سے انہیں کافی افاقہ ہوا۔ پھر دادا انہیں رخصت کرا لائے۔ شادی کے بعد ان پر کوئی بڑا دورہ نہ پڑا وہ آہستہ آہستہ نارمل ہوتی گئیں۔

دادی کے والدین نے دادی کے بارے میں کچھ نہ چھپایا تھا۔ ایک ایک بات بتا دی تھی، ساری روداد سنا دی تھی۔ اس لئے دادا نے ان کا اور خیال رکھا وہ اپنی طرف سے بھی ان کا علاج کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دادی چھ ماہ کے اندر اندر بالکل صحت یاب ہوگئیں۔ پھر جب تک زندہ رہیں، ان پر کسی قسم کا اثر نہ ہوا۔ دادا ہنس کر کہتے۔ "بھئی اب تمہاری دادی پر اثر کیسے باقی رہتا وہ ایک بڑے جن کے زیر سایہ جو آگئی تھیں۔"

دادا جب بھی دادی کے اثر کی بات کسی کو سناتے تو دادی فوراً اٹھ کر چلی جاتی تھیں۔ دادی نے آج تک اپنی زبان سے کسی کو اپنی کہانی نہ سنائی تھی اگر ان سے کوئی پوچھتا بھی تو وہ ہنس کر ٹال دیتی تھیں لیکن اصل میں وہ خوفزدہ ہو جاتی تھیں۔

دادا کی زندگی میں ہی دادی کا انتقال ہوا۔ دادا تنہا ہوگئے۔ ان کے ایک ہی اولاد تھی یعنی فرقان ماموں کے والد جو ایک سرکاری افسر تھے اور عموماً دوروں پر رہتے تھے۔ جب دادا کا انتقال ہوا تو فرقان ماموں کی عمر اس وقت چودہ پندرہ سال ہوگی دادا کی موت، فرقان ماموں کیلئے ذہنی کرب کا باعث بنی انہیں محسوس ہوا، جیسے ان کا دادا نہ مرا ہو، باپ مر گیا ہو۔

ٹرین اپنی پوری رفتار سے منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسٹیشن پر اسٹیشن گزر رہے تھے اب لاہور نزدیک آرہا تھا۔ فرقان ماموں کی آنکھوں میں یادوں کے دیئے بجھنے لگے تھے۔ کالے بلّے کی آمد نے انہیں یہ واقعہ یاد دلا دیا تھا۔ وہ ایک گہری سوچ میں تھے انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے آئندہ کچھ ہونے والا ہو۔

جب گاڑی لاہور کے اسٹیشن پر رکی تو وہاں بارات کے استقبال کیلئے لوگ موجود تھے۔ اسٹیشن کے باہر ایک لمبی بس کھڑی تھی۔ سب لوگ آرام سے بس میں سوار ہوگئے اور بس سمن آباد کی طرف روانہ ہوگئی۔

وہ کالا بلّا اچانک ہی کہیں سے نکلا تھا اور بس کے چلتے ہی اس نے چھلانگ لگائی تھی اور سیڑھی کے ذریعے وہ بس کی چھت پر پہنچ گیا تھا اور کسی کو احساس تک نہ تھا کہ وہ کالا بلّا بس کی چھت پر آرام سے لیٹا ان کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔

سمن آباد پہنچ کر جب بس ایک گھر کے سامنے رکی تو باراتیوں کے اترنے سے پہلے اس کالے بلّے نے بس کی چھت سے دیوار پر چھلانگ لگائی اور دوڑتا ہوا گھر کے اندر چلا گیا۔

بارات کیلئے ایک پورا مکان خالی کرا لیا گیا تھا۔ اس مکان کے برابر ہی دلہن کا گھر تھا۔ بارات میں

آنے والی خواتین کیلئے، دلہن والے گھر میں ایک بڑا کمرہ مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ویسے بھی یہ گھر اکبر کی امی کیلئے نیا نہ تھا۔ اکبر کی جس لڑکی سے شادی ہو رہی تھی وہ ان کی بہن کی لڑکی تھی ان لوگوں کا یہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اکبر نے نیلم کو، اور نیلم نے اکبر کو دیکھ رکھا تھا۔

اکبر نیلم کو "نیلم پری" کہتا تھا اور نیلم بھی ایسی ہی۔ وہ کسی پری کی طرح حسین تھی۔ اس کے سحر انگیز حسن سے متاثر ہو کر خاندان کے کئی لڑکے اس کو حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن نیلم، اکبر کے کھاتے میں لکھی گئی تھی۔ اس لئے اکبر اب اسے لینے آ پہنچا تھا۔

عصر کے وقت۔ نکاح سے پہلے جب اکبر کی امی سے بری دینے کو کہا گیا تو انہوں نے راشدہ کو آواز دی۔ "راشدہ۔ ذرا بری والا سوٹ کیس اٹھاؤ۔"

"جی اچھا امی۔" راشدہ نے دیوار سے لگا ہوا سوٹ کیس اپنی امی کے سامنے لا رکھا۔ امی نے اپنے پرس سے چابیاں نکالیں اور سوٹ کیس کھولنے لگیں۔

ابھی انہوں نے سوٹ کیس کا ڈھکن اٹھایا ہی تھا کہ ایکدم انہیں چکر سا آ گیا۔ انہوں نے فوراً اپنی ناک پر رومال رکھ لیا۔

بری والے سوٹ کیس کا ڈھکن اٹھاتے ہی راشدہ کی امی کو جو چکر آیا تھا وہ صرف انہی کو نہیں آیا تھا بلکہ اس وقت کمرے میں جتنی خواتین بھی موجود تھیں سب ہی کا یہ حشر ہوا تھا۔ سب نے جلدی جلدی اپنی ناکوں پر دوپٹے رکھ لئے تھے۔ راشدہ کا برا حال تھا اسے نہ صرف چکر آیا تھا بلکہ ایک دم جی متلا اٹھا تھا۔ وہ "اوہ" کرتی باتھ روم کی طرف بھاگی تھی اور وہاں اس کی ساری آنتیں سمٹ کر حلق میں آ گئی تھیں۔

راشدہ کو بدبو کی برداشت نہ تھی۔ ذرا سی بدبو اس کا دماغ الٹ دیتی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ ہر وقت پرفیوم میں نہائی رہتی تھی۔ سوٹ کیس سے برآمد ہونے والی بدبو ایسی تھی کہ اس نے دماغ میں گھس کر نسوں تک کو جلا دیا تھا۔

سوٹ کیس میں موجود بری کے جوڑوں کی بری حالت تھی وہ سب غلاظت میں لتھڑے ہوئے تھے۔ ان جوڑوں کو ہاتھ لگانا تو دور کی بات کوئی ان کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ بدبو اتنی شدید تھی کہ اب کمرے میں موجود دوسری خواتین کو بھی ابکائیاں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ کمرے سے ساری خواتین بھاگ گئی تھیں لیکن راشدہ کی امی موجود تھیں۔ انہوں نے بدبو سے بچنے کیلئے اپنے منہ پر اچھی طرح دوپٹہ باندھ لیا تھا لیکن بدبو تھی کہ پھر بھی تھمی چلی آ رہی تھی۔

راشدہ کی امی بہت پریشان تھیں ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بند سوٹ کیس میں یہ غلاظت کہاں سے بھر گئی۔ امی نے چٹکی سے اٹھا کر سارے جوڑوں کو دیکھ ڈالا۔ ایک جوڑا بھی صاف نہ تھا نیچے تک ہر جوڑا غلاظت سے بھرا ہوا تھا۔ پھر انہوں نے زیورات کے ڈبے نہ لے انہیں کھول کر دیکھا ان کا بھی وہی حال تھا اندر غلاظت بھری ہوئی تھی۔

بری کے جوڑوں اور زیورات کا یہ حشر دیکھ کر راشدہ کی امی شدید صدمے سے دوچار تھیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہوئی تھی سوٹ کیس میں کس نے غلاظت بھر دی تھی۔ یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

اچانک کمرے میں "میاؤں" کی آواز سنائی دی۔

امی نے لپک کر دیکھا تو ایک کالا بلّا الماری کے پیچھے سے نکل رہا تھا۔ وہ باہر نکلا اس نے اپنے اگلے پاؤں پر جھک کر ایک زوردار انگڑائی لی اور امی کی طرف دیکھتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

راشدہ کی امی اس وقت کمرے میں بالکل تنہا تھیں وہ بڑے مضبوط اعصاب کی مالک تھیں لیکن اس کالے بلّے کی آنکھوں میں جانے کیا بات تھی کہ انہیں اپنے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے محسوس ہوتے معلوم ہوئے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کمرے سے باہر آگئیں۔

"راشدہ! اے راشدہ!" انہوں نے کمرے سے باہر آکر آواز دی۔ راشدہ ابھی تک باتھ روم میں تھی وہ امی کی آواز سن کر بھاگی ہوئی آئی۔

"جی امی۔" اس نے اپنی ناک پر دوپٹہ اچھی طرح لپیٹتے ہوئے کہا۔

"جا اپنے ابو اور ماموں فرقان کو بلا کر لا۔" امی نے پریشان لہجے میں کہا۔

بارات برابر والے مکان میں ٹھہری ہوئی تھی۔ نکاح کا وقت قریب تھا لہٰذا سب تیار ہونے میں لگے ہوئے تھے۔ راشدہ کے ابو باہر علی نے اپنی بیٹی کو اس طرح بدحواسی سے کمرے میں آتے دیکھا تو وہ پریشان ہوگئے۔ انہوں نے گھبرا کر پوچھا کیا ہوا؟

"ابو آپ کو امی بلا رہی ہیں جلدی چلیں۔" پھر راشدہ نے کمرے میں ادھر اُدھر نظر دوڑائی مگر ماموں فرقان نظر نہ آئے۔ "ابو! ماموں کہاں ہیں؟"

"ابھی تو یہیں تھے شاید باتھ روم....." ابھی باہر علی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ماموں فرقان باتھ روم سے نکل آئے۔ "لو وہ آگئے۔"

"خیریت۔" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"ماموں خیریت نہیں، امی نے آپ کو اور ابو کو بلایا ہے جلدی چلیں۔" راشدہ نے گھبرا کر کہا۔

"کیوں بلایا ہے؟" ماموں فرقان نے اپنے ہاتھ تولیے سے پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"بُری کے جوڑوں کا ستیاناس لگ گیا ہے۔ سوٹ کیس غلاظت سے بھرا ہوا ہے۔" یہ کہہ کر راشدہ نے فوراً اپنے منہ پر دوپٹہ رکھ لیا۔

"ارے!" ماموں فرقان چونک پڑے۔ "آؤ باہر جلدی چلو۔"

یہ لوگ تیزی سے باہر نکلے راشدہ کی امی صابرہ گیٹ پر ہی کھڑی تھیں۔ وہ شدید صدمے سے دوچار تھیں ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ صدمے کی بات بھی تھی۔ نکاح کا وقت سر پر تھا اور اتنی محنت اور پیار سے بنائے ہوئی بری کا ناس لگ گیا تھا۔

"سوٹ کیس کہاں ہے؟" باہر علی نے پوچھا۔ "ایسا کیسے ہوگیا۔"

"وہ اندر ہے کمرے میں۔" صابرہ نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں یہ غلاظت اس میں کہاں سے آئی۔"

"آؤ دیکھتے ہیں۔ تم پریشان مت ہو۔" ماموں فرقان نے صابرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"میں نے اتنی محنت سے بڑی تیار کی تھی اتنے شوق سے ایک ایک جوڑا بنایا تھا۔" صابرہ نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "سب برباد ہو گیا۔"

جس کمرے میں سوٹ کیس تھا وہاں کوئی نہ تھا اس واقعہ نے گھر کی تمام خواتین کو خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ ماموں فرقان نے آگے قدم بڑھائے ان کے پیچھے بابر علی تھے کمرے میں داخل ہوتے ہی بدبو کا ایک تیز بھبکا آیا حالانکہ سوٹ کیس بند تھا۔

ماموں فرقان نے فوراً اپنا سانس روک لیا اور تیزی سے ناک پر رومال رکھ لیا۔ بابر علی کا بھی یہی حال تھا وہ بھی اپنی ناک رومال سے ڈھک چکے تھے۔ صابرہ کمرے میں نہ آئی تھیں وہ دروازے پر کھڑی تھیں۔

ماموں فرقان نے سوٹ کیس کا ڈھکن اٹھایا ڈھکن اٹھاتے ہی بدبو کا طوفان اٹھا ناک بند ہونے کے باوجود فرقان کو اپنے دماغ کی نسیں جلتی ہوئی محسوس ہوئیں غلاظت کو دیکھ کر ان کا جی متلا اٹھا۔ انہوں نے فوراً سوٹ کیس بند کر دیا۔

پھر وہ سوٹ کیس کو کھینچ کر باہر صحن میں لے آئے صحن میں ایک باتھ روم تھا انہوں نے سوٹ کیس اس کے دروازے میں کھسکا دیا۔

"گھر میں کوئی پانی کا پائپ نہیں؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

پاس کھڑی صابرہ نے اپنی بہن واجدہ کی طرف دیکھا وہ فوراً بولی "جی ہے۔"

"ذرا لائیں۔" ماموں فرقان نے کہا۔

پائپ آنے کے بعد انہوں نے صحن میں لگے نلکے میں لگایا اور نلکا کھول کر دیکھا پانی بڑے پریشر سے آرہا تھا پائپ سے خاصی موٹی دھار بر آمد ہوئی۔

"ماموں کیا کرنا ہے؟" صابرہ نے پوچھا۔

"غلاظت دھونی ہے اور کیا کرنا ہے۔"

"ماموں آپ ٹھہریں میں ملازمہ کو بھیجتی ہوں۔" اس مرتبہ واجدہ نے کہا اور اندر چلی گئیں۔

چند لمحوں بعد ایک ملازمہ باہر آئی اس نے دوپٹے کا اچھی طرح ڈھاٹا باندھا ہوا تھا۔

ماموں نے بھی ایک بڑا کپڑا لے کر اپنے منہ پر اچھی طرح ڈھاٹا باندھا ہوا تھا۔

اب چہرے پر صرف ان کی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔

ماموں فرقان نے پائپ لے کر کپڑوں پر پانی کی موٹی دھار ڈالنا شروع کی۔ ملازمہ ایک ایک جوڑا باہر نکالتی گئی ان کھلے جوڑوں سے اس قدر شدید بدبو اٹھ رہی تھی کہ پاس پڑوس کے مکین بھی پریشان ہو کر باہر آگئے تھے اور حیران پریشان ہو کر دیکھ رہے تھے کہ یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے۔

کپڑوں سے جب اچھی طرح غلاظت دور ہو گئی تو ان کپڑوں کو سرف کے پانی میں ڈالا گیا اس کے بعد زیورات کے ڈبوں کو بھی اسی طرح پانی سے دھویا گیا۔

نکاح جو عصر کے بعد ہونے والا تھا اسے ملتوی کیا گیا عشاء کے بعد رکھا گیا۔

نکاح کے جوڑے کو جلدی جلدی استری سے سکھانے کی کوشش کی گئی جوڑا تو سوکھ گیا لیکن اس میں سے بدبو نہ گئی اس صورت حال نے پھر گھر والوں کو پریشان کر دیا۔ ماموں فرقان نے مشورہ دیا کہ کسی اچھے

Urdufans.com

ڈرائی کلینز سے جوڑا ارجنٹ ڈرائی کلین کروالیا جائے۔ نکاح تو عشاء تک ملتوی کر دیا تھا ابھی وقت تھا۔

ایک بندے کو گاڑی پر شہر کے ایک بڑے ڈرائی کلینز کی طرف بھگایا گیا وہ ایک گھنٹے میں کپڑے واپس لے کر آیا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ کپڑوں سے اب بھی ہلکی ہلکی بدبو آرہی تھی۔ زیورات کا بھی یہی حال تھا انہیں اچھی طرح سرف میں دھونے کے باوجود ان کی بدبو نہ نکلی تھی۔ پتہ نہیں یہ کس قسم کی بدبو تھی۔

"اب کیا کریں۔" صابرہ نے بابر علی سے کہا۔ "جوڑا اس قابل ہے کہ اسے پہنایا جائے اور نہ زیورات۔ ویسے واجدہ کہہ رہی ہے کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں نیلم کے پاس بہت جوڑے ہیں ان میں سے کوئی پہن لے گی۔"

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" بابر علی نے کہا۔ "کیوں ماموں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں تمہارے خیال سے متفق ہوں دلہن کو ہمارے یہاں کا جوڑا پہننا چاہئے۔" ماموں فرقان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اور یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔"

"لیکن اتنی جلدی نیا جوڑا کیسے بن جائے گا۔" بابر علی نے ماموں فرقان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"آج کل بازار میں سب کچھ مل جاتا ہے یہ ہمارے وقتوں کا زمانہ نہیں ہے کہ مہینوں شادی کی تیاری کرنا پڑتی تھی اب تو چار دن میں شادی کی پوری تیاری ہو سکتی ہے۔" ماموں فرقان نے ہنس کر کہا۔

"ٹھیک ہے پھر بازار سے جا کر ایک جوڑا اور زیورات کا ایک سیٹ خرید لاتے ہیں۔" بابر علی نے کہا۔ "کیوں صابرہ ٹھیک ہے نا؟"

"جی بالکل ٹھیک ہے لیکن کچھ پیسوں کا مسئلہ ہوگا۔" صابرہ نے فکر مند ہو کر کہا۔

"پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں تم لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں میرے پاس پیسے بہت ہیں۔" ماموں فرقان نے اپنی جیب پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ماموں فرقان تقریباً تیار ہی تھے بس دوسرے مکان میں جا کر انہوں نے اپنا کوٹ پہنا اور اپنے سوٹ کیس میں سے مزید پیسے نکال کر جیب میں رکھ لئے اس وقت ان کی جیب میں پندرہ ہزار روپے تھے۔ دس ہزار صابرہ نے اپنے پرس میں رکھ لئے تھے۔

جب واجدہ اور ان کے شوہر کو پتہ چلا کہ یہ لوگ بری کے جوڑے اور زیور خریدنے کیلئے بازار جا رہے ہیں تو انہوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن بابر علی اور فرقان ماموں نہیں مانے اور وہ فوراً گاڑی لے کر انارکلی کی طرف چل دیئے۔

اکبر کو جب یہ معلوم ہوا کہ بری کے جوڑوں اور زیورات کا کیا حشر ہوا ہے تو وہ پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکا سوٹ کیس میں غلاظت کس نے بھردی یہ سوچ سوچ کر وہ ہلکان ہو گیا پھر اسے فکر ہوئی کہ اب بری کے جوڑوں کا کیا ہوگا کہاں سے آئیں گے۔

پھر اسے کسی نے بتایا کہ ماموں فرقان تمہاری امی ابو کو لے کر انارکلی گئے ہیں بری کا جوڑا اور زیورات لینے تو اس کی کچھ جان میں جان آئی ورنہ اسے تو شادی خطرے میں پڑتی نظر آرہی تھی بری کے بغیر کیسے

Urdufans.com

ہوتی شادی۔

گاڑی سمن آباد سے نکلی تو ماموں فرقان جو اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے مڑ کر بابر علی سے مخاطب ہوئے۔

"بھئی بابر تمہاری بیوی صابرہ تو جنات پر یقین رکھتی نہیں ہے یہ تو مجھے بھی توہم پرست کہتی ہے لیکن اب تم دونوں مجھے یہ بتاؤ کہ یہ غلاظت سوٹ کیس میں کہاں سے آئی؟"

پچھلی سیٹ پر بابر علی کے ساتھ صابرہ بیٹھی ہوئی تھیں ماموں فرقان کی بات سن کر اس نے کہا۔

"ماموں فرقان میں تو چکرا کر رہ گئی ہوں سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے یہ عقل کو دنگ کرنے والے واقعات پے در پے کیوں ہو رہے ہیں؟"

"صابرہ تم نے ٹرین میں کالے بلے کو دیکھا تھا؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"جی دیکھا تھا۔" صابرہ نے جواب دیا۔

"تمہیں اسے دیکھ کر کیا محسوس ہوا؟" ماموں فرقان نے دوسرا سوال کیا۔

"مجھے اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ وہ ایک کالا بلا ہے۔" صابرہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"وہ کالا بلا تمہارے بیٹے اکبر کے کندھے پر کودا تھا۔" ماموں فرقان نے بتایا۔

"اچھا پھر۔" صابرہ نے ماموں فرقان کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے بیٹے نے اس کا وزن ایک گدھے کے برابر محسوس کیا تھا..... میں اسی وقت کھٹک گیا تھا لیکن میں نے اکبر سے کچھ نہیں کہا تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ خوفزدہ ہو جائے۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا۔" صابرہ نے بغیر پریشان ہوئے پوچھا۔

"وہ کالا بلا محض کالا بلا نہ تھا..... کچھ اور تھا۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"وہ کالا بلا تو مجھے گھر میں بھی نظر آیا تھا وہ اس وقت الماری کے پیچھے سے نکل کر کمرے کے باہر چلا گیا تھا جب میں نے سوٹ کیس کھولا تھا۔" صابرہ نے بتایا۔

"اب کچھ یقین آیا۔" ماموں فرقان بولے۔

"ڈر تو مجھے لگا تھا اسے دیکھ کر خاص کر اس کی سرخ آنکھوں میں کچھ تھا لیکن پھر وہ میرے ذہن سے محو ہو گیا۔ لیکن ماموں فرقان وہ بلا نہیں ہے تو اور کیا ہے۔" صابرہ نے پوچھا۔

"اس بات کا تو مجھے یقین ہے کہ وہ بلا نہیں ہے وہ کوئی اور مخلوق ہے اب کیا ہے اس کے بارے میں، میں صحیح طور پر کچھ نہیں بتا سکتا..... ایک آدھ بار اسے دیکھ لوں پھر ہی کچھ بتا سکوں گا۔"

"کیا آج کے زمانے میں بھی بھوت پریت ہوتے ہیں۔" اس مرتبہ ڈرائیور بولا اس کی آواز سے خوف جھلک رہا تھا۔ "مجھے بھوت پریت سے بڑا ڈر لگتا ہے جی۔"

"بھائی بھوت پریت کا تو پتہ نہیں میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا..... لیکن جن ضرور ہوتے ہیں ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا..... میں نے خود جن دیکھے ہیں۔" ماموں فرقان نے ڈرائیور کو بتایا۔

"ہیں جی آپ نے۔" ڈرائیور ایک دم پریشان ہو گیا اس کی گھبراہٹ میں ایک سائیکل والا لپیٹ میں آتے آتے رہ گیا۔

Urdufans.com

"کیا کرتے ہو گاڑی سامنے دیکھ کر چلاؤ۔" صابرہ نے اسے پیچھے سے ڈانٹا۔ "ماموں فرقان خدا کے واسطے اسے جنات کے واقعات سنانے نہ بیٹھ جانا..... ورنہ اس کا ضرور ہارٹ فیل ہوجائے گا۔"

یہ سن کر ماموں فرقان نے قہقہہ لگایا اور خاموش ہوگئے۔ ڈرائیور انہیں اس طرح مڑمڑکر دیکھ رہا تھا جیسے انہوں نے جن نہ دیکھے ہوں بلکہ وہ خود جن ہوں۔

تھوڑی دیر بعد بازار آگیا اور وہ لوگ انارکلی کی ایک بڑی دکان میں داخل ہوئے اور سیلزمین سے بڑی کا جوڑا دکھانے کو کہا۔ سیلزمین نے جلدی جلدی ان کے سامنے کئی جوڑے رکھ دیئے۔

ایک جوڑا صابرہ کو پسند آگیا اس نے تھوڑا بھاؤ تاؤ کیا اور اس کی قیمت طے کر کے پیکنگ کیلئے کہہ دیا۔ پھر جب کاؤنٹر پر ادائیگی کیلئے پرس میں ہاتھ ڈالا تو اس کے چھکے چھوٹ گئے۔

صابرہ نے جلدی جلدی پرس کی تمام جیبیں دیکھ ڈالیں لیکن بے سود اس کی آنکھوں میں اندھیرا اترنے لگا گھر سے چلتے ہوئے اس نے دس ہزار روپے پرس میں ڈالے تھے لیکن اب پرس میں دس ہزار تو بڑی بات ہے دس روپے بھی نہ تھے اس کا پرس خالی پڑا تھا۔

صابرہ کو پریشان دیکھ کر ماموں فرقان آگے بڑھے اور صابرہ سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"ماموں پرس سے سارے پیسے غائب ہیں۔" صابرہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میرے خیال میں تم جلدی جلدی میں پیسے گھر پر ہی چھوڑ آئیں۔" فرقان ماموں نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں ماموں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پیسے میں نے پرس میں رکھے تھے۔"

"چلو کوئی مسئلہ نہیں فی الحال میں رقم ادا کئے دیتا ہوں۔" ماموں فرقان نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم پیسے گھر بھول آئی ہو۔" یہ کہتے کہتے فرقان ماموں کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ انہوں نے گھبرا کر جیب سے ہاتھ باہر نکالا اور پھر ایک ایک کر کے تمام جیبیں چھان ماریں لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

ان کی جیب سے بھی پندرہ ہزار روپے غائب تھے۔

بڑی کا جوڑا کاؤنٹر پر پیک رکھا رہ گیا۔ وہ تینوں دکاندار سے معذرت کر کے باہر آگئے۔ صابرہ نے واپس آتے ہوئے اپنے پرس کو بار بار ٹٹولا۔ انہوں نے اپنے شوہر بابر سے بھی اپنی جیبیں دیکھنے کو کہا۔ بابر علی نے بھی اپنی جیبیں کھنگال ڈالیں لیکن رقم برآمد نہ ہوئی۔ صابرہ بہت پریشان تھی اس کا نقصان پر نقصان ہوا جارہا تھا ابھی بڑی کے جوڑوں اور زیورات کا ستیاناس ہوا تھا کہ اس کے بعد فوراً ہی دس ہزار روپے کی چپت لگ گئی۔ یہ پیسے کہاں غائب ہوگئے تھے۔ کیسے غائب ہوگئے تھے۔ کسی کی عقل کام نہ کر رہی تھی۔

جب وہ لوگ سمن آباد واپس پہنچے اور منہ لٹکائے گھر میں داخل ہوئے تو واجدہ تیزی سے آگے بڑھی اس نے صابرہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا صابرہ خیر تو ہے۔"

"خیر کہاں۔ سارے پیسے غائب ہوگئے۔" صابرہ نے پھر واقعہ کی تفصیل بتائی۔

Urdufans.com

"حیرت ہے۔" واجدہ نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "خیر غم نہ کرو نیلم کے پاس تیس چالیس جوڑے ہیں پندرہ بیس سلے ہوئے ہیں ان میں سے کوئی ایک پسند کر لو وہ ہم بڑی کا جوڑا سمجھ کر پہنا دیں گے تم اپنا دل نہ دکھاؤ۔"

"اچھا۔" صابرہ نے ایک گہرا سانس لے کر کہا اب اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔

جوڑے کا مسئلہ حل ہوا تو ایک دوسرا مسئلہ کھڑا ہو گیا نکاح کا وقت ہو ایک بندہ نکاح خواں کو لینے گیا عین اس وقت جب سب لوگ قاضی کا انتظار کر رہے تھے وہ شخص جو نکاح خواں کو لینے گیا تھا مایوس ہو کر شامیانے میں داخل ہوا۔

نیلم کے والد نے اس شخص کو تنہا دیکھ کر پوچھا۔ "کہاں ہیں قاضی صاحب؟"

"وہ تو نہیں آسکیں گے جی ..... انہوں نے معذرت کر لی ہے انہیں ایک سو چار درجے کا بخار ہے۔" اس نے نیلم کے والد فیاض حسین کو بتایا۔

"انہیں بھی آج ہی بخار ہونا تھا۔" فیاض حسین نے غصے سے کہا۔

پھر ایمرجنسی میں ایک اور نکاح خواں کا انتظام کیا گیا جیسے تیسے ہانپتے کانپتے دوسرے قاضی صاحب آئے اسٹیج پر پہنچ کر انہوں نے کاغذات کھولے نکاح کے رجسٹر پر ضروری اندراج کیا اندراج کرتے ہوئے بار بار ان کا ہاتھ رک جاتا اور وہ گردن اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتے۔

کوئی ایسی چیز ضرور تھی جو ان کی توجہ بٹا رہی تھی لیکن ان کی سمجھ میں خود یہ بات نہیں آرہی تھی کہ وہ اندراج کرتے کرتے کس کو گردن اٹھا کر دیکھنے لگتے ہیں۔

خدا خدا کر کے اندراج پورا ہوا تب قاضی صاحب نے ایجاب و قبول کا سلسلہ شروع کیا۔

ادھر ایجاب و قبول کا سلسلہ شروع ہوا ادھر وہ شامیانے میں داخل ہوا اور اچھل کر اسٹیج پر چڑھا پھر وہ خاموشی سے صوفے کے نیچے بیٹھ گیا۔ اسی صوفے پر اکبر سہرا باندھے بیٹھا تھا اور اس کے پاؤں اور اس کے پاؤں کے درمیان دو تین انچ کا فاصلہ تھا۔

قاضی صاحب نے ایک جھرجھری سی لی انہیں اچانک ہی اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سردی اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ انہوں نے جلدی سے دولہا کے سامنے ایجاب و قبول کے لئے لڑکی کا نام، ولدیت اور مہر وغیرہ دہرائی مگر ان سے کوئی غلطی ہو گئی۔

انہوں نے نیلم کے والد کا نام فیاض حسین کے بجائے سرفراز حسین کہا پھر ہر بار وہ غلطی کرنے لگے کبھی لڑکی کا نام بھول جاتے کبھی مہر کی رقم غلط بتاتے۔ بار بار غلطی کرنے پر وہ خود شرمندہ ہو رہے تھے ان کی حالت یہ تھی کہ وہ رجسٹر میں دیکھ کر کوائف بول رہے تھے لیکن آنکھیں جو دیکھ رہی تھیں وہ زبان پر نہیں آرہا تھا۔

اسٹیج پر جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہ سب پریشان ہو رہے تھے۔ نیلم کے والد فیاض حسین کو بڑا غصہ آرہا تھا۔

پھر خدا خدا کر کے ایجاب و قبول مکمل ہوا اکبر نے سہرا اٹھایا اور شامیانے میں مبارک سلامت کا شور اٹھا لوگ دولہا سے گلے ملنے اور مبارکباد دینے اسٹیج پر آنے لگے۔

وہ جو صوفے کے نیچے بیٹھا تھا وہاں سے نکلا، اسٹیج سے کودا، اس نے منہ ڈال کر قنات اٹھائی اور تیزی

Urdufans.com

سے وہاں سے نکل گیا۔

قاضی کی بڑی عجیب حالت تھی ان کے جسم میں کپکپی بڑھتی ہی جارہی تھی لہٰذا انہوں نے کھانا بھی نہ کھایا نکاح پڑھایا، اپنے پیسے وصول کیے اور ہانپتے کانپتے شامیانے سے نکل گئے۔

نکاح کے بعد بارات نے کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد دلہن رخصت ہوئی۔ وہ رخصت ہو کر برابر والے مکان میں آگئی اس مکان میں جہاں بارات ٹھہری تھی۔ اس مکان کے ایک کمرے کو دولہا دلہن کیلئے مخصوص کر دیا گیا تھا اسے اچھی طرح سجایا گیا تھا۔ گلاب کے تازہ پھولوں سے خوب مہکایا گیا تھا۔

صابرہ اور داجدہ دلہن کے پاس بیٹھی تھیں اور آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ آج دن بھر جو بیتی تھی اس کی روداد صابرہ بتا رہی تھی۔ نیلم ان کے پیچھے خاموش بیٹھی تھی وہ یہ ساری باتیں سن کر پریشان ہو رہی تھی۔

ادھر دوسرے کمرے میں فرقان ماموں، بابر علی اور فیاض کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اکبر اپنے خاندان کے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ تیسرے کمرے میں بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا۔

فرقان ماموں نے کھانا کچھ زیادہ ہی کھالیا تھا پیٹ پر کسی ہوئی پینٹ انہیں پریشان کر رہی تھی انہوں نے سوچا کہ کپڑے تبدیل کر کے ذرا ایزی ہوا جائے۔

"بابر میں کپڑے بدل کر ابھی آیا۔" فرقان ماموں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"جی اچھا ماموں۔" بابر علی نے کہا۔

فرقان ماموں نے اپنا کوٹ اتار کر ہینگر پر لٹکایا..... کوٹ کو ہینگر پر لٹکاتے ہوئے ان کی نظر اندرونی جیب پر پڑی اس جیب میں انہیں کچھ نوٹ رکھے ہوئے نظر آئے..... انہوں نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا ان کے ہاتھ میں نوٹوں کی موٹی گڈی موجود تھی۔

ماموں فرقان نے جلدی جلدی نوٹ گنے پورے پندرہ ہزار تھے۔

"ارے بابر بہ کمال ہو گیا۔" ماموں فرقان نے دور ہی سے آواز لگائی۔

"کیا ہوا ماموں۔" بابر علی نے چونک کر کہا۔

"بابر پیسے تو یہ رہے۔" ماموں فرقان نے قریب آکر نوٹ دکھائے۔

"یہ کہاں سے ملے۔" بابر علی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"کوٹ کی جیب میں سے۔" فرقان ماموں نے بتایا۔

"ماموں اسی کوٹ کی جیب میں سے جو آپ نے ابھی پہن رکھا تھا۔" بابر علی نے تصدیق چاہی۔

"ہاں اسی کوٹ کی جیب میں سے۔" فرقان ماموں نے اثبات میں گردن ہلائی..... "بازار جاتے ہوئے میں نے کوٹ کی اسی جیب میں پیسے رکھے تھے اور اب اسی جیب سے ملے ہیں..... دکان پر تو میں نے ساری جیبیں ٹٹول ڈالی تھیں مگر پیسوں کا پتہ نہ تھا۔"

"ماموں فرقان یہ کیا ہو رہا ہے۔" بابر علی کی پیشانی فکر آلود ہو گئی۔

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" ماموں فرقان نے گہرا سانس لیا پھر کچھ سوچ کر بولے۔ "صابرہ کہاں ہے؟"

Urdufans.com

"وہ ڈسن والے کمرے میں ہیں۔" کسی نے بتایا۔

تب ماموں فرقان مجلۂ عروسی کی طرف آئے اور دروازے پر رک کر آواز دی۔ "صابرہ"۔

"جی آئی ماموں۔" صابرہ کی اندر سے آواز آئی پھر وہ دروازے پر نمودار ہوئی۔ "جی ماموں آپ اندر آجائیں آپ سے کیا پردہ۔"

"صابرہ تمہارا پرس کہاں ہے۔" ماموں نے کہا۔

"اندر کمرے میں ہے۔" صابرہ نے ماموں فرقان کا چہرہ غور سے دیکھ کر کہا۔

"ذرا اٹھا کر لانا۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"اچھا میں لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر صابرہ اندر چلی گئی پھر فوراً ہی واپس آئی اس کے ہاتھ میں پرس تھا۔ "یہ رہا ماموں پرس..... کیا کرنا ہے۔"

"ذرا اسے کھول کر دیکھو۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"خالی پرس کو کیا کھول کر دیکھنا۔" صابرہ نے پرس کی زپ کھولی۔

زپ کھولتے ہی اس کی خوشی سے چیخ نکل گئی۔ "ارے ماموں پیسے..... اس میں تو پیسے موجود ہیں۔" صابرہ نے جلدی سے پیسے نکال کر انہیں گنا..... پورے دس ہزار تھے۔

"ماموں پورے دس ہزار ہیں۔" صابرہ خوشی سے چلائی۔

لیکن فرقان ماموں اب وہاں موجود نہ تھے وہ یہ خبر سنانے بابر علی کے پاس جا چکے تھے۔

"بابر، صابرہ کے پرس میں بھی سارے پیسے موجود ہیں۔" انہوں نے کمرے میں پہنچ کر بابر کو بتایا۔

"واقعی۔" بابر علی خوش ہو کر بولا۔

"ہاں واقعی۔" صابرہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ "ماموں کیا آپ کے پیسے بھی مل گئے۔"

"ہاں، ماموں کو بھی مل گئے۔" بابر علی نے بتایا۔

"صابرہ، اب کیا کہتی ہو۔" ماموں فرقان نے صابرہ کو بغور دیکھا۔

"میں کیا کہوں ماموں، پیسے مل گئے یہ میرے لئے سب سے بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"یہ پیسے غائب کہاں ہو گئے تھے۔" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم۔" صابرہ نے بے نیازی سے کہا۔

"ویسے یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ آپ دونوں کے پاس سے رقم غائب ہو گئی۔" اس مرتبہ فیاض حسین بولے۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ بازار میں کسی نے اڑا لی..... اگر یہ پیسے نہ ملتے تو ہمیشہ یہی سمجھتا رہتا۔"

"اب کیا سمجھ رہے ہیں؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"میرے خیال میں آپ لوگوں نے اپنی جیب اور پرس اچھی طرح نہ دیکھا۔" فیاض حسین نے رائے دی۔

"بھائی صاحب کیا بات کرتے ہیں۔" بابر علی نے کہا۔

"صابرہ نے تو میری جیبیں بھی کھنگال ڈالی تھیں۔"

"فیاض صاحب آپ کو جنوں وغیرہ پر یقین ہے۔" فرقان ماموں نے اب صاف لفظوں میں پوچھا۔

"مجھے تو بس پیسے پر یقین ہے یہ پیسہ اتنا بڑا جن ہے کہ سب کو نچلی کا ناچ نچا دیتا ہے۔" فیاض حسین نے ایک قیمتی سگریٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے کہا۔

ان کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ فیاض حسین ایک بڑے بزنس مین تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بس ایک ہی چیز پر یقین کیا تھا اور وہ تھا پیسہ..... پیسہ ان کا ایمان تھا وہ جن بھوتوں سے نہیں ڈرتے تھے البتہ ڈوبتی ہوئی رقم سے ان کی جان جاتی تھی اور آتی ہوئی رقم سے ان کے جسم میں جان پڑ جاتی تھی۔ وہ دو اور دو چار کے آدمی تھے۔ ہندسوں میں ان کیلئے بڑی کشش تھی۔

یہی وجہ تھی کہ ماموں فرقان کی بات کا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔

ماموں فرقان نے سوچا جو آدمی پیسے کے علاوہ کسی بات پر یقین ہی نہ رکھتا ہو اس سے بات کرنے کا کیا فائدہ۔

اکبر کو جب پیسے ملنے کی خبر ملی تو وہ بہت خوش ہوا ورنہ جب سے وہ لوگ گھر سے چلے تھے کچھ نہ کچھ ایسی باتیں ہو رہی تھیں جو ذہنی پریشانی کا باعث تھیں۔ ٹرین میں ایک کالے بلے نے پریشان کئے رکھا، گھر آئے تو بری کے سوٹوں میں غلاظت بھر گئی۔ غلاظت بھی ایسی کہ ڈرائی کلیننگ کے بعد بھی ان کپڑوں میں سے بو نہ گئی، پھر نیا جوڑا خریدنے بازار گئے تو صابرہ کے پرس اور ماموں فرقان کی جیب سے پیسے غائب ہو گئے، جن قاضی کو بلایا گیا تھا وہ اچانک بخار میں مبتلا ہو گیا، نکاح پڑھانے نہ آسکا، عجلت میں ایک اور قاضی کا انتظام کیا گیا وہ نکاح خواں تھا بھی یا نہیں بڑی مشکلوں سے اٹک اٹک کر اس نے نکاح پڑھایا یہ واقعات کی وہ کڑیاں تھیں جو ایک کے بعد ایک ظہور پذیر ہو کر اکبر کے دل کا قرار لوٹ رہی تھیں۔

نیلم سے شادی اس کا خواب تھی اس نے کراچی میں اپنے گھر کے لوگوں اور خاندان والوں سے نیلم کے حسن کے چرچے سنے تھے اور وہ اسے دیکھے بغیر ہی اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ وہ اس کے خواب دیکھنے لگا تھا اور جب نیلم لاہور سے کراچی آئی اور اکبر نے پہلی بار اسے دیکھا تو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس کی وہ اس کے تصور سے بھی کہیں حسین تھی اس قدر حسین کہ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"یہ نیلم نہیں..... نیلم پری ہے۔"

ایسا ملکوتی حسن انسانوں میں کہاں ہوتا ہے۔ یہ انسان نہیں پری ہے پری..... اکبر نے بچپن میں پریوں کے بہت قصے پڑھے تھے۔ نیلم کو دیکھا تو اسے فوراً خیال آیا کہ نیلم کے پر نہیں ہیں حسن تو ویسا ہی ہے اگر اس کے پر لگے ہوتے تو یہ نیلم پری ہو جاتی۔

بس اسی دن سے اس نے دل میں دعائیں مانگنا شروع کر دی تھیں کہ اے اللہ میری شادی نیلم سے کرا دے۔ کہتے ہیں کہ تقدیر کی طرح اللہ نے شادی بیاہ کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں رکھا ہے جوڑے آسمانوں میں لکھے جاتے ہیں اللہ نے اکبر کی دعا قبول کر لی اور خوش ہو کر نیلم کو اس کے نام لکھ دیا۔

خاندان میں لڑکوں کی کمی نہ تھی لاہور، کراچی اور دیگر شہروں میں ایک سے ایک لڑکا پڑا تھا نیلم کے نام پر سب اپنی گردنیں کٹوانے کیلئے تیار تھے لیکن قرعۂ فال نکلا اکبر کے نام اور یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ وہ

Urdufans.com

اس کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔

اب وہ وقت بہت نزدیک تھا جب اس کا مقدر کھلنے والا تھا۔ اس کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے والا تھا۔

رات آدھی گزر چکی تھی۔ اکبر اس انتظار میں تھا کہ کب وہ لمحہ آئے اور وہ مجلہ عروسی میں پہنچے۔ اب وہ وقت قریب تھا۔ اکبر کی بہن راشدہ نیلم کو بنا سنوار رہی تھی، ہلکی لپ اسٹک کو اور گہرا کیا جا رہا تھا، لباس درست کیا جا رہا تھا، نیلم کی امی واجدہ نے کمرے میں مٹھائی، پھل اور ایک بڑا گلاس دودھ سے بھرا رکھ دیا تھا۔ راشدہ اپنے بھائی کو لینے جا چکی تھی۔

واجدہ، نیلم کو گلے سے لگا کر کمرے سے نکل رہی تھیں۔ "اچھا چندا صبح ملاقات ہوگی۔"

ابھی وہ کمرے سے باہر نہ نکل پائی تھیں کہ انہوں نے کسی چیز کے گرنے کی آواز سنی۔

پلٹ کر دیکھا تو ان کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ انہوں نے زور سے چیخ ماری واجدہ کی چیخ سن کر نیلم پریشان ہوگئی اس نے وہ منظر نہ دیکھا تھا اس لئے فوراً اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ امی نے کیوں چیخ ماری ہے جب اس کی نظر اس پر پڑی تو وہ اپنا دلہن ہونا بھول گئی اور گرتی پڑتی دروازے کی طرف بھاگی۔ اکبر دروازے کے نزدیک آچکا تھا اس نے اپنی ساس کو بدحواس اور اپنی دلہن کو بے حال دیکھا تو اس کا جسم ٹھنڈے پسینے میں ڈوب گیا۔

"کیا ہوا۔" اس نے بمشکل پوچھا۔

"وہ..... وہ" واجدہ نے کمرے کے اندر اشارہ کیا۔ راشدہ نے آگے بڑھ کر نیلم کو سنبھالا وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

اکبر نے جلدی سے کمرے میں قدم رکھا تو اس نے دیکھا کہ کالا بلا ٹرے میں گرا ہوا دودھ اپنی سرخ سرخ زبان سے لپ لپ پی رہا ہے۔ اس نے دودھ سے بھرا گلاس کمرے میں الٹا دیا تھا۔

یہ دیکھ کر اکبر کو بڑا غصہ آیا اس کالے بلے نے اس کی آنکھوں سے میٹھے میٹھے خواب چھین لئے تھے اس کا جی چاہا کہ وہ اس کالے بلے کی دُم پکڑ کر پہلے اسے خوب چکر دے اور پھر زور سے گھما کر دیوار میں دے مارے۔

وہ کالا بلا اکبر کے غصے سے بے نیاز بڑے آرام سے دودھ پی رہا تھا اور جب تک اس نے دودھ کا ایک ایک قطرہ ٹرے میں سے نہیں چاٹ لیا اس نے سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

اکبر نے آگے بڑھنا چاہا مگر جیسے اس کے قدم جم گئے تھے۔ اس وقت خوف نہ تھا شدید غصہ تھا وہ اس بلے کی ڈھٹائی پر حیران تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اکبر کمرے میں آگیا ہے اور چار قدم کے فاصلے پر ہے اس کی دم پکڑ کر گھما سکتا ہے مگر اس کالے بلے کو ذرا پروانہ تھی وہ لپ لپ دودھ پیئے جا رہا تھا اور اکبر اسے مارنے کی شدید خواہش کے باوجود آگے نہیں بڑھ پا رہا تھا اس کے پاؤں جیسے فرش سے چپک گئے تھے۔ بس یہ کچھ لمحوں کی بات تھی، دودھ پینے کے بعد اس کالے بلے نے سائیڈ ٹیبل سے چھلانگ لگائی اب وہ اکبر کے مقابل تھا اور اپنی لال لال آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔

اکبر نے ٹھوکر مارنے کیلئے اپنی ٹانگ اٹھائی اور اسے ٹھوکر مارنے ہی والا تھا کہ وہ بلا بجلی کی تیزی سے اس کی ٹانگوں کے درمیان سے نکل گیا۔ اس بلے کی رگڑ سے اکبر غیر متوازن ہوگیا۔ اس نے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا نہیں تو زمین پر گر پڑتا۔ اس کالے بلے کی رگڑ بڑی آہنی تھی اکبر کو ایسا لگا جیسے کوئی

www.urdufans.com

لوہے کی چیز اس کی ٹانگوں کو رگڑتی ہوئی نکل گئی ہو۔

کالے بلے کے جانے کے بعد دلہن کو پھر سے بیڈ پر بٹھایا گیا۔ ٹرے صاف کر کے ایک گلاس دودھ اور رکھا گیا۔ دلہن جب سج بن کر بیٹھ گئی تو سب خواتین کمرے سے باہر نکل آئیں۔

تب راشدہ نے اپنے بھائی اکبر سے کہا۔ "جایئے صاحب، دلہن آپ کا انتظار کر رہی ہے۔"

"شکریہ جناب آپ کا بہت شکریہ۔" یہ کہہ کر اکبر کمرے میں داخل ہوا اس نے سامنے دیکھا۔

نیلم سر جھکائے بیڈ کے درمیان بیر بہوٹی بنی بیٹھی تھی۔

اکبر نے پلٹ کر دروازہ بند کیا، چٹخنی چڑھائی اور مسکراتا ہوا دلہن کی طرف پلٹا۔

اب جو بیڈ پر نظر پڑی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔

وہ ہوش کیوں نہ گنواتا۔ بات ہی ایسی تھی۔

اس کے سامنے ایک دلہن نہیں، دو دلہنیں بیٹھی تھیں اور یہ دونوں دلہنیں نیلم ہرگز نہ تھیں، کوئی خبیث صورتیں تھیں ایسی صورتیں کہ آدمی دیکھے تو گر کر بے ہوش ہو جائے۔

وہ کالی بھجنگ عورتیں تھیں، دونوں کی صورتیں ایک جیسی تھیں ایک فٹ لمبی زبان، ایک دم سرخ جیسے ابھی کسی کا خون چاٹا ہو۔ لال زبانیں کتوں کی طرح اندر باہر ہو رہی تھیں اور زبانوں کے دائیں بائیں سے لمبے لمبے دو دانت جھانک رہے تھے۔ ان عورتوں کی ناک نہیں تھی، ناکوں کی جگہ دو گہرے سوراخ تھے۔ ان کی آنکھوں میں سے شعلے خارج ہو رہے تھے۔ اس قدر بڑی اور ڈراؤنی آنکھیں تھیں کہ ان کی طرف دیکھا نہ جائے، آدمی دیکھے تو غش کھائے۔

دونوں عورتیں دلہن کے روپ میں تھیں۔ سرخ جوڑا اور زیور سے آراستہ دونوں عورتیں ایک دوسرے کے قریب بیٹھی تھیں ان کے چہروں پر گھونگھٹ نہ تھے۔ اکبر کو دیکھ کر انہوں نے بڑی تیزی سے اپنی زبانیں جلدی جلدی اندر باہر کیں اور اس طرح غراتی ہوئی اٹھیں جیسے اسے پکڑ کر کچا چبا جائیں گی۔

اکبر گھبرا کر دروازے کی طرف لپکا۔ پلک جھپکتے میں اس نے چٹخنی کھولی اور دروازے سے نکل گیا۔

یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا تھا۔ خواتین ابھی اپنے کمرے میں داخل ہوئی ہی تھیں کہ اکبر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پکارا۔ "امی"

صابرہ نے اکبر کی آواز سنی تو وہ تڑپ کر پلٹیں۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کا بیٹا اکبر اس کڑاکے کی سردی میں پسینے میں نہایا ہوا ہے اور آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی ہے۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

"ارے میرا بیٹا۔" صابرہ نے اکبر کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ "کیا ہوا میرے بیٹے کو۔"

اکبر ابھی کچھ کہنے کے قابل نہ تھا وہ زبان سے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولتا تو اس کی زبان لڑکھڑا کر رہ جاتی۔ کسی نے اسے ایک گلاس پانی دیا جسے اکبر اس طرح پی گیا جیسے برسوں سے پیاسا ہو۔

پانی پی کر جب ذرا اس کی کچھ حالت سدھری تو اس نے صابرہ سے کہا۔ "امی، وہاں نیلم نہیں ہے۔ دو چڑیلیں بیٹھی ہیں۔"

"اکبر تجھے کیا ہو گیا ہے، کیا بکواس کر رہا ہے۔" صابرہ نے اکبر کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے

Urdufans.com

کہا۔

"امی، میں سچ کہہ رہا ہوں، وہاں نیلم نہیں ہے، وہاں دو خوفناک عورتیں بیٹھی ہیں، ان کی یہ لمبی زبانیں تھیں اور کتوں کی طرح ہل رہی تھیں۔"

یہ بات سن کر وہاں جتنی عورتیں تھیں سب کی سٹی گم ہو گئی۔ کسی میں اتنی ہمت نہ رہی کہ دلہن کے کمرے میں جا کر دیکھیں۔

صابرہ ایک بڑی خاتون تھیں۔ انہیں جن بھوتوں پر یقین بھی نہ تھا لیکن اس وقت اکبر کی حالت دیکھ کر وہ بھی ہمت نہ کر پائیں کہ تنہا اندر جا کر دیکھیں۔ انہوں نے نیلم کی امی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آؤ واجدہ میرے ساتھ نیلم کے کمرے میں چلو۔"

"ہائے، نہیں صابرہ مجھ سے اکیلے نہیں جایا جائے گا۔" واجدہ نے سہم کر کہا۔ "ادھر سے کسی مرد کو بلا لو۔"

واجدہ کی یہ تجویز صابرہ کے دل کو لگی اندر سے وہ بھی یہ چاہ رہی تھی کہ کوئی مرد ان کے ساتھ چلے۔ انہوں نے فوراً راشدہ کو اشارہ کیا۔ "راشدہ جاؤ ذرا فرقان ماموں کو بلا کر لاؤ۔"

راشدہ پہلے ہی ڈری ہوئی تھی اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ڈرائنگ روم تک تنہا چلی جائے۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ "امی میں۔"

"اری، تو اتنی ڈرپوک کیوں ہے تو سامنے کے کمرے سے ماموں فرقان کو بلا کر نہیں لا سکتی۔" صابرہ نے ذرا تیز لہجے میں کہا پھر انہوں نے اپنی بھتیجی شکیلہ کو مخاطب کر کے کہا۔ "شکیلہ تم اس کے ساتھ چلی جاؤ۔"

راشدہ اور شکیلہ دونوں مل کر کمرے سے نکلیں۔ مرد جس کمرے میں ٹھہرائے گئے تھے وہ دس پندرہ قدم کے فاصلے پر تھا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے راہداری سے گزریں۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا لیکن اندر اندھیرا تھا ان دونوں میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ اندھیرے کمرے میں اندر جائیں، اندر جا کر لائٹ جلائیں اور پھر یہ دیکھیں کہ فرقان ماموں کہاں سوئے ہوئے ہیں۔ کمرے سے فرنیچر نکال کر فرش کر دیا گیا تھا اور فرش پر بستر بچھا دیئے گئے تھے۔ سب لوگ کمبل اور لحاف اوڑھے لمبے لمبے پڑے تھے۔ اندھیرے میں ایسا لگ رہا تھا جیسے برابر قبریں بنی ہوں۔

"شکیلہ اندر تو اندھیرا ہے، اندر کیسے جائیں۔" راشدہ نے کہا۔

"تجھے معلوم ہے لائٹ کا سوئچ کہاں ہے۔" شکیلہ نے پوچھا۔

"نہیں، مجھے نہیں معلوم۔" راشدہ نے جواب دیا۔

فرقان ماموں دروازے کے نزدیک ہی سوئے ہوئے تھے ابھی وہ پوری طرح سو نہ پائے تھے کہ ان لڑکیوں کی آوازیں سن کر ان کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے اپنے چہرے سے لحاف ہٹایا تو دیکھا دروازے میں راشدہ اور شکیلہ کھڑی ہیں وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"بھئی کیا ہوا؟" ماموں فرقان کی اچانک آواز سن کر لڑکیاں اور ڈر گئیں۔ وہ ایک دوسرے کے قریب ہو گئیں۔

"راشدہ خیریت تو ہے۔" فرقان ماموں لحاف سے نکلتے ہوئے بولے۔

Urdufans.com

"فرقان ماموں جلدی چلئے، آپ کو امی نے بلایا ہے۔" راشدہ نے جلدی سے کہا۔

"اچھا چلو۔ کہاں ہیں، تمہاری امی۔" فرقان ماموں نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

ماموں فرقان جب راشدہ اور شکیلہ کے ساتھ خواتین کے کمرے میں پہنچے تو انہیں احساس ہوا کہ معاملہ کچھ سنگین ہے۔ ساری خواتین کے چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھی۔ پھر سب سے عجیب بات یہ تھی کہ دولہا میاں بھی ان خواتین کے درمیان موجود تھے جبکہ انہیں یہاں نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اکبر بھی ہونق بنا ہوا تھا۔ ماموں فرقان کو دیکھ کر سب کے چہروں پر ایک اطمینان کی لہر ابھری۔

"اکبر کیا ہوا؟" ماموں فرقان نے براہ راست اکبر سے سوال کیا۔

"ماموں اسے ہم لوگ ابھی دلہن کے کمرے میں چھوڑ کر آئے تھے مگر یہ وہاں سے ڈر کر آگیا ہے۔" جواب صابرہ نے دیا۔

"وہ کیوں؟" ماموں فرقان نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ماموں وہاں نیلم نہیں ہے۔" اس مرتبہ اکبر بولا، ہمت کر کے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔" ماموں فرقان پریشان ہو گئے۔

"ہاں، ماموں میں سچ کہہ رہا ہوں، وہاں نیلم نہیں ہے وہاں دو چڑیلیں بیٹھی ہیں۔" اکبر نے بتایا۔

"یہ کیا فضول بات کر رہے ہو۔" ماموں فرقان نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

ماموں فرقان نے اکبر کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور کمرے کی طرف بڑھے۔

"صابرہ تم بھی آؤ۔" ماموں فرقان نے صابرہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور اکبر بھاگا ہی اس بُری طرح سے تھا۔ فرقان ماموں نے اکبر کو پیچھے کیا اور خود آگے بڑھے۔ کھلے دروازے سے انہوں نے جو منظر دیکھا اس میں کوئی خوفناکی نہیں تھی، نیلم بیڈ پر بیٹھی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا سر جھکا ہوا نہ تھا، اٹھا ہوا تھا اور اس کی نظریں دروازے پر تھیں۔

دروازے پر فرقان ماموں کو دیکھ کر نیلم نے سر جھکا لیا اور سمٹ سکڑ کر بیٹھ گئی۔

"اکبر یہاں تو کچھ نہیں۔" فرقان ماموں نے پلٹ کر اکبر سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے پیچھے صابرہ تھیں۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہو کر سب سے پہلے نیلم کو دیکھا بیڈ پر بیٹھ کر صابرہ نے نیلم کا ذرا سا گھونگھٹ ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا گھونگھٹ کے اندر نیلم ہی تھی۔ وہ صابرہ کو دیکھ کر مسکرائی۔ صابرہ نے محسوس کیا کہ نیلم کی آنکھوں میں کچھ فکرمندی موجود ہے صابرہ نے نیلم کو قریب کر کے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا اور پیار سے بولیں۔ "میری بچی۔"

صابرہ کو نیلم سے باتیں کرتے دیکھ کر فرقان ماموں، اکبر کو اپنے ساتھ لے کر کمرے سے نکل گئے تاکہ وہ اطمینان سے باتیں کر سکیں۔

"خالہ انہیں کیا ہوا تھا؟" نیلم نے دونوں کے باہر نکلتے ہی صابرہ سے سوال کیا۔

صابرہ، نیلم کا سوال سن کر عجیب الجھن میں پڑ گئیں ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں۔

"یہ کمرے میں آکر کیوں بھاگ گئے تھے؟" نیلم نے اپنے سوال کی وضاحت کی۔

اس سوال کا جواب صابرہ کے پاس تھا لیکن وہ خاموش رہیں۔ نہیں چاہتی تھیں کہ نیلم کو حقیقت بتا کر کسی دہشت میں مبتلا کر دیں۔ اگر دونوں ہی دہشت زدہ ہو گئے تو پھر اس سنسنی رات کا ستیاناس ہو جائے گا۔

"اسے کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی۔" صابرہ نے اصل بات کو گول کر دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" نیلم نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔ صابرہ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ نیلم نے اس سلسلے میں مزید سوالات نہیں کیے۔ نیلم بہت کم گو مشہور تھی اس وقت اس کی کم گوئی اس کے حق میں بہتر ثابت ہوئی تھی۔

ماموں فرقان اور اکبر کے نکلنے کے بعد کمرے میں خواتین کی یلغار ہو گئی۔ واجدہ کچھ پوچھنا چاہ رہی تھیں لیکن صابرہ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش کر دیا سب خواتین سمجھ گئیں کہ یہاں نیلم کے سامنے کوئی بات نہیں کرنی۔

تھوڑی دیر کے بعد دلہن کا کمرہ خالی کر دیا گیا۔

اکبر کو ایک مرتبہ پھر کمرے میں جانے کا "ویزا" مل گیا وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ چند لمحے وہ دروازے پر کھڑا رہا نیلم اس کی آنکھوں کے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی اس کے علاوہ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ اپنی دھڑکن پر قابو پاتے ہوئے اس نے دروازہ بند کیا ابھی وہ دروازے کی چٹخنی چڑھا ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں میں "میاؤں" کی آواز آئی۔

اکبر چٹخنی چڑھاتے چڑھاتے فوراً رک گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اسے کمرے میں کچھ نظر نہ آیا۔

کمرے میں زیادہ سامان نہ تھا۔ بیڈ کے دونوں طرف سائیڈ ٹیبلیں تھیں، ایک ڈریسنگ ٹیبل تھی باقی کوئی ایسا سامان نہ تھا جس کے پیچھے وہ غائب ہو سکتا۔

اکبر نے پورا کمرہ کھنگال ڈالا۔ مگر اسے وہ کہیں نظر نہ آیا پھر "میاؤں" کی آواز کہاں سے آئی تھی اس نے سوچا۔ یہ اس کا وہم ہو گا یہ سوچ کر اس نے پھر دروازہ بولٹ کرنا چاہا۔

ابھی اس کا ہاتھ چٹخنی پر ہی تھا کہ اسے پھر "میاؤں" کی آواز سنائی دی۔

اس مرتبہ اسے یہ آواز اپنے قدموں کے نیچے سے سنائی دی تھی وہ اچھل کر پیچھے ہٹا پھر اس نے چاروں طرف تیزی سے گھوم کر دیکھا اسے وہ کہیں نظر نہ آیا۔

نیلم اپنی جگہ بیٹھی بیٹھی پریشان ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا شوہر اس کی طرف آنے کے بجائے کونے کونے بچالوں میں کیا دیکھتا پھر رہا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ اس سے پوچھے مگر پھر شرم مانع آگئی۔ وہ دلہن تھی وہ بات چیت میں پہل کیسے کرتی۔

ادھر اکبر کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر اکبر نیلم کے بیڈ کے نزدیک آیا۔ اس نے ذرا سا جھک کر نیلم سے پوچھا۔ "نیلم کیا تم نے کوئی آواز سنی ہے۔"

یہ وہ پہلا مکالمہ تھا جو اکبر کو اپنی نئی نویلی دلہن سے بولنا پڑا۔ اس رات کے اس نے کیسے کیسے خواب

Urdufans.com

دیکھے تھے جانے کیا کیا سوچا تھا کہ یوں کمرے میں داخل ہوگا، یوں اس کے سامنے کھڑا ہوگا، سلام کرے گا پھر بیڈ پر بیٹھے گا، دھیرے سے، آہستہ آہستہ اس کا گھونگھٹ اٹھائے گا۔ ان لفظوں میں اس کے حسن کی تعریف کرے گا وہ لفظ بھی اس نے سوچ لئے تھے۔ پھر منہ دکھائی میں سونے کی ایک خوبصورت انگوٹھی دے گا جس میں ایک ننھا سا ہیرا لگا ہوا ہوگا۔

لیکن سارے پلان دھرے رہ گئے۔ سہاگ رات، خواب رات بن گئی۔ ایسا بھیانک خواب جس نے جسم میں سردی کی لہر دوڑا دی تھی۔

"کیسی آواز؟" نیلم نے سر جھکا کے دھیرے سے پوچھا۔

اسی وقت "میاؤں" کی آواز آئی اس مرتبہ یہ آواز بیڈ کے نیچے سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"یہ، یہ۔" اکبر نے گھبرا کر کہا۔ "کسی بلّے کے بولنے کی آواز۔"

"مجھے تو کوئی آواز نہیں سنائی دی۔" نیلم نے سادگی سے جواب دیا۔

"ارے، حیرت ہے۔" اکبر نے کہا اور جھک کر بیڈ کے نیچے دیکھا۔ وہاں کوئی چیز نہ تھی پھر وہ نیلم سے مخاطب ہو کر بولا "اس کمرے میں، میں مسلسل بلّے کی آواز سن رہا ہوں لیکن مجھے بلّا کہیں نہیں دکھائی دے رہا ہے جانے وہ کہاں چھپا بیٹھا ہے۔ اس بلّے نے تو میری زندگی حرام کر دی ہے۔"

"اس سے پہلے جب آپ کمرے میں آئے تھے تو گھبرا کر بھاگ کیوں گئے تھے اس وقت کیا ہوا تھا آپ کو۔" نیلم نے اپنا چہرہ اوپر اٹھا کر اکبر کو دیکھا۔ اس کی تیکھی نظروں میں بڑا شکوہ تھا۔

"وہ اس وقت۔" یہ کہتے ہوئے اس نے نیلم کے چہرے پر نظر ڈالی۔ صابرہ نے اکبر کو منع کر دیا تھا کہ وہ دلہن کو کچھ نہ بتائے۔ خواہ مخواہ وہ ڈرے گی۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے کیا کہے اس کا چہرہ دیکھ کر ایک مرتبہ پھر اس کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اب اس گھونگھٹ میں نیلم نہ تھی وہ لمبی زبان والی خوفناک عورت تھی جو اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اکبر کے لئے اب اس کمرے میں ٹھہرنا ممکن نہ تھا وہ ایک مرتبہ پھر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

اس مرتبہ وہ عورتوں کی طرف نہ گیا، ماموں فرقان کے پاس پہنچا۔ ماموں فرقان اپنے کمرے کی بجلی بجھا کر لحاف میں گھس چکے تھے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے۔

"ماموں فرقان۔" اکبر نے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز لگائی۔

اکبر کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر ماموں فرقان نے لحاف ایک طرف پھینکا جلدی سے اٹھ کر کمرے کی لائٹ جلائی اور بولے۔ "اب کیا ہوا؟"

"ماموں وہ کمرے میں موجود ہے اس مرتبہ وہ اکیلی ہے اس کے علاوہ کمرے سے میاؤں میاؤں کی آوازیں بھی آ رہی ہیں۔" اکبر نے جلدی جلدی گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

ماموں فرقان نے منہ سے ایک لفظ نہ کہا وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لئے۔

کمرے میں پہنچ کر انہیں کوئی غیر معمولی بات محسوس نہ ہوئی نیلم بیڈ پر بیٹھی تھی اس کا چہرہ دروازے کی طرف تھا اور صاف نظر آ رہا تھا۔

Urdufans.com

فرقان ماموں نے کمرے میں چاروں طرف چکر لگایا سارے کونے بچالے دیکھ ڈالے مگر انہیں وہاں بلّے کی موجودگی کا احساس نہ ہوا۔ فرقان ماموں نے سوالیہ نگاہوں سے اکبر کی طرف دیکھا اکبر ان کی سوالیہ نگاہوں کا کیا جواب دیتا اس نے خاموشی سے چہرہ جھکا لیا اس وقت کمرے میں نیلم موجود تھی اور کوئی نہ تھا۔

اکبر جب فرقان ماموں کو بلانے آیا تھا تو اس کی آواز خواتین کے کمرے تک پہنچ گئی تھی صابرہ فوراً کمرے سے نکل آئی تھیں پیچھے پیچھے واجدہ بھی تھیں۔

صابرہ کو دروازے پر دیکھ کر فرقان ماموں نے کہا۔ "صابرہ ، ذرا دلہن کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

"پھر کچھ ہوا کیا؟" صابرہ نے پوچھا۔

"ہاں۔" فرقان ماموں نے مختصر سا جواب دیا۔

"الٰہی خیر۔" واجدہ نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ "آؤ بیٹی باہر چلو۔"

دلہن کے باہر جانے کے بعد فرقان ماموں نے اکبر سے کہا۔ "تم بھی جاؤ۔"

پھر اس کے جانے کے بعد فرقان ماموں نے کمرہ اندر سے بند کر لیا۔

پانچ منٹ کے بعد جب وہ کمرے سے باہر آئے تو ان کے چہرے پر انتہائی سنجیدگی طاری تھی۔ انہوں نے صابرہ کو علیحدہ لے جا کر اس سے کہا۔ "صابرہ وہ کمرہ ٹھیک نہیں۔"

"کیوں ماموں وہاں کیا ہے؟" صابرہ نے پوچھا۔

"وہ آسیب زدہ ہے۔" فرقان ماموں نے بڑی سنجیدگی سے کہا لیکن تم اس بات کو نہیں سمجھو گی اب میرا مشورہ یہ ہے کہ دولہا دلہن کو کوئی اور کمرہ دے دو۔ وہ کمرہ اس گھر میں نہ ہو تو زیادہ بہتر ہے۔"

"اچھا ماموں ٹھیک ہے۔" خلاف توقع صابرہ نے کوئی بحث نہیں کی۔ ان کا بیٹا اس وقت جس عذاب میں مبتلا تھا اسے دیکھ کر کچھ نہ ماننا اتنا آسان نہ تھا۔

پھر واجدہ نے تجویز پیش کی کہ نیلم کو اس کے اپنے کمرے میں پہنچائے دیتے ہیں جلدی جلدی اس کے کمرے کو ٹھیک کیا گیا اور نیلم کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

اس وقت نیلم کے پاس راشدہ موجود تھی وہ اسے بٹھا کر اس کا گھونگھٹ وغیرہ درست کر رہی تھی۔ نیلم نے راشدہ سے پوچھا۔ "راشدہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"مجھے تو معلوم نہیں۔" راشدہ نے صاف جھوٹ بولا۔ "امی سے پوچھ کر بتا دوں گی۔"

"آؤ راشدہ باہر آجاؤ۔" صابرہ نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اسے آواز دی۔

"اچھا امی آئی۔" راشدہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا بھابھی صبح تک کے لئے خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" نیلم نے مسکرا کر کہا۔

راشدہ کے جانے کے بعد نیلم کی نظریں کھلے دروازے پر جم گئیں پھر اسے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ اکبر اس طرف آرہا تھا۔ اس نے فوراً اپنا سر جھکا لیا اور گٹھری بن کر بیٹھ گئی۔

اکبر کھلے دروازے میں داخل ہوا دو قدم آگے بڑھ کر رک گیا۔ اس مرتبہ اس نے فوراً پلٹ کر

Urdufans.com

دروازہ نہیں بند کیا وہ دودھ کا جلا تھا اس لئے چھاچ بھی پھونک پھونک کر پی رہا تھا کچھ لمحے کھڑے ہو کر وہ نیلم کو دیکھتا رہا۔ نیلم سر جھکائے گٹھری بنی بیٹھی تھی ابھی تک اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔

"نیلم۔" اکبر نے دور ہی سے کھڑے ہو کر اسے آواز دی۔

اس کی آواز سن کر نیلم نے سر اٹھایا اور آہستہ سے بولی "جی۔"

اس کے سر اٹھانے پر اس کے چہرے کا خاصا حصہ اسے نظر آیا تھا وہ نیلم ہی تھی یہاں تک خیریت تھی پھر اکبر نے نظریں گھما کر کمرے کا جائزہ لیا شاید کہیں وہ اُسے بیٹھا نظر آجائے لیکن اس وقت بھی وہ کمرے میں نہ تھا اکبر نے احتیاطاً کمرے کے وہ کونے بچالے بھی دیکھ ڈالے جہاں اس کے ہونے کا امکان ہو سکتا تھا وہ کمرے میں اس کی آواز بھی سنائی نہ دی تھی۔

اب اکبر کو کچھ اطمینان ہوا۔ ہوائیاں اڑتے چہرے پر تھوڑی سی خوشی لہرائی اب وہ پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ بند کیا، دروازے کو لاک کرنے سے پہلے اس نے ایک نظر نیلم کو دیکھا وہ اپنی جگہ پر تھی تب اس نے دروازہ لاک کر دیا اور مسکراتا ہوا واپس نیلم کی طرف بڑھا۔

آگے بڑھتے ہوئے اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی تین بج رہے تھے رات کا آخری پہر تھا، تھرتی سرد رات اب آخری دموں پر تھی۔

اکبر کو اس سنہری رات کے ضائع ہونے کا بڑا دکھ تھا ایسی راتیں زندگی میں بار بار کہاں آتی ہیں ایسی راتوں کے لڑکے خواب دیکھتے ہیں۔ شادی کی پہلی رات کس قدر سحر انگیز ہوتی ہے یہ رات بڑے انتظار کے بعد آتی ہے۔ قدم قدم پر دل دھڑکتا ہے، ہر آہٹ پر دل اچھلتا ہے، آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تب کان، آنکھیں بن جاتے ہیں، جو دیکھتے بھی ہیں اور سنتے بھی ہیں گویا سارے حواس ساعت میں سمٹ آتے ہیں، ہر آواز پر دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، ہر آواز میں ان کی خوشبو آتی ہے۔

آج وہی رات تھی جو زندگی کے زنگ آلود تالوں کو کھولتی ہے، دل کی کلیاں کھلاتی ہے، محبت کی پھوار پڑتی ہے تو ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں رقصاں ہوتی ہیں۔

اکبر اور نیلم کے ساتھ قسمت نے عجب کھیل کھیلا تھا وہ ایک ہونے کے باوجود ایک نہ ہو سکے تھے۔ ایک بندھن میں بندھنے کے باوجود ان میں صدیوں کے فاصلے تھے خوشی جیسے ان سے روٹھ گئی تھی، خوف و ہراس کا چاروں طرف راج تھا۔

گھر اور کمرہ تبدیل ہونے کی وجہ سے اکبر کو امید تھی کہ آئندہ اسے خوشی کے لمحات میسر آجائیں گے، نیلم کو پانے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا۔ ابھی کچھ نہ بگڑا تھا ابھی وقت تھا، یہ ٹھیک ہے کہ رات اپنے پر سمیٹ رہی تھی اڑنے کیلئے پر تول رہی تھی لیکن اسے اڑتے اڑتے بھی وقت لگتا ہے۔ ابھی تین بجے تھے، ابھی سپیدۂ سحر نمودار ہونے میں کچھ وقت تھا۔ اتنا وقت ضرور تھا کہ وہ اپنا حال دل نیلم کو سنا سکے۔

بیڈ پر بیٹھ کر، اکبر نے نیلم کا پری چہرہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھایا پھر اس کا گھونگھٹ پلٹ دیا اچانک کمرے میں روشنی ہو گئی، نیلم کا چہرہ چاند کی طرح جگمگا اٹھا۔

اکبر اس کے ملکوتی حسن میں کھو سا گیا اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "ماشاء اللہ۔"

نیلم نے شرما کر اپنے چاند چہرے کو بازو کے حصار میں چھپالیا۔ نیلم کے بدن میں ہلکی ہلکی لرزش

تھی۔

"نیلم تم اس قدر حسین کیوں ہو؟" اکبر نے بڑے والہانہ انداز میں کہا۔ "یہ حسن تم نے کہاں سے پایا۔ تم اس دنیا کی لگتی ہی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوہ قاف سے آئی ہو۔ میرے لئے امرتی ہو، میری نیلم پری۔" یہ کہہ کر اکبر نے اس کا ریشمیں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"میں اتنی خوبصورت کہاں؟" نیلم نے اپنے یاقوتی لب کھولے اس کی آواز میں بڑا سحر تھا۔ "آپ کو شاید کسی نے بہکا دیا ہے۔"

"مجھے کسی نے نہیں بہکایا، مجھے تمہارے حسن نے بہکا دیا ہے میں نے تمہارے کتنے خواب دیکھے، تمہیں پانے کی کیسی کیسی آرزوئیں کی ہیں، تم کیا جانو۔ میں تمہیں پانے کی خوشی میں ہزاروں میل کا سفر کر کے آیا ہوں اس پتھر دل کو جو کسی طرح آگے کھسکتا ہی نہ تھا کس طرح گزارہ ہے تم کیا جانو۔" اکبر کے لہجے کی سچائی اس کے دل پر اثر کر رہی تھی۔

نیلم نے اپنی بھاری پلکوں کی جھالر کو دھیرے سے اٹھایا اور اپنی ہیرے کی طرح جگمگاتی آنکھوں سے اکبر کو دیکھا۔ "بہت پسند کرتے ہیں مجھے۔"

"پسند نہیں، عشق کہو عشق۔ میں مرتا ہوں تم پر۔ تمہارے لئے جان دے سکتا ہوں۔" اس کی وارفتگی برقرار تھی۔

"ابھی تو ابتداء ہے۔" نیلم نے مسکرا کر کہا۔ "ابھی تو مرنے جینے کی باتیں نہ کریں۔"

"یہ ابتداء ہے تو میں انتہا کر دوں گا، تمہیں اتنا چاہوں گا کہ لوگ نظریں دیں گے۔"

پھر اکبر کو خیال آیا کہ اس نے ابھی تک نیلم کو منہ دکھائی تو دی نہیں۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے وہ جگمگاتی انگوٹھی نکالی اور بولا۔ "نیلم تمہارے حسن کا خراج پیار کا پہلا تحفہ۔ اسے قبول کر لو اپنا سیدھا ہاتھ لاؤ۔ اسے میں تمہاری انگلی میں پہنا دوں۔"

نیلم نے جگمگاتی انگوٹھی پر نظر ڈالتے ہوئے اپنا سیدھا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ "لیجئے۔"

ابھی اکبر نے وہ جگمگاتی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنائی ہی تھی کہ وہ اکبر کے ہاتھ پر گری۔

وہ ایک موٹی سی، کالی سی خوفناک چھپکلی تھی۔ اکبر نے فوراً اپنا ہاتھ جھٹک دیا۔ نیلم چیخ مار کر کھڑی ہو گئی اور پھر بیڈ سے زمین پر کود گئی۔ ان کی انگلی سے انگوٹھی نکل کر دور جا گری۔

اکبر بھی فوراً اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ چھپکلی بیڈ پر پڑی ہے۔ نیلم خوف سے لرزتی ہوئی اکبر کے پیچھے آ گئی۔ اس نے اکبر کے دونوں بازو تھام لئے تھے۔

"اکبر اسے مارو۔" وہ گھبرا کر چیخی۔

"کس چیز سے ماروں۔" اکبر نے پریشان ہو کر ادھر اُدھر دیکھا۔

"میرا سینڈل لے لو۔" نیلم نے کہا۔

"اسے بیڈ پر مارا تو چادر خراب ہو جائے گی۔" اکبر نے سینڈل اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہو جانے دو، اسے فوراً مار دو، دیکھو یہ کہیں بھاگ نہ جائے۔" نیلم نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

ابھی اکبر نے چھپکلی مارنے کو سینڈل اوپر اٹھایا ہی تھا اور اسے پھینک کر مارنے والا ہی تھا کہ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

Urdufans.com

"اکبر یہ کیا؟" نیلم نے اس کے بازو سے جھولتے ہوئے کہا۔ وہ چھپکلی کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اکبر نے دیکھا کہ وہ چھپکلی بغیر مارے ہی زخمی ہو گئی تھی اس کے ارد گرد سیاہی مائل سیال پھیل رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھپکلی گھل گئی اور چادر پر ایک بڑا سا دھبہ رہ گیا۔

نیلم سے یہ سب نہ دیکھا گیا وہ خوفزدہ ہو کر اپنے ہوش کنوا بیٹھی اور بیہوش ہو کر قالین پر گر گئی۔ اکبر کیلئے یہ لمحے بڑے مذاب ناک تھے۔ ایک طرف اس نے چھپکلی کو برف کی طرح پگھلتے دیکھا تھا اس منظر کی خوفناکی ابھی اس کے جسم سے نہ نکلی تھی کہ نیلم بیہوش ہو گئی۔

وہ چکرا کر رہ گیا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار اندھیرا چھا رہا تھا۔

اکبر قالین پر بیٹھ گیا، اس نے نیلم کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے ہلایا جلایا۔

"نیلم، نیلم، آنکھیں کھولو۔" اس نے کئی مرتبہ کہا مگر نیلم نے آنکھیں نہ کھولیں اس پر گہری بیہوشی طاری تھی۔

اکبر کی عجیب حالت تھی، کبھی وہ سفید چادر پر پڑے سیاہی مائل دھبے کو دیکھتا کبھی نیلم کے چاند چہرے پر نظر ڈالتا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

جو خواب اس کی آنکھوں میں جاگے تھے وہ اب سسک رہے تھے، ایک ایک کر کے مرتے جا رہے تھے۔

اب سے کچھ دیر پہلے اس کمرے کا کس قدر رومانی ماحول تھا، اکبر اور نیلم کس قدر خوش تھے۔ وہ ان خواب بھرے لمحوں کے ابدی ہونے کی تمنا کر رہے تھے کہ خوشیوں کے کسی دشمن نے ایک لمحے میں ان سے سب کچھ چھین لیا۔

اب اس کمرے میں گھٹتی فضا کے بجائے خوف رہ گیا تھا لرزتے ہاتھ رہ گئے تھے اور شکستہ اعصاب رہ گئے تھے۔ ایک عذاب تھا جو اکبر کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ کوئی کٹڑی کا جالا تھا جس میں اکبر کے حواسوں کو جکڑا جا رہا تھا۔

وہ کون تھا ایسا کیوں کر رہا تھا یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔

اب اکبر کیلئے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اٹھے اور اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کر سو جائے اس کا مقدر سو گیا تھا وہ کس طرح جاگتا وہ اٹھا شکستہ قدموں سے چل کر اس نے دروازہ کھولا۔ یہ دروازہ تو اس نے کھولنا ہی تھا آخر وہ کب تک اس کمرے میں بند رہتا لیکن یہ دروازہ وہ اس وقت کھولتا جب اس کے دل کا دروازہ کھل جاتا، کلیاں چٹکتیں، گلوں کی خوشبو فضا میں مہکتی، سورج کی کرنیں ان مدہوش سوتے لوگوں کے چہرے گدگداتیں تب وہ مسکرا کر اٹھتا اور دروازہ کھول کر باہر نکل جاتا لیکن، آہ ایسا نہ ہو سکا۔

وہ من کی من میں لئے، اپنی حسرتوں پر آنسو بہاتا باہر نکلا۔ باہر نکل کر اس نے ایک بند دروازے کھٹکھٹایا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کمرے میں کون سو رہا ہے لیکن اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ کوئی سو ضرور رہا ہے فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔

دروازے پر واجدہ نمودار ہوئیں ان کے پیچھے صابرہ تھیں۔ اکبر کو دروازے پر دیکھا تو دونوں کا دل

Urdufans.com

دھک سے رہ گیا۔ انہوں نے قیاس کر لیا کہ پھر کچھ ہو گیا ہے۔

"کیا ہوا؟" دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"وہ نیلم بیہوش ہو گئی ہے۔" اکبر نے بڑی آزردگی سے کہا۔

"لیکن کیسے؟ کیا ہوا اسے۔" واجدہ نے پوچھا۔

"چھت سے ایک چھپکلی میرے ہاتھ پر گری تھی جانے وہ کیسی چھپکلی تھی۔ میرے ہاتھ سے اچھل کر بیڈ پر گری اور ابھی میں اسے مارنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ پانی بن کر بہہ گئی۔ وہ چند لمحوں میں گھل گئی۔ چادر پر ایک سیاہی مائل دھبہ رہ گیا۔ نیلم اس منظر کو دیکھ کر بیہوش ہو گئی۔" اکبر نے جلدی جلدی ساری روداد سنا دی۔

"ہائے میرے اللہ۔" واجدہ نے اپنا دل تھام لیا۔ "ارے فیاض کو اٹھاؤ۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے۔" صابرہ نے فکر مند ہو کر کہا۔ "جاؤ ذرا اپنے باپ کو بلاؤ۔"

پھر تھوڑی دیر میں یہاں سے وہاں تک سب اٹھ گئے۔ نیلم کے والد بھی اٹھ گئے۔ فرقان ماموں کو بھی بلا لیا گیا کچھ خواتین بھی اٹھ گئیں۔ بابر علی گہری نیند سو رہے تھے انہیں نہ اٹھایا گیا۔ نیلم کے منہ پر ہلکے ہلکے پانی کے چھینٹے دیئے گئے۔ اسے ہلایا جلایا گیا تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھلیں تو اس نے خود کو اپنی ماں کی گود میں پایا پھر ادھر ادھر نظریں گھمائیں تو کمرے میں بہت سے لوگوں کو پایا۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"لیٹی رہو بیٹی۔" واجدہ نے پھر اسے اپنی گود میں لٹانا چاہا۔

"نہیں امی میں ٹھیک ہوں۔"

نیلم تو ہوش میں آ گئی ٹھیک ہو گئی پھر وہ چھپکلی موضوع بحث بن گئی۔ چھپکلی کا معمہ حل نہ ہو سکا وہ کس قسم کی چھپکلی تھی۔ وہ کہاں سے آئی تھی، کس طرح اس کے ہاتھ پر گری پھر چند لمحوں میں کیونکر سیال مادے میں تبدیل ہو گئی۔ سب سوچتے رہے۔ اپنی اپنی کہتے رہے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ اس گفتگو کے دوران وہ باتیں بھی نیلم کے سامنے آ گئیں جو اب تک اس سے چھپی ہوئی تھیں، جو اس لئے اسے اب تک نہیں بتائی گئی تھیں کہ وہ ڈر جائے گی، دہشت زدہ ہو جائے گی۔

ٹرین سے اب تک کے واقعات جب نیلم کے سامنے آئے تو وہ واقعی خوفزدہ ہو گئی وہ اپنی ماں کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ "امی مجھے اکیلا نہ چھوڑیں میرے ساتھ رہیں۔"

اذان کب کی ہو چکی تھی ہر سُو روشنی پھیلنے والی تھی اب اسے چھوڑنے کا کیا جواز تھا بھلا۔ واجدہ کے کچھ کہنے سے پہلے صابرہ نے کہا۔ "نہیں بیٹی تم پریشان نہ ہو میں رہوں گی تمہارے پاس۔"

"یہ اکبر کہاں ہیں؟" واجدہ کو اپنے داماد کی فکر ہوئی۔

"وہ ماموں فرقان کے بستر میں گھسے ہوئے ہیں۔" راشدہ نے بتایا۔

"ارے ادھر فیاض کے کمرے میں لیٹ جاتے۔" واجدہ نے کہا۔ "جاؤ بلا لاؤ۔"

راشدہ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ تنہا اس مکان سے اس مکان میں چلی جاتی۔ وہ بولی۔ "خالہ میں اکیلی جاؤں ویسے وہ اب تک سو چکے ہوں گے وہ نیند کے بہت کچے ہیں۔"

تب واجدہ نے فیاض حسین کو ادھر بھیجا وہ دوسرے مکان میں پہنچے تو اکبر واقعی ماموں فرقان کے بستر

Urdufans.com

میں گھسا سو رہا تھا۔ ماموں فرقان نماز پڑھنے کے بعد وظیفہ پڑھ رہے تھے۔

فیاض نے بے خبر سوتے ہوئے اپنے واماد کو اٹھانا مناسب خیال نہ کیا وہ خاموشی سے واپس آ گئے۔

اب نیلم کو بھی سخت قسم کی نیند آ رہی تھی وہ جہاں بیٹھی تھی وہیں لیٹ گئی اور چند منٹوں میں ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ صابرہ اور واجدہ کو بھی پریشان ہوتے ہوئے پوری رات ہو گئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں بھی نیند بھری ہوئی تھی۔ وہ دونوں بھی اسی کمرے میں نیلم کے ساتھ ہی لیٹ گئیں۔

نیلم قالین پر لیٹی تھی اس نے سردی سے بچنے کیلئے کمبل اوڑھ لیا تھا جبکہ صابرہ بیڈ پر لیٹ گئی تھیں اور واجدہ، نیلم کے برابر ہی سو گئی تھیں۔

دروازہ بند نہ تھا تب وہ کھلے دروازے سے دبے پاؤں اندر آیا اور نیلم کے کمبل میں گھس گیا۔ نیلم بہت گہری نیند سو چکی تھی اسے معلوم نہ تھا کہ وہ خوفناک کالا بلا اس کے خوبصورت ہمدی لگے پیروں سے لپٹ کر سونے کی کوشش میں ہے۔

فرقان ماموں نماز اور وظیفے سے فارغ ہو کر سیر کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے اپنے کانوں سے مفلر اچھی طرح لپیٹا، کوٹ پہنا پھر بھی سردی محسوس ہوئی تو ایک ہلکا سا کمبل اوڑھ لیا اور مکان سے باہر نکل گئے۔

باہر کہر چھائی ہوئی تھی اسٹریٹ لائٹ ابھی تک جل رہی تھیں۔ وہ اپنے منہ سے بھاپ اڑاتے تیز تیز سڑک پر چلنے لگے سڑک تقریباً سنسان تھی اکا دکا گاڑی کبھی گزر جاتی۔

ابھی وہ زیادہ دور نہ گئے ہوں گے کہ انہوں نے محسوس کیا کہ جیسے ان کے پیچھے کوئی آ رہا ہے بھاری قدموں کی آواز آ رہی تھی اور یہ بھاری قدم فرقان ماموں سے نزدیک تر ہوتے جا رہے تھے۔

فرقان ماموں کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی فل بوٹ پہنے ان کے پیچھے چلا آ رہا ہو۔ صبح کے سناٹے میں قدموں کی آواز دور تک گونج رہی تھی۔

فرقان ماموں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا..... گہری دھند میں انہیں بس ایک ہیولا سا نظر آیا تھا شاید وہ کسی گہرے رنگ کے کمبل میں لپٹا ہوا تھا اب وہ ان کے بالکل نزدیک آ گیا تھا دو چار قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا پھر یہ فاصلہ بھی مٹ گیا اور وہ ان کے برابر آ گیا۔

فرقان ماموں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی..... لیکن وہ نظر نہ آ سکا کیونکہ اس نے کمبل اس طرح اوڑھا ہوا تھا کہ چہرے پر چھوٹا سا گھونگھٹ بن گیا تھا۔ اب وہ ان کے برابر چل رہا تھا۔ فرقان ماموں نے اپنی رفتار ذرا دھیمی کر لی تاکہ وہ آگے نکل جائے لیکن وہ آگے نہ نکلا اس نے بھی اپنی رفتار کم کر لی..... وہ دس پندرہ قدم خاموشی سے ان کے ساتھ چلا دو تین بار اس نے مڑ کر فرقان ماموں کو دیکھا جیسے وہ ان کی صورت پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو..... پھر اچانک بولا۔

"آپ فیاض حسین کے گھر سے نکلے ہیں۔"

"میں فیاض کے گھر سے نہیں بلکہ ان کے برابر والے مکان سے نکلا ہوں۔" فرقان ماموں نے جواب دیا۔

"ایک ہی بات ہے۔" اس شخص نے لاپروائی سے کہا۔ "بارات میں آئے ہوئے ہیں؟"

"جی، ہاں۔" فرقان ماموں بولے۔

"آپ لڑکے کے کون ہیں؟" سوال پوچھا گیا۔

"میں لڑکے کا رشتے میں دادا لگتا ہوں لیکن وہ مجھے کہتا ماموں ہے..... اور وہ کیا مجھے تو سب ہی ماموں کہتے ہیں..... آپ بھی چاہیں تو ماموں کہہ لیں..... ویسے میں اکبر کے باپ بابر کا سگا ماموں ہوں۔" ماموں فرقان نے ہنستے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ "میں نے تو اپنا تعارف کروا دیا، اب آپ فرمائیں آپ کون ہیں؟"

"میں فیاض کا پڑوسی ہوں میرا نام دلدار بٹ ہے جس مکان میں بارات ٹھہری ہے میں اس مکان کے سامنے رہتا ہوں۔ آپ کو گھر سے نکلتے دیکھ کر میں بھی آپ کے پیچھے ہولیا..... آپ کو شاید میری طرح صبح سیر کرنے کی عادت ہے۔"

"جی ہاں، نماز پڑھ کر میں ایک دو میل پیدل چلنے کا عادی ہوں۔" فرقان ماموں نے سادگی سے کہا۔ "آپ کراچی سے آئے ہیں۔" دلدار نے پھر سوال کیا۔

"جی ہاں۔" فرقان ماموں نے جواب دیا۔ اس نے اپنا کیبل اب تھوڑا سا سر کے پیچھے کر لیا تھا وہ گول چہرے کا ایک صحت مند شخص تھا۔ چہرے پر بھاری مونچھیں تھیں۔ ان مونچھوں نے اس کے چہرے کو بارعب بنا دیا تھا۔ وہ ماموں فرقان سے ایسے ہی ادھر اُدھر کے سوالات کئے جا رہا تھا۔ ماموں فرقان سمجھ رہے تھے کہ وہ ان سے ضرور کوئی خاص بات کرنا چاہتا ہے لیکن شاید اسے اپنی بات کہنے کیلئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں یا پھر وہ اس تذبذب میں مبتلا ہے کہ وہ اپنی بات کہے یا نہ کہے۔

کچھ دیر وہ اسی طرح کے بے ضرر سے سوالات کرتا رہا پھر بات کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گیا چند لمحے خاموش رہا پھر اچانک بولا۔ "مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔"

"جی فرمائیں۔" ماموں فرقان نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ اس لڑکی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟" دلدار بٹ نے براہ راست سوال کیا۔

"کس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟" فرقان ماموں فوراً محتاط ہو گئے۔

"میں نیلم کی بات کر رہا ہوں جناب۔" دلدار نے سیدھے اور صاف لہجے میں کہا۔

"دیکھئے دلدار صاحب! اگر آپ اس لڑکی کے کردار کے بارے میں مجھے کچھ بتانا چاہتے ہیں تو براہِ کرم اب کچھ نہ بتائیے..... اس لڑکی کی شادی ہو چکی ہے..... وہ اب جیسی بھی ہے ہماری بہو ہے، ہماری عزت ہے۔" فرقان ماموں نے اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کی۔

فرقان ماموں نے دنیا دیکھ رکھی تھی وہ جانتے تھے کہ ایسے موقعوں پر پاس پڑوس کے لوگ کیا گل کھلایا کرتے ہیں گھر کا بھیدی ہمیشہ لنکا ڈھانے کی کوشش کرتا ہے اور بعض اوقات پڑوسی بھی اسی قسم کا کردار ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"جناب آپ مطمئن رہیں میں آپ کی بہو پر کسی قسم کی کیچڑ اچھالنا نہیں چاہتا آپ مجھے غلط سمجھے ہیں میں تو صرف آپ کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔" دلدار نے بات صاف کرنے کی کوشش کی۔

"اچھا کہئے کیا کہنا چاہتے ہیں۔" بالآخر ماموں فرقان سننے کیلئے تیار ہو گئے۔

"آپ کو یہ تو معلوم ہو گا کہ نیلم فیاض حسین کی اکلوتی اولاد ہے۔" دلدار نے کہنا شروع کیا۔

Urdufans.com

"جی ہاں معلوم ہے۔" فرقان ماموں نے فوراً جواب دیا ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔

"لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ....."

دلدار بٹ نے فرقان ماموں کی معلومات میں اضافہ کرنے کیلئے جو بات کہی وہ واقعی ان کی معلومات میں اضافہ ثابت ہوئی۔ فرقان ماموں وہ بات سن کر حیران رہ گئے وہ بار بار یہی کہتے رہے کہ "نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔"

خیردہ شخص جس کا نام دلدار بٹ تھا۔ ان کی معلومات میں اضافہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ فرقان ماموں کافی آگے نکل آئے تھے اب کچھ دھند چھٹ گئی تھی اور زرد زرد سی مریل دھوپ نکل آئی تھی۔ فرقان ماموں نے واپسی کیلئے قدم اٹھالئے۔

جب وہ واپس گھر میں داخل ہوئے تو کچھ لوگ جاگ گئے تھے اور کچھ لوگ ابھی پڑے سوتے تھے۔ اکبر بھی بے خبر سو رہا تھا۔ فرقان ماموں ایک خالی بستر دیکھ کر اس میں گھس گئے۔

باہر اچھی خاصی ٹھنڈ تھی ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے..... جسم میں ہلکی سی کپکپی تھی۔ انہوں نے اچھی طرح اپنے گرد لحاف لپیٹ لیا اور اس شخص کی باتوں پر غور کرنے لگے۔

اگر یہ سب سچ تھا تو بڑی حیرت کی بات تھی۔ سب سے زیادہ حیرت انہیں اس بات پر تھی کہ یہ بات واجدہ نے صابرہ سے کیوں چھپائی تھی۔ ایک طرح سے یہ بات اہم بھی تھی اور غیر اہم بھی..... بات صرف سچ چھپانے کی تھی اور جہاں اتنا قریبی رشتہ ہو، وہاں کچھ چھپانا ایک طرح سے جرم کے مترادف تھا۔

فرقان ماموں نے سوچا کہ ابھی وہ کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ یہ بات وہ کراچی پہنچ کر کریں گے اگر انہوں نے فوراً اس راز کو کھول دیا تو ہوسکتا ہے کہ بدمزگی ہو جائے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ شادی کا ہنسی خوشی کا گھر کسی اذیت سے دوچار ہو جائے۔

اب تک جو کچھ ہو چکا تھا وہ کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کتنی الجھنوں کا شکار ہونا پڑا تھا۔ اکبر کیلئے یہ کتنی بدنصیبی کی بات تھی کہ اس کا نصیبہ کھلنے کے باوجود اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا تھا بالآخر وہ بیچارہ تھک ہار کر سو گیا تھا۔

آج سہ پہر کو بارات کی واپسی تھی۔ فرقان ماموں دل ہی دل میں دعا کر رہے تھے کہ یہ سفر بخیر و عافیت تمام ہو جائے۔

اب خاصے باراتی جاگ گئے تھے بابر علی بھی اٹھ چکے تھے۔ انہوں نے بستر سے نکل کر سب سے پہلے فرقان ماموں کے بستر کی طرف دیکھا وہ ابھی تک سو رہے تھے انہیں حیرت ہوئی ماموں فرقان جو صبح اٹھنے کے عادی تھے وہ خود اٹھ کر دوسروں کو اٹھانے کے عادی تھے اب تک کیسے سوئے پڑے تھے یہ اچھا موقع تھا ماموں فرقان پر سبقت لے جانے کا..... انہوں نے آگے بڑھ کر ان کے منہ سے لحاف ہٹایا..... لحاف ہٹایا تو انہیں بڑی حیرت ہوئی ماموں فرقان کے بستر میں ان کا اپنا بیٹا اکبر سو رہا تھا۔

ارے۔ یہ کیسے یہاں سو رہا ہے اسے تو "وہاں" ہونا چاہئے تھے۔ انہوں نے سوچا یہ یہاں سو رہا ہے۔ ماموں فرقان کہاں گئے۔

Urdufans.com

"بھئی، یہ ماموں فرقان کہاں گئے؟" بابر علی نے کسی سے پوچھا۔

"میں یہاں ہوں۔" ماموں فرقان نے بابر علی کی آواز سن کر فوراً اپنے منہ سے لحاف ہٹایا۔

"ارے، آپ وہاں کہاں لیٹے ہیں؟" بابر علی نے ان کے بستر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"بھئی کیا کروں. تمہارے بیٹے نے میرے بستر پر قبضہ کر رکھا ہے۔" ماموں فرقان ہنستے ہوئے بولے۔

"یہ یہاں کیوں ہے۔" بابر علی نے پوچھا۔

"تو پھر یہ کیا کرے بیچارہ. کہاں جائے۔" ماموں فرقان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں۔" بابر علی حیرت سے بولے۔

"تم سمجھو گے بھی نہیں..... رات بھر خراٹے جو بھرتے رہے ہو۔" ماموں فرقان نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ادھر آجاؤ میرے پاس تمہیں رات کی ساری کہانی سناتا ہوں۔"

رات کو اس قدر ہنگامہ ہوا تھا کہ سب ہی جاگ گئے تھے ایک نہیں جاگے تھے تو بابر علی..... یہ بڑی گہری نیند سونے کے عادی تھے. سونے کے بعد ان کے سر پر دھماکے بھی ہوتے رہیں تو وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ان کی عجیب عادت تھی سونے کے بعد اگر انہیں کچی نیند میں جگا دیا جائے تو ان کے سر میں فوراً شدید قسم کا درد ہو جاتا تھا۔ رات کو جب نیلم بیہوش ہوئی تھی تو صابرہ نے چاہا تھا کہ بابر علی کو اٹھا لیا جائے لیکن ماموں فرقان کیونکہ بابر کی عادت سے واقف تھے اس لئے انہوں نے اسے اٹھانے سے منع کر دیا تھا۔

جب رات بھر کی روداد ماموں فرقان سے بابر علی نے سنی تو وہ فکر مند ہو گئے لیکن حالات اور واقعات ایسے تھے کہ اس میں کوئی کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

اور جو کر سکتا تھا وہ ابھی تک نیلم کے قدموں میں پڑا تھا۔ نیلم گہری نیند سو رہی تھی وہ پوری رات کی جاگی ہوئی. پھر پے در پے واقعات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے نیند کی گولی دیدی گئی تاکہ اس کے ذہن کو کچھ سکون مل جائے ابھی اسے ایک لمبا سفر بھی کرنا تھا۔

نیلم گہری نیند سو رہی تھی اور وہ اس کے قدموں سے لپٹا ہوا تھا۔ نیلم کو کچھ ہوش نہ تھا اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ ایک خوفناک بلا اس کے پیروں میں لپٹا ہے تو شاید اس کی جان ہی نکل جاتی۔

اس سے پہلے کہ اس کمرے میں لوگ جاگتے وہ کالا بلا نیلم کے پیروں سے اپنا جسم رگڑتا ہوا لحاف سے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر اس نے ایک زوردار انگڑائی لی اور اطمینان سے چلتا ہوا دروازے تک آیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

نیلم کو دس گیارہ بجے تک سوتی رہی کسی نے اسے اٹھانے کی کوشش بھی نہ کی خود ہی اس کی آنکھ کھلی پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا خواب آور گولی کا نشہ اتر چکا تھا لیکن اس کے اثرات باقی تھے۔ تھوڑی دیر وہ یونہی خاموشی سے لیٹی رہی کبھی وہ آنکھیں کھول لیتی کبھی بند کر لیتی پھر اس کے ذہن میں ایک ایک بات تازہ ہو گئی وہ اپنے حواسوں میں آگئی تب اسے احساس ہوا کہ اس پر کیسی بھیانک رات گزری ہے۔

اسے شادی کا بڑا چاؤ تھا اور جتنا شوق تھا اتنا ہی اس کے ساتھ بڑا ظلم ہوا تھا۔ وہ سنہری رات جس

Urdufanz.com

لئے لڑکیاں دن گنتی ہیں کیسی لمحہ لمحہ عذاب بن کر اس پر ٹوٹی تھی۔ رات گزر گئی تھی لیکن اس کے اثرات ختم نہ ہوئے تھے جیسے اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے تھے۔

ابھی وہ جانے کتنی دیر یوں ہی آنکھیں موندیں پڑی رہتی کہ اس کی امی اندر آئیں۔ انہوں نے یہ دیکھنے کیلئے کہ نیلم ابھی سو رہی یا جاگ رہی ہے، اسے آواز دی۔ "اری نیلم۔"

"جی امی۔" نیلم نے آنکھیں کھول دیں۔

"اب اٹھ جاؤ بیٹی ناشتہ وغیرہ کر لو۔" واجدہ نے پیار سے کہا۔

"جی امی، اٹھ رہی ہوں۔" نیلم نے آہستگی سے کہا۔

"بیٹا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" واجدہ نے فکرمندی سے پوچھا۔

"جی امی طبیعت تو ٹھیک ہے بس ذرا سر بھاری ہو رہا ہے۔"

"وہ گولی کی وجہ سے ہو گا، چائے وائے پیو گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہاں امی یہ خواب آور گولیوں کی مجھے بالکل برداشت نہیں ہے وہ تو میں نے ابو کی وجہ سے گولی کھالی تھی ورنہ کبھی نہ کھاتی۔"

"بیٹی آج تو تم سے جدا ہو جائے گی، تجھے کچھ معلوم ہے۔" واجدہ کے چہرے پر اداسی پھیل گئی۔

"ہاں امی جانتی ہوں۔" نیلم نے افسردگی سے کہا۔ "آپ نے مجھے بیاہ بھی اتنی دور دیا کہ کوئی جلدی آنا بھی چاہے تو نہ آسکے، کیا امی میں آپ کو اتنی بری لگتی تھی۔"

"اکبر بہت اچھا لڑکا ہے وہ تیرا بہت خیال رکھے گا۔" واجدہ نے اسے تسلی دی۔

"ہاں امی میں یہ بھی جانتی ہوں۔" نیلم نے تھوڑا سا مسکراتے ہوئے کہا..... پھر وہ یکلخت اداس ہو گئی۔ "امی، آپ اور ابو مجھے بہت یاد آئیں گے۔"

"ہمارا گھر تو سُونا ہو جائے گا..... اس گھر میں تیرے سوا اور تھا کون..... اب اس گھر میں وہ ہوں گے اور میں ہوں گی..... اور وہ بھی کہاں ہوں گے وہ تو دن بھر کاروبار میں مصروف ہوں گے..... میں اکیلی ہی گھر پر اِدھر اُدھر گھومتی پھروں گی۔"

"امی کوئی مصروفیت نکال لینا ورنہ بور ہو جاؤ گی۔" نیلم نے مشورہ دیا۔

"ہاں، کروں گی کچھ ورنہ یہ اکیلا گھر تو مجھے کاٹنے کو دوڑے گا۔" واجدہ نے نیلم کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم اپنا خیال رکھنا..... مجھ سے فون پر دوسرے تیسرے روز بات کر لیا کرنا..... میں بھی تمہیں فون کر لیا کروں گی..... ہم نے بہت سوچ سمجھ کر تمہیں اتنی دور بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے..... مجھے پوری امید ہے کہ تم وہاں پر خوش رہو گی وہ گھر تمہارے لئے اجنبی نہیں ہے وہاں تم کئی مرتبہ رہ آئی ہو..... اکبر تمہارا دیکھا بھالا لڑکا ہے وہ تم سے شادی کرنے کا شدید خواہشمند تھا..... وہ تمہیں ہر قیمت پر خوش رکھے گا..... لیکن اتنا یاد رکھنا کہ اسے تمہارے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے اس سلسلے میں ہر ممکن طور پر اپنی زبان بند رکھنا..... ورنہ پیچیدگیاں بڑھ جائیں گی..... تم سمجھ رہی ہو نا میری بات۔"

"جی امی سمجھ رہی ہوں۔" نیلم نے سنجیدگی سے کہا۔

"ابھی تک کوئی ان حالات سے واقف نہیں ہے اور تمہیں کراچی بیاہنے میں یہ حکمت عملی بھی کارفرما تھی کہ کوئی ان حالات سے واقف نہ ہوسکے..... ہم دونوں کی جان تمہارے اندر ہے..... تمہارے ابو تمہیں ٹوٹ کر چاہتے ہیں..... میری محبت سے تو تم واقف ہی ہو..... اگر وہ سب نہ ہوا ہوتا تو ہم کبھی تمہیں کراچی نہ بھیجتے..... اس شہر میں لڑکوں کی کیا کمی ہے لیکن ہم نے جان بوجھ کر تمہیں اپنے سے دور کیا ہے تاکہ تم سدا سکھی رہ سکو..... تمہاری خوشی ہمارے لئے اولین ہے ہم تمہیں ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔" واجدہ کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

"میں اندر آجاؤں۔" ابھی یہ دونوں بات کر ہی رہے تھے کہ دروازے سے صابرہ نے جھانکا۔

"ہاں خالہ آجائیں۔" نیلم نے بڑے احترام اور بڑی محبت سے کہا۔

"بھئی کوئی پرائیویٹ بات تو نہیں ہورہی تھی۔" صابرہ نے چھیڑا۔

"جی ہاں بڑی خاص پرائیویٹ قسم کی بات ہورہی تھی۔"

نیلم نے ہنس کر کہا۔

"تو پھر میں واپس لوٹ جاؤں۔" صابرہ نے نیلم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے خالہ کمال کرتی ہیں آپ بھی۔" نیلم سنجیدہ ہوگئی۔

"نیلم تو مذاق کررہی تھی۔" واجدہ نے ہنس کر کہا۔ "کیا ہمارے درمیان کوئی ایسی بات بھی ہوسکتی ہے جو تم سے چھپائی جائے..... راز رکھی جائے۔"

"ہاں ہوسکتی ہے ماں بیٹیوں میں ہزار باتیں ایسی ہوسکتی ہیں جو چھپائی جائیں۔"

"یہاں چھپانے کو کچھ نہیں ہے ایک نیلم تھی جسے اب تک اپنے کلیجے میں چھپائے رکھا تھا تم سے یہ بھی نہ دیکھا گیا آخر ہم سے چھین کر لے چلی نا اپنے ساتھ۔" واجدہ نے بات کا رخ بڑی خوبصورتی سے موڑ دیا۔

"تم نے اپنے کلیجے میں چھپائے رکھا نا، ہم اسے کراچی لے جاکر اپنے دل میں چھپا کر رکھیں گے..... تم کیا سمجھتی ہو ایک تمہی محبت کرنے والی پیدا ہوئی ہو..... اس دنیا میں۔" صابرہ نے ہنس کر کہا۔

"سن لیا نیلم تُو نے یہی بات میں تجھ سے کہہ رہی تھی کہ میری بہن تجھے اپنے دل میں چھپا کر رکھے گی۔"

"یہ پریشان ہورہی تھی کیا؟" صابرہ نے پوچھا۔

"نہیں پریشان نہیں ہورہی تھی بلکہ یہ کہہ رہی تھی کہ اتنی دور مجھے کیوں بیاہ دیا..... آپ سے ملنے میں بھی دشواری ہوگی۔" واجدہ نے بتایا۔

"واہ نیلم تم نے خوب فکر کی۔" صابرہ نے نیلم کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "جب تمہارا جی چاہے لاہور آجانا..... لاہور امریکہ میں تو نہیں ہے..... لاہور پاکستان میں ہی ہے جہاز گھنٹے سوا گھنٹے میں تمہیں یہاں پہنچا دے گا۔"

Urdufans.com

کچھ دیر اور اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں پھر نیلم منہ ہاتھ دھونے کیلئے اٹھ گئی۔ ناشتہ تیار تھا جو لوگ باقی رہ گئے تھے ان کے ساتھ نیلم نے ناشتہ کیا باقی رہنے والوں میں اکبر بھی تھا۔

اکبر کی موجودگی میں نیلم کو ناشتہ کرتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر تو جا نہیں سکتی تھی خاموشی سے سر جھکائے ناشتہ کرتی رہی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد بارات نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا..... پھر وہ گھڑی بھی آپہنچی جو والدین کیلئے متضاد جذبات لے کر آتی ہے۔ بیٹی جب گھر سے رخصت ہوتی ہے تو ایک طرف والدین کو اپنے فرض سے سبکدوشی کی خوشی ہوتی ہے دوسری طرف انہیں اپنے لختِ جگر سے دور ہونے کا غم کسی عذاب سے کم نہیں محسوس ہوتا۔ لڑکیاں پرائی ہوتی ہیں انہیں ایک دن گھر سے جانا ہی ہوتا ہے بابل کے آنگن کی چڑیوں کو ایک دن اڑنا ہی ہوتا ہے۔

نیلم اپنے ابو امی کے گلے لگ کر خوب روئی۔ اس طرح کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں بری حالت ہوگئی۔ ماں باپ سے دور ہونے کا غم بھی ایک دم ہی بارش کی طرح برسا تھا۔ وہ بہت دور جا رہی تھی یہ احساس شدت سے اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر گیا تھا۔

رو دھو کر وہ گاڑی میں بیٹھی اس کے پاس، اب جس نے زندگی بھر اس کے آنسو پونچھنے تھے ایک رشتہ ٹوٹا تھا تو دوسرا جڑ گیا تھا۔ ایک گھر چھوٹا تھا دوسرا مل گیا تھا یہ وہ گھر تھا جہاں اس نے اب ہمیشہ رہنا تھا۔

گارڈ نے جھنڈی دکھائی گاڑی نے رینگنا شروع کیا۔

اچانک ہی وہ کالا بلا کہیں سے نمودار ہوا اور چلتی ٹرین میں چھلانگ لگا کر ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔

فرقان ماموں کھڑکی کے نزدیک بیٹھے تھے گاڑی چلی تو انہوں نے کھڑکی سے باہر منہ نکال لیا اور ایسے ہی باہر کی طرف دیکھنے لگے۔ تب ان کی نظر اس کالے بلے پر پڑی انہوں نے اسے برابر والے ڈبے میں چڑھتا دیکھ لیا۔

گاڑی نے اب رفتار پکڑ لی تھی۔ ماموں فرقان نے اپنا سر کھڑکی سے اندر کیا اور فکرمندی سے بابر علی کو دیکھنے لگے۔ بابر علی ان کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔

"کیا ہوا ماموں؟" بابر علی نے ان کی پیشانی پر فکر کی لکیریں دیکھ لی تھیں۔ انہوں نے پوچھا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" ماموں نے برتھ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ادھر چل کر بات کرتے ہیں۔"

بابر علی فوراً ہی ان کے ساتھ ہولئے۔ ماموں فرقان نے سب سے پہلے بوگی کا دروازہ اندر سے بند کیا۔ یہ پوری بوگی ریزرو تھی۔ اس میں باراتیوں کے سوا کوئی باہر کا آدمی نہ تھا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے فرقان ماموں نے کہا۔ "میں نے اسے گاڑی میں چڑھتے دیکھا ہے؟"

"کس کو ماموں؟" بابر علی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کالے بلے کو۔" ماموں فرقان نے آہستہ سے کہا۔

"یہ وہی بلا ہے جو ہمارے ساتھ لاہور گیا تھا اب یہ پھر ہمارے پیچھے لگ گیا ہے بوگی کی ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کر دو تاکہ وہ بلا اس بوگی میں نہ آسکے اور یہ بات کسی کو بتانی بھی نہیں ہے میں اسی لئے

Urdufans.com

تمہیں اپنے ساتھ اٹھا کر لایا ہوں۔"

کھڑکیاں، دروازے تو خیر بند کر دیئے گئے لیکن بوگی کے درمیان کے دروازے جو ایک بوگی کو دوسری بوگی سے ملاتے ہیں اور جن سے بیرے اور ٹکٹ چیکر وغیرہ گزرتے رہتے ہیں، انہیں بند کرنا آسان نہ تھا۔ ان دروازوں پر نظر رکھنے کیلئے ضروری تھا وہاں کوئی آدمی مستقل بیٹھے اور یہ نگرانی کا کام لڑکے ہی اچھی طرح کر سکتے تھے لہٰذا اب ضروری ہو گیا کہ خاندان کے دو تین لڑکوں کو اعتماد میں لے کر انہیں کالے بلے کی نگرانی پر مامور کر دیا جائے۔

فرقان ماموں نے دو تین لڑکوں کو منتخب کر کے انہیں صورت حال سے آگاہ کر دیا انہیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ یہ کام بڑی رازداری سے کرنا ہے۔ باراتیوں کو بالخصوص خواتین کو یہ بات ہرگز نہیں بتانا ہے کہ وہ خبیث بلا پھر ہمارا شریک سفر ہے خواہ مخواہ بوگی میں خوف و ہراس پھیل جائے گا اتنا لمبا سفر ہے ابھی سے عذاب بن جائے گا۔

فرقان ماموں کی خفیہ فورس نے کام کرنا شروع کر دیا۔ ماموں فرقان اور بابر علی بھی بوگی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگا لیتے تھے نگرانی ٹھیک طرح جاری تھی۔

شام ڈھلنے لگی پھر رات آئی یہ ایک اچھی خاصی سرد رات تھی گاڑی میں غیر معمولی سردی تھی۔ کھڑکیاں دروازے بند ہونے کے باوجود یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بوگی میں برف بھری ہو۔

خدا خدا کر کے یہ رات گزری فرقان ماموں ایک لمحے کو بھی نہیں سوئے عشاء کی نماز پڑھ کر وہ بوگی کے درمیان میں کمبل اوڑھے بیٹھے رہے ان کی نظریں بوگی کے راستے پر دائیں بائیں گھومتی رہیں اور ان کے ہونٹ ہلتے رہے وہ مستقل کچھ نہ کچھ پڑھتے رہے۔

دن نکلا تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ رات خیریت سے گزر گئی تھی وہ کالا بلا اس بوگی میں داخل نہ ہو سکا تھا۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب گاڑی کراچی کے اسٹیشن میں داخل ہوئی سفر تمام ہوا سارے باراتی ایک ایک کر کے ٹرین سے اتر آئے ان اترنے والوں میں ماموں فرقان بھی تھے۔

پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر انہوں نے دور تک جہاں تک وہ دیکھ سکتے تھے دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ انہیں کہیں نظر نہ آیا۔ فرقان ماموں نے اطمینان کا سانس لیا اور پل کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ باراتوں کو گھر تک لے جانے کیلئے اسٹیشن کے باہر ایک بس موجود تھی لیکن بہت سے باراتی اسٹیشن سے ہی رخصت ہو گئے بس میں صرف وہ لوگ رہ گئے جن کے گھر بس کے روٹ پر تھے یا گھر جانا چاہتے تھے۔

بس چلی تو کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ وہ کالا بلا کب بس کے دروازے سے چھلانگ لگا کر اندر آ گیا اور پورے اطمینان سے ایک سیٹ کے نیچے پیر پھیلا کر لیٹ گیا۔ فرقان ماموں پہلے آگے بیٹھے تھے پھر جانے کیا سوچ کر وہ پیچھے اٹھ آئے اور اسی سیٹ پر بیٹھ گئے جس کے نیچے بلا لیٹا تھا۔ ان کے اور بلے کے پیروں کے درمیان مشکل سے دو تین انچ کا فاصلہ ہو گا۔ اگر وہ کالا بلا چاہتا تو ماموں فرقان کی ٹانگ پر اپنا پنجہ مار سکتا تھا۔ اپنے ساتھ انہوں نے بابر علی کو بھی بلا لیا تھا۔ اب وہ دونوں پیچھے بیٹھے سفر بخیر و خوبی ختم ہونے پر خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔

Urdufans.com

اور نیچے وہ کالا بلا لیٹا ہوا بار بار اپنی دُم کو بس کے فرش پر مار رہا جیسے تنبیہہ کر رہا ہو کہ یہ سفر ابھی شروع ہوا ہے۔

"چلو اس بلّے سے تو جان چھٹی۔" ماموں فرقان نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

کالے بلّے نے پھر اپنی موٹی دُم بس کے فرش پر ماری جیسے کہہ رہا ہو کہ ابھی کہاں جان چھٹی ابھی تو جاں عذاب میں آنا شروع ہوگی۔

"ماموں، اس بلّے نے واقعی جان عذاب میں ڈال دی تھی پتہ نہیں کہاں سے پیچھے لگ گیا تھا۔" بابر علی نے بس سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "عجیب بلا تھا وہ۔"

"تم دادا غفور کو جانتے ہو؟" فرقان ماموں نے بابر علی سے پوچھا۔

"ہاں جانتا ہوں وہ جو برنس روڈ پر رہتے ہیں۔" بابر علی نے تصدیق چاہی۔

"ہاں وہی میں ان کے پاس جاؤں گا..... وہ ان معاملات میں بڑے ماہر ہیں ان سے بات کروں گا۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"ماموں ان سے کوئی تعویذ وغیرہ لے لیں۔" بابر علی نے تجویز پیش کی۔

"میں ان سے بات کرتا ہوں جو وہ بتائیں گے ویسا کریں گے یہ معاملہ ویسے تعویذوں سے حل ہونے والا نہیں ہے اس کیلئے عمل کرنا پڑے گا۔"

"ماموں آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا۔" بابر علی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ بات اگلے دو تین دن میں معلوم ہو جائے گی۔" ماموں فرقان بولے۔

"کیا پھر کچھ ہوگا۔" بابر علی نے فکر مندی سے پوچھا۔

"اگر اثرات ختم نہیں ہوئے ہیں تو وہ ہر صورت میں ظاہر ہوں گے۔" ماموں فرقان نے جواب دیا۔

"ماموں آپ دو تین دن میرے گھر پر ہی رہیں۔" بابر علی نے کہا۔

"پریشان کیوں ہوتے ہو اب کچھ نہیں ہوگا اور اگر کچھ ہوا تو میں تم سے کونسا دور ہوں مجھے ٹیلیفون کر دینا میں فوراً آجاؤں گا..... ویسے پرسوں ویسے پر ملاقات ہوگی انشاء اللہ سب ٹھیک رہے گا۔" ماموں فرقان نے تسلی دی۔

لیکن کچھ ٹھیک نہ رہا۔ فرقان ماموں کے سارے اندازے غلط نکلے ان کا خیال تھا کہ کالے بلّے سے نجات مل گئی ہے لیکن ایسا نہ تھا۔

ماموں فرقان تو حسن اسکوائر پر اتر گئے انہیں عزیز آباد جانا تھا۔ بابر علی نے انہیں وہاں اترنے سے منع بھی کیا کہ گھر چلیں وہاں سے آپ کو گاڑی کے ذریعے گھر بھجوا دوں گا لیکن ماموں فرقان نہ مانے کہ خواہ مخواہ زحمت ہوگی وہ بس سے اتر گئے اور ٹیکسی پکڑ کر گھر پہنچ گئے۔

ماموں فرقان کے اترتے ہی کالے بلّے نے پورے اطمینان سے پاؤں پھیلا لئے جیسے فرقان ماموں کے اترنے سے اسے سکون ملا ہو۔

بابر علی کی رہائش گاہ گلشن میں تھی بس جب گلشن پہنچی تو اس میں بہت کم باراتی رہ گئے تھے زیادہ تر گھر

کے افراد تھے یا وہ مہمان تھے جو حیدر آباد ٹھٹھہ سے آئے ہوئے تھے۔

بس خالی ہونے کے بعد کالے بلّے نے بھی سیٹ کے نیچے سے اپنا منہ نکالا..... گردن گھما کر ادھر اُدھر دیکھا بس میں کوئی نہ تھا وہ پورے اطمینان سے "مہمان خصوصی" کی طرح شان سے نیچے اترا اور گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔

شادی کی پہلی رات تو اس کالے بلّے کی نذر ہو گئی تھی دوسری رات ٹرین میں گزری آج تیسری رات تھی اکبر ذہنی طور پر بہت اُلجھا ہوا تھا ان عجیب وغریب واقعات نے اس کے اعصاب شکستہ کر دیئے تھے اوپر سے سفر کی تکان تھی۔ گھر پہنچ کر اکبر نے تیز گرم پانی کا شاور لیا۔ ایک خواب آور گولی کھائی، چائے پی اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا اس نے راشدہ کو ہدایت کر دی کہ شام ہونے سے پہلے اسے کوئی نہ اٹھائے۔

اپنے بیڈ پر لیٹ کر اسے ایک طرح کی آسودگی کا احساس ہوا۔ تھکا ہوا تو وہ تھا ہی اوپر سے نیند کی گولی کا نشہ ..... جلد ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس نے لحاف اپنے اوپر کھینچا اور کروٹ لے کر سو گیا۔ جانے وہ کتنی دیر سویا ہو گا کہ اچانک اس کی کسی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا اس کا مطلب تھا کہ شام ہو چکی ہے کوئی زور زور سے دروازہ بجا رہا تھا اکبر نے سوچا وہ اندر سے دروازہ بند کر کے تو نہیں سویا تھا پھر یہ کون اس بیسودگی سے دروازہ پیٹ رہا ہے..... اندر کیوں نہیں آجاتا وہ لحاف پھینک کر غصے سے اٹھا کہ دیکھے تو سہی کون ہے دروازے پر.....

ابھی وہ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ دروازہ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوا۔

"ارے بھئی آجاؤ، کون ہے؟" اکبر نے ذرا غصے سے کہا۔

پورا دروازہ کھل گیا تھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ اکبر کو اور غصہ آیا کہ ایک تو دروازہ پیٹ کر اسے اٹھا دیا اور اب مزید اس کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہے وہ تیزی سے آگے بڑھا تاکہ دیکھ سکے کہ باہر کون ہے۔ چار قدم آگے بڑھائے ہوں گے کہ اسے دیکھ کر اس کی سٹی گم ہو گئی اکبر جلدی سے الٹے قدموں پیچھے بھاگا اور جلدی سے لحاف میں گھس گیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور اس کی نظریں اس چیز پر تھیں جو اندر آرہی تھی۔

وہ کوئی بڑی ہیبت ناک شے تھی اس کی لمبائی کوئی دو فٹ رہی ہو گی ایک فٹ کے پاؤں ہوں گے اور ان پاؤں کے اوپر سر تھا اس کا دھڑ نہیں تھا نہ ہاتھ تھے سر چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور اس میں سے ایک ہیبت ناک چہرہ جھلک رہا تھا۔

اس عجیب الخلقت چیز کو دیکھ کر اکبر کی چیخ گلے میں پھنس گئی وہ لاکھ چیخنا چاہ رہا تھا لیکن چیخ تھی کہ گلے سے نکلتی ہی نہ تھی اور عجیب الخلقت چیز اپنے پاؤں پر اچھلتی ہوئی اس کی طرف بڑھی آرہی تھی بڑی مشکل سے اس کی چیخ حلق سے برآمد ہوئی۔

تبھی اس کی آنکھ کھل گئی اس نے خود کو بری طرح چیختے ہوئے پایا وہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا، اس کا حلق خشک تھا اور جسم بہولے بہولے کانپ رہا تھا۔

کمرے میں اندھیرا نہ تھا کسی نے اندر آکر لائٹ جلا دی تھی اس کا مطلب تھا کہ مغرب کا وقت گزر چکا تھا کمرے میں روشنی دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا اس نے گردن گھما کر چاروں طرف کمرے میں دیکھا۔

وہاں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے خوفزدہ ہوا جاتا اس کا مطلب ہے اس نے جو کچھ دیکھا تھا خواب میں دیکھا تھا لیکن جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اسے نے جو کچھ دیکھا تھا خواب نہ تھا بلکہ اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

اب وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور ابھی باتھ روم جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ راشدہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"اٹھ گئے آپ، شکر ہے۔" راشدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کے دوست آئے ہیں ادھر ہی بھیج دوں ڈرائنگ روم تو اس وقت خالی نہیں ہے۔"

"ہاں ادھر ہی بھیج دو۔" اکبر نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا منہ ہاتھ دھولوں پھر چائے بھیج دینا۔"

"جی اچھا۔" راشدہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد اکبر کے دوست آفاق اور گلزار کمرے میں داخل ہوئے اکبر ابھی باتھ روم میں تھا انہوں نے ایک کالے بلے کو اکبر کے بیڈ کے نیچے سے نکلتے دیکھا۔ کالے بلے کی سرخ سرخ آنکھیں اور بڑا قد دیکھ کر وہ دونوں سہم گئے۔ کالے بلے نے ایک نظر دونوں کو دیکھا اور ٹہلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

"یار یہ کس قسم کا بلا تھا۔" آفاق نے گلزار سے کہا۔

اتنے میں اکبر تولیہ سے منہ پونچھتا باتھ روم سے باہر آگیا۔ اس نے آفاق کی بات سن لی تھی۔ وہ گھبرا کر بولا۔ "آفاق تم کس بلے کی بات کر رہے ہو۔"

"بھئی ایک کالا بلا تمہارے بیڈ کے نیچے سے نکل کر ابھی باہر گیا ہے۔" آفاق نے کہا۔ "یار وہ عجیب قسم کا بلا تھا ڈراؤنا اور اتنا لمبا چوڑا بلا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

کالے بلے کا ذکر سن کر اکبر کے پسینے چھوٹ گئے اس نے جلدی سے باہر نکل کر ادھر اُدھر دیکھا لیکن وہ کالا بلا کہیں نظر نہ آیا اکبر واپس کمرے میں آیا اور خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا بھئی تو کیوں اتنی خاموشی سے بیٹھ گیا۔" گلزار نے اسے چھیڑا۔

"ہاں بھئی سنا کچھ رات کا فسانہ۔" آفاق نے گرہ لگائی۔

اکبر کے یہ دونوں دوست بارات میں نہیں گئے تھے انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ اکبر کے ساتھ کیا بیتی ہے وہ کرید کرید کر اس سے "رات کا فسانہ" پوچھتے رہے اور وہ ہنس ہنس کر انہیں ٹالتا رہا۔ وہ کیا بتاتا کہ اس کے ساتھ کیا گزری ہے۔

اکبر کپڑے پہن کر اپنے دوستوں کو لے کر باہر نکل گیا۔ کافی دیر کے بعد وہ گھر واپس آیا پھر اس نے کھانا کھایا اور کھانا کھا کر اپنے ایک اور دوست سے ملنے چلا گیا۔ وہاں سے کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب واپسی ہوئی۔

گھر واپس آیا تو گھر والے اس کے منتظر تھے کچھ دیر کے بعد اسے نیلم کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو دیوار پر لگی گھڑی نے بارہ گھنٹے بجائے۔ اکبر نے پہلے بارہ بجاتی گھڑی اور پھر نیلم کو دیکھا۔ نیلم نے اسے مسکرا کر دیکھا اور پھر اپنی نظریں نیچی کر لیں جب وہ قریب آیا تو نیلم نے اپنا سر

بھی جھکالیا۔ اکبر بیڈ پر بیٹھا اس نے اپنے ہاتھ سے اس کا چہرہ اٹھایا اور قریب ہونے لگا۔
لیکن قربت اس کے نصیب میں نہ تھی۔
وہ اچانک چیخ اٹھا۔ "نیلم، میری آنکھیں۔"
جب اکبر نے گھبرا کر کہا۔ "نیلم میری آنکھیں۔" اور یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھوں کو ڈھک لیا تو نیلم کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے ٹھنڈا پسینہ سا آگیا..... ہاتھ پاؤں میں جان نہ رہی اس نے تڑپ کر پوچھا۔ "ہائے. اکبر تمہیں کیا ہوا۔"
اکبر کچھ نہ بولا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں مل رہا تھا۔
تب نیلم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے کہا۔ "اکبر، ہاتھ تو ہٹائیں۔"
اکبر نے اپنے ہاتھوں پر نیلم کی نرم ملائم ریشم سی انگلیوں کا لمس محسوس کیا چند ثانیے کو اسے سکون ملا۔ اس نے اپنا ہاتھ آنکھوں سے ہٹالیا۔ آنکھیں کھول کر نیلم کی طرف دیکھنا چاہا لیکن دیکھ نہ سکا جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں شدت کی تکلیف ہوئی اس نے فوراً آنکھیں بند کرلیں۔
"اکبر خدا کے لئے. اپنی آنکھیں کھولیں، مجھے دیکھیں۔" نیلم نے اس کا ذرا سا ہاتھ دبا کر کہا۔
کوئی اور وقت ہوتا تو اکبر، نیلم کے اس جملے پر قربان ہو جاتا اسے اس طرح دیکھتا کہ پھر اسے دید کی حسرت نہ رہتی لیکن اس وقت تو وہ بڑی مشکل میں تھا۔ اس نے پھر تھوڑی سی آنکھیں کھولنا چاہیں لیکن آنکھوں کے چراغ جل نہ سکے، روشنی کے باوجود ہر طرف دھند سی چھائی رہی۔
"نیلم آنکھیں نہیں کھل رہیں۔" اکبر نے ایک کرب کے عالم میں کہا۔
"ہوا کیا ہے؟" نیلم نے فکر مندی سے پوچھا۔
"آنکھوں میں شدید مرچیں لگ گئی ہیں۔"
"ابھی تو آپ ٹھیک تھے۔"
"ہاں، ابھی تو میں ٹھیک تھا۔" اکبر نے کہا۔
"پھر یہ مرچیں کہاں سے آگئیں۔" نیلم نے پوچھا۔
"بس، مجھے اچانک ہی یہ محسوس ہوا جیسے کسی نے مٹھی بھر کر پسی ہوئی مرچیں میری آنکھوں میں جھونک دی ہوں..... اس قدر شدید تکلیف ہے کہ بتا نہیں سکتا۔" اکبر کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔
"آپ باتھ روم میں جاکر آنکھیں دھولیں۔" نیلم نے مشورہ دیا۔
"ہاں، یہی کرنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر اکبر اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی نیلم بھی اٹھی اس نے سہارا دے کر اکبر کو باتھ روم کا راستہ دکھایا۔
اکبر نے واش بیسن کے نلکے سے اچھی طرح اپنی آنکھیں دھوئیں درد میں بہت معمولی سا فرق پڑا اس نے کھڑے ہو کر آنکھیں دیکھیں..... اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں اس قدر سرخی تھی کہ لگتا تھا جیسے آنکھوں میں خون بھر گیا ہو اور اتنی شدید جلن تھی جیسے کوئی اس کی آنکھوں پر بلیڈ پھیر رہا ہو۔

Urdufans.com

باتھ روم سے واپس آکر وہ بیڈ پر لیٹ گیا اسے کسی کروٹ قرار نہ تھا۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھنے کے باوجود کمرے میں جلتی ہوئی نیوب لائٹ کی روشنی اس کی آنکھوں میں تیزاب بن کر ٹپک رہی تھی۔ اس نے اپنا منہ بیڈ کے گدے میں چھپالیا۔ چین پھر بھی نہ ملا۔

"کیا لائٹ بجھادوں۔" نیلم نے اسے گدے میں منہ چھپائے دیکھ کر پوچھا۔

نیلم کا یہ جملہ بھی مرہٹنے والا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مرچیں نہ بھری ہوتیں تو وہ اس جملے سے لطف اٹھاتا لیکن اس وقت تو اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا اس نے سادگی سے کہا۔ "ہاں، بجھادو۔"

نیلم نے لائٹ بجھادی لیکن اس سے بھی کوئی خاص فرق نہ پڑا تکلیف اپنی جگہ جوں کی توں برقرار رہی پھر نیلم نے باتھ روم کی لائٹ جلا کر دروازہ کھول دیا اس نے تولیہ پانی میں تر کیا اور اس گیلے تولیہ کو اس نے آنکھوں پر رکھ کر بہت آہستہ آہستہ پھیرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ٹھنڈا ٹھنڈا پانی لگ رہا تھا۔ پانی کی ٹھنڈک نے اسے تھوڑا سا سکون پہنچایا۔

لیکن یہ سکون بھی لمحاتی ثابت ہوا وس پندرہ منٹ ہو چکے تھے لیکن کسی طرح اسے آرام نہیں آرہا تھا تب نیلم نے پریشان ہو کر کہا۔ "کیا خالہ کو بلا کر لاؤں؟"

"نہیں، تم رہنے دو میں خود جاتا ہوں۔" اکبر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "نیلم، بہت شدید قسم کی تکلیف ہے۔"

"آپ جائیں، جاکر کسی ڈاکٹر کو دکھائیں۔" نیلم نے مشورہ دیا۔

اکبر آنکھوں پر ہاتھ رکھے اندازے سے چلتا ہوا کمرے سے باہر آیا..... پھر اس نے اپنے امی ابو کے کمرے میں قدم رکھا۔ ان کا دروازہ کھلا ہوا تھا وہ لوگ ابھی جاگ رہے تھے۔

اکبر کو اس طرح اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے آتے دیکھ کر صابرہ نے اپنا کلیجہ تھام لیا۔

"یا اللہ خیر۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"ابو، میری آنکھیں دیکھیں۔" اکبر نے کہا۔

"کیا ہوا تمہاری آنکھوں کو۔" بابر علی لپک کر اس کی طرف بڑھے۔

انہوں نے جلدی سے اسے اپنے بیڈ پر بٹھایا۔ صابرہ نے اکبر کا ہاتھ ہٹا کر اس کی ایک آنکھ کھول کر دیکھی۔ "ارے، یہ تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا ایک دم لال انگارہ ہو رہی ہیں۔"

"امی بس اچانک ہی ایسا ہوا..... مجھے یوں لگا جیسے کسی نے ڈھیر ساری پسی ہوئی مرچیں میری آنکھوں میں جھونک دی ہوں۔"

"اپنی آنکھیں دھولو۔" بابر علی نے کہا۔

"ابو بہت اچھی طرح دھولی ہیں گیلے تولیئے سے بھی مسلسل رگڑی ہیں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔" اکبر نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"سنیں۔" صابرہ، بابر علی سے مخاطب ہوئیں۔ "اسے اسپتال لے جائیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے؟" یہ کہہ کر بابر علی نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیئے، گاڑی نکالی اور اکبر کو بٹھا کر اپنے علاقے کے ایک اچھے اسپتال میں لے گئے۔

Urdufans.com

وہاں ڈاکٹر نے اس کی آنکھ کا معائنہ کیا ..... آنکھوں کو اچھی طرح دھو کر ایک ٹیوب سے مرہم لگا دیا۔ کھانے کو کچھ دوائیں لکھ کر دیں، لگانے کو دو قسم کے ٹیوب تجویز کر دیں۔

بابر علی کے دریافت کرنے پر کہ یہ معاملہ کیا ہے اچانک آنکھوں کا یہ حال کیسے ہو گیا۔ تو ڈاکٹر نے بتایا۔ "یہ ایک طرح کی الرجی ہے فکر کی کوئی بات نہیں ایک دو دن میں آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔"

لیکن اکبر کی آنکھیں ایک دو دن میں ٹھیک نہ ہوئیں ..... البتہ تکلیف کچھ کم ہو گئی لیکن بالکل ختم نہ ہوئی۔

ماموں فرقان کو دوسرے دن بابر علی نے فون پر صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ ماموں فرقان، اکبر کی آنکھوں کی تکلیف کے بارے میں سن کر فکرمند ہو گئے۔ انہوں نے پوچھا تھا۔

"کسی آنکھوں کے اسپیشلسٹ کو دکھاؤ، ہو سکتا ہے اس ڈاکٹر کی رائے صحیح ہو واقعی اس کی آنکھوں میں الرجی ہو گئی ہو لیکن اسپیشلسٹ کو دکھاؤ ضرور تاکہ تسلی ہو جائے۔"

"ماموں، میں نے شام کو ایک بڑے ڈاکٹر سے وقت لیا ہے۔ اسے لے کر جاؤں گا۔"

"تم اکبر کو ڈاکٹر کو دکھاؤ میں رات کو ادھر آؤں گا۔" ماموں فرقان نے کہا۔ "دکان سے اٹھ کر پہلے میں دادا غفور کی طرف جاؤں گا ان سے ذرا بات کر کے دیکھتا ہوں وہ کیا کہتے ہیں۔"

"اچھا ماموں ٹھیک ہے میں رات کو آپ کا انتظار کروں گا۔" یہ کہہ کر بابر علی نے ریسیور رکھ دیا۔

بابر علی کے ریسیور رکھنے کے بعد بھی ماموں فرقان چند لمحوں تک ریسیور اپنے ہاتھ میں تھامے رہے۔ ان کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئی تھیں پھر انہوں نے گہرا سانس لے کر ریسیور زور سے کریڈل پر رکھ دیا۔

شام کو جلدی اپنی دکان سے اٹھے تاکہ دادا غفور سے بات کر کے وہ گلشن پہنچ سکیں پھر گلشن سے انہیں اپنے گھر واپس بھی آنا تھا۔ لیاقت آباد کی مارکیٹ میں ماموں فرقان کی کپڑے کی بہت بڑی دکان تھی اور خوب چلتی تھی۔ لیاقت آباد سے ٹیکسی پکڑ کر وہ برنس روڈ دادا غفور کے پاس پہنچے۔

دادا غفور ماموں فرقان کے دور کے رشتے داروں میں سے تھے لیکن ان سے دادا غفور کے تعلقات بہت قریبی تھے۔ ماموں فرقان کو جب بھی فرصت ہوتی وہ ان سے ملنے ضرور جاتے۔ دادا غفور بھی ماموں فرقان کو بہت پسند کرتے تھے وہ اگر کبھی ملاقات کو نہ آتے تو دادا غفور انہیں اپنے بیٹے سے فون کروا کر بلوا لیا کرتے تھے۔ دادا غفور کی عمر 72 سال سے کم نہ ہو گی لیکن ان کی آنکھیں بالکل ٹھیک تھیں۔ وہ چشمہ نہیں لگاتے تھے اور اڑتے کبوتر کو دیکھ کر بتا دیا کرتے تھے کہ یہ کس نسل کا کبوتر ہے۔ سماعت بھی بالکل ٹھیک تھی صرف قدموں کی چاپ سے بندے کو پہچان لیا کرتے تھے البتہ ہاتھوں میں خفیف سا رعشہ تھا تھوڑی بہت گردن بھی ہلنے لگی تھی۔ دبلے پتلے تھے رنگ گورا چٹا تھا۔ جوانی میں سرخی مائل رہا ہو گا اب تھوڑا سا زردی مائل ہو گیا تھا۔ سفید ریشمیں داڑھی، گہری سیاہ آنکھیں، مسکراتے ہونٹ، کڑک دار آواز وہ ایک بارعب شخصیت کے مالک تھے۔

Urdufans.com

ماموں فرقان، دادا غفور کے فلیٹ پر پہنچے تو وہ دسترخوان پر بیٹھ چکے تھے کھانا مغرب کے فوراً بعد کھالیا کرتے تھے۔ ماموں فرقان کو دیکھ کر خوش ہوئے بڑی محبت سے بولے۔

"آؤ بھئی فرقان بہت اچھے وقت پر آئے..... کھانا کھاؤ۔"

ماموں فرقان اگرچہ عشاء کے بعد کھانا کھانے کے عادی تھے لیکن دادا غفور کی دعوت پر ان کا ساتھ دینے کیلئے فوراً دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ دو چار لقمے کھا کر اٹھ جائیں گے لیکن دسترخوان پر ان کی پسند کی چیز موجود تھی۔ پائے وہ بہت شوق سے کھاتے تھے اور دادا غفور کے گھر کے پایوں کا تو کوئی جواب نہ ہوتا تھا۔ وہ کھانے بیٹھے تو کھاتے چلے گئے پھر پورا پیٹ بھر کر اٹھے۔ دادا غفور کو ماموں فرقان کی یہی بے تکلفی بہت پسند تھی۔

کھانے کے بعد دادا کمرے میں چہل قدمی فرمانے لگے۔ دادا کو کھانا کھانے کے بعد ٹہلنے کی عادت تھی۔ ٹہلنے کیلئے وہ باہر نہ جاتے تھے گھر ہی میں آدھا گھنٹہ ٹہل لیا کرتے تھے۔ ماموں فرقان آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور دادا غفور ٹہلتے ہوئے بولے۔ "بھئی فرقان تمہارے کاروبار کا کیا عالم ہے۔"

"ٹھیک ہے دادا اللہ کا بڑا احسان ہے۔" ماموں فرقان نے موقع غنیمت جانا دادا اب ان کی بات سننے کے موڈ میں تھے وہ فوراً بولے۔ "دادا مجھے آپ سے ایک بات کرنا تھی۔"

"ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو کیا دوسری شادی کرنے کا ارادہ ہے۔" دادا غفور نے اپنی بڑی سیاہ آنکھوں سے انہیں مسکرا کر دیکھا۔

"ارے نہیں دادا۔" ماموں فرقان ہنس کر بولے۔

"پھر کیا معاملہ ہے۔" دادا غفور اب سنجیدہ ہوگئے۔

"میرا بھانجا ہے بابر علی فرنیچر کا کاروبار کرتا ہے اچھا بزنس ہے اس کا۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"ابھی اس کے بیٹے کی شادی تھی گزشتہ کل ہی بارات لاہور سے واپس آئی ہے اور کل اس کا ولیمہ ہے۔"

"اچھا پھر۔" دادا غفور نے ٹہلتے ٹہلتے ماموں فرقان کی طرف دیکھا۔

"اس شادی میں کچھ ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ سب چکرا کر رہ گئے ہیں۔" ماموں فرقان نے بتایا۔

"مسئلہ کیا ہے۔" دادا غفور نے پوچھا۔ "ذرا تفصیل سے بتاؤ۔"

تب ماموں فرقان نے الف سے لے کر یے تک ساری داستان پوری تفصیل سے ان کے گوش گزار کردی۔ دادا غفور ٹہلتے رہے اور ماموں فرقان کی بات پوری توجہ سے سنتے رہے۔ ماموں فرقان جب تک خود خاموش نہ ہوگئے دادا غفور نے انہیں درمیان میں ٹوکا نہ کوئی سوال کیا جب وہ چپ ہوگئے تو دادا غفور نے پوچھا۔ "تمہاری سمجھ میں کیا آیا۔"

میری سمجھ میں، تو یہ آرہا ہے کہ نیلم پر اثر ہے..... اثر کس قسم کا ہے ..... یہ آپ بتائیں گے۔"

"اچھا۔" دادا غفور اچانک ٹہلتے ٹہلتے رک گئے پھر وہیں کھڑے کھڑے اپنے پوتے ساجد کو آواز

Urdufans.com

لگائی۔ "ساجد۔"
ان کی آواز سن کر دس بارہ سال کا ایک لڑکا فوراً اندر آیا۔ "جی دادا۔"
دادا غفور نے کہا۔ "بیٹا، ایک شیشے کا گلاس اچھی طرح دھو کر اس میں پانی لاؤ۔"
"جی دادا۔" ساجد نے بڑی فرمانبرداری سے کہا اور اندر چلا گیا۔
دادا غفور عملیات کے ماہر تھے ماموں فرقان اور دادا غفور کی دوستی کا راز بھی انہی عملیات میں مضمر تھا۔ وہ دونوں اکٹھا بیٹھتے تو نہ جانے کب کب کے قصے چھڑ جاتے دادا غفور اپنے پیر کے قصے سناتے جن کے یہاں جنوں کے بچے قرآن شریف پڑھنے آتے تھے۔
حاضرات کا علم، دادا غفور نے انہی سے سیکھا تھا ان کے پیر ہاتھ کے انگوٹھے پر حاضرات کیا کرتے تھے اور ذرا سے ناخن کے انگوٹھے پر دنیا دیکھ لیا کرتے تھے۔ دادا غفور اس علم کو پانی سے بھرے گلاس پر کیا کرتے تھے۔
ساجد پانی سے بھرا شیشے کا چمکتا گلاس ایک چھوٹی سی میز پر رکھ کر چلا گیا۔
دادا غفور نے وضو کیا پھر باوضو ہو کر چوکی پر بیٹھ گئے۔ سودانے والی تسبیح نکالی تسبیح کا ایک چکر کیا پھر ہاتھ کے اشارے سے ماموں فرقان کو گلاس اپنے سامنے چوکی پر رکھنے کو کہا۔ ماموں فرقان نے بہت احتیاط سے گلاس اٹھا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ دادا غفور نے گلاس کو اپنے آگے کھسکا کر اور اپنے اوپر ایک سفید چادر ڈال لی۔ چادر انہوں نے اس طرح اپنے اوپر ڈالی تھی کہ وہ بالکل ڈھک گئے تھے۔
ماموں فرقان پورے اطمینان سے بیٹھے ان کو دیکھتے رہے وہ اس عمل کو بارہا اپنے سامنے ہوتے دیکھتے رہے تھے ہاں کوئی نیا آدمی ہوتا تو بڑا حیران پریشان ہوتا، ہو سکتا ہے کہ وہ ڈر کر کمرے سے بھاگ جاتا۔
چادر سے اب کوئی آواز نہیں آ رہی تھی لیکن ماموں فرقان کو معلوم تھا کہ وہ کچھ پڑھ رہے ہیں وہ ان کا سر ہلتے دیکھ رہے تھے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا گھر والوں کو منع کر دیا گیا تھا کہ کوئی دروازہ نہ کھٹکھٹائے۔
پھر اچانک انہوں نے چادر الٹ دی ایسی سخت سردی میں بھی ان کی پیشانی پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے ماموں فرقان کی نظر جب پانی کے گلاس پر پڑی تو وہ ایک لمحے کو سہم کر رہ گئے پانی کا رنگ سرخ ہو چکا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے گلاس میں تازہ تازہ خون بھرا ہو۔
"یہ کیا دادا۔" ماموں فرقان نے پریشان ہو کر کہا۔
"کوئی فکر کی بات نہیں۔" پسینے میں نہائے ہوئے ہونے کے باوجود وہ مسکرا کر بولے۔ "ذرا اپنا رنگ دکھا رہا ہے۔"
"کون ہے وہ۔" ماموں فرقان نے پوچھا۔
"ابھی صرف دھواں ہے۔" دادا غفور گلاس پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے بولے۔
"دھواں۔" ماموں فرقان نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

Urdufans.com

"ہاں دھواں۔" دادا غفور نے اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے ماموں فرقان کو دیکھا۔ "خیر کوئی بات نہیں، کب تک دھواں بنا رہے گا، کب تک سامنے نہیں آئے گا..... میں دیکھتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ ٹھیک تھا..... تیلم پر کوئی اثر ضرور ہے۔"

"ہاں دلمن کسی کے زیر اثر ہے۔" دادا غفور نے یقین سے کہا۔ "یہی وجہ ہے کہ وہ دولہا کو دلمن کے پاس جانے نہیں دے رہا ہے..... جب بھی دولہا، دلمن سے قریب ہونے کی کوشش کرتا ہے تو وہ شعبدہ دکھا کر اسے ڈرا دیتا ہے اسے دور کر دیتا ہے۔"

"آنکھوں کی بیماری بھی کیا دلمن سے دور رکھنے کی کوشش ہے۔" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"حالات تو یہی بتاتے ہیں..... خیر کوئی بات نہیں..... میں تمہیں ایک فلیتہ دیتا ہوں..... تم جاکر ذرا دلمن کے سامنے جلاؤ..... پھر آکر مجھے بتاؤ اور ہاں آتے ہوئے دلمن کا کوئی استعمال شدہ کپڑا لیتے آنا..... کوئی قمیض یا دوپٹہ وغیرہ۔" دادا غفور نے کہا۔

"اور دولہا کے بارے میں کیا حکم ہے۔" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ اس سے کھو ذرا صبر سے کام لے..... دلمن کے نزدیک نہ جائے ورنہ کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے کا اندیشہ ہے..... وہ جو کوئی بھی ہے اب شعبدہ بازی سے براہ راست نقصان پہنچانے پر اتر آیا ہے۔"

"جی ٹھیک ہے دادا، میں اسے ہدایت کر دوں گا۔" یہ کہتے کہتے ان کی نظر گلاس پر پڑی تو وہ ایک دم چونک پڑے..... "ارے یہ کیا۔"

"بس دیکھتے رہو۔" دادا غفور نے بڑے اطمینان سے کہا اور خود بھی گلاس کو غور سے دیکھنے لگے۔

گلاس کی سرخی غائب ہوتی جا رہی تھی گلاس کا پانی اوپر سے سفید ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ پورا گلاس سفید ہو گیا۔ دادا غفور نے ماموں فرقان کو مسکرا کر دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ایسے شعبدے میں نے بہت دیکھے ہیں۔

پھر دادا غفور نے ایک پیلے رنگ کا کاغذ اپنی الماری سے نکالا اور اس پر قلم سے کچھ لکھا اور کاغذ کی اس طرح پڑیا بنادی جیسے چنے بیچنے والے بناتے ہیں اس لمبی سے بتی پر انہوں نے ایک لال دھاگہ لپیٹ دیا دھاگہ لپیٹتے ہوئے وہ کچھ پڑھتے جا رہے تھے۔

"یہ لو فرقان۔" دادا غفور نے وہ فلیتہ ماموں کی طرف بڑھایا۔ "اسے دلمن کے سامنے جلانا اور اس سے کہنا کہ اس جلتے ہوئے فلیتے کو دیکھے۔ فلیتے کو جلانے سے پہلے کمرے کو بند کر لینا۔" دادا غفور نے ہدایت کی۔

"کیا دلمن کو اس جلتے فلیتے میں کچھ نظر آئے گا۔" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"ہاں نظر تو آنا چاہئے۔" پھر دادا غفور نے ماموں فرقان کو کچھ پڑھنے کو بتایا۔

ماموں فرقان نے اس فلیتے کو اپنی کوٹ کی جیب میں رکھا اور دوسرے دن "رپورٹ" دینے کا وعدہ

Urdufans.com

کر کے ان کے فلیٹ سے نکل آئے۔

اتفاق کی بات کہ بلڈنگ کی سیڑھیاں اترتے ہی نیچے سڑک پر ایک خالی ٹیکسی مل گئی اور اس نے گلشن چلنے پر کوئی اعتراض بھی نہ کیا۔ ایسے حسین اتفاق کراچی میں کم ہی میسر آتے ہیں۔

گلشن پہنچے تو عشاء کا وقت ہو چکا تھا۔ ماموں فرقان نے سب سے پہلے عشاء کی نماز پڑھی نماز سے فارغ ہوئے تو بابر علی نے کہا۔ "ماموں کھانا میز پر لگ چکا ہے ..... آپ کا انتظار ہے۔"

"بھئی میں دادا غفور کے ہاں سے کھانا کھا کر آرہا ہوں ..... تم لوگ کھاؤ مجھے ابھی کچھ پڑھنا ہے۔"

"اچھا ماموں ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر بابر علی کمرے سے نکل گئے۔

ماموں فرقان عشاء کی نماز کے بعد جو پڑھتے تھے وہ تو انہوں نے پڑھا ہی۔ ساتھ ہی وہ بھی پڑھا جو دادا غفور نے بتایا تھا۔ ادھر ماموں فرقان اپنے پڑھنے پڑھانے سے فارغ ہوئے ادھر وہ لوگ کھانا کھا کر اس کمرے میں آگئے۔

بابر اور صابرہ کو دیکھ کر ماموں فرقان نے پوچھا۔ "اکبر کہاں ہے؟"

"وہ کمرے میں ہے آنکھیں بند کئے لیٹا ہے۔" صابرہ نے بتایا۔

"ذرا بلاؤ اسے۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"اچھا میں بلاتی ہوں۔" صابرہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"دادا غفور سے آپ کی کوئی بات ہوئی؟" بابر علی نے صابرہ کے جانے کے بعد پوچھا۔

"ہاں بڑی تفصیل سے ہوئی ہے معاملہ بڑا سنگین ہے۔" ماموں فرقان نے جواب دیا۔

"کیا مطلب۔" بابر علی فکرمند ہو گئے۔

"مطلب یہ کہ نیلم پر اثر ہے۔" ماموں فرقان نے وضاحت کی۔

اتنے میں کمرے میں اکبر داخل ہوا۔ اس نے آنکھوں پر تاریک شیشوں کا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ اس نے ماموں فرقان کو دیکھ کر سلام کیا اور ایک صوفے پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

"ہاں جی! اکبر صاحب کیا حال ہے۔" ماموں فرقان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ماموں بہت برا حال ہے..... آنکھوں کی تکلیف ابھی ختم نہیں ہوئی۔" اکبر نے افسردگی سے کہا۔

"ذرا آنکھیں دکھاؤ۔" ماموں فرقان بولے۔

اکبر نے آنکھوں سے چشمہ ہٹا دیا اس کی آنکھیں اس قدر سرخ اور گلی گلی سی ہو رہی تھیں کہ ماموں فرقان سے دیکھا نہ گیا انہوں نے فوراً اپنا منہ پھیر لیا۔

"تمہاری آنکھیں تو بہت خراب ہو رہی ہیں۔" ماموں فرقان نے کہا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اپنے سامنے رکھا ہوا پانی اکبر کی طرف بڑھایا۔ "لو اسے پی لو۔"

اکبر نے پڑھا ہوا پانی پیا تو اسے اپنی آنکھوں میں کچھ ٹھنڈک کا احساس ہوا۔

"ماموں یہ پانی تو بہت اچھا ہے میری آنکھوں میں ایک دم ٹھنڈک سی پڑ گئی۔" اکبر نے خوش ہو کر

Urdufans.com

کہا۔

"میں ابھی اور پانی پڑھ دوں گا..... تم اسے بوتل میں ڈال کر رکھ لینا اور اسے بغیر پڑھے پانی میں ملا کر پیتے رہنا۔" ماموں فرقان نے کہا۔ "دو تین دن میں تمہاری آنکھیں صاف ہو جائیں گی..... اب تم کمرے میں جا کر سو جاؤ..... نیلم کے کمرے میں دو تین دن نہ جاؤ تو اچھا ہے۔"

ماموں فرقان کا اتنا کہنا کافی تھا۔ اکبر ان کی بات کو سمجھ گیا۔ ماموں فرقان کی بات سمجھ کر اس پر اوس پڑ گئی لیکن اب مجبوری تھی حالات اور واقعات جس طرح پیش آ رہے تھے اس کے پیش نظر نیلم سے دور ہی رہنا بہتر تھا۔

وہ جو کوئی بھی تھا یہی چاہتا تھا۔ اکبر اپنی بدنصیبی کو کوستا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

"ماموں فرقان، دادا غفور کے پاس سے آ رہے ہیں۔" بابر علی، اکبر کے جانے کے بعد صابرہ سے مخاطب ہوئے..... "ان کا خیال ہے نیلم پر اثر ہے..... کیوں ماموں۔"

"ہاں یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر ماموں فرقان نے دادا غفور کے یہاں جو کچھ ہوا تھا اور انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ سب پوری تفصیل کے ساتھ دونوں میاں بیوی کو بتا دیا۔

ساری باتیں سن کر بابر علی پریشان ہو گئے لیکن صابرہ پر اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ انہوں نے کہا۔

"ماموں میں نہیں مانتی اس اثر وثر کو۔"

"ہاں تم مت مانو میں کب کہہ رہا ہوں کہ مانو..... تمہارے ماننے سے اثر ختم ہو جائے تو شاید میں اصرار بھی کرتا۔" ماموں فرقان نے ہنس کر کہا۔ "تم بس اتنا کرو کہ دو تین دن نیلم کو اپنے پاس سُلاؤ..... اکبر کو اس سے دور رکھنا ہے ورنہ اسے کوئی شدید قسم کا نقصان پہنچ سکتا ہے۔" یہ کہہ کر فرقان ماموں نے گھڑی دیکھی۔ "خاصا وقت ہو گیا ہے مجھے گھر پہنچنا ہے..... تم اب مجھے نیلم کے کمرے میں لے چلو مجھے فلیتہ جلانا ہے۔"

"اچھا میں کمرہ خالی کراتی ہوں کچھ پڑوس کی لڑکیاں آئی ہوئی ہیں۔" یہ کہہ کر صابرہ کمرے سے نکل گئیں۔

"ماموں، یہ صابرہ عجیب مٹی کی بنی ہے..... کسی چیز کو مانتی ہی نہیں۔" بابر علی نے کہا۔

"بھئی تمہیں تو مانتی ہے..... کیا اتنا کافی نہیں۔" ماموں فرقان نے ہنس کر جواب دیا۔

"آیئے ماموں۔" صابرہ نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

"اچھا۔" ماموں فرقان اٹھتے ہوئے بولے۔ "نیلم کس کمرے میں ہے۔"

"آیئے میرے ساتھ۔" صابرہ نے کہا۔

ماموں فرقان، نیلم کے کمرے میں پہنچے تو وہاں راشدہ بھی موجود تھی دونوں نے ماموں فرقان کو سلام کیا ماموں نے سلام کا جواب دے کر راشدہ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ راشدہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔ صابرہ اور بابر علی بھی کمرے سے باہر نکل آئے اور دروازہ باہر سے بند کر لیا۔

کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی نیلم کی حالت ایک دم بدل گئی ابھی وہ لجائی شرمائی سی بیٹھی تھی دروازہ بند

Urdufans.com

ہوتے ہی اس نے اپنا سر اٹھایا اور غصے بھری نظروں سے ماموں کو دیکھا۔
ماموں فرقان نے اس غصے بھری نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی کوٹ کی جیب سے فلیتہ نکالا۔
فلیتے کو دیکھ کر نیلم زور سے ہنسی..... بڑی ہذیانی سی ہنسی تھی اس کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔
ماموں فرقان نے سیدھے ہاتھ میں فلیتہ پکڑ لیا اور بائیں ہاتھ سے جیب سے ماچس نکالنے لگے۔
اب نیلم نے شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر اپنا دوپٹہ سر سے اتار کر دور پھینک دیا۔ غصے سے ایک مرتبہ پھر ماموں فرقان کو دیکھا اور بولی۔
"کیا کرتا ہے۔" یہ آواز نیلم کی نہ تھی ایک مردانہ آواز تھی۔
"کچھ نہیں فلیتہ جلا رہا ہوں۔" ماموں فرقان نے بڑے سکون سے کہا۔ "تم کیوں ناراض ہو رہی ہو۔"
"ہو نہیں رہی، ہو رہا ہوں۔" نیلم نے پھر کرخت مردانہ آواز میں جواب دیا۔
"کون ہو تم؟" ماموں فرقان نے دیا سلائی جلاتے ہوئے پوچھا۔
"دیکھ فرقان ہمارے معاملے میں نہ پڑ ورنہ بہت پچھتائے گا۔" نیلم نے غصے سے کہا۔ اس کی نظریں جلتی تیلی پر تھیں تبھی تیلی بھڑک کر بجھ گئی۔
"اچھا، شعبدے بازی شروع ہو گئی۔" ماموں فرقان نے بجھی ہوئی تیلی کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "یاد رکھو میں اکبر نہیں ہوں۔"
"ہاں جانتا ہوں تو اکبر نہیں ہے تو اکبر کا دادا ہے۔" نیلم نے کہا۔ "تیرے حق میں یہی بہتر ہے کہ تو کنارہ کش ہو جا۔"
ماموں فرقان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے خاموشی سے تیلی جلائی اور اس کے شعلے کو فلیتے کے قریب لے آئے تبھی تیلی بجھ گئی یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے پھونک مار کر بجھا دی ہو حالانکہ نیلم اپنی جگہ سے ہلی نہیں تھی۔
"اچھا یہ بات ہے۔" ماموں فرقان کو بھی غصہ آ گیا۔ "اب بجھا کر دکھا تو جانوں۔" یہ کہہ کر ماموں فرقان نے ماچس سے ایک تیلی اور نکالی اور اس کے مصالحے پر کچھ پڑھ کر پھونک مار کر تیلی جلانے سے پہلے بولے۔ "تو کون ہے؟"
لیکن نیلم نے ماموں فرقان کے سوال کا جواب نہ دیا وہ بڑی حیرت سے تیلی کی طرف دیکھ رہی تھی۔
ماموں فرقان نے ماچس پر تیلی رگڑی شعلہ بھڑکا اس سے پہلے کہ تیلی بجھانے کی کوشش کی جاتی ماموں فرقان نے فلیتے کو آگ دکھا دی فلیتہ فوراً جل اٹھا۔ ماموں فرقان نے جلتے فلیتے کو نیلم کی آنکھوں کے سامنے کیا اور سختی سے بولے۔ "ہاں اب بتا کون ہے تو؟"
"میں سید پور کا جن ہوں، فرقان مجھ سے ٹکر نہ لے..... میں تیری زندگی خراب کر دوں گا۔"

Urdufans.com

نیلم نے یہ کہتے ہوئے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور بیہوش ہوگئی۔

فلیتہ اب پورا جل چکا تھا کمرے میں دھواں ہی دھواں تھا۔ اتنا دھواں کہ کمرے سے باہر نکل رہا تھا لگتا تھا جیسے کمرے کے اندر آگ لگ گئی ہو۔

ماموں فرقان تب دروازے کی طرف بڑھے انہوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ ماموں فرقان نے ہاتھ سے دروازہ بجایا فوراً ہی دروازہ کھول دیا گیا۔

"کیا ہوا ماموں؟" صابرہ کی پریشان صورت نظر آئی۔

"کچھ نہیں ایک گلاس میں پانی لاؤ۔" ماموں فرقان نے کہا۔

صابرہ جلدی سے پانی لے کر آگئیں۔ بابر علی کمرے میں داخل ہو چکے تھے انہوں نے دیکھا کہ نیلم بیہوش پڑی ہے اور کمرے میں دھواں ہی دھواں بھرا ہے۔

ماموں فرقان نے صابرہ سے گلاس ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھا پانی پر پھونکیں ماریں اور نیلم کے چہرے پر کئی بار چھینٹے دیئے چند لمحوں کے بعد نیلم نے آنکھیں کھول دیں۔ حیران ہو کر چاروں طرف دیکھا پھر فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ماموں فرقان نے گلاس اس کی طرف بڑھایا اور بولے۔ "لو بیٹی پانی پی لو۔"

نیلم نے ماموں فرقان کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور صدیوں کے پیاسے کی طرح غٹ غٹ پانی پی گئی۔ اس کا حلق سوکھ رہا تھا زبان پر جیسے کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ پانی پیا تو کچھ ہوش بحال ہوئے۔

"مجھے کچھ ہو گیا تھا کیا۔" نیلم نے صابرہ سے پوچھا۔

"ہاں بیٹی تم بیہوش ہو گئی تھیں۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"یہ کمرے میں دھواں کیسا بھرا ہے۔"

"ابھی نکل جائے گا..... تم پریشان مت ہو۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"ماموں ابھی آپ میرے کمرے میں آئے تھے پھر خالہ، خالو باہر چلے گئے تھے اتنا مجھے یاد ہے اس کے بعد کیا ہوا یہ مجھے یاد نہیں..... میں بیہوش کس طرح ہو گئی تھی۔" نیلم پریشان ہو کر بولی۔

"بس میں تم سے کچھ بات کر رہا تھا کہ تم بات کرتے کرتے بیہوش ہو گئیں۔" ماموں فرقان نے بات ٹالنے کیلئے کہا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ نیلم کو ابھی یہ بتایا جائے کہ تم پر جن کا سایہ ہے۔ وہ ہنستے ہوئے بولے "نیلم تم پریشان مت ہو ماموں فرقان کے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

پھر انہوں نے نیلم کے کمرے سے باہر آکر بابر، صابرہ اور اکبر کے سامنے بند کمرے کی روداد سنائی۔ صابرہ نے کوئی بات پوچھنا چاہی تو بابر علی نے انہیں ڈانٹ دیا۔ "صابرہ پلیز..... اب کوئی الٹی سیدھی بات نہ کرنا معاملہ بہت سنگین ہو گیا ہے۔"

صابرہ نے یہ سن کر خاموشی اختیار کر لی جو کچھ انہوں نے فرقان ماموں کے منہ سے سنا تھا اس پر انہیں یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن حالات ایسے تھے کہ یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ماموں فرقان تھوڑی دیر وہاں اور ٹھہرے انہوں نے نیلم کا استعمال شدہ دوپٹہ لیا اور کل ویسے میں ملاقات کا وعدہ کر کے گھر سے نکلنا چاہا تو بابر علی نے انہیں روکا۔

"ٹھہریں ماموں میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔ راشدہ ذرا گاڑی کی چابی لانا۔"

ماموں فرقان نے منع بھی کیا کہ وہ آرام سے چلے جائیں گے کوئی ٹیکسی لے کر..... لیکن بابر علی نہ مانے وہ انہیں ان کے گھر تک چھوڑ کر گئے۔

دوسرے دن وہ شام ویسے میں شرکت سے پہلے دادا غفور کے یہاں پہنچے۔ انہوں نے دادا غفور کو نیلم کا دوپٹہ دیا اور فلیتہ جلانے سے پہلے اور جلانے کے بعد جو کچھ نیلم سے گفتگو ہوئی وہ دادا غفور کے گوش گزار کر دی۔ دادا غفور نے فرقان ماموں کی ایک ایک بات غور سے سنی۔

ماموں فرقان کے خاموش ہوتے ہی دادا غفور نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ وہ بکارنے میں کچھ وقت لے گا لیکن وہ تو فلیتہ ہی دیکھ کر بکار اٹھا۔" دادا غفور نے "نام نہیں بتایا اس ماموں فرقان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو وہ سید پور کا جن ہے..... نام نہیں بتایا اس نے۔"

"نہیں۔" ماموں فرقان نے کہا۔ "نام پوچھنے سے پہلے ہی وہ نیلم کا جسم چھوڑ گیا۔"

"فرقان کچھ کرنا پڑے گا بھئی۔" دادا غفور نے فکر مند ہو کر کہا۔ "نہیں تو وہ لڑکی کو تباہ کر کے رکھ دے گا..... تم نے دولہا کو تو دور رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔"

"جی دادا۔" فرقان ماموں نے جواب دیا۔ "زندگی لڑکی کی ہی نہیں لڑکے کی بھی تباہ ہوگی۔"

"اچھا تم یوں کرو نیلم کا دوپٹہ چھوڑ جاؤ میں ذرا اثرات کی گہرائی کا اندازہ کر لوں ..... پھر کچھ کریں گے ..... ہمیں بہرحال دولہا دلہن کو اس خبیث سے نجات دلانا ہوگی۔"

"ٹھیک ہے..... پھر میں کل آؤں گا۔" ماموں فرقان نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"سنو وہ دولہا دلہن کے نام کیا ہیں۔" دادا غفور نے پوچھا۔

"دلہن کا نام نیلم ہے اور دولہا کا نام اکبر۔" ماموں فرقان نے بتایا۔

"اور نیلم کی ماں کا کیا نام ہے۔" دادا غفور نے پھر پوچھا۔

"واجدہ۔" ماموں فرقان نے بتایا۔

"اکبر کی والدہ کا نام کیا ہے۔" دادا غفور نے دوبارہ پوچھا۔

"صابرہ۔" ماموں فرقان نے پھر بتایا۔

"ماموں سے تو یہ دونوں بہنیں معلوم ہوتی ہیں۔" دادا غفور نے خیال ظاہر کیا۔

"جی ہاں واجدہ اور صابرہ آپس میں سگی بہنیں ہیں۔" ماموں فرقان نے تصدیق کی۔ "ٹھیک اب تم جاؤ پھر کل ملاقات ہوگی۔" دادا غفور نے انہیں جانے کی اجازت دیدی۔ ماموں فرقان جب دادا غفور کے فلیٹ سے نیچے اتر رہے تھے تو سیڑھی پر ان کا توازن بگڑا انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے پیچھے سے انہیں دھکا دیا ہو سیڑھیوں پر زیادہ روشنی نہ تھی انہوں نے فوراً دیوار کا سہارا لیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا کوئی وہاں کوئی نہ تھا۔ ماموں فرقان اسے اپنا وہم سمجھ کر محتاط طریقے سے سیڑھیاں اترنے لگے۔

Urdufans.com

ٹیکسی میں بیٹھ کر اچانک انہیں دلدار بٹ یاد آگیا۔ دلدار بٹ نے انہیں جو کچھ بتایا تھا اس کا تذکرہ انہوں نے ابھی کسی سے نہیں کیا تھا۔ خیال آیا کہ واہ غفور کو بتا دینا چاہئے تھا..... خیر کوئی بات نہیں کل ان کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے گا۔

ولیمہ راشد منہاس روڈ پر بنے بہت سے شادی ہالوں میں سے ایک میں تھا۔ فرقان ماموں نے گھڑی دیکھی اور اندازہ لگایا کہ ابھی یہ لوگ شادی ہال پر نہیں پہنچے ہوں گے لہٰذا انہوں نے سوچا کہ گھر ہی چلا جائے۔

گھر پہنچے تو فرقان ماموں کو معلوم ہوا کہ لاہور سے بھی مہمان پہنچ چکے ہیں۔

اب یہ وقت تھا کہ وہ تمام حقائق سے بابر علی کو آگاہ کر دیں۔ ماموں فرقان، بابر علی کو گھر سے باہر لے آئے اور بولے۔ "مجھے تنہائی میں تم سے کچھ بات کرنا تھی۔"

"جی ماموں فرمائیں، اس وقت یہاں میرے آپ کے سوا کوئی نہیں۔" بابر علی نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"لاہور میں جب میں صبح کی سیر کو نکلا تھا تو مجھے ایک شخص ملا تھا وہ خود کو فیاض کا پڑوسی کہتا تھا اور نام اس کا دلدار بٹ تھا۔ اس نے نیلم کے بارے میں ایک عجیب انکشاف کیا تھا۔" ماموں فرقان نے بتایا۔

"وہ کیا ماموں؟" بابر علی نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

"اس نے کہا تھا کہ نیلم، واجدہ اور فیاض حسین کی سگی بیٹی نہیں ہے۔" ماموں فرقان نے انکشاف کیا اور یہ انکشاف کسی بم کے دھماکے سے کم نہ تھا۔

یہ انکشاف اتنا حیرت میں ڈالنے والا تھا کہ بابر علی چکرا کر رہ گئے۔

"نہیں ماموں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا..... اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔" ماموں فرقان نے جواب دیا۔

"گویا آپ کو دلدار بٹ کی بات کا یقین ہے۔" بابر علی نے کہا۔ "ماموں ذرا سوچیں تو واجدہ، صابرہ کی سگی بہن ہے..... وہ اپنی بہن کی آنکھوں میں کس طرح دھول جھونک سکتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے واجدہ سے اس مسئلے پر کبھی پوچھا ہی نہ گیا ہو..... میرا مطلب ہے کہ از خود یہ سوچ لیا ہو کہ نیلم، واجدہ کی ہی بیٹی ہے۔"

"نہیں ہم نے از خود نہیں سوچا..... خود یہ قیاس کر کے نہیں بیٹھ گئے کہ نیلم، واجدہ کی سگی بیٹی ہوگی..... بلکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نیلم مری میں پیدا ہوئی تھی..... ڈاکٹرنے واجدہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ کسی صحت افزاء مقام پر رہے..... ڈاکٹر کی ہدایت کے پیش نظر ہی واجدہ مری چلی گئی تھی اور وہاں نیلم پیدا ہوئی تھی..... مری سے واپسی پر اس کا خط آیا تھا..... جس میں نیلم کے بخیر و عافیت پیدا ہونے کا ذکر تھا..... اب آپ کہہ رہے ہیں کہ نیلم، واجدہ کی بیٹی نہیں ہے، میں اس بات کو کس طرح مان لوں۔"

"ماننے کو تو میرا دل بھی نہیں چاہ رہا میں نے بھی اس معاملے میں اس سے بہت بحث کی تھی

Urdufanz.com

کہ ایسا کیسے ممکن ہے تب اس نے بتایا تھا کہ وہ نیلم کی اصل ماں کو جانتا ہے..... اور اگر مجبوری نہ ہوتی تو وہ مجھے اس کی اصل ماں سے ملوا دیتا۔" فرقان ماموں نے بتایا۔

"مجبوری کیا تھی؟" بابر علی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اس کی اصل ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔" فرقان ماموں نے جواب دیا۔

"چلو جی قصہ ہی ختم ہوا۔" بابر علی نے مذاق کے انداز میں کہا۔ "اور باپ؟"

"وہ ماں کے مرنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔"

"ماموں پھر بھی آپ نے اس بدمعاش کی بات پر یقین کر لیا..... ماموں یہ صرف تعلقات خراب کرانے کی کوشش ہے اس کے سوا کچھ نہیں..... ایک طرف الزام لگا دیا کہ نیلم، واجدہ کی سگی بیٹی نہیں..... دوسری طرف اس کے والدین کو مار دیا..... اب کر لو کیا کرو گے..... کس طرح تصدیق کرو گے۔" بابر علی نے غصے سے کہا۔ "ماموں آپ نے مجھے فوراً کیوں نہیں بتایا..... میں ذرا اس کمینے سے نمٹتا۔"

"میں نے اس لئے نہیں بتایا کہ خواہ مخواہ بدمزگی ہوگی۔"

"بدمزگی تو اس صورت میں ہوتی اگر یہ بات سچی ہوتی اسی وقت اگر آپ بتا دیتے تو وہ دلدار کا بچہ فوراً ایکسپوز ہو جاتا..... اس کے عزائم سامنے آجاتے..... ساری بات کھل کر فیاض کے سامنے ہو جاتی۔"

"بس میں نے چاہا نہیں ویسے اس طرح کی بات پر یقین نہ تھا مجھے میں نے اسے ایک پڑوسی کی دشمنی پر محمول سمجھتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی تھی۔"

"لیکن اس وقت تو آپ اس انداز سے بات کر رہے ہیں جیسے آپ کو بھی نیلم، واجدہ کی سگی اولاد نہ ہونے کا یقین ہو۔" بابر علی نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"ہاں تم نے ٹھیک انداز لگایا ہے مجھے اب شبہ ہونے لگا ہے کہ نیلم واقعی واجدہ کی بیٹی نہیں ہے، بابر ہمیں چاہئے کہ اس معاملے کی کھوج کریں..... میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اگر نیلم، واجدہ کی سگی بیٹی نہ نکلے تو اسے فوراً طلاق دلوا دی جائے ایسی احمقانہ بات میں تصور میں بھی نہیں لا سکتا..... اب وہ واجدہ کی بیٹی ہے یا نہیں ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا وہ ہماری بہو ہے، ہماری عزت ہے۔"

"ماموں آپ کے اس شبہ کی وجہ کیا ہے؟" بابر علی نے پوچھا۔

"بابر تم کسی سیدپور سے واقف ہو۔"

"نہیں ماموں میں نہیں جانتا کہ سیدپور کہاں ہے؟"

"سیدپور کا تو خیر مجھے بھی معلوم نہیں..... کہاں ہے لیکن دلدار نے بتایا تھا کہ نیلم کی ماں سیدپور کی رہنے والی تھی..... اور نیلم پر جس جن کا سایہ ہے وہ بھی سیدپور کا ہے..... مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ جن نیلم پر سیدپور سے آنا شروع ہوا..... اب اس بات کا سراغ لگانا چاہئے کہ نیلم کا سیدپور سے کیا تعلق ہے۔"

"اس کا سیدپور سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟" بابر علی نے سوچتے ہوئے کہا۔

Urdufanz.com

"نیلم کا سید پور سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے..... تم ذرا اس مسئلے پر واجدہ سے بات کر کے دیکھو۔"

"بات تو خیر میں ابھی آپ کے سامنے کر لیتا بس ذرا ولیمہ کا خیال ہے..... ولیمہ ہو جائے پھر رات کو بات کروں گا..... اور صبح میں آپ کو بتا دوں گا ٹھیک ہے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے، بات کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا کہ جھگڑا نہ بڑھے۔" ماموں فرقان نے ہدایت کی۔

"نہیں جھگڑا نہیں بڑھے گا..... جھگڑے کی کوئی بات ہی نہیں ہے..... پہلے تو میں باتوں باتوں میں یہ معلوم کروں گا، یہ سید پور کہاں ہے..... سید پور کے پیچھے کوئی کہانی موجود ہے تو واجدہ چونکے بغیر نہ رہ سکے گی..... واجدہ کے ردعمل سے معلوم ہو جائے گا کہ سید پور کا کیا چکر ہے۔"

"ہاں یہ طریقہ اچھا ہے واجدہ سے انجان بن کر بات کرنا..... جو ہو گا سامنے آ جائے گا۔"

"اگر یہ بات آپ کے سامنے ہوتی تو اچھا ہوتا..... آپ کو دلدار بٹ کے حوالے سے بات کرنے میں آسانی ہوتی۔"

"نہیں، ابھی میں سامنے نہیں آنا چاہتا..... تم فی الحال سید پور کا بم چھوڑ کر واجدہ اور فیاض حسین کا ردعمل دیکھو..... بلکہ واجدہ اور فیاض حسین سے الگ الگ بات کرو تو زیادہ بہتر ہے..... اگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو تو پھر میں درمیان میں آؤں گا..... اور براہ راست اس مسئلے پر بات کروں گا۔"

"چلئے ٹھیک ہے؟" بابر علی نے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "آیئے، گھر چلیں وہاں ہماری ڈھونڈ پڑی ہو گی۔" بابر علی اور ماموں فرقان گھر کے اندر پہنچے تو واقعی ان کی ڈھونڈ مچی تھی۔

صابرہ، بابر علی کو ماموں فرقان کے ساتھ دیکھ کر خاموش ہو گئی انہیں اپنے شوہر کے اس طرح غائب ہو جانے پر بڑا غصہ آ رہا تھا بھلا یہ بھی کوئی بات تھی کہ لوگ ولیمے میں جانے کیلئے کھڑے ہیں اور وہ جناب غائب ہو گئے۔ ماموں فرقان نے صابرہ کا چہرہ دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اسے اس وقت غصہ آ رہا ہے وہ ہنستے ہوئے بولے۔ "اس غریب کو معاف کر دو یہ میرے ساتھ تھا۔"

"کوئی بات نہیں ماموں۔" صابرہ نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "آیئے چلیں سب تیار ہیں۔"

شادی ہال پر پہنچے تو خاصے مہمان آ چکے تھے دس بجے کے قریب کھانا شروع ہوا کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد تصویریں اتاری گئیں اکبر کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ دیکھ کر سب کو پریشانی ہوئی سب نے اس سے باری باری پوچھا۔ وہ بیچارہ آنکھوں کا حال بتاتا بتاتا بے حال ہو گیا۔

کیمروں پر چڑھی فلش گنوں کے شعلے بار بار اس کی آنکھوں میں کوند رہے تھے۔ تاریک شیشوں کا چشمہ چڑھانے کے باوجود فلش گنوں کی لائٹ اس کی آنکھوں میں بری طرح چبھ رہی تھی لیکن وہ تصویریں اتروانے پر مجبور تھا۔

ولیمہ بخیر و عافیت ہو گیا۔ ساڑھے گیارہ بجے یہ لوگ اپنے گھر پہنچ گئے۔ فرقان ماموں کھانے کے فوراً

Urdufans.com

بعد اپنے اہل خانہ کے ساتھ اپنے گھر عزیز آباد چلے گئے۔

کوئی ایک بجے تک سب لوگ کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے کافی کا دور بھی چلا اس گفتگو کے دوران بابر علی خاصے بے چین دکھائی دے رہے تھے وہ چاہ رہے تھے کہ کسی طرح واجدہ کمرے میں تنہا جائے تو وہ اس سے سید پور کا ذکر چھیڑیں لیکن واجدہ کے تنہا جانے کا کوئی سوال نہ تھا ہاں اتنا ضرور ہوا کہ آہستہ آہستہ کمرے میں رش کم ہو گیا۔

اب کمرے میں وہ چاروں رہ گئے واجدہ اور فیاض حسین، صابرہ اور بابر علی۔

بابر علی کے دل سے دھواں سا اٹھ رہا تھا جب ماموں فرقان نے نیلم کے سلسلے میں انکشاف کیا تھا بابر علی کو یہ جان کر بہت افسوس ہوا تھا۔ افسوس اس بات کا زیادہ تھا کہ بسن نے بسن کو دھوکا دیا تھا اگرچہ ابھی اس بات کی تصدیق نہ ہو پائی تھی لیکن جانے کیوں انہیں یقین سا ہوتا جا رہا تھا کہ ماموں فرقان نے جو کچھ کہا ہے حقائق پر مبنی ہے۔ بابر علی ابھی اکیلے ہی اس آگ میں جل رہے تھے ابھی انہوں نے اپنی بیوی صابرہ کو اس میں شامل نہ کیا تھا۔ ویسے کے دوران کئی بار ان کے جی میں آئی کہ اس جان لیوا انکشاف کے بارے میں اپنی بیوی کو بتا دیں لیکن ہر بار رک گئے..... یا بتانا بھی چاہا تو کوئی مہمان درمیان میں آگیا..... اب بھی وہ سوچ رہے تھے کہ پہلے واجدہ سے بات کریں یا بات کرنے سے پہلے حقیقت صابرہ پر کھول دیں۔

اسی ادھیڑبن میں تھے کہ کیا کریں..... کہ فیاض حسین کو جماہی پر جماہی آنے لگیں وہ یہ کہہ کر اٹھ گئے۔ "اچھا جی میں تو چلا مجھے آرہی ہے نیند۔"

"بھئی مجھے تو ابھی نیند نہیں آرہی آپ چلیں میں آتی ہوں۔" واجدہ نے کہا۔

بابر علی نے فیاض حسین کے کمرے سے نکلنے پر شکر ادا کیا۔ قدرت نے انہیں ایک گولڈن چانس عطا کر دیا تھا اب وہ پورے اطمینان سے واجدہ سے بات کر سکتے تھے۔

بابر علی نے دو چار منٹ ادھر اُدھر کی باتیں کیں..... پھر انہوں نے صابرہ کو چائے بنانے کے بہانے سے کمرے سے باہر بھیج دیا اب وہ دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے۔

"واجدہ ایک بات تو بتائیں۔" بابر علی نے فوراً اپنی پٹاری کھولی۔

"جی پوچھیں۔" واجدہ نے مسکرا کر کہا۔ "کوئی خاص بات پوچھنا ہے کیا؟"

"ہاں میں یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ سید پور لاہور سے کتنی دور ہے۔"

"سید پور۔" واجدہ نے اس طرح آنکھیں پھاڑ کر بابر علی کو دیکھا جیسے سامنے بابر علی نہ ہو کوئی ہیرو شیر مینا ہو لیکن یہ کیفیت چند لمحوں تک ہی رہی۔ واجدہ نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور بولی۔

"کونسا سید پور مجھے نہیں معلوم آپ کس سید پور کی بات کر رہے ہیں۔"

"اچھا تم دلدار بٹ کو جانتی ہو۔" اس مرتبہ بابر علی نے دوسری پٹاری کھولی۔

"کون دلدار بٹ؟" واجدہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ارے تم دلدار بٹ کو بھی نہیں جانتیں۔" بابر علی نے اب واجدہ کے چہرے کا رنگ اڑتا ہوا

Urdufans.com

محسوس کر لیا تھا۔ سید پور کے نام پر وہ چونکی تھی اور دلدار بٹ کے نام پر اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا تھا۔ دال میں کچھ ضرور کالا تھا..... لیکن بابر علی نے اپنی بے نیازی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "بھئی وہ تمہارا پڑوسی نہیں ہے۔"

"لیکن آپ اسے کیسے جانتے ہیں۔" واجدہ نے ذرا سا پریشان ہو کر پوچھا۔

"میری اس سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی اس نے....." بابر علی نے جان بوجھ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"وہ پاگل آدمی ہے..... کئی ماہ تک پاگل خانے میں رہ چکا ہے پچھلے ہی دنوں وہاں سے واپس آیا ہے..... اس کی ذہنی حالت اب بھی ٹھیک نہیں..... وہ لوگوں کو پکڑ کر ان سے عجیب عجیب باتیں کرتا ہے..... آپ سے بھی کچھ کہہ دیا ہوگا اس نے۔" واجدہ نے جلدی جلدی بتایا۔

"اچھا۔" بابر علی نے اس کی بات پر یقین کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے مجھ سے اس نے بڑی دلچسپ بات کہی۔"

"وہ کیا۔" واجدہ کے چہرے پر پھر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"اس نے مجھے بتایا کہ نیلم تم لوگوں کی سگی بیٹی نہیں ہے۔" بابر علی نے واجدہ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا..... اتنے میں صابرہ چائے کی ٹرے ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کی زبان سے نکلنے والا جملہ سن لیا تھا یہ سن کر ان کے ہاتھ میں ٹرے لرز کر رہ گئی۔

"ہیں بابر یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں..... کس نے کہی آپ سے یہ بات۔"

انہوں نے بمشکل چائے کی ٹرے میز پر رکھی اور جلدی سے بابر علی کے برابر آ کر بیٹھ گئیں اور پریشان ہو کر بابر علی کی صورت تکنے لگیں..... اب بابر علی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اسے چاہئے تھا کہ جیسے ہی نیلم کے بارے میں معلوم ہوا تھا وہ فوراً صابرہ کو بتا دیتا اور اگر اس مسئلے کو راز ہی رکھنا تھا تو اس بات کا خیال رکھتا کہ صابرہ کے کانوں میں کوئی بات نہ پڑے..... لیکن دونوں ہی باتیں نہ ہو سکی تھیں نہ تو بابر علی صابرہ کو پہلے سے کچھ بتا سکا تھا اور نہ اس مسئلے کو راز رکھ سکا تھا اور یہ صورت حال ایسی تھی جو اس کی بیوی صابرہ کے لئے دکھ کا باعث بن سکتی تھی اور ناراضگی کا سبب بھی۔

تب بابر علی نے اس نازک صورت حال کو قابو میں کرنے کیلئے پینترا بدلا پہلے بابر علی نے ایک زوردار مصنوعی قہقہہ لگایا۔ صابرہ بھی پریشان ہو گئیں وہ بولیں۔ "ہائے کیا ہو گیا آپ کو۔"

"بھئی صابرہ مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔" بابر علی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لاہور میں مجھے واجدہ کا ایک پڑوسی دلدار بٹ ملا تھا اس نے نیلم کے بارے میں ایک عجیب انکشاف کیا کہ وہ ان لوگوں کی سگی بیٹی نہیں ہے..... یہ بات میں نے تم کو نہیں بتائی تھی اور اس لئے نہیں بتائی تھی کہ مجھے وہ آدمی کچھ ابنارمل سا لگا تھا میں نے سوچا واجدہ سے تصدیق کر کے تمہیں بتاؤں گا تاکہ تمہارے دل میں خواہ مخواہ کوئی گرہ نہ پڑ جائے..... اب میں نے واجدہ سے ذکر کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ پاگل آدمی ہے اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں سے اسی طرح کی الٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا ہے..... چلو اب بات صاف ہو گئی اسی لئے کہتے ہیں کہ بدگمان ہونے سے پہلے تصدیق کر لینا چاہئے..... بتاؤ اگر میں اس وقت واجدہ سے

Urdufans.com

اس معاملے کی تصدیق نہ کرتا تو کیسی تباہی پھیلتی۔"

"ہاں آپ نے بہت اچھا کیا جو مجھ سے پوچھ لیا..... ورنہ جانے کیا ہو جاتا..... آپ ہم لوگوں کے بارے میں کیا سوچتے۔" واجدہ نے کہا اب اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔

"میں تو یہ بات سن کر لرز گئی تھی۔" صابرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"صابرہ آپ چائے بنائیں میں ذرا باتھ روم ہو کر آیا۔" بابر علی یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ دو تین منٹ کے بعد وہ واپس آئے تو صابرہ چائے بنانے کیلئے اٹھ چکی تھیں اب وہ کیتلی سے چائے نکال رہی تھی تینوں نے بیٹھ کر چائے پی۔ چائے خاموشی سے پی گئی پھر بابر علی نے کہا۔

"اچھا بھئی اب میں تو چلتا ہوں..... نیند کی آمد آمد ہے۔"

"تو پھر ہم ایسا ہی کریں ہم بھی چلتے ہیں۔" واجدہ نے کہا۔

بابر علی کا بقصد بھی یہی تھا..... وہ چاہ رہے تھے کہ واجدہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جائے۔ چائے پینے سے پہلے جو بابر علی اٹھے تھے وہ باتھ روم میں نہیں گئے..... فیاض حسین کے کمرے میں گئے تھے۔ فیاض حسین سو چکے تھے اور بابر علی اپنی کارروائی مکمل کر کے وہاں سے نکل آئے تھے اب ضروری تھا کہ واجدہ بھی اپنے کمرے میں پہنچ جائے تاکہ انہوں نے جو کمرے میں دام بچھایا تھا اس میں پھنس سکے۔

صبح جب فیاض اور واجدہ کمرے سے نکل آئے تو بابر علی فوراً اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے ٹیبل لیمپ کے برابر کتابوں کے درمیان رکھا کتاب جیسا حساس ٹیپ ریکارڈر وہاں سے نکالا اور تیزی سے کمرے سے نکل آئے پھر انہوں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر دروازہ بند کیا اور کیسٹ کو ریورس کر کے ٹیپ ریکارڈ کو آن کر دیا۔

واجدہ جب بابر علی کے کمرے سے نکلی تو اس کی کیفیت کشتی کے اس مسافر جیسی تھی جس کی کشتی طوفانوں میں گھر کر نکل آئی ہو۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے اس نے اپنے شوہر پر نظر ڈالی۔ دروازہ بند کرنے کی آواز سے فیاض حسین کی اچانک آنکھ کھل گئی تھی اور اب وہ واجدہ کو گردن اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔

فیاض حسین کو جاگتے دیکھ کر وہ تیزی سے بیڈ کے نزدیک آئی اور تشکر آمیز لہجے میں بولی۔ "خدا کا شکر ہے آج ہم بچ گئے۔"

"کیوں کیا ہوا؟ خیریت تو ہے۔" فیاض نے پوچھا۔

"ولدار بٹ اس کمینے نے تو ہمیں کہیں کا نہ رکھا تھا اگر میں اسے پاگل قرار نہ دیتی تو اس نے تو اس بھیانک راز سے پردہ اٹھا دیا تھا جسے آج تک ہم اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں۔"

"وہ گدھے کا بچہ بابر کو کہاں مل گیا..... ہم نے تو بابر کو اپنی نگرانی میں رکھا تھا۔"

"مجھے نہیں معلوم وہ انہیں کہاں ملا..... میں نے ان سے پوچھا بھی نہیں..... لیکن بابر بھائی کی گفتگو کے انداز سے یہ معلوم ہوا کہ اس نے سب کچھ انہیں بتا دیا ہے وہ سید پور کے بارے میں پوچھ رہے تھے کہ لاہور سے کتنی دور ہے۔"

"ارے یہ تو بہت بُرا ہوا..... پھر تم نے بات کو کیسے سنبھالا۔" فیاض حسین نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

"بس اس وقت جانے کیسے میرے دماغ میں یہ بات آگئی..... میں نے فوراً اسے ذہنی مریض قرار دیدیا..... بس اس طرح بات نبھ گئی اور ایک بھیانک حقیقت سے پردہ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔"

"بابر کو تمہاری بات کا یقین آگیا؟" فیاض حسین نے سوال کیا۔

"ہاں مجھے محسوس تو یہی ہوا کیونکہ جب یہ بات ہو رہی تھی تو صابرہ باجی اندر آگئی تھیں..... انہیں بابر بھائی نے کچھ نہیں بتایا تھا اس وقت بابر بھائی نے جس طرح تقصہ لگا کر بات کی اس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے میری بات کا یقین کر لیا ہے۔" واجدہ نے بتایا پھر چند لمحے توقف کر کے بولی۔ "لیکن فیاض اب میرا دل ڈرنے لگا ہے..... مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اب یہ راز کہ نیلم ہماری بیٹی نہیں ظاہر ہو کر رہے گا..... اور اگر کسی طرح یہ بات ثابت ہو گئی تو میں اپنی بہن کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہوں گی..... شرمندگی ہوگی..... بہت تباہی پھیلے گی جانے کیا ہو جائے۔"

"ارے کچھ نہیں ہو گا..... تم فکر مت کرو۔" فیاض حسین نے یقین سے کہا۔ "اور اگر قسمت میں کچھ ہونا ہی لکھا ہے تو اسے بھگتیں گے..... آؤ اب سو جاؤ۔"

ٹیپ ریکارڈر پر یہ ساری گفتگو سن کر بابر علی سناٹے میں آگیا۔ اس نے دروازہ کھول کر سامنے سے گزرتی راشدہ سے کہا۔ "بیٹا ذرا امی کو بھیجنا۔"

"جی اچھا ابو۔"

چند منٹ کے بعد صابرہ کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ "آپ نے مجھے بلایا۔"

"ہاں..... میں نے تمہیں بلایا ہے..... ذرا دروازہ بند کر دو اور میرے پاس آؤ۔" بابر علی نے کہا۔

"شاید آپ بھول گئے کہ شادی آپ کی نہیں آپ کے بیٹے کی ہوئی ہے۔" صابرہ بولی۔

"ہاں مجھے معلوم ہے وقت ضائع مت کرو اور دروازہ بند کر کے ادھر آؤ۔" بابر علی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ بابر علی کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ صابرہ کی شوخی ہوا ہو گئی..... اس نے خاموشی سے دروازہ بند کیا اور بابر کے نزدیک آکر بولی۔ "خیر تو ہے۔"

"خیر کہاں؟" بابر علی نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "میں اپنے چاروں طرف طوفان اٹھتا ہوا دیکھ رہا ہوں..... کالی آندھی چل رہی ہے..... سمندر موجیں مارتا ہماری طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔"

"بابر آپ کو کیا ہو گیا ہے۔" صابرہ نے پوچھا۔

"تمہاری بہن نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔"

"کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔"

"نیلم واجدہ کی بیٹی نہیں ہے۔"

"لیکن رات کو تو آپ نے کہا تھا کہ....."

"رات کی بات چھوڑو۔" بابر علی نے صابرہ کی بات کاٹ کر کہا۔ "یہ ٹیپ سنو۔"

"خدا کا شکر ہے کہ آج ہم بچ گئے۔" واجدہ کی آواز سنائی دی۔

صابرہ نے اپنے کان پوری توجہ سے ٹیپ کی طرف لگا دیئے جوں جوں واجدہ اور فیاض کی گفتگو آگے بڑھتی جارہی تھی صابرہ کے ہوش اڑتے جارہے تھے وہ گھبرا گھبرا کر بابر علی کو دیکھ رہی تھی۔

پھر اس پُراسرار گفتگو کا آخری جملہ سنائی دیا۔ "ارے کچھ نہیں ہوگا تم فکر مت کرو اور اگر قسمت میں کچھ ہونا ہی لکھا ہے تو اسے بھگتیں گے..... آؤ اب سو جاؤ۔"

جملے کے ختم ہوتے ہی بابر علی نے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبا دیا۔ کمرے میں ایک سوگوار سناٹا چھا گیا ایسا لگا جیسے کسی کی موت ہو گئی ہو۔

موت واقعی ہو گئی تھی یہ اس بھروسے کی موت تھی جو ایک بہن نے دوسری بہن پر کیا تھا۔

صابرہ کو جہاں اپنی سگی بہن کے دھوکا دینے کا دکھ تھا وہاں اسے غصہ بھی تھا۔

"میں اس کمینی کو اپنے گھر میں نہیں رکھوں گی..... پتہ نہیں کس ذلیل کی اولاد ہے..... جب سے ہمارے گھر میں آئی ہے ..... تباہی پھیلا دی ہے میں اس چڑیل کو طلاق دلوا دوں گی۔"

"صابرہ..... صابرہ۔" بابر علی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "ذرا صبر سے کام لو..... اس میں نیلم کا کیا قصور ہے اسے طلاق دلوا کر کیوں عذاب میں مبتلا کرنا چاہتی ہو..... سزا دینا ہی ہے تو اپنی بہن کو دو کہ اس نے اتنی بڑی حقیقت کو ہم سے کیوں چھپائے رکھا۔"

"اس کو تو میں ایسی سزا دوں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔" صابرہ نے غصے سے کہا۔

"صابرہ تمہیں یاد ہوگا کہ نیلم کی پیدائش پر لاہور سے خط آیا تھا اس خط میں مری میں نیلم کے پیدا ہونے کی اطلاع دی گئی تھی..... وہ سب کیا تھا۔" بابر علی نے صابرہ کو یاد دلایا۔

"وہ ڈرامہ ہی ہوگا..... پتہ نہیں کس کی لڑکی کو گود لیا ہے..... اس لڑکی کو اپنی بچی ثابت کرنے کیلئے وہ مری میں رہی..... ویسے ان لوگوں نے ڈرامہ بڑی کامیابی سے کیا..... آج تک اس کی حقیقت کا پتہ نہ چلنے دیا وہ تو بھلا ہو اس آدمی کا کہ جس نے یہ راز فاش کر دیا۔"

"صابرہ تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔" بابر علی نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"وہ کیا۔" صابرہ بولی۔

"تم ان لوگوں سے لڑو گی نہیں۔" بابر علی نے کہا۔ "میں تمہارے غصے سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن اس غصے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا..... جو ہونا تھا ہو چکا..... نیلم کس کی بیٹی ہے اس سے کیا فرق پڑتا ہے..... اب وہ ہماری ہو چکی ہے۔ ہماری عزت ہے۔"

"میں نیلم کو تو خیر بخش سکتی ہوں لیکن واجدہ کو کسی قیمت پر معاف نہیں کروں گی۔"

"تم کیا کرو گی۔" بابر علی نے پوچھا۔

"میں اب زندگی بھر اسے نیلم سے نہیں ملنے دوں گی اس نے ہمیں دکھ پہنچایا ہے تو ہم بھی اسے چین سے نہیں رہنے دیں گے..... اس نے دھوکا دے کر ہمارے دل کو تڑپایا تو ہم اس سے نیلم کو دور

Urdufans.com

کے اسے تڑپائیں گے۔"

بابر علی ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا اس نے صابرہ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانی اس کے اندر آگ بھڑکی ہوئی تھی وہ واجدہ سے اس مسئلے پر خوب لڑی پہلے تو واجدہ نے اس حقیقت سے انکار کرنے کی کوشش کی لیکن جب صابرہ نے بلند آواز میں ٹیپ سنوادیا تو دونوں میاں بیوی کی سٹی گم ہوگی اب دونوں میاں بیوی کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہ تھا بالآخر انہیں اقرار کرتے ہی بنی۔ اس بھیانک حقیقت کا اقرار تو انہیں کرنا ہی پڑا کہ اب اسے چھپانا ممکن نہ رہا تھا ساتھ میں جو شرمندگی تھی وہ قابل دید تھی۔ دونوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں..... نظریں اٹھتی نہ تھیں۔

شام کو فرقان ماموں آئے تو بابر علی نے پوری روداد سنائی اور وہ ٹیپ کی ہوئی گفتگو بھی سنوادی ساری تفصیل سن کر ماموں فرقان بولے۔ "حیرت ہے تمہیں گفتگو ٹیپ کرنے کا خیال کیسے آیا۔"

"ماموں جب میں نے واجدہ سے سید پور اور ولدار بٹ کے بارے میں سوالات کئے تو میں نے اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھی تھیں اسی سے مجھے اندازہ ہوا کہ دال میں کچھ کالا ہے..... تب میں نے اس کی بات پر یقین کر کے اسے فریب میں مبتلا کر دیا..... پھر مجھے خیال آیا کہ یہ کمرے میں جا کر فیاض سے اس معاملے میں گفتگو ضرور کرے گی..... تو میں نے اس کے کمرے میں جا کر ٹیپ ریکارڈ رکھ دیا اور اسے آن کر کے آگیا..... اس کا نتیجہ سامنے ہے..... آپ نے ساری گفتگو سن ہی لی۔" بابر علی نے اپنے کارنامے کی تفصیل بتائی۔

"ابھی ایک بات اور چھپائی ہے ان دونوں نے۔" ماموں فرقان نے ایک اور دھماکہ کیا۔

"وہ کیا ماموں۔" بابر علی نے پریشان ہو کر کہا۔

"میں اس وقت دادا غفور کے گھر سے آرہا ہوں..... انہوں نے اس اثر کے بارے میں اپنے علم کے ذریعے معلومات حاصل کی ہیں ان کے خیال کے مطابق یہ اثر تقریباً چھ ماہ پرانا ہے..... اور یہ جن سید پور سے نیلم کے ساتھ لگا ہے۔" ماموں فرقان نے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ یہ بات بھی دانستہ چھپائی گئی۔" بابر علی نے کہا۔

"آخر کیوں؟" صابرہ نے پوچھا۔

"ظاہر ہے یہ شادی پھر نہ ہوتی جس لڑکی پر جن کا سایہ ہو ایسی لڑکی سے جانتے بوجھتے کون شادی کرنے کی ہمت کرتا۔" ماموں فرقان نے جواب دیا۔

"یہ سید پور کا راز کیا ہے نیلم آخر وہاں کیوں گئی۔" بابر علی کچھ سوچتا ہوا بولا۔

"اس راز سے تو واجدہ ہی پردہ اٹھا سکتی ہے..... اسی سے پوچھو۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"میں پوچھوں گی اس سے..... اس طرح پوچھوں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔" صابرہ غصے سے بپھر اٹھی۔

"صابرہ اتنا غصہ مت کرو تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی۔" بابر علی نے اسے سمجھایا۔

"اب کونسی میری طبیعت ٹھیک ہے ان لوگوں نے میرے گھر کا سکون تباہ کر کے رکھ دیا ہے..... میرا بیٹا ایک عذاب میں مبتلا ہے۔" صابرہ نے بڑے کرب کے عالم میں کہا۔ "میں جانتی

Urdufans.com

ہوں اسے یہیں بلا کر لاتی ہوں اب جو کوئی بھی بات ہوگی سب کے سامنے ہوگی۔ ماموں بھی اس وقت یہاں موجود ہیں۔"

"بہت شدید غصے میں ہے۔" صابرہ کے جانے کے بعد ماموں فرقان بولے۔

"ماموں ویسے یہ غصے والی بات تو ہے۔ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ وہ سلوک کیا جو کبھی کوئی غیر بھی نہ کرتا..... میرا تو اب اپنوں سے ایمان اٹھ گیا ہے..... ایسے ہوتے ہیں اپنے..... عذاب میں مبتلا کرنے والے..... ذہنی سکون لوٹنے والے..... میں صابرہ کے سامنے زیادہ بولا نہیں..... میں اگر غصہ دکھاتا تو صابرہ آپے سے باہر ہو جاتی لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرا دل چاہ رہا ہے کہ ان دونوں میاں بیوی کو گھر سے کھڑے کھڑے نکال دوں۔" بابر علی نے کہا۔

"بابر تم سمجھدار آدمی ہو ذرا صبر سے کام لو غصہ کرو گے تو حقائق پوری طرح سامنے نہیں آئیں گے اور اس وقت ضرورت اس بات کی ہے ہمارے سامنے پورے حقائق آجائیں تاکہ نیلم کو اس سے نجات دلوائی جاسکے۔" ماموں فرقان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "نیلم پر جو سایہ ہے وہ اتنی آسانی سے دور ہونے والا نہیں ہے اس کیلئے بہت محنت کرنا پڑے گی۔" ماموں فرقان ابھی بابر علی کو سمجھا ہی رہے تھے کہ دروازے پر زور زور سے بولنے کی آواز سنائی دی۔ واجدہ اور فیاض حسین مجرموں کی طرح گردن جھکائے کمرے میں داخل ہو رہے تھے اور صابرہ بولے جا رہی تھی جو اس کی نوک زبان پر آرہا تھا وہ بے نقط سنا رہی تھی وہ خاموشی سے سننے پر مجبور تھے ایک تو بیٹی والے تھے اوپر سے کام ایسے کیے تھے کہ بغیر سنے چارہ نہ تھا۔

جب صابرہ مستقل بولتی چلی گئی اس کا غصہ بڑھتا ہی گیا تب بابر علی نے اسے روکا اور چپ رہنے کی تلقین کی۔ "صابرہ چپ ہو جاؤ۔"

"میں کیسے چپ ہو جاؤں میرے کلیجے میں آگ لگی ہوئی ہے۔"

"بھائی صاحب انہیں بولنے دیں ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جانے دیں ہم لوگ واقعی قصوروار ہیں ہم نے نیلم کے بارے میں حقائق چھپا کر بہت زیادتی کی ہے..... اگر ان کی جگہ ہم ہوتے تو اسی طرح کا ردعمل سامنے آتا۔" فیاض حسین نے بڑے التجا بھرے لہجے میں کہا۔

"بھئی فیاض صاحب یہ سب ہوا کیسے؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"ماموں میں اب کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ ایک ایک بات تفصیل سے بتاؤں گا..... بس ذرا صابرہ کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔"

"صابرہ بھئی اب تم کچھ نہیں بولو گی۔" ماموں فرقان نے صابرہ کو تنبیہہ بھرے لہجے میں کہا۔

ماموں فرقان کی ہدایت پر صابرہ نے خاموشی اختیار کر لی..... تب فیاض حسن نے کہنا شروع کیا..... ابتداء اس نے اپنی شادی سے کی۔

واجدہ سے شادی کر کے فیاض حسین بہت خوش تھا اور کیوں نہ ہوتا، یہ ان کی محبت کی شادی تھی۔ شادی کے بعد فیاض حسین نے سوچا تھا کہ اگر پانچ سال تک بھی ان کے یہاں بچہ نہ ہو تو کوئی بات نہیں فیاض حسین کے برخلاف واجدہ کو بچوں سے بہت دلچسپی تھی وہ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد ایک گول مٹول

پیارے بچے کی ماں بن جائے۔ فیاض حسین کی ماں بھی یہی چاہتی تھی لہٰذا شادی کے ایک سال بعد ہی دونوں ساس، بہو نے ڈاکٹروں کے چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔

معائنے کے دوران جو صورت حال سامنے آئی وہ واجدہ کی زندگی جہنم بنانے کیلئے کافی تھی۔ فیاض حسین نے اس وقت عقلمندی کا ثبوت دیا جو کچھ ڈاکٹروں نے بتایا وہ اس نے اپنی ماں کو نہ بتایا ساتھ ہی اس نے واجدہ کو بھی منع کر دیا کہ وہ بھی ماں سے کوئی تذکرہ نہ کرے۔ یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ جس دن معائنے کی رپورٹیں ملنے والی تھیں اس دن واجدہ کی ساس کی طبیعت خراب ہو گئی وہ اس کے ساتھ نہ جا سکی تب وہ مجبوراً فیاض کو اپنے ساتھ لے گئی کلینک پر رپورٹیں دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے جو روح فرسا خبر سنائی اسے فیاض حسین نے بڑے صبر سے سنا لیکن واجدہ برداشت نہ کر سکی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اس دن فیاض حسن نے خدا کا بڑا شکر ادا کیا کہ واجدہ کے ساتھ اس کی ماں نہ تھی ورنہ گھر جاتے ہی ماں کا سب سے پہلا مطالبہ یہی ہوتا۔

"فیاض اس کلموہی کو طلاق دو۔"

اگر طلاق کا مطالبہ نہ ہوتا تو دوسری شادی کا حکم ضرور دیا جاتا۔

فیاض حسین کو ان دونوں باتوں میں کوئی بات منظور نہ تھی۔ وہ واجدہ کو طلاق دینا چاہتا نہ دوسری شادی کا خواہشمند تھا اسے واجدہ ہر قیمت پر عزیز تھی وہ اس کی محبت تھی۔

ماں نے یہ روح فرسا خبر نہ سنی اس سے فیاض کو سہولت ہو گئی۔ فیاض نے واجدہ کو اپنی ماں کے عتاب سے تو بچا لیا لیکن ڈاکٹری معائنے کے بعد واجدہ خود جس آگ میں جلنے لگی اس سے اسے وہ نہ بچا سکا۔

بات کچھ بھی ہوتی لیکن واجدہ گھوم پھر کر بچہ پر پہنچ جاتی۔ اب ان کی شادی کو ڈیڑھ سال ہو چکا تھا۔ واجدہ کی بے قراری کا وہی عالم تھا۔ ایک رات جب وہ دونوں سونے کیلئے لیٹے تو واجدہ نے کہا۔ "فیاض ایک بات بتاؤ گے۔"

"ہاں پوچھو۔" فیاض نے جواب دیا۔

"اپنا چہرہ میری طرف کر لو۔" واجدہ نے پیار سے کہا۔

"اچھا کوئی بہت خاص بات ہے کیا۔" فیاض حسین نے کروٹ لے کر اپنا چہرہ واجدہ کی طرف کر لیا۔

"ہاں ..... اب بولو۔"

"تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے۔" واجدہ نے ایک عجیب سوال کیا۔

"میری محبت کا حال مجھ سے پوچھتی ہو کیا تم خود نہیں جانتیں۔" فیاض حسین بولا۔

"میں تمہاری زبانی سننا چاہتی ہوں۔"

"اچھا سنو پھر میری جان تمہارے اندر ہے میں تم سے ہوں ..... تم ہو تو میں ہوں ..... تم نہ رہیں تو میں بھی نہ رہوں گا۔"

"اور تمہیں بچوں سے کتنی محبت ہے۔" وہ بولی۔

"میں بچوں کے بغیر ساری زندگی تمہارے ساتھ رہ سکتا ہوں۔" فیاض حسین نے بڑے وثوق سے

Urdufans.com

کہا۔

"لیکن فیاض میں بچے کے بغیر نہیں رہ سکتی مجھے ہر قیمت پر بچہ چاہئے۔"

"تم جانتی ہو کہ ڈاکٹر نے تمہارے بارے میں کیا کہا ہے۔"

"ہاں جانتی ہوں اس نے کہا ہے کہ میں بنجر زمین ہوں، بانجھ ہوں، میری کوکھ سے کوئی بچہ جنم نہیں لے سکتا۔" واجدہ نے افسردگی سے کہا۔

"جب تم یہ جانتی ہو تو پھر مجھے بتاؤ بچہ کہاں سے آئے گا۔"

"بچہ!" واجدہ نے کہا۔ ابھی وہ اپنی بات پوری نہ کر پائی تھی کہ ان دونوں نے ایک چیخ کی آواز سنی۔

یہ چیخ فیاض حسین کی ماں کے علاوہ کسی کی نہ تھی۔

چیخ کی آواز سن کر دونوں پریشان ہو گئے جس بات کو انہوں نے اتنی رازداری سے سات پردوں میں چھپا رکھا تھا شاید وہ بات فیاض حسین کی ماں نے سن لی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی بہو بانجھ ہے، سوکھا درخت ہے، خشک نہر ہے، بن پانی کا بادل ہے، وہ کسی کو کچھ نہیں دے سکتی، وہ اب اپنی گود میں اپنے پوتے کو نہیں کھلا سکتی۔

اس بھیانک حقیقت نے فیاض کی ماں کو شاید ایک جنونی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ تبھی وہ ہذیانی انداز میں چیخی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام لے کر آواز دی تھی۔ "فیاض۔"

جبکہ روم کا دروازہ مکمل بند نہ تھا، کمرے کی آواز باہر اور باہر کی آواز باآسانی اندر آ سکتی تھی۔

ماں بھاری میں چاروں خانے چت لیٹی تھی اور اس پر بیہوشی طاری تھی۔

فیاض نے اپنی ماں کے چہرے کو ادھر اُدھر ہلایا لیکن اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔

"فیاض، جلدی کریں، اماں کو اسپتال لے چلیں۔" واجدہ نے اپنی ساس کو بیہوش دیکھ کر کہا۔

تب فیاض نے اپنی ماں کو گود میں اٹھایا۔ اٹھا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹایا۔ واجدہ نے اپنی ساس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس نے کتنی بار اسے آواز دی۔ "اماں، اماں۔"

لیکن اماں تک بہو کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ اماں کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ اسے رک رک کر سانس آ رہی تھی۔ "فیاض جلدی کرو۔" واجدہ نے بے قراری سے کہا۔ فیاض سے گھبراہٹ میں گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں ہی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ واجدہ کا بھی یہی حال تھا۔ اس نے بھی کپڑے تبدیل نہ کئے تھے۔ ویسے یہ وقت کپڑوں کا خیال رکھنے کا نہ تھا، اماں کا خیال رکھنے کا تھا۔

فیاض کو اپنی ماں سے بے حد لگاؤ تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر اسپتال پہنچ جائے۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ اسے اس بات کا شبہ زیادہ تھا کہ اماں نے کمرے میں ہونے والی گفتگو سن لی تھی اور اس گفتگو کو سن کر وہ اپنے ہوش کھو بیٹھیں۔

اسپتال کا ایک بڑا ڈاکٹر ڈاکٹر تنویر اس کا دوست تھا۔ اتفاق سے اس وقت وہ ڈیوٹی پر بھی تھا۔ اس کی

urdufans.com

وجہ سے مریضہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کو خاص نگہداشت کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔
لیکن اب اماں کو کسی نگہداشت کی ضرورت رہی تھی، نہ علاج کی۔ وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملی تھیں۔ ان کا انتقال گاڑی میں ہی ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر تنویر نے محض دل کی تسلی کے لئے اس کا معائنہ کیا تھا۔

ڈاکٹر تنویر نے بعد میں اماں کے انتقال کی وجہ دل کا شدید دورہ بتایا۔

اس راز سے پھر کبھی پردہ نہ اٹھ سکا کہ اماں نے ان دونوں کی گفتگو سن لی تھی اور اپنی بہو کے شجر بے سایہ ہونے کے صدمے نے انہیں دل کے دورے میں مبتلا کر دیا تھا یا انہیں اپنے کمرے میں دل کا دورہ پڑا اور وہ گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکلیں۔ دورہ کیونکہ شدید تھا سنبھل نہ سکیں وہیں چیخ مار کر گر گئیں۔

بہرحال کچھ بھی ہوا ہو، اماں اب اس گھر میں نہ رہی تھیں۔ کوئی بچہ نہ ہونے کی وجہ سے اس گھر کا آنگن پہلے ہی سُونا تھا، اب سارا گھر ہی سُونا ہو گیا تھا۔

واجدہ کو اپنے شجر بے سایہ ہونے کا پہلے ہی کیا کم صدمہ تھا کہ اب اس کے سر سے ہی سایہ اٹھ گیا تھا۔ یہ گھر اب اسے کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ اماں تھیں تو وہ ان سے باتیں کر کے اپنا جی بہلا لیا کرتی تھی۔ اب گھر میں کوئی نہ رہا تھا کس سے باتیں کرتی۔ فیاض مصروف آدمی تھا اس کا ایک فلم ڈسٹری بیوشن آفس تھا۔ وہ صبح کا نکلا شام کو گھر پلٹتا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ دفتر سے ہی اسٹوڈیو چلا جاتا وہاں سے پھر رات گئے واپسی ہوتی۔ اس اثناء میں واجدہ اتنے بڑے گھر میں، کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح اس کمرے سے اس کمرے میں اور اس کمرے سے صحن میں منڈلاتی رہتی۔ وہ ایک سمجھدار عورت تھی اپنے شوہر کے کام کی نوعیت سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس لئے وہ اس سے کبھی نہ الجھتی۔ وہ جب بھی گھر آتا اس کا مسکرا کر استقبال کرتی۔

ویسے بھی یہ وہ مرد تھا جس نے اس سوکھی ٹہنی کو گلے کا ہار بنایا ہوا تھا۔ وہ اس سے شدید محبت کرتا تھا۔ پھر وہ اپنی تنہائیوں کا رونا رو کر، اسے جلدی گھر آنے پر کیوں مجبور کرتی۔

فیاض کو تو ویسے ہی اس کا بہت خیال تھا۔ اس نے ایک ملازمہ اس کے لئے رکھ دی تھی۔ واجدہ گھر میں کل وقتی ملازمہ رکھنے کی قائل نہ تھی۔ اسے گھر میں اپنے ہاتھ سے کام کرنا زیادہ پسند تھا۔ لہٰذا جب تک اماں زندہ رہیں، اس نے فیاض کے کہنے کے باوجود گھر میں کبھی ملازمہ نہ رکھی۔

فیاض نے اب ملازمہ رکھی تو واجدہ نے سختی سے انکار نہ کیا۔ اس نے سوچا چلو گھر میں ایک سے دو بھلے کام وام تو ایسا کوئی خاص نہ تھا بس باتیں ہی باتیں تھیں۔

حسنہ اچھے مزاج کی عورت تھی۔ سمجھدار تھی جلد ہی دونوں کا ایک دوسرے میں دل لگ گیا۔ حسنہ، حسینہ کی بڑی بہن تھی حسینہ ایک ایکسٹرا گرل تھی۔ وہ ڈانس ڈائریکٹر عزیز کے گروپ میں تھی۔ گروپ ڈانس کے موقع پر حسینہ کو دو چار شاٹ دینے کے لئے بلا لیا جاتا۔ حسینہ صورت شکل کی اچھی تھی۔ وہ اس کوشش میں تھی کہ اب ناچ گانوں سے ہٹ کر کوئی چھوٹا موٹا رول مل جائے۔ اس سلسلے میں وہ فلسازوں کے دفتروں کے چکر کاٹتی رہتی تھی ایک دن فیاض حسین سے بھی ٹکرا گئی۔ فیاض نے کوشش کر کے

ایک فلموں میں اسے چھوٹے موٹے رول دلوا دیئے۔ وہ اس سلسلے میں اس کی بہت ممنون تھی اور اکثر اس کے دفتر آتی رہتی تھی۔ ایک دن فیاض نے اس سے کسی ملازمہ کے بارے میں پوچھا کہ اگر اس کی نظر میں کوئی شریف اور ضرورت مند عورت ہو تو بتائے۔ تب حسینہ نے اپنی بہن حسنہ کا نام لیا۔ اس کے شوہر نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا تھا وہ اپنی بہن حسینہ کے پاس آگئی تھی۔ حسنہ کا شوہر اسے برے راستے پر ڈالنا چاہتا تھا جبکہ وہ اس کے لئے راضی نہ تھی۔ تب اس نے دھکے دے کر اپنے گھر سے نکال دیا۔

فیاض نے سوچا، چلو مظلوم عورت ہے۔ گھر میں پڑی رہے گی۔ واجدہ کا جی بھی بہل جائے گا اور وہ گھر کا کام کاج بھی سنبھال لے گی۔ یہ سوچ کر اس نے حسنہ کو اپنے دفتر بلوایا۔

عورت اسے سلیقے کی محسوس ہوئی اس نے اسے فوراً اپنے گھر میں ملازمت دے دی۔ حسنہ نے بہت جلد واجدہ کے دل میں اپنی جگہ بنالی۔ واجدہ کو بھی وہ اچھی لگنے لگی۔

حسنہ سولہ سال کی تھی، تب اس کی شادی ہوئی۔ اب اس کی شادی کو چار سال ہو چکے تھے اس اثناء میں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جو ایک سال کا ہو کر مر گیا تھا۔ اس کے بعد سے پھر کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔

حسنہ سید پور بیاہی تھی۔ وہ تھوڑا بہت پڑھی لکھی تھی۔ اسے لفظوں کی پہچان تھی جبکہ اس کا شوہر نپٹ ان پڑھ تھا، اس کے پاس اپنی زمین کوئی نہ تھی وہ دوسروں کے کھیتوں میں کام کر کے روزی حاصل کرتا تھا۔ حسنہ کے شوہر کو مستقل کام کرنے کی عادت نہ تھی۔ دو دن کام کرتا تو دو دن آرام، کھیل تماشے کا بڑا شوقین تھا۔ سید پور میں کبھی کوئی چلتا پھرتا سینما آجاتا تو وہ کام کو بھول کر "منڈوا" کے چکر لگاتا رہتا۔

حسنہ نے یہ چار سال اس کے ساتھ بڑے عذاب میں گزارے۔ اس نے خود محنت مزدوری کی، خود بھوکی پیاسی رہی، فاقے کئے مگر مست رہی۔ کبھی اس نے زبان سے اُف بھی نہ کی مگر جب اس کا شوہر بالکل پٹڑی سے اتر گیا اور اس نے حسنہ کو پیسے کمانے کی مشین بنانا چاہا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"دنیا سے یہ نہیں ہو سکتا۔" اس نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کہا۔ "میں فاقے کر سکتی ہوں لیکن اپنی چادر کو نہیں فروخت کر سکتی۔ تو یہ بات اپنے دماغ سے نکال دے کہ میں تیرے بتائے ہوئے گندے راستے پر چلوں گی۔"

"میرے راستے پر نہ چلی تو یاد رکھ پھر سارے راستے بند ہو جائیں، البتہ ایک راستہ کھل جائے گا اور وہ ہے تیرے گھر کا راستہ واپسی کا راستہ۔" اس نے غصے سے کہا۔

"ہاں میں واپس چلی جاؤں گی۔" حسنہ کو بھی غصہ آگیا۔

"پھر میں تجھے کبھی نہ بلاؤں گا۔" اس نے دھمکی دی۔

"میں کبھی نہ آؤں گی۔" حسنہ نے دھمکی قبول کر لی۔

پھر حسنہ نے انتظار نہ کیا اسی دن گاڑی میں بیٹھ کر لاہور پہنچ گئی۔ اسٹیشن سے تانگے میں بیٹھ کر دھرم پورے پہنچی۔ دھرم پورے میں اس کی ماں رہتی تھی ایک چھوٹی بہن تھی حسینہ۔ ایک بھائی بھی تھا لیکن باپ کے مرنے کے بعد اس نے گھر سے منہ موڑ لیا تھا۔ اب وہ کہاں تھا کوئی نہ جانتا تھا اس کی ماں

دوسرے گھروں میں کام کر کے کچھ کما لیتی تھی۔ حسینہ فلم لائن میں ہاتھ پیر مار رہی تھی۔ وہ ماں پر بوجھ تھی، اپنا خرچہ خود نکال لیتی تھی۔ حسنہ گھر میں داخل ہوئی تو ماں نے اس کا چہرہ دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ کچھ ہو گیا ہے۔ وہ ماں کو دیکھ کر اس کے گلے لگ گئی اور خوب روئی۔ اتنا روئی کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ماں نے اسے بمشکل الگ کر کے پانی پلایا اور اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ پھر بولی۔

"وزیرے نے تجھے نکال دیا ہے۔"

"ماں تو نے مجھے کہاں بیاہ دیا، اسے تو معلوم ہی نہیں عورت کیا ہوتی ہے۔ وہ تو عورت کو مرد سے دار پان سمجھتا ہے۔ چبایا اور تھوک دیا۔ ماں میں مر جاؤں گی مگر اب وزیرے کے گھر نہیں جاؤں گی۔ ان چار سالوں میں اس نے اتنے دکھ دیئے ہیں کہ تجھے کیا بتاؤں، ماں وہ بالکل نکھٹو ہے وہ کوئی کام کرنا جانتا ہی نہیں، وہ تو اپنی عورت سے کام کرانا چاہتا ہے۔ ماں وہ بہت بڑا شوہر ہے جس پر تھوکا تو جا سکتا ہے اس کے ساتھ رہا نہیں جا سکتا۔" حسنہ کی آنکھوں میں پھر سے آنسو بھرنے لگے۔

"تو تھوک آئی اس پر۔" ماں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ماں میں اس پر تھوک آئی ہوں۔" حسنہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"اگر وہ تجھے لینے آیا تو نہ جائے گی۔" ماں نے پوچھا۔

"اول تو وہ مجھے لینے نہیں آئے گا، میں اس کے مطلب کی عورت نہیں ہوں۔ اگر وہ بھولا بھٹکا آ گیا تو میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" حسنہ نے بڑے پُر وثوق انداز میں کہا۔

"چاہے اسے اپنی غلطی کا احساس ہی کیوں نہ ہو جائے۔" ماں نے پھر پوچھا۔

"اگر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں اپنی عورت کی غیرت اور عزت جاگ اٹھی تو پھر میں اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔" حسنہ نے فیصلہ سنایا۔

"یہ عورت بھی اللہ میاں نے کیا چیز بنائی ہے۔" اس کی ماں نے ہنس کر کہا۔

"اللہ نے تو بہت اچھی چیز بنائی ہے، ماں۔" حسنہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "ان مردوں نے اس کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اتنا گرا دیا ہے کہ وہ بلندی پر کھڑی ہونا بھی چاہے تو نہ ہو سکے۔"

اس طرح کی باتیں جب وہ واجدہ سے کرتی تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہتی۔ حسنہ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی وہ بس لفظ آشنا تھی لیکن وہ باتیں بہت سمجھداری کی کرتی تھی۔ واجدہ اس سے اس کی باتیں سنتی تو وہ کٹ کٹ جاتی۔ ایک اچھی خاصی سلیقے مند لڑکی کو کیسا جاہل اور دیہاتی شوہر نصیب ہوا تھا۔ اگر کوئی ذرا بھی سمجھدار شوہر ہوتا تو ایسی پیاری بیوی کے پاؤں دھو دھو کر پیتا۔ حسنہ، حسینہ سے کہیں خوبصورت تھی۔ اگر وہ فلم لائن میں جانا چاہتی تو شاید اسے جلد کام مل جاتا لیکن اسے اداکاری سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنی چھوٹی بہن حسینہ سے بالکل مختلف تھی۔ واجدہ اکثر اس کے بارے میں سوچتی کہ اگر حسنہ تعلیم یافتہ ہوتی اور کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئی ہوتی تو آج وہ کسی گھر میں ملازمہ کے بجائے مالکہ ہوتی لیکن قسمت بھی آخر کوئی چیز ہے۔ شاید یہ اسی لئے کہتے ہیں کہ اللہ لڑکیوں کو صورت نہ دے لیکن ان کے مقدر اچھے نصیب کرے۔ اچھا مقدر بُری صورتوں کو بھی اچھا بنا دیتا ہے لیکن اچھی صورتوں سے مقدر اچھے نہیں ہوتے۔

Urdufans.com

حسنہ، واجدہ کے گھر میں آکر بہت خوش تھی۔ واجدہ اسے ملازمہ نہیں سمجھتی تھی۔ وہ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس کی قدر کرتی تھی۔ وجیرے وجیرے حسنہ کو اس گھر کا تمام حال معلوم ہو گیا۔ واجدہ نے اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ اپنے سارے دکھ بیان کر دیئے۔

جب حسنہ، واجدہ کا دکھ سنتی تو سوچتی کہ یہ دکھ صرف غریبوں کے پلے ہی نہیں بندھے بلکہ یہ تو ہر اس جگہ مل جاتے ہیں جہاں یہ شاذ و نادر ہی نہیں ہوتا کہ یہاں بھی دکھ ہوں گے۔ اللہ بڑا انصاف والا ہے۔ جب وہ کچھ دیتا ہے تو کچھ چھین بھی لیتا ہے۔ اچھی صورت دی تو اس سے خوشحالی چھین لی، خوشحالی دی تو اولاد سے محروم کر دیا۔ بے پناہ دولت سے نوازا مگر ایسی بیماری دے دی کہ ڈبل روٹی کے ایک پیس کے سوا کچھ نہ کھا سکے۔ دولت مند ہونا اس بات کی ضمانت نہیں کہ وہ ہر غم سے آزاد ہے۔

واجدہ کا دکھ اسے آٹھ آٹھ آنسو رلاتا۔ حسنہ ایک درد مند دل رکھنے والی عورت تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنی مالکن کا دکھ کس طرح بٹائے۔ وہ جن پیروں، فقیروں کو جانتی تھی وہاں سے تعویذ گنڈے لے آئی تھی لیکن تعویذوں گنڈوں سے کبھی اولاد پیدا ہوتی ہے اور ایسی صورت میں جب عورت کسی سوکھی ٹہنی کی طرح ہو۔

جب سے حسنہ اس گھر میں آئی تھی اور واجدہ کے دکھ سے آشنا ہوئی تھی وہ تواتر سے ایک خواب دیکھتی تھی۔ وہ خواب میں دیکھتی کہ ایک بہت خوبصورت باغ ہے چاروں طرف سبزہ ہے، پھول ہی پھول ہیں، پھولوں کے درمیان ایک سولہ سترہ سال کی نہایت حسین لڑکی بیٹھی ہے۔ واجدہ اس لڑکی کے قریب جاتی ہے تو وہ لڑکی اس کے پاس آجاتی ہے۔ تبھی حسنہ کہیں سے نمودار ہوتی ہے اور واجدہ کو اس لڑکی کے پاس دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہے اور واجدہ سے کہتی ہے بی بی جی، اس لڑکی کو اپنے گلے سے لگالیں۔ یہ آپ کی بیٹی ہے۔" یہ سن کر واجدہ بہت خوش ہوتی ہے اور اس حسین جمیل لڑکی کو "میری بیٹی۔" کہہ کر گلے سے لگالیتی ہے۔

یہ خواب حسنہ نے سیکڑوں مرتبہ دیکھا تھا۔ یہ خواب اسے اسی طرح نظر آتا تھا اس میں کوئی ترمیم اضافہ نہ ہوتا تھا۔

ایک دن صبح حسنہ سو کر اٹھی تو اس کی طبیعت کچھ بھاری بھاری سی تھی۔ متلی کی سی کیفیت ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر باتھ روم گئی تو وہاں اسے قے ہوئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔

جب ذرا اس کی طبیعت سنبھلی اور ابکائیوں سے اس کو نجات ملی تو واجدہ نے حسنہ کو لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا جہاں ڈاکٹر نے اس کے امید سے ہونے کی نوید سنائی۔

حسنہ گھر آکر واجدہ سے لپٹ گئی۔ واجدہ نے پوچھا۔ "بہت خوش ہو۔"

"ہاں بی بی جی، میں بہت خوش ہوں مجھے میرے خواب کی تعبیر ملنے والی ہے۔" حسنہ نے خوش ہو کر کہا۔

"کیا مطلب۔" واجدہ سمجھ نہ پائی۔

"بی بی جی، میں خواب بہت کم دیکھتی ہوں اور کبھی دیکھتی ہوں تو وہ ہمیشہ سچے نکلتے ہیں۔" وہ بولی۔

Urdufans.com

"ایسا کیا خواب دیکھ لیا تم نے۔" واجدہ نے وضاحت چاہی۔

"میں آپ کو بتاؤں۔ اچھا میں نہیں بتاتی۔ آپ بتایئے کہ کیا ہوگا۔ لڑکی یا لڑکا۔" حسنہ نے پوچھا۔ "لڑکا ہوگا۔" واجدہ نے اسے خوش کرنے کے ایسے ہی کہہ دیا۔

"نہیں بی بی جی میں آپ کو ابھی سے بتائے دیتی ہوں کہ لڑکی ہوگی، میرے خواب بڑے سچے ہوتے ہیں۔"

"اری حسنہ تو اللہ والی بنتی جارہی ہے۔ بڑی پیشگوئی کرنے لگی ہے۔" واجدہ نے ہنس کر کہا۔

"بی بی جی، آپ کو یاد نہیں۔ میں نے جب بھی وہ خواب دیکھا ہے، آپ کو بتایا ہے، کیا آپ کو میرا وہ خواب یاد نہیں۔" حسنہ نے کہا۔

"ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" واجدہ مسکرا کر بولی۔

"بس پھر سمجھ لیجئے کہ آپ کی بیٹی آرہی ہے۔" حسنہ نے انکشاف کیا۔

"حسنہ تو جو بات کہہ رہی ہے، اس کا مطلب سمجھتی ہے نا۔" واجدہ نے تصدیق چاہی۔

"ہاں، میں جو بات کہہ رہی ہوں، اس کا مطلب خوب سمجھتی ہوں۔" حسنہ نے بڑے یقین سے کہا۔

"کیا واقعی یہ میری بیٹی ہوگی۔" واجدہ خوشی سے جھوم کر بولی۔

"ہاں، بی بی جی، مجھ سے آپ کا دکھ نہیں دیکھا جاتا میں سوچتی رہتی تھی کہ آپ کے کسی طرح کام آجاؤں۔ میں سوچتی رہتی تھی اور خواب دیکھتی رہتی۔ آج میری سوچ، میرا خواب حقیقت کا روپ دھار گیا ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ آنے والا بچہ جو یقیناً لڑکی ہے، آپ کا ہوگا۔ میں اسے پہلے ہی دن سے آپ کی گود میں ڈال دوں گی۔ پھر آپ کو کوئی نہ کہہ سکے گا کہ آپ بانجھ ہیں، میں آپ کو ماں بنادوں گی۔" حسنہ نے واجدہ کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

واجدہ کو بچے کی بڑی خواہش تھی اور جب سے اسے اپنے بارے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ زندگی بھر بچے کی ماں نہ بن سکے گی تب سے بچے کی خواہش اور شدید ہوگئی تھی۔ یہ انسانی فطرت ہے کسی چیز سے محرومی اس چیز کے لئے شدت اختیار کرلیتی ہے اسے حاصل کرنے کی تڑپ بڑھ جاتی ہے۔

واجدہ کی محرومی دیکھ کر، فیاض اس سے کسی کا بچہ گود لینے کا مشورہ دیتا لیکن واجدہ یتیم خانے سے بچہ لاکر پالنا نہ چاہتی تھی۔ وہ ایسا بچہ گود لینا چاہتی تھی جو پہلے ہی دن سے اس کی گود میں آجائے اور پھر اس کے والدین اس بچے سے کوئی غرض نہ رکھیں۔ وہ اس بچے کو اپنا بچہ مشہور کرکے پالنا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فیاض کے کہنے کے باوجود اس نے کسی بڑے بچے کو گود لینے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ اب یہ موقع خود بخود اس کے ہاتھ آگیا تھا وہ اس سنہری موقع سے ہر قیمت پر فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

حسنہ کے سامنے ایک پہاڑ سی زندگی پڑی تھی۔ اسے بچے کی ایسی خواہش نہ تھی اور ان حالات میں کہ غربت اس کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھی۔ نکھٹو شوہر سے واسطہ تھا۔ وہ اولاد کا روگ پال کر کیا کرتی پھر جسے وہ اس گھر میں آئی تھی، تب سے اسے پتہ چلا کہ خلوص اور محبت کیا چیز ہے۔ اسے واجدہ بہت پسند تھی اس سے اپنی مالکن کا دکھ نہ دیکھا جاتا تھا۔ جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ وہ امید سے ہے، اس نے فوراً فیصلہ

Urdufans.com

کرلیا کہ وہ اپنے آنے والے بچے کو واجدہ کی گود میں ڈال دے گی۔

واجدہ نے اس خوشخبری کو فوراً فیاض کو بتایا۔ فیاض نے اس کی باتیں غور سے سنیں اور پھر بولا واجدہ، بچہ گود لینے میں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن بعد میں یہ نہ ہو کہ بچہ بڑا ہو جائے تو وہ ہمارے در پر آکر کھڑی ہو جائے کہ میرا بچہ واپس کرو، ذرا اس کو پکا کرلینا۔ وہ بچہ ہمارے حوالے کر کے بھول جائے۔ ایک تو کبھی اپنا بچہ ہونے کا دعویٰ نہ کرے، دوسرے اس راز کو ہمیشہ راز رکھے۔ اس لئے کہ ہم اسے اپنا بچہ بنا کر پالیں گے۔ بڑے ہو کر کبھی اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ ہماری اولاد نہیں ہے تو اس کی شخصیت متاثر ہوگی۔"

"یہ آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں اس سے ساری بات پکی کرلوں گی۔" واجدہ نے کہا۔

دوسرے دن واجدہ نے حسنہ کے سامنے سارے خدشات ظاہر کر دیئے۔ وہ بولی۔ "دیکھ حسنہ آج تو جوش میں ہے۔ میری محبت میں، یا مجھے دکھی دیکھ کر تو نے مجھے اپنا بچہ دینے کی ہامی بھرلی ہے لیکن ایک بات میں تجھے صاف صاف بتائے دیتی ہوں کہ اگر تو نے ایک مرتبہ بچہ میری خالی گود میں ڈال دیا تو وہ ہمیشہ کے لئے میرا ہو جائے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بچہ بڑا ہو جائے پھر تو اسے دیکھے، تیری ممتا جوش مارے اور اس جوش میں تو ہم سے اس کی واپسی کا مطالبہ کر دے۔ ایک بات تو اچھی طرح کان کھول کر سن لے بچے سے تیرا دعویٰ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ تو اس راز کو ہمیشہ راز رکھے گی۔ کسی پر ظاہر نہیں کرے گی، حتیٰ کہ بچے پر بھی نہیں۔ بچہ دیکھنے کی تجھے اجازت ہوگی۔ صرف دیکھنے کی، زبان پر تیری ایک لفظ نہ آئے گا۔"

"بی بی جی آپ یہ کیوں بھولتی ہیں کہ بچہ آپ نے مجھ سے مانگا نہیں میں نے آپ کو خود دینے کی پیشکش کی ہے۔ پھر میں آپ سے اسے واپس کیوں مانگوں گی۔ آپ نے میرا مشکل وقت میں ساتھ دیا ہے میں اس گھر میں ایک معمولی ملازمہ کی طرح آئی تھی لیکن آپ نے مجھے ملازمہ کب سمجھا۔ آپ نے مجھے عزت دی، مجھے چھوٹی بہنوں کی طرح سمجھا۔ میں آپ سے اس قدر محبت کرتی ہوں کہ اگر مجھ سے میری جان بھی مانگیں تو اس کے نذر کرنے میں پس وپیش سے کام نہ لوں گی۔ بچہ تو کوئی چیز نہیں، میں بچہ آپ کے اس طرح حوالے کروں گی کہ اس پر میرا حق خود بخود ختم ہو جائے گا آپ دیکھتی جایئے۔"

حسنہ کی یہ پیشگوئی کہ اس کے بطن سے لڑکی جنم لے گی۔ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ اس طرح وہ جو خواب تواتر سے دیکھتی تھی، سچ ثابت ہو گیا۔ لڑکی کو واجدہ کے حوالے کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"بی بی جی اس لڑکی کو اپنے گلے سے لگالیں یہ آپ کی بیٹی ہے۔"

تب واجدہ نے حسنہ سے اس کی بچی کو لے کر بے اختیار آنکھوں سے لگالیا۔

"میری بچی۔" کہہ کر واجدہ نے اسے کلیجے سے بھینچ لیا۔ پھر حسنہ نے اپنی پھول سی بچی اس طرح واجدہ کے حوالے کی کہ اس کا حق خود بخود ختم ہو گیا۔ یہاں بھی اس کا کہا سچ ثابت ہو گیا۔

حسنہ نے واجدہ کو مشورہ دیا تھا کہ ہم لاہور چھوڑ کر کہیں اور چلتے ہیں لیکن جانے سے پہلے ایک ڈرامہ کرنا ہوگا۔

واجدہ نے پوچھا۔ "کیسا ڈرامہ۔"

حسنہ نے کہا۔ "آپ اپنے خاندان میں امید سے ہونے کا اعلان کر دیں۔ یہ بات سب میں مشہور کر دیں کہ آپ کو اللہ نے بچے سے نواز دیا ہے اور وہ بات غلط ثابت ہو گئی ہے کہ آپ بانجھ ہیں۔ ڈاکٹر تو ڈاکٹر ہی ہوتے ہیں اللہ میاں نہیں ہوتے۔ اولاد سے نوازنے والا اللہ ہے، ڈاکٹر نہیں۔"

یہ بات سن کر واجدہ خوش ہو گئی، وہ یہی چاہتی تھی۔ بچہ ہر صورت میں اس کا کہلائے کوئی یہ نہ کہے کہ گود لیا ہے۔ حسنہ کی تجویز پر سوچ بچار کے بعد ایک مکمل منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس منصوبہ کا ہر طرح سے جائزہ لیا گیا، کہیں اگر کوئی جھول تھا تو اسے دور کیا گیا۔

یہ بات پورے خاندان، رشتے داروں، پاس پڑوس اور محلے میں مشہور کر دی گئی کہ واجدہ کی اللہ نے گود بھر دی ہے۔ یہ خبر واجدہ نے اپنی بہن صابرہ کو بھی کراچی بھجوا دی۔ صابرہ کا فوراً خط آیا اس نے ڈھیروں مبارکباد دی تھیں اور دعا کی تھی کہ واجدہ تخلیق کے اس مرحلے سے بخیر و خوبی گزر جائے۔

پھر اعلان ہوا۔ یہ اعلان تقریباً ایک ماہ بعد ہوا کہ واجدہ کی خصوصی حالت کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ اسے صحت افزا مقام پر لے جایا جائے۔ ورنہ ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق بچے کی پیدائش میں پیچیدگیاں پڑنے کا امکان تھا۔ اس طرح واجدہ کو مری روانہ کر دیا گیا۔ وہاں ایک ڈاک بنگلے میں اس کی رہائش کا انتظام کیا گیا کام کاج کیلئے حسنہ موجود تھی۔

چھ ماہ واجدہ مری رہی۔ حسنہ نے وہاں ایک بہت خوبصورت بچی کو جنم دیا۔ حسنہ نے یہ بات کہ وہ امید سے ہے اس نے اپنے گھر والوں سے بھی چھپائی تھی اس کی ماں اور بہن کو بھی معلوم نہ تھا انہیں بس اتنا معلوم تھا کہ وہ اپنی مالکن کے ساتھ مری گئی ہوئی ہے اس طرح یہ بات تین افراد کے علاوہ کسی کو معلوم نہ تھی کہ یہ بچی واجدہ کی نہیں حسنہ کی ہے۔ اور جب سب کو یہ معلوم تھا کہ واجدہ نے مری میں ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا ہے تو حسنہ کا حق خود بخود اس بچی پر سے ختم ہو گیا۔ اب اگر وہ آئندہ یہ دعویٰ بھی کرتی تو کون اس کی بات پر یقین کرتا۔

مری سے واپس آنے کے بعد واجدہ نے صابرہ کو بہت خوبصورت بچی پیدا ہونے کی اطلاع دی۔ صابرہ کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اس نے اسے مبارکباد کا خط لکھا اور بچی کی زندگی کے لئے ڈھیروں دعائیں بھیجیں۔ اس طرح یہ راز صابرہ پر بھی آشکار نہ ہو سکا کہ واجدہ نے دراصل بچے کو جنم نہیں دیا بلکہ اس نے بچے کی پیدائش کا محض سوانگ بھرا تھا۔

حسنہ، واجدہ کے ساتھ بچی کی پیدائش کے بعد تقریباً چار سال رہی۔ پھر اس کا شوہر زبیر علی اسے لینے آ پہنچا۔ اب وہ سدھر گیا تھا۔ اس نے گناہوں سے توبہ کر لی تھی۔ کام کاج بھی کرنے لگا تھا اس عرصے میں کوئی چکر چلا کر دبئی کا پھیرا بھی مار آیا تھا۔ اب سید پور میں اس نے زمین خریدلی اور ایک آٹا پیسنے کی چکی لگا لی تھی۔ ان چار سالوں میں اس نے ایک شادی بھی کر لی تھی لیکن اس کی نئی بیوی نے اس کے ساتھ دغا کی اور وہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔

تب اسے حسنہ کی یاد شدت سے آئی اور وہ سیدھا بھاگ کر لاہور پہنچا تھا۔ حسنہ کی ماں کے پاؤں پکڑ لئے تھے۔ اپنی غلطیوں کی رو رو کر معافی مانگی تھی۔ تب حسنہ کی ماں نے اسے بتایا تھا کہ وہ یہاں نہیں رہتی وہ سمن آباد میں رہتی ہے اور اس نے اس کا گھر نہیں دیکھا حسینہ نے دیکھا ہے شام کو وہ آئے تو اس

Urdufans.com

ساتھ چلے جانا۔

یہ سن کر وزیرے کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہ سمن آباد میں کس کے ساتھ رہتی ہے۔ کہیں اس نے شادی تو نہیں کرلی۔ لیکن وہ شادی کیسے کر سکتی ہے اس نے ابھی حسنہ کو طلاق کہاں دی ہے جس شیطنے نے اس کے سر میں اپنا پھن پھیلایا تھا اس کا اظہار اس نے اپنی ساس کے سامنے کر دیا۔

"کیا حسنہ نے شادی کرلی ہے۔" اس نے پوچھا۔

"وزیر تو نے میری پھول سی بیٹی کو بڑے دکھ دیئے ہیں، اب تو باز آجا۔" ماں نے تلخی سے کہا۔

"وہ شادی کیسے کرے گی اسے تو شادی کے نام سے ہی نفرت ہوگئی ہے۔ تو نے میری بیٹی کو بہت ستایا ہے۔"

یہ سن کر وزیر علی کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی اطمینان کی گہری سانس لی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ یہ اچھا تھا لیکن وہ کس کے ساتھ، کس کے گھر پر رہ رہی تھی۔ وہ ایک خوبصورت عورت تھی اسے کوئی بھی اپنے ساتھ رکھ سکتا تھا۔ وزیر کے گندے دماغ میں پھر کیڑے کلبلانے لگے۔ وہ اسی طرح سوچ سکتا تھا۔

اور اسی طرح کی سوچ نے حسنہ کو گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حسنہ کی ماں نے اسے جلانے کے لئے صاف صاف نہیں بتایا تھا کہ حسنہ کس حیثیت سے وہاں رہتی ہے۔ وہ شام تک بیٹھا ٹوٹی کرسی پر پہلو بدلتا رہا۔

دن چھپے حسینہ گھر میں داخل ہوئی اس نے دیکھا کہ گھر میں وزیر امو جود ہے، بہنوئی کی شکل دیکھ کر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور خاموشی سے اندر کمرے میں چلی گئی۔

اندر کمرے میں ماں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اسے دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ "اری حسینہ وزیرا آیا ہے۔ حسنہ کو لینے، ذرا تو اسے حسنہ کے گھر پہنچا دے۔"

"یہ اب آیا ہے چار سال کے بعد ماں یہ کچھ جلدی نہیں آگیا۔" حسینہ نے زور سے کہا، تاکہ باہر بیٹھا وزیر علی سن لے۔ اس نے سن لیا لیکن خاموش بیٹھا رہا۔ یہ وقت اس کے بولنے کا نہ تھا۔ سننے کا تھا۔

"تو ٹھیک کہتی ہے حسینہ یہ کچھ جلدی ہی آگیا ہے۔" ماں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "بہرحال اب آگیا ہے تو اسے حسنہ تک پہنچا دے۔"

"میں نہیں جاؤں گی، اسے وہاں لے کر۔" حسینہ نے سخت لہجے میں کہا۔ "یہ خود جائے گا۔"

"حسینہ تو مجھے پتہ بتا دے میں خود چلا جاؤں گا۔" وزیر اس کی بات سن کر کمرے میں داخل ہوا اور خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

"وزیرے تو اب آیا کیوں ہے، چار سال کے بعد اچانک تجھے حسنہ کی کیا ضرورت پڑ گئی۔" حسینہ نے اپنی شعلے برساتی آنکھوں سے اسے گھورا۔ "کبھی آکر یہی دیکھ لیتا کہ وہ زندہ بھی ہے مرگئی۔"

urdufans.com

"حسینہ میں جانتا ہوں کہ میں قصور وار ہوں میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔" وزیر علی نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"تیرا کیا خیال ہے وہ تجھے معاف کر دے گی۔"

"ہاں، حسنہ بہت اچھی ہے وہ مجھے ضرور معاف کر دے گی۔"

"پھر جا وہاں جا کر دیکھ لے۔" حسینہ نے کہا اور اسے سمن آباد کا پتہ لکھ کر دے دیا اور زبانی سمجھا دیا۔

پتہ لے کر وہ پھر ایک منٹ بھی اس گھر میں نہ رکا۔ بس پکڑ کر وہ سمن آباد پہنچا۔ پتہ ڈھونڈنے میں اسے کافی دشواری پیش آئی۔ بالآخر وہ ٹھکانے پر پہنچ گیا اس نے اطلاعی گھنٹی بجانے کے بجائے گیٹ زور زور سے کھٹکھٹایا۔

اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ حسنہ باورچی خانے میں تھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ واجدہ ٹیلیوژن دیکھ رہی تھی گھر کا گیٹ بجانے پر اس نے حسنہ کو آواز دی۔

"حسنہ دروازے پر کون ہے۔"

"بی بی جی کوئی فقیر معلوم دیتا ہے، گھنٹی نہیں بجائی، گیٹ بجا رہا ہے۔"

"اچھا میں دیکھتی ہوں، ان مانگنے والوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے اس طرح دروازے بجاتے ہیں جیسے قرض وصول کرنے آئے ہوں۔"

واجدہ نے جب دروازے پر پہنچ کر گیٹ کھولا تو اسے وہاں فقیر کے بجائے پنک قمیض پہنے ایک آدمی نظر آیا۔ واجدہ کو دیکھ کر وزیر اپنا کچھ جھجکا پھر ہمت کر کے آگے بڑھا۔ "سلام جی۔"

"وعلیکم اسلام۔" واجدہ نے اس شخص کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے کس سے ملنا ہے۔"

"میں حسنہ کے گھر سے آرہا ہوں، اس کی ماں نے بتایا ہے کہ وہ یہاں رہتی ہے مجھے اس سے ملنا ہے۔"

"حسنہ سے۔" واجدہ نے سوالیہ انداز میں کہا۔

حسنہ کو رہتے ہوئے اس گھر میں چار سال کا عرصہ ہو گیا تھا لیکن اس سے آج تک کوئی ملنے نہ آیا تھا اس اجنبی کو دیکھ کر واجدہ کو حیرت ہوئی۔ اس نے اس سے پوچھا۔ "تم کون ہو حسنہ کے۔"

"میں وزیر علی ہوں جی ..... وزیر، میں اس کا شوہر ہوں۔"

"اوہ۔" واجدہ نے ایک گہرا سانس لیا۔ "اچھا تم ٹھہرو میں حسنہ کو جا کر بتاتی ہوں۔"

کچن میں داخل ہو کر واجدہ، حسنہ کو غور سے دیکھنے لگی۔ وہ بیلن سے روٹی بڑھانے میں مصروف تھی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ واجدہ کو وہ اس وقت بہت اچھی لگی اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ حسنہ کو شوہر کی آمد کی اطلاع کس طرح دے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس خبر سے اسے خوشی ملے گی یا افسردہ ہو جائے گی۔

دروازے پر واجدہ کو کھڑے دیکھ کر اس نے اپنی نظریں گھمائیں اور بولی۔ "کون تھا بی بی جی، فقیر

Urdufans.com

ہوگا۔"

"تھا نہیں ہے۔" واجدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ پیشہ ور فقیر ہے یا نہیں یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن سوالی ضرور ہے۔"

"سوالی۔" حسنہ نے روٹی کو توے سے اتارتے ہوئے کہا۔ "پھر کچھ دے دیا آپ نے۔"

"مجھ سے اس نے کچھ نہیں مانگا وہ تمہارا سوالی ہے۔"

"میرا سوالی۔"

"ہاں، تمہارا سوالی۔"

"کون ہے وہ۔"

"تمہیں بلا رہا ہے جا کر دروازے پر دیکھ لو۔"

"آپ اسے جانتی ہیں۔"

"میں اسے جانتی تو نہیں لیکن اس نے اپنی پہچان کروادی ہے۔"

"بی بی جی بتائیں نا۔"

"نہیں میں بتاؤں گی نہیں خود جا کر دروازے پر دیکھو، پھر فیصلہ کرو کہ اسے گھر کے اندر بلانا ہے یا نہیں۔ اگر گھر کے اندر بلانا ہو تو لے آنا مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

اتنے واضح اشارے کے باوجود حسنہ کچھ نہ سمجھ سکی وہ اس اشارے کو سمجھتی اس وقت جب اس کے ذہن میں کسی وزیر علی کا خیال ہوتا۔ وہ اپنے شوہر کو یکسر بھلا بیٹھی تھی اور کیسے نہ بھلاتی۔ اس نے حسنہ کو ویسا ہی کیا تھا۔ ایک عذابناک زندگی۔ چار سال اس نے اس کے ساتھ کس طرح گزارے تھے، وہ چار سال اسے چالیس سال محسوس ہوتے تھے ان دکھوں کو وہ کب تک کلیجے سے لگائے رکھتی۔ شروع شروع میں تو وہ خاصی پریشان رہی پھر رفتہ رفتہ وہ سب کچھ بھولنے لگی۔ واجدہ کے روپے نے اسے سب کچھ بھلانے پر مجبور کر دیا اور اب تو اسے واجدہ کے گھر میں رہتے، اس جنت میں بستے چار سال ہو گئے تھے۔ اب وہ دوزخ بھرے دنوں کو یکسر بھلا بیٹھی تھی۔ اب اسے اپنے در پر آنے والے کسی سوالی کا انتظار نہ تھا پھر وہ اس سوالی کو کیسے پہچانتی۔ چولہے کی آگ کم کر کے حسنہ اٹھی واجدہ کو دیکھتی ہوئی کچن سے باہر نکلی وہ گیٹ کی طرف چلی، واجدہ نے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھائے۔

حسنہ نے گیٹ کھول کر تھوڑی سی گردن باہر نکالی اور پوچھا کون ہے۔"

"میں ہوں حسنہ، میں وزیرا۔" وزیر علی نے جلدی سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"چلے جاؤ یہاں سے میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔" یہ کہہ کر حسنہ نے گیٹ بند کر لیا۔

حسنہ نے گیٹ بند کیا تو وزیر علی کو لگا جیسے اس نے دل کا دروازہ بند کر لیا ہو، وہ یہاں بڑی آس لے کر آیا تھا۔ مایوس ہو کر لوٹنا نہ چاہتا تھا۔ گیٹ بند ہوتے ہی اس نے تڑپ کر آواز دی۔ "حسنہ بس ایک منٹ میری بات سن لے۔" یہ کہہ کر اس نے گیٹ بجایا۔

"میں نے تیری بہت سنی ہے، چار سال رہی ہوں تیرے پاس اب اور سنانے کو کیا رہ گیا ہے۔" حسنہ نے گیٹ کے اس طرف سے کہا۔ وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ گلا خشک ہو رہا

Urdufans.com

تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے، کیا کہے۔

"حسنہ، میں تجھ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔" گیٹ کے اس طرف سے وزیر علی نے کہا۔

"جا، میں نے تجھے معاف کیا۔" حسنہ نے بڑے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "اب چلا جا یہاں سے۔"

"نہیں حسنہ میں یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گا۔ میں گیٹ پر دھرنا دے کر بیٹھ جاؤں گا۔ اس وقت اٹھوں گا جب تیری شکل نظر آئے گی، تیرا دیدار ہو گا۔" وزیر علی نے بڑی محبت سے کہا۔

"میں ہیر نہیں ہوں، تو رانجھا نہیں ہے۔" حسنہ کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی۔

"میں رانجھا نہ سہی تو ہیر ضرور ہے۔" وزیر علی نے پانسہ پھینکا۔

"یہاں کیوں آیا ہے۔" حسنہ نے غصے سے کہا، پانسہ پلٹ گیا۔

"دروازہ کھول پھر بتاؤں گا۔" وزیر علی نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"حسنہ گیٹ کھول کیوں نہیں دیتی، اسے اندر تو آنے دے۔" واجدہ کمرے کے دروازے میں کھڑی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ جانے وزیر کے لہجے میں واجدہ کو کیا دکھائی دیا کہ اس نے حسنہ کو دروازہ کھولنے پر مجبور کر دیا۔

حسنہ کو پھر گیٹ کھولنا پڑا۔ واجدہ، وزیر علی کو ڈرائنگ روم میں لے آئی اس نے اسے عزت سے بٹھایا۔ حسنہ ڈرائنگ روم میں نہ آئی۔ وہ شاید باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔ واجدہ نے اسے آواز دی۔

"حسنہ تم کہاں ہو، ادھر آؤ۔"

"بہت غصہ ہے، اسے۔" وزیر علی نے کہا۔

"غصہ کیوں نہ ہو، تم نے کام ہی ایسا کیا ہے۔ چار سال تک تم نے پلٹ کر دیکھا ہی نہیں کہ تمہاری بیوی کہاں ہے، زندہ ہے یا مر گئی۔ کیسے مرد ہو تم۔" واجدہ نے شکایت آمیز انداز میں کہا۔

"میں اب اسے لے جانے کے لئے آیا ہوں، اب چار سال پہلے والا وزیر علی نہیں ہوں۔ اب میرے پاس بہت کچھ ہے بس ایک حسنہ نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں نے حسنہ کو بہت دکھ دیئے ہیں لیکن اب میں اسے اتنے سکھ دوں گا کہ وہ سارے دکھ بھول جائے گی۔ بیگم صاحبہ آپ میری مدد کریں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ مجھے میری حسنہ واپس دلوا دیں۔" یہ کہتے کہتے وزیر علی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کے آنسو دیکھ کر واجدہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

"بھئی میں نے تمہاری حسنہ کو باندھ کر نہیں رکھا ہے، وہ تمہارے ساتھ جانا چاہے تو اسے ضرور لے جاؤ۔" واجدہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ٹھہرو میں اسے یہاں بلا کر لاتی ہوں۔"

ڈرائنگ روم سے نکل کر واجدہ کچن میں پہنچی، اس کا خیال تھا کہ حسنہ روٹیاں پکانے بیٹھ گئی ہوگی لیکن وہ باورچی خانے میں نہ تھی۔ چولہا اسی طرح دھیمے دھیمے جل رہا تھا۔ واجدہ کچن سے نکل کر اس کے کمرے میں پہنچی۔ یہاں وہ موجود تھی اور اپنا چہرہ ہاتھ میں چھپائے بے تحاشا روئے جا رہی تھی۔

واجدہ نے خاموشی سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ وہ بے اختیار چونک اٹھی اس نے سر اٹھا کر دیکھا

Urdufans.com

سامنے واجدہ کو پاکر وہ کھڑی ہوگئی اور اس سے لپٹ کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہیں کیوں رو رہی ہے۔" واجدہ نے اسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ "خوشی کی بات ہے کہ تمہارا مرد تمہیں لینے آیا ہے۔ نہیں، اب وہ پہلے جیسا نہیں ہے، اس سے بات کر کے دیکھ لو وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا رو رہا ہے۔"

بالآخر وزیر کے آنسو کام آگئے۔ جس شوہر کو اس نے ہمیشہ چیختے دھاڑتے دیکھا تھا، اب اسی شوہر کی آنکھوں میں ندامت کے موتی تھے۔ وہ پگھل گئی، اس نے اس کی آنکھوں کے موتی چن لئے۔ وہ جو اسے ہمیشہ دُتکارتا اور رلا کر خوش ہوتا تھا، آج اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ بے قرار ہو اٹھی۔ وہ عورت تھی، نرم دل، نازک جذبات والی پسپا ہوگئی۔ اس کا عزم اس کے شوہر کے آنسوؤں میں بہہ گیا۔ پھر کچھ سارا واجدہ نے لگایا۔ اگرچہ حسنہ کے اس گھر سے چلے جانے سے واجدہ کو نقصان تھا۔ اب وہ حسنہ کی عادی ہوگئی تھی۔ اس کے بغیر رہنا مشکل تھا۔ پھر بھی واجدہ نے اس بات پر اصرار کیا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ چلی جائے، اپنا گھر بسائے۔ زندگی کی رنگینیوں سے لطف اٹھائے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ یہ عمر تنہا رہنے کی نہ تھی۔ پھر واجدہ نے اس کو یہاں تک سمجھا دیا بلکہ ایک طرح سے اسے تسلی دے دی تھی کہ اگر کبھی وزیر کا رویہ ذرا بھی خراب ہو تو وہ فوراً لاہور چلی آئے۔ اس گھر کے دروازے اس پر ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ جو احسان اس نے واجدہ پر کیا تھا، وہ ایسا نہ تھا کہ اسے بھلایا جاسکے۔

حسنہ، واجدہ کے سمجھانے پر وزیر علی کے ساتھ چلی گئی۔

گھر سے رخصت کرتے ہوئے واجدہ نے حسنہ سے کہا۔ "حسنہ اس گھر سے جو لے جانا چاہو اٹھا لو، مجھے خوشی ہوگی۔"

حسنہ نے مسکرا کر کہا "نہیں بی بی جی مجھے کچھ نہیں چاہئے، آپ نے چار سال تک مجھے اس گھر میں بہنوں کی طرح رکھا۔ بس میرے لئے یہی کافی ہے۔"

پھر وہ بیڈ روم میں گئی۔ اس نے سوئی ہوئی نیلم کو پیار کیا۔ واجدہ نے کہا۔ "اسے اٹھا دوں۔"

"نہیں بی بی جی سونے دیں۔" حسنہ نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"حسنہ اپنا وعدہ یاد رکھنا۔" واجدہ نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں بی بی جی مجھے یاد ہے۔ جو راز ہے وہ مرتے دم تک راز رہے گا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔"

یہ کہہ کر وہ گھر سے رخصت ہوگئی۔

حسنہ نے جو وعدہ کیا تھا اسے نباہ کر دکھایا۔ وہ آخری وقت تک اپنے عہد پر قائم رہی۔ بیس سال تک اس نے پلٹ کر نہ دیکھا کہ اس کی بیٹی نیلم کہاں ہے۔ اب وہ پلٹ کر دیکھتی بھی کیوں۔ نیلم سے اس کا کوئی واسطہ نہ رہا تھا۔ ادھر واجدہ نے بھی حسنہ کے بارے میں زیادہ کھوج نہ کی۔ وہ ایسا کیوں کرتی۔ بس کبھی کبھار حسنہ کی بہن حسینہ سے اس کے بارے میں معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ سید پور میں ہے اپنے شوہر کے ساتھ سکھ بھری زندگی گزار رہی ہے۔ حسنہ کے جانے کے بعد کچھ عرصے تو وہ واجدہ کو یاد آئی، پھر وہ اسے بھول گئی۔ کتنا اچھا ہوا کہ اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی، لاہور سے دور ہوگئی۔ اگر وہ یہاں رہتی تو نیلم کا

Urdufaps.com

راز کھلنے کا خطرہ رہتا۔ اس کے چلے جانے سے واجدہ کو اطمینان ہو گیا تھا۔ اب نیلم کو کوئی اس سے نہیں چھین سکتا تھا۔

نیلم کے بعد حسنہ کے یہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ کوئی سات سال تک وزیر علی نے حسنہ سے اولاد ہونے کا انتظار کیا۔ جب انتظار کا کوئی فائدہ نہ ہوا تو اس نے ایک اور شادی کر لی۔ وزیر علی کو بچے کی شدید خواہش تھی۔ ان سات سالوں میں اس نے حسنہ کا کافی علاج کروایا تھا۔ حسنہ بالکل ٹھیک تھی۔ کسی ڈاکٹر نے اس میں کوئی خامی نہ بتائی تھی پھر بھی وہ اولاد سے محروم تھی۔ قدرت کے کام میں کون دخل دے سکتا ہے۔

جب وزیر علی نے اولاد کی خاطر دوسری شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تو حسنہ نے خوشی سے اس کی اجازت دے دی۔ وزیر علی نے ایک کم عمر لڑکی سے شادی کر لی۔ شادی کے ایک سال بعد ہی وزیر علی ایک لڑکے کا باپ بن گیا۔ وہ بہت خوش ہوئی اس نے اپنے آس پاس کے علاقے میں گھر گھر مٹھائی بانٹی۔

اس خوشی کے موقع پر، وہ حسنہ کو نہ بھولا اس نے اپنے بچے کو اس کی ماں کے پہلو سے اٹھا کر حسنہ کی گود میں ڈال دیا اور بولا۔ "تیرا بچہ ہے۔ بتا اس کا کیا نام رکھوں۔"

حسنہ نے اس بچے کو اپنی گود میں لے کر اس کے پھول سے گالوں پر پیار کیا اور بولی۔ "وزیر ے اس کا نام لیاقت رکھ دے۔ لیاقت علی۔"

"چل ٹھیک ہے رکھ دیا، آج سے یہ لیاقت علی ہو گیا۔"

لیکن یہ بات لیاقت علی کی ماں کو پسند نہ آئی۔ بچہ اس کا اور نام رکھے سوکن بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وزیر علی کے اس روئیے پر وہ جل بھن کر رہ گئی۔ اس نے اسی وقت طے کر لیا کہ اب اس گھر میں حسنہ رہے گی یا سروری۔ اس نے اب ہر وقت وزیر علی کے کان بھرنا شروع کیے۔ سروری چھوٹے ذہن کی عورت تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ وزیر علی کے ذہن کو بھی چھوٹا کر دیا۔ حسنہ، سروری کا رویہ دیکھ کر دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتی گئی کہ وہ اس سے الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسنہ گھر کی ایک کوٹھری تک محدود ہو کر رہ گئی اور سروری گھر کی مالکن بن گئی۔

اب سروری کے کئی بچے ہو چکے تھے۔ اس نے وزیر علی کے دل و دماغ پر اچھی طرح قبضہ جما لیا تھا وہ حسنہ پر اب آخری ضرب لگانا چاہتی تھی کہ الٹی اس پر ضرب لگ گئی۔ یہ ضرب بڑی کاری تھی، وہ بلبلا کر رہ گئی۔ سروری نے وزیر علی پر اپنا اثر رنگ جما لیا تھا کہ وہ حسنہ کو بیکار شے سمجھنے لگا۔ سروری کی ترغیب کے مطابق وہ اسے طلاق دینے ہی والا تھا کہ اوپر سے اس کا بلیک وارنٹ آ گیا۔

رات کے وقت گاؤں کے پاگل کتے نے اسے کاٹ لیا۔ صبح کو اسپتال لے جانے سے پہلے ہی وہ منہ سے جھاگ ڈالتا، زندگی سے منہ موڑ گیا۔

وزیر علی کی موت کے بعد سروری نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ گھر پر اس کا پہلے ہی قبضہ تھا۔ حسنہ اس گھر کی کوٹھری میں کوڑھ کے مریض کی طرح محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ گھر کے ساتھ سروری نے اس جائداد پر بھی قبضہ کر لیا۔ حسنہ کا اب اس دنیا میں کوئی نہ تھا، وہ اب کہاں جاتی۔ ایک ماں اور چھوٹی بہن

حسینہ تھی۔ ماں کا کب کا انتقال ہو چکا تھا۔ حسینہ کو نئے کی عادت نے زندہ در گور کر دیا تھا۔ وہ داتا دربار پر بیٹھی رہتی تھی۔

حسنہ اب سیدپور سے نکلنا نہ چاہتی تھی۔ اس گاؤں میں وہ بیاہ کر آئی تھی اس نے یہاں رہ کر جوانی سے بڑھاپے تک کا سفر طے کیا تھا۔ اس گاؤں کی ایک ایک گلی سے اسے محبت تھی۔ وہ اب گاؤں کو چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس نے گاؤں والوں کو درمیان میں ڈالا تب گاؤں والوں نے سروری سے وہ گھر حسنہ کو دلا دیا جس میں وہ رہتی تھی بس اس نے اتنی ہی خواہش کی تھی۔

پھر سروری سیدپور میں نہ رہی۔ اس نے زمینیں اور آٹے کی چکی فروخت کر دی اور میکے چلی گئی۔ وہاں اس نے دوسال بعد ہی دوسری شادی کر لی۔

حسنہ سیدپور میں تنہا رہ گئی۔ حسنہ ملنسار عورت تھی اس لئے گاؤں کے سارے لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ حسنہ نے اپنا دل لگانے کے لئے گھر کے اندر چھوٹی سی دکان کھول لی۔ یہ چھوٹی سی دکان اس کی گزر بسر کے لئے کافی تھی۔

اس دکان پر جب کوئی تین چار سال کی بچی آتی تو اس کی نگاہوں میں اپنی بیٹی نیلم کی تصویر آجاتی۔ وہ جب لاہور سے آئی تھی تو وہ اتنی ہی چھوٹی تھی۔ نیلم کی یاد آتی تو وہ کھوسی جاتی۔ اب تو نیلم جوان ہو گئی ہوگی۔ کیا پتہ اب تک اس کی شادی بھی ہو چکی ہو۔ کئی بار وہ سوچتی کہ لاہور چلے اور اپنی بیٹی کا دیدار کر کے واپس آجائے لیکن وہ ایسا سوچ کر ہی رہ جاتی۔ اسے اپنا وعدہ یاد آجاتا۔ اس راز کو راز ہی رکھنا تھا۔ کیا پتہ وہ اپنی بیٹی کو دیکھ کر قابو میں نہ رہ سکے۔

اسی طرح سوچتے ہوئے وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ لاہور سے آئے اب اسے بیس سال ہو گئے تھے لیکن اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کل کی بات ہو۔ واجدہ کے ساتھ بتائے ہوئے چار سال ہر وقت اس کی نگاہوں میں بسے رہتے تھے۔ حسنہ اب بیمار رہنے لگی تھی۔ وہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دن بھر دکان پر بیٹھی کھانستی رہتی، رات ہوتی تو یہ کھانسی بجائے دبنے کے ابھر آتی۔ کھانس کھانس کر اس کا برا حال ہو جاتا۔ اس کے پھیپھڑے دن بدن چھلنی ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اب وہ دکان پر بیٹھنے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔ اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ چلنا پھرنا بھی دوبھر تھا۔ وہ خون تھوکنے لگی تھی۔ اسے اب یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اب وہ وقت زیادہ دور نہیں، جب زندگی موت کے گلے لگ جائے گی۔

مرنے سے پہلے وہ ایک بار اپنی بیٹی نیلم کو دیکھنا چاہتی تھی۔ نیلم میں جیسے اس کی جان اٹکی ہوئی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ نیلم سیدپور آئے کیسے۔ حسنہ میں اب اتنی جان نہ تھی کہ وہ اتنا لمبا سفر کر کے لاہور پہنچتی۔ وہ تو بس اب آخری سفر کی تیاریوں میں تھی۔ حسنہ نے اپنے پڑوس کے ایک لڑکے سے واجدہ کے نام ایک خط لکھوایا۔ دلدار بٹ ان دنوں سیدپور آیا ہوا تھا۔ سیدپور میں اس کی کافی زمینیں تھی ان کی دیکھ بھال اس کے چھوٹے بھائی عاشق کے ذمے تھی۔ وہ خود بھی گاہے گاہے گاؤں آتا رہتا تھا۔ دلدار بٹ۔ فیاض حسین کا پڑوسی تھا۔ وہ کل لاہور واپس جانے والا تھا۔ حسنہ کو اس کی واپسی کا علم ہوا تو اس نے اس لڑکے کے ہاتھ وہ خط اسے بھجوا دیا کہ بحفاظت اور یقینی طور پر واجدہ کو مل جائے گا۔

دلدار بٹ نے اس بند لفافے کو حیرت سے دیکھا۔ جس پر فیاض حسین کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس نے اس

Urdufans.com

وقت تو یہ خط یہ کہہ کر اپنے بیگ میں ڈال لیا کہ ٹھیک ہے وہ اس خط کو فیاض کو دیدے گا لیکن بعد میں اس کا تجسس جاگا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ سید پور کی ٹی بی کے مرض میں مبتلا، ایک بیوہ کالاہور کے ایک بڑے فلم تقسیم کار سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

اس نے راستے میں بیگ سے وہ بند لفافہ نکال لیا۔ اس کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ لفافہ آگے سے چپکایا گیا تھا۔ اسے کھولنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ دلدار بٹ نے ذرا سے اشارے پر وہ لفافہ کھول لیا، خط پڑھ کر اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، جو بات اب تک کسی کو معلوم نہ تھی اس راز سے دلدار بٹ واقف ہو گیا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا نیلم، فیاض کی بیٹی نہیں ہے بلکہ سید پور کی ایک بیوہ کی بیٹی ہے جس نے بڑے جذباتی انداز میں نیلم کو دیکھنے کی گزارش کی تھی۔ اس خط کو پڑھ کر دلدار بٹ کے ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹ کھیل گئی۔ دلدار بٹ اچھے اطوار کا آدمی نہ تھا، وہ ایک بُرا پڑوسی تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر گلی کے لوگوں سے جھگڑے مول لینے کا عادی تھا۔ اس نے فیاض حسین سے بھی کئی بار الجھنے کی کوشش کی تھی۔ فیاض حسین اس کی کمینی فطرت سے واقف تھا، اس لئے ہر بار طرح دے گیا تھا۔

دلدار نے اس خط کو فیاض حسین کے حوالے کر دیا۔ اس نے اپنی زبان سے یہ نہ کہا کہ وہ نیلم کی حقیقت سے واقف ہو گیا ہے لیکن اپنے رویئے اور طنز بھری مسکراہٹ سے اس نے بہت کچھ ظاہر کر دیا۔

فیاض حسین نے جب وہ خط واجدہ کو دیا تو وہ اسے پڑھ کر پریشان ہو گئی۔

"اب کیا ہو گا حسنہ نے تو ہمیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔" واجدہ بولی۔

"ایک کام ہو سکتا ہے اس خط کو پھاڑ دیا جائے اور ہم یہ بھول جائیں کہ کوئی خط ملا تھا۔"

"نہیں فیاض یہ بہت مشکل ہے۔ اس خط کو پھاڑ کر میں زندگی بھر ضمیر کی خلش میں مبتلا رہوں گی۔ یہ حسنہ کی آخری خواہش ہے۔ اس نے ہم سے زندگی میں کچھ نہیں مانگا۔ وہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو ہمیں دے کر جیسے بھول گئی۔ اب بیس سال بعد اس نے اپنی بیٹی کو پہلی اور آخری بار دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے تو ہمیں اس کے لئے کچھ کرنا ہو گا۔ مرنے سے پہلے اس کی یہ آخری خواہش پوری کرنا ہو گی۔"

"ٹھیک ہے پھر ہم سید پور چلتے ہیں۔" فیاض حسین نے کہا۔

یہ لوگ نیلم کو لے کر دوسرے دن ہی سید پور پہنچ گئے۔ یہ لوگ گاڑی میں آئے تھے لیکن گاؤں کی گلیاں چھوٹی تھیں کہ گاڑی کا اندر جانا مشکل تھا۔ لہٰذا انہیں گاڑی گاؤں کے باہر ہی چھوڑنا پڑی۔ فیاض حسین نے ڈرائیور کو گاڑی میں ہی چھوڑ دیا کیونکہ گاڑی دیکھ کر گاؤں کے بچے اس کے گرد اکٹھا ہو گئے۔ خطرہ تھا کہ کہیں کوئی بچہ پتھر دھکر نہ مار دے۔

گاؤں کے ایک لڑکے سے فیاض نے حسنہ کے بارے میں پوچھا یہ کوئی شہر نہ تھا کہ جہاں پڑوسی بھی پڑوسی سے واقف نہیں ہوتا۔ حسنہ کا نام سن کر وہ بچہ فوراً ان کے ساتھ چل پڑا۔ فیاض حسین، واجدہ اور نیلم اس بچے کی قیادت میں اس کے پیچھے چلنے لگے۔

گاؤں کی چھوٹی اور پتلی گلیاں، گلیوں میں بہتی گندی نالیاں، نالیوں سے اٹھتی بدبوئیں، نیلم نے فوراً اپنی ناک پر دوپٹہ رکھ لیا اور گلیوں میں پڑے گوبر سے خود کو بچاتی، بڑے محتاط انداز میں چلنے لگی۔

Urdufans.com

چلتے چلتے اچانک نیلم کی نظر سامنے پڑی تو وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس وقت وہ اپنے والدین سے آگے تھی۔ نیلم کو رکتے اور جھجکتے دیکھ کر واجدہ نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"امی، وہ۔" نیلم نے اپنی آنکھ سے اشارہ کیا۔ "وہ کیا ہے؟" اس نے فیاض حسین سے کہا۔

واجدہ نے سامنے دیکھا تو اس کے جسم میں ایک دم جھرجھری سی آ گئی۔ وہ بلا تھا اس کا رنگ ایک دم سیاہ تھا۔

"وہ، دیکھتے ہو۔"

فیاض اسی کو دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا وہ گلی کے بیچوں بیچ بیٹھا تھا اس کا رنگ ایک دم سیاہ تھا۔ وہ بلا تھا لیکن اس کی جسامت بلے جیسی نہ تھی کسی کتے جیسے تھی۔

"کیا بلا ہے یہ۔" فیاض حسین نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بلا ہے کہ کتا۔"

نیلم اس بلے سے خوفزدہ ہو کر اپنے باپ کے پیچھے ہو گئی تھی۔ کالے بلے نے اسے بڑے غور سے دیکھا تھا۔ جب نیلم، فیاض کے پیچھے ہو گئی، اسے نظر نہ آئی تو وہ کھڑا ہو گیا۔

اب یہ لوگ اس کالے بلے کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ اس دیہاتی بچے نے نیلم کو اس کالے بلے سے ڈرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لئے وہ کالے بلے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "باجی ڈریں مت یہ کالا بلا کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ آپ آرام سے نکل جائیں۔"

لیکن کالے بلے کو اس دیہاتی لڑکے کا درمیان میں آنا پسند نہ آیا وہ اچھل کر اس کے کندھے پر چڑھ گیا۔ لڑکا اس کا بوجھ برداشت نہ کر سکا وہ فوراً زمین پر بیٹھ گیا اتنی دیر میں نیلم آگے نکل چکی تھی۔ وہ دیہاتی لڑکا کبھی زمین سے اٹھ کر بھاگا، جبکہ وہ کالا بلا اطمینان سے بیٹھ کر اپنے اگلے دونوں پاؤں چاٹنے لگا۔ اس کی نظریں اب بھی نیلم پر تھیں۔

وہ اس کی پشت پر لہراتے ہوئے گھنے بالوں کو دیکھ رہا تھا۔ نیلم کے بال بہت خوبصورت تھے۔ ریشم جیسے اور ایکدم لمبے اس کے بال گھٹنوں سے بھی نیچے آتے تھے اور بہت گھنے تھے۔

کالا بلا نیلم کی خوبصورت زلفوں، متناسب جسم اور دلکش چال کو دور تک دیکھتا رہا۔

سیدپور کے جن کی نیلم سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ وہ اس حسین لڑکی کو دیکھتے ہی اس کی زلف کا اسیر ہو گیا تھا۔ اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ اس کے دام الفت میں جکڑ گیا تھا۔

اب وہ ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا تھا۔

دو تین گلیوں سے گزرنے کے بعد بالآخر وہ دیہاتی لڑکا ایک گھر میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک کچا گھر تھا اس گھر کے در و دیوار سے کسمپرسی جھلک رہی تھی۔ لڑکے نے ٹوٹے دروازے کے گھر میں داخل ہو کر انہیں پلٹ کر دیکھا اور بولا۔ "اندر آ جاؤ۔"

گھر میں سب سے پہلے واجدہ داخل ہوئی اس کے بعد فیاض حسین پھر نیلم۔ واجدہ نے صحن میں داخل ہوتے ہی سامنے چارپائی پر ایک ہڈیوں کے ڈھانچے کو دیکھا۔ حسنہ کو اس حال میں دیکھ کر اسے دھچکا سا لگا۔ کیسی حسین عورت تھی حسنہ اور اس کا کیا حال ہو گیا تھا۔ جیسے قبر کا مردہ۔ وہ کالی کھوسٹ ہو گئی تھی۔ ہڈیوں سے کھال چمٹ گئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ وہ چارپائی پر ایک میلے چیکٹ تکیے پر سر رکھے لیٹی تھی۔ اس کی نظریں دروازے کی طرف تھیں جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔

Urdufans.com

واجدہ کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک دم حسنہ کے چہرے پر رنگ بکھر گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اس نے فوراً اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھا نہ گیا۔

حسنہ کو اس حالت میں دیکھ کر اسے شدید صدمہ پہنچا۔ واجدہ تیزی سے آگے بڑھی اور اس کی چارپائی کے نزدیک جاکر بولی۔ "ہائے حسنہ، تجھے یہ کیا ہوگیا۔"

"کچھ نہیں بی بی جی، یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔" حسنہ نے بمشکل کہا۔

"دیکھ حسنہ تو نے خط میں لکھا تھا کہ میں مر رہی ہوں مرنے سے پہلے مجھے میری بیٹی سے ملوا دو یہ میری آخری خواہش ہے، تو حسنہ تیری آخری خواہش کے احترام میں ہم لوگ اتنی دور آگئے ہیں اور ساتھ میں تیری بیٹی کو لے آئے ہیں۔ لے مل لے اس سے۔" واجدہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔ پھر وہ نیلم کی طرف مڑی اور بولی۔ "نیلم یہ تمہاری آیا نہیں سگی ماں ہے۔"

"سگی ماں۔" نیلم کی آنکھوں میں حیرت کے پردے لہرا گئے۔

"ہاں، ہم نے تمہیں راستے میں بتایا کہ حسنہ تمہاری آیا تھی اسے تم سے بہت محبت تھی۔ اب مرتے وقت اس نے تمہیں یاد کیا ہے۔ ہم نے تمہیں غلط بتایا تھا اس عورت کی آنکھوں میں دیکھو نیلم، اس کی آنکھوں سے ممتا امڈ رہی ہے۔ ممتا کی اس پیاسی کو "ماں" کہہ کر اس سے لپٹ جاؤ۔ اسے اپنا ہونے کا احساس دلا دو شاید اس کی موت آسان ہوجائے۔"

"آؤ بیٹی میرے نزدیک آؤ۔ یہاں چارپائی پر بیٹھ جاؤ تمہاری ماں نے تمہیں غلط بتایا ہے پہلی بات صحیح تھی، میں تمہاری ماں نہیں تمہاری آیا ہوں۔ میں نے تمہیں چار سال تک اپنی گود میں کھلایا ہے تم میری نظروں میں بسی ہوئی ہو۔ یوں سمجھو تم میرے جگر کا ٹکڑا ہو۔ میری جان ہو۔ تمہیں دیکھنے کے لئے میں تڑپ رہی تھی۔ اب تمہیں دیکھ لیا ہے آسانی سے اور پورے اطمینان سے مر سکوں گی۔" یہ کہہ کر حسنہ نے نیلم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سوکھے ہاتھ کا لمس پاکر نیلم کے جسم میں جھرجھری سی آگئی۔ حسنہ نے نیلم کا گورا اور نرم ملائم ہاتھ کھینچ کر اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا، اسے دھیرے سے پیار کرلیا، نیلم نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

پھر ایک دم سے حسنہ کے جسم میں زلزلہ سا آگیا اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ تب واجدہ نے نیلم کو چارپائی سے اٹھا دیا اور اس کے نزدیک بیٹھ گئی۔ بڑے پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔ "حسنہ روتی کیوں ہے۔ نیلم کو جی بھر کر دیکھ لے، یا ایسا کر تو ہمارے ساتھ چل۔ ہم تجھے اسپتال میں داخل کروا دیں گے تو اچھی ہوجائے گی۔ پھر زندگی بھر میرے پاس، اپنی نیلم کے پاس رہنا۔"

"نہیں بی بی جی میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں جانتی ہوں کہ میں گھڑی دو گھڑی کی مہمان ہوں۔ آپ نے ہمیشہ مجھے محبت دی ہے۔ آپ نیلم کو میرے پاس لے آئیں۔ یہی احسان مجھ پر بہت بڑا ہے۔ میری آنکھیں سیراب ہوگئیں، میری بے چین روح کو قرار آگیا ہے۔" حسنہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

نیلم کی عجیب حالت تھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ حقیقت کیا ہے حسنہ اس کی سگی ماں ہے یا محض

Urdufans.com

آیا ہے بہرحال جو کچھ بھی تھی اسے دیکھ کر اسے کھن آرہی تھی۔ وہ اس ہڈیوں کے ڈھانچے سے جلد از جلد دور ہونا چاہتی تھی۔

نیلم نے فیاض حسین کی طرف اکتاہٹ بھری نظروں سے دیکھا۔ "ابو واپس کب چلیں گے۔"

"چلتے ہیں بیٹا۔" فیاض حسین نے اسے تسلی دی پھر وہ حسنہ سے مخاطب ہوا۔ "ہاں حسنہ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔ تم ہمارے ساتھ جانا نہیں چاہتیں چلتیں تو اچھا تھا۔"

"نہیں صاحب جی، آپ کا بہت شکریہ۔ اب میں کہاں جاؤں گی۔ چل چلاؤ کا وقت ہے۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتی ہوں۔" حسنہ نے کہا۔

"آپ اس گھر میں اکیلی رہتی ہیں۔" نیلم پہلی بار حسنہ سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں بیٹا، اکیلی رہتی ہوں۔ جب ساتھ والا ہی نہ رہا تو کسی اور کو کیا ضرورت ہے کہ وہ میرے ساتھ رہے۔ بیٹا تم پڑھتی ہو۔" حسنہ نے نیلم کے خوبصورت چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"جی پڑھتی ہوں۔" نیلم بولی۔

"بیٹا کیا تمہیں میں یاد ہوں۔" حسنہ نے محبت سے پوچھا۔

"نہیں مجھے آپ یاد نہیں ہیں۔" نیلم نے سادگی سے کہا۔ "حسنہ اسے کیا یاد ہوگا، یہ چار سال کی تھی۔ تمہیں لاہور سے آئے ہوئے اب بیس سال ہوگئے۔ اسے کہاں یاد ہوگا۔" واجدہ نے وضاحت کی۔

"لیکن بی بی جی، میں نیلم کو کبھی نہیں بھولی۔ ساتھ ہی میں اس عہد کو بھی نہیں بھولی جو میں نے آپ کے ساتھ لبسر کیا تھا۔ میں نے آج تک کسی سے کچھ نہیں کہا۔ ابھی آپ نے نیلم کو حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تو میں نے آپ کو جھٹلا دیا لیکن اس وقت جانے کیوں میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں سچ کہوں اور سچ کا روعمل دیکھوں۔ اس وقت میرا دل پھٹا جارہا ہے۔ ممتا امڈی آرہی ہے۔ میرا بے اختیار جی چاہ رہا ہے کہ نیلم مجھے ایک مرتبہ "میری امی" کہہ کر پکارے۔" حسنہ نے اپنے بازو پھیلا کر کہا۔

"نیلم اپنی ماں کی خواہش پوری کرو۔" واجدہ نے نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔

"امی یہ کیا تماشا ہے۔" نیلم پر جھنجلاہٹ طاری ہوگئی۔

"بیٹی، حسنہ تمہاری سگی ماں ہے۔ اسے ماں کہو، اس کے گلے لگ جاؤ۔" فیاض حسین نے نیلم کو دوبارہ چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

نیلم نے اپنی جان چھڑانے کے لئے جلدی سے حسنہ کو "میری امی" کہا اور منہ بناتی ہوئی اس کے گلے لگی اور پھر فوراً ہی کھڑی ہوگئی۔ "بس ابو۔"

"بس بیٹی۔" فیاض حسین کے بجائے حسنہ نے جواب دیا۔ "اللہ تجھے خوش رکھے۔"

لیکن نیلم کی خوشی کے دن اب پورے ہوچکے تھے اور یہ بات حسنہ کو معلوم تھی نہ واجدہ کو۔ اگر حسنہ کو یا واجدہ میں سے کسی کو آگے آنے والے واقعات کا اندازہ ہوتا تو شاید حسنہ اسے سیدپور کبھی نہ بلاتی اور نہ ہی واجدہ۔ نیلم کو سیدپور لاتی۔ لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔ جو مقدر میں لکھ دیا جاتا ہے اس پر حرف بحرف عمل ہوتا ہے۔ مقدر کے لکھے کو بھلا کون مٹا سکتا ہے۔

کچھ دیر بعد گاؤں کا ایک دس بارہ سالہ لڑکا گھر میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں چینی مٹی کا بڑا سا پیالہ تھا اس میں دودھ بھرا ہوا تھا۔

"حسنہ چاچی دودھ پی لو۔" اس لڑکے نے کہا۔

"چنے دودھ کا پیالہ ادھر گھڑونچی پر رکھ دے۔" حسنہ نے چنے کو ہدایت کی۔

چنے نے دودھ سے بھرا پیالہ گھڑے کے برابر رکھ دیا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

لڑکے کے گھر سے نکلنے کے بعد وہ کالا بلا گھر میں داخل ہوا۔ دروازے میں کھڑے ہو کر اس نے ایک نظر نیلم کو دیکھا اور پھر چھلانگ لگا کر گھڑونچی پر چڑھ گیا۔

بلے کو گھڑونچی پر چھلانگ لگاتے ہوئے فیاض نے دیکھا تو وہ اسے مارنے کے لئے دوڑا اسے خدشہ تھا کہ کہیں بلا دودھ نہ پی جائے۔ کالے بلے نے فیاض کی ذرہ بھر بھی پروانہ کی۔ اس نے بڑے اطمینان سے گھڑونچی پر چڑھ کر پیالے میں منہ ڈال دیا اور اپنی سرخ سرخ زبان سے لپ لپ دودھ پینے لگا۔

فیاض کو یہ دیکھ کر بڑا غصہ آیا، اس نے قریب جا کر اس کے لات جمانا چاہی لیکن حسنہ ایک دم چیخ پڑی۔ "نہیں صاحب جی! اسے مت مارنا۔"

"حسنہ اس نے دودھ کا ستیاناس کر دیا۔"

"کوئی بات نہیں صاحب جی، یہ دودھ اسی کا ہے۔"

"یہ دودھ اسی کا ہے، لیکن وہ لڑکا تو یہ دودھ تمہارے لئے لایا تھا۔ اصل میں تم کچھ کھاتی پیتی نہیں ہو، اس لئے تمہارا یہ حال ہو گیا ہے۔" فیاض حسین نے قدرے غصے سے کہا۔ اس کی نظریں ابھی تک اس کالے بلے پر تھیں۔

"یہ بلا کس قدر خوفناک ہے، یہ وہی معلوم ہوتا ہے جو ابھی ہمیں گلی میں ملا تھا۔" واجدہ نے کالے بلے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو بڑی بے نیازی سے دودھ پی رہا تھا۔

"بی بی جی، یہ بلا نہیں ہے۔" حسنہ نے کہا۔

"پھر کیا ہے۔" واجدہ نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

اتنے میں کالے بلے نے پیر مار کر پیالہ نیچے پھینک دیا۔ پیالہ زمین پر گرتے ہی ٹوٹ گیا۔ حسنہ نے چونک کر کالے بلے کی طرف دیکھا۔ وہ گھڑونچی پر چڑھا ہوا حسنہ کو ہی دیکھ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ حسنہ کو تنبیہہ کر رہا ہو۔ وہ ایک مرتبہ ہلکے سے غرایا، پھر اس نے "میاؤں" کی آواز نکالی۔ یہ میاؤں کی آواز بھی بڑی لرزا دینے والی تھی۔

حسنہ ایک دم سہم گئی وہ کالا بلا نیلم کو دیکھتا ہوا چھلانگ مار کر دروازے میں غائب ہو گیا۔

"ہاں حسنہ بتاؤ یہ بلا نہیں تو پھر کیا ہے۔" واجدہ نے حسنہ سے پھر پوچھا۔

"نہیں بی بی جی میں کچھ نہیں بتا سکتی، وہ غصے ہو کر گیا ہے۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ وہ جو کچھ نظر آ رہا تھا وہ نہیں تھا۔" حسنہ نے آہستہ سے کہا۔ "وہ اپنا دودھ پینے آیا تھا پی کر چلا گیا۔"

واجدہ اور فیاض حسین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ حسنہ کیا کہہ رہی ہے۔ انہوں نے اس کی بات کو دماغ کا خلل سمجھ کر زیادہ بحث نہ کی۔

Urdufans.com

تیہ پور زیادہ بڑا گاؤں نہ تھا اس گاؤں میں آنے والا مہمان کسی سے چھپ نہیں سکتا تھا۔ یہ لوگ تو یہاں کار میں آئے تھے۔ کار گاؤں کے باہر کھڑی تھی۔ جلد ہی عاشق بٹ کو ان مہمانوں کے بارے میں علم ہو گیا جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ نہ صرف لاہور سے آئے ہیں بلکہ سمن آباد سے آئے ہیں اور دلدار بٹ کے پڑوسی ہیں تو بھاگا بھاگا حسنہ کے گھر میں آیا۔ اور انہیں ضد کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔

دوپہر کا کھانا اس نے انہیں زبردستی اپنے ساتھ کھلایا۔

ابھی یہ لوگ کھانا کھا ہی رہے تھے کہ انہیں حسنہ کی موت کی اطلاع ملی۔

واجدہ اور فیاض کو اس اطلاع پر کوئی حیرت نہ ہوئی۔ حیرت تو انہیں اس بات پر تھی کہ حسنہ اس حالت میں اب تک زندہ کیسے تھی۔ واجدہ نے دل میں شکر ادا کیا کہ اس نے نیلم کو حسنہ سے ملوا دیا اگر وہ نیلم کو دیکھے بغیر مر جاتی تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ کم از کم واجدہ زندگی بھر ضمیر کی آگ میں جلتی رہتی۔

کھانا چھوڑ کر یہ لوگ حسنہ کے گھر آئے۔ واجدہ نے نیلم کو عاشق کی بیوی اور بیٹی کے پاس چھوڑ دیا۔ نیلم نے خود بھی اپنی ماں کا چہرہ دیکھنے کی ضد نہ کی۔ یہ معلوم ہو جانے کے باوجود کہ حسنہ اس کی سگی ماں ہے نیلم کے دل میں ذرا بھی ماں کی محبت نے جوش نہیں مارا تھا۔ شاید ایسا فلموں میں ہی ہوتا ہے کہ اپنے خون کو دیکھ کر دل میں محبت کا سمندر موجزن ہو جاتا ہے۔ یہاں تو نیلم کو یہ بھی معلوم تھا کہ حسنہ اس کی اصل ماں ہے پھر بھی نیلم نے کوئی خاص توجہ نہ لیا۔ اصل میں پہلے ہی دن سے واجدہ کی گود میں چلی گئی تھی اس نے واجدہ کو ہی اپنی ماں کے روپ میں دیکھا تھا۔ واجدہ اور حسنہ میں زمین آسماں کا فرق تھا اگر نیلم سے کہا جاتا کہ تم اپنی سگی ماں کے ساتھ رہنا پسند کرو گی یا منہ بولی ماں کے ساتھ تو وہ بغیر سوچے سمجھے کہہ دیتی کہ اپنی منہ بولی ماں کے ساتھ۔ ایک خوبصورت شہر کا ایک خوبصورت گھر چھوڑ کر اس چھوٹے سے دیہات کے ایک کچے گھر میں رہنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لب گور، ماں کے ساتھ رہنے کے بجائے وہ منہ بولی ماں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتی۔

واجدہ اور فیاض، حسنہ کے گھر میں داخل ہوئے تو انہوں نے سامنے چارپائی پر حسنہ کا لاشہ دیکھا، اس کے اوپر ایک میلی سی چادر پڑی تھی اور دو بوڑھی عورتیں نیچی زمین پر چارپائی کے نزدیک بیٹھی تھیں۔ حسنہ مر گئی تھی اسے رونے والا کوئی بھی نہ تھا۔ وہ کیسی کسمپرسی کی موت مری تھی، کچھ دیر پہلے تک وہ زندہ تھی واجدہ اس کے ساتھ دو ڈھائی گھنٹے رہی تھی۔ اس نے بہت ساری پرانی یادیں تازہ کی تھیں اور اب وہ خود یادوں میں بدل گئی تھی۔ واجدہ کے لئے وہ ایک حسین یاد سے کم نہ تھی۔ اس نے اس پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ وہ اسے اپنے جگر کا ٹکڑا تحفے میں دے گئی تھی۔ یہ ایک انمول تحفہ تھا۔

فیاض حسین نے اس کی تجہیز و تکفین میں اٹھنے والے تمام اخراجات کو اپنے ذمے لے لیا۔ اس کے علاوہ اس نے حسنہ کی پختہ قبر بنانے کے لئے بھی رقم ادا کر دی۔

پھر واجدہ نے حسنہ کے چہرے سے چادر سرکا کر آخری بار اس کا چہرہ دیکھا۔ حسنہ کا چہرہ بڑا پرسکون تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بڑی مطمئن ہو کر اس دنیا سے گئی ہے۔ اس کا چہرہ دیکھ کر واجدہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

تب فیاض حسین نے دھیرے سے واجدہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے حسنہ کے گھر سے نکال لایا۔

Urdufans.com

جب وہ واپس عاشق بٹ کے گھر پہنچے اور انہوں نے نیلم کو ساتھ لے کر سیدپور سے جانے کا قصد کیا تو انہوں نے نیلم کے بارے میں بڑی عجیب خبر سنی۔

جب واجدہ نے یہ خبر سنی تو فوراً اس نے اپنا دل تھام لیا۔ "ہائے نہیں۔"

"ارے، یہ کیسے ہوا؟" فیاض حسین بھی پریشان ہو گیا۔

واجدہ اور فیاض جب حسنہ کے گھر سے واپس آئے تو عاشق بٹ اپنے گھر سے گھبرایا ہوا نکل رہا تھا وہ نیلم کے بارے میں انہیں بتانے جا رہا تھا انہیں سامنے دیکھ کر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور بولا۔ "نیلم بیہوش ہو گئی ہے۔"

یہ سن کر واجدہ پر بجلی سی گری فیاض پریشان ہو گیا۔ دونوں گھر کے اندر کی طرف بھاگے۔ نیلم ایک کمرے میں، چارپائی پر بے سدھ پڑی تھی، عاشق بٹ کی بیوی اور بیٹی اس کے نزدیک پریشان کھڑی تھیں۔

"ہائے میری بیٹی کو کیا ہوا؟" واجدہ نے تڑپ کر پوچھا اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر پکارا۔ "نیلم میری بچی کیا ہوا؟"

نیلم کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے واجدہ کی پکار کو نہ سنا، وہ کیسے سنتی، وہ بیہوش تھی۔

"بہن پریشان نہ ہوں۔" عاشق بٹ کی بیوی بولی۔ "ابھی اسے ہوش آجائے گا، یہ ڈر گئی ہے۔"

"ڈر گئی ہے؟" فیاض نے پوچھا۔ "لیکن کس چیز سے؟"

"وہ جی کالے بلّے سے۔" اس مرتبہ عاشق بٹ کی بیٹی بولی۔

"کالا بلّا یہاں کہاں آگیا۔" واجدہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"بس جی ہم دونوں چارپائی پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔" عاشق بٹ کی بیٹی نے بتایا۔ "میں نیلم کو گاؤں کے بارے میں بتا رہی تھی کہ وہ کالا بلّا اچانک چارپائی کے نیچے سے برآمد ہوا اور اچھل کر نیلم کی گود میں آبیٹھا۔ اس کالے بلّے کو اپنی گود میں دیکھ کر نیلم نے ایک زوردار چیخ ماری اور پھر بیہوش ہو گئی۔"

"میں کمرے سے باہر تھی۔" عاشق بٹ کی بیوی بولی۔ "چیخ کی آواز سن کر بھاگی ہوئی اندر آئی اس وقت تک نیلم بیہوش ہو چکی تھی۔ کالا بلّا اس کی گود سے نکل کر چھلانگ لگا رہا تھا اور یہ عائشہ (اس نے اپنی بیٹی کی طرف اشارہ کیا) اس کالے بلّے کو کوشش کر کے بھگا رہی تھی۔ کالے بلّے نے تیزی سے چھلانگ لگائی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔"

"عجیب لڑکی ہے۔" فیاض حسین نے کہا۔ "بلا گود میں آبیٹھا تو ڈر کر بیہوش ہو گئی۔ بھلا بلّے بلیوں سے بھی کوئی ڈرتا ہے۔"

"فیاض اس کو ہوش میں لانے کے لئے کچھ کریں، میرا دل تو بیٹھا جا رہا ہے۔ جانے کیا ہونے والا ہے۔"

"ذرا اس کو ہوا کرو اور پانی کے چھینٹے اس کے منہ پر مارو، ابھی ہوش میں آجائے گی۔" عاشق بٹ

Urdufans.com

بولا۔

عاشق بٹ کی بیٹی عائشہ فوراً ہاتھ کا پنکھا لے کر جھلنے لگی۔ عاشق بٹ کی بیوی ایک کٹورے میں ٹھنڈا پانی لے آئی۔ واجدہ نے اس کے ہاتھ سے کٹورا لے کر اس کے منہ پر چھینٹے دیئے۔ مگر نیلم نے آنکھیں نہ کھولیں۔

"نہیں یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں۔" واجدہ، عاشق بٹ سے مخاطب ہوئیں۔

"یہ چھوٹا سا گاؤں ہے، یہاں ڈاکٹر کہاں البتہ ایک کمپاؤنڈر ضرور ہے جو یہاں ڈاکٹر بنا بیٹھا ہے۔ آپ کہیں تو اسے بلوا دوں۔" عاشق بٹ نے جواب دیا۔

"کیوں فیاض۔" واجدہ نے فیاض حسین سے اجازت چاہی۔

"ہاں بلوا لو۔ کمپاؤنڈر ہے تو کچھ نہ کچھ تو ضرور جانتا ہوگا۔"

"ہاں جی، ویسے تو بڑا تجربہ کار ہے، پورا گاؤں اسی سے علاج کراتا ہے۔"

"پھر اسے بلوا دیں۔" فیاض حسین نے کہا۔

"اچھا جی۔" یہ کہہ کر عاشق بٹ نے پاس کھڑے ایک بچے کو حکم دیا۔ "اوے جا، بوٹے نوں پھڑ لا، اس سے کہنا چوہدری جی نے بلایا ہے۔"

یہ سن کر بچہ فوراً کمرے سے تیر کی طرح نکل گیا۔

"ذرا اس کے تلوے سہلاؤ۔" فیاض حسین نے واجدہ سے کہا۔

واجدہ یہ سن کر نیلم کے سرہانے سے اٹھنے لگی تو عائشہ نے اسے روک دیا۔ "خالہ آپ وہیں بیٹھیں میں سہلائے دیتی ہوں۔"

"پھر وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ سے اس کے تلوے رگڑنے لگی۔ واجدہ، نیلم کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ پھر اس کی بھنوؤں کو آہستہ آہستہ اپنی انگلیوں سے دبانے لگی۔ عاشق بٹ کی بیوی گاہے گاہے اس کے چہرے پر چھینٹے مار رہی تھی۔ فیاض حسین اور عاشق بٹ خاموش کھڑے تھے۔

کوئی ترکیب کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ نیلم ابھی تک بیہوش تھی۔ فیاض حسین بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا اس بچے کو گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی لیکن ڈاکٹر بوٹا ابھی تک نہیں آیا تھا۔

"کیا ڈاکٹر کا گھر دور ہے۔" فیاض نے پوچھا۔

"نہیں جی قریب ہی ہے، پتہ نہیں وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا، میں جا کر دیکھتا ہوں۔"

"چلیں آپ کے ساتھ میں بھی چلتا ہوں۔"

"آجائیں۔" عاشق بٹ نے کہا اور وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔

ان دونوں کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے اپنی دُم زور سے کچی زمین پر ماری اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک کرسی کے نیچے بیٹھا تھا، اس کے کھڑے ہونے سے کرسی الٹ گئی۔ کرسی کے گرنے کی آواز سے سب چونک پڑے پھر اس کرسی کے نیچے سے کالے بلّے کو برآمد ہوتے دیکھ کر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ کالے بلّے نے چارپائی پر بیہوش پڑی نیلم کو اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھا۔ میاؤں کی

ڈراؤنی آواز نکالی اور وہیں سے چھلانگ لگائی۔

یہ چھلانگ اس نے چارپائی پر لگائی تھی۔ واجدہ فوراً اٹھ کر بھاگی۔ عائشہ اور عاشق بٹ کی بیوی بھی ہائے اللہ، اوئی اللہ کرتی ہوئی کمرے سے بھاگیں۔

واجدہ کا کالے بلّے کو چارپائی پر چھلانگ لگاتے دیکھ کر تھرا کر اٹھ تو گئی، دروازے کی طرف بھاگی بھی لیکن پھر اسے اپنی بیٹی کا خیال آیا۔ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتی تھی۔ اس نے ہمت کی اور دروازے پر رک گئی جبکہ عائشہ اور عاشق بٹ کی بیوی کمرے سے کب کی نکل چکی تھیں۔

واجدہ نے پلٹ کر دیکھا اس نے جو دیکھا وہ اسے لرزا دینے کیلئے کافی تھا۔ وہ کالا بلا سرخ اور لمبی زبان سے نیلم کا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔

واجدہ نے اپنے منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکالیں کہ وہ ڈر کر بھاگ جائے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

تب واجدہ نے کوئی چیز تلاش کرنے کے لئے ادھر ادھر دیکھا مگر اسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جسے وہ پھینک کر مار سکتی۔ پھر اسے اپنے سینڈل کا خیال آیا۔ اس نے فوراً اپنے پاؤں سے سینڈل اتار لیا اور کھینچ کر کالے بلے کو مارا۔ سینڈل کالے بلّے کی پیٹھ پر لگا۔ سینڈل کھا کر وہ غصے سے غرا کر پلٹا اور اس نے واجدہ پر جست لگانے کے لئے اپنی دونوں ٹانگیں جھکائیں۔

واجدہ پر لرزا طاری ہو گیا۔ وہ گھبرا کر کمرے سے بھاگی۔ واجدہ کے کمرے سے نکل جانے کے بعد کالا بلا اطمینان سے واپس پلٹا اور پھر نیلم کا نرم ملائم گورا ہاتھ اپنی سرخ زبان سے چاٹنے لگا۔

واجدہ کمرے سے باہر نکلی تو اسے وہ تینوں نظر آئے۔ فیاض، عاشق اور ڈاکٹر بوٹا کمرے کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے عائشہ اور عاشق بٹ کی بیوی تھی۔

"کیا ہوا واجدہ۔" فیاض حسین نے گھبرا کر پوچھا۔

"وہ کم بخت کالا بلّا۔" واجدہ کی آواز میں لرزش تھی۔ "وہ اندر ہے نیلم کا ہاتھ چاٹ رہا ہے۔"

"ارے۔" فیاض حسین یہ سن کر بجلی کی تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ وہ کالا بلّا نیلم کا ہاتھ بڑے اطمینان سے چاٹ رہا ہے۔

فیاض حسین نے آگے بڑھ کر اس کے ٹھوکر ماری۔ ٹھوکر کھا کر بلے نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ البتہ فیاض حسین کے چھکے چھوٹ گئے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی فولاد کے تختے کو ٹھوکر مار دی ہو۔ جوتے پہنے ہونے کے باوجود ضرب اس کے انگوٹھے پر لگی، وہ بلبلا کر رہ گیا۔

اسے بڑی حیرت ہوئی کہ اس کالے بلّے کا جسم نرم ملائم نہ تھا بلکہ فولاد کی طرح سخت تھا۔

جب وہ کالا بلّا ٹھوکر کھا کر بھی پیچھے نہ ہٹا تو عاشق بٹ ایک لاٹھی لے آیا۔ اس نے پوری طاقت سے اس کی کمر پر لاٹھی ماری۔ عاشق بٹ ایک مضبوط جسم کا مالک تھا۔ یہ وار اتنا زور دار اور بھرپور تھا کہ کوئی عام بلّا ہوتا تو وہیں دم توڑ دیتا۔

لیکن وہ عام بلّا نہ تھا وہ کالا بلّا تھا اس کی کمر پر لاٹھی پڑی تو وہ دو ٹکڑے ہو گئی۔ کالے بلّے کی کمر کو کچھ

Urdufans.com

نہ ہوا۔ اس کی کمر سے "ٹن" کی آواز آئی جیسے بلے کے بدن پر نہ پڑی، لوہے کی پٹڑی پر پڑی ہو۔

"چوہدری جی بلم لاؤ۔" ڈاکٹر بوٹا نے کہا۔

عاشق بٹ جلدی سے باہر نکلا اور چند سیکنڈوں میں ہی واپس آگیا۔ اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں ایک چمکیلا تیز دھار کا بلم تھا۔

عاشق بٹ نے بڑے غصے سے اس کالے بلے کے پیٹ میں بلم مارا۔ خیال تھا کہ تیز دھار کا بلم اس کے پیٹ کے اندر آر پار ہو جائے گا لیکن فیاض نے دیکھا کہ بلے کو کچھ نہ ہوا، اس مرتبہ ٹن کی آواز بھی نہ آئی۔ بلم بلے کے آر پار بھی ہو گیا بالکل اس طرح جیسے روئی میں آر پار ہو جائے۔

عاشق بٹ نے کئی مرتبہ اس کے جسم میں بلم مارا لیکن ہر مرتبہ بلم کالے بلے کے جسم کے آر پار ہو گیا لیکن اسے کوئی تکلیف پہنچی نہ خون نکلا، نہ اس کے کوئی زخم آیا۔ وہ بڑے اطمینان سے نیلم کا ہاتھ چاٹنے لگا۔

اب عاشق کے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ بلم اس نے گھبرا کر نیچے پھینک دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

عاشق بٹ کے کمرے سے نکلتے ہی کالے بلے نے اپنی گردن اٹھائی۔ فیاض حسین کی طرف لال انگارہ آنکھوں سے دیکھا اور چھلانگ مار کر چارپائی سے زمین پر آیا، پھر تیزی سے فیاض حسین کی ٹانگوں سے ٹکراتا، کمرے سے نکل گیا۔ فیاض حسین نے محسوس کیا جیسے کوئی سخت چیز اس کی ٹانگوں کو رگڑتی ہوئی گزر گئی ہو۔ فیاض کالے بلے کے جانے کے بعد تیزی سے نیلم کی طرف بڑھا۔ اس نے دیکھا کہ نیلم کی ہتھیلی ایک دم سرخ ہو رہی تھی یوں لگتا تھا جیسے اب خون جھلک آئے گا۔

پھر اچانک نیلم نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں اور بے قراری سے گردن گھما کر ادھر اُدھر دیکھا۔

"ہاں، بیٹا میں ادھر ہوں، تمہارے پاس ہوں۔" فیاض حسین نے چارپائی کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ابّو۔" نیلم جلدی سے اٹھ کر فیاض حسین سے لپٹ گئی اور گھبرا کر بولی۔ "یہاں سے جلدی نکل چلیں۔"

"ہاں بیٹے فوراً چلتے ہیں، ہم تمہارے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔" فیاض حسین نے اس کے خوبصورت بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ نیلم کا جسم لرز رہا تھا۔ انہوں نے اسے اور اپنے نزدیک کر لیا اور تسلی دیتے ہوئے بولے۔ "بیٹا ڈرو مت، میں تمہارے پاس ہوں اور ہاں ان سے ملو یہ اس گاؤں کے ڈاکٹر ہیں، ڈاکٹر بوٹا۔"

"بیٹی آپ بیہوش کیسے ہو گئی تھی۔" ڈاکٹر بوٹا نے اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"ابو وہ بلّا کہاں ہے۔" نیلم نے ڈاکٹر کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔

"وہ چلا گیا۔" فیاض حسین نے دروازے کی طرف دیکھا ان کی آواز میں خوف تھا۔

تب اچانک نیلم کی نظر ہتھیلی پر پڑی وہ ایک دم سرخ ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی جلن بھی ہو رہی تھی۔ نیلم نے اپنی ہتھیلی فیاض حسین کے سامنے کر کے پوچھا۔ "ابو یہ کیا ہوا؟"

پہلے فیاض نے سوچا کہ اسے سچ سچ بتا دے کہ تمہاری ہتھیلی کو کالے بلے نے چاٹا ہے لیکن پھر انہوں

نے سوچا اس طرح اس کے دل میں میں دہشت نہ بیٹھ جائے۔ یہ سوچ کر انہوں نے ارادہ بدل دیا اور بولے۔ "پتہ نہیں بیٹا یہ تمہارے ہاتھ کو کیا ہوا۔ خیر کوئی بات نہیں ابھی مرہم وغیرہ لگائے دیتے ہیں۔"

پھر فیاض حسین، ڈاکٹر بوٹا سے مخاطب ہوئے۔ "آپ کے پاس ہے کوئی ٹیب وغیرہ۔"

"جی ہاں ہے میں ابھی پٹی کئے دیتا ہوں۔" ڈاکٹر بوٹا نے اپنا بیگ کھولتے ہوئے کہا۔

ہاتھ کی مرہم پٹی کر کے ڈاکٹر بوٹا نے نیلم کے ایک انجکشن لگانا چاہا لیکن فیاض حسین نے منع کر دیا۔ وہ اب اچھی طرح ہوش میں آچکی تھی۔ اس لئے اسے اب کسی انجکشن کی ضرورت نہ تھی۔

ڈاکٹر بوٹا طاقت کی کچھ گولیاں وغیرہ دے کر رخصت ہو گیا۔

اب شام ہونے کو آرہی تھی۔ فیاض حسین سورج غروب ہونے سے پہلے اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا تاکہ اندھیرا ہونے تک وہ مین روڈ پر پہنچ جائے۔ یہ سوچ کر انہوں نے فوراً ہی وہاں سے نکلنے کی تیاری کی۔ عاشق بٹ نے انہیں روکنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ رکے نہیں۔

خاص طور پر نیلم کسی طور وہاں رکنے کیلئے تیار نہ تھی وہ بار بار یہی کہے جا رہی تھی۔

"ابو چلیں نا، یہاں سے نکلیں میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

تب وہ لوگ حسنہ کا جنازہ اٹھنے سے پہلے ہی سیدپور سے روانہ ہو گئے۔

عاشق بٹ انہیں گاؤں کے باہر کار تک چھوڑنے آیا۔ ڈرائیور انہیں دور سے آتے دیکھ کر گاڑی سے باہر آگیا۔ نیلم کے ہاتھ میں پٹی بندھی دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔

"کیا ہوا نیلم بی بی۔" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ایسے ہی چوٹ لگ گئی۔" فیاض حسین نے جواب دیا۔ "چلو جلدی کرو اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے ہی مین روڈ پکڑ لو۔"

"جی بہتر صاحب جی۔" اس نے بڑے ادب سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔

نیلم اور واجدہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ ڈرائیور کے ساتھ فیاض حسین بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ فیاض نے عاشق بٹ کو خدا حافظ کہا اور تیزی سے شیشہ چڑھا لیا۔

گاڑی کچے راستے پر سے گزر رہی تھی۔ آگے آموں کا باغ تھا۔ باغ کے کنارے سے گاڑی گزری تو ایک درخت پر بیٹھے ہوئے کالے بلّے نے بڑی پھرتی سے چھلانگ لگائی اور گاڑی کی چھت پر کود گیا اور اس طرح جم کر بیٹھ گیا جیسے اسے چھت پر کیلوں سے جڑ دیا گیا ہو۔

کالے بلّے کے چھت پر کودنے کا کسی کو پتہ نہ چلا۔ وہ کودا بھی اتنی آہستگی سے تھا۔ کودتے وقت وہ بالکل پھول سا ہو گیا تھا حالانکہ اس کا وزن کسی گدھے سے کم نہ تھا۔

فیاض اور واجدہ کے دل پر بڑا بوجھ سا تھا۔ سیدپور آکر ان کا بڑا دل خراب ہوا تھا انہیں توقع نہ تھی کہ حسنہ کو وہ اس خستہ حالت میں دیکھیں گے۔ پھر وہ ان کی موجودگی میں ہی چل بسے گی۔ ادھر کالے بلّے نے دہشت پھیلا دی تھی۔

پہلے تو اس کے بارے میں حسنہ کا یہ کہنا کہ وہ محض ایک بلّا نہیں ہے کچھ اور ہے۔ اس کے بعد نیلم کا بیہوش ہونا۔ اس کی ہتھیلی جلنا اور اس پر کوئی وار کارگر نہ ہونا یہ سب باتیں تھیں کہ ذہن چکرا کر رہ گیا

Urdufans.com

تھا۔ بہرحال یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ وہ کالا بلّا نہ تھا کچھ اور تھا۔

وہ کیا تھا یہ کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔

وہ چھت پر جما ہوا بیٹھا تھا اور گاڑی برق رفتاری سے چلی جا رہی تھی۔ گاڑی کے اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ سب اپنی اپنی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

نیلم اپنے ہاتھ کے بارے میں بار بار سوچ رہی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہاتھ پر یہ زخم سا کس طرح بنا۔ یہ اسے معلوم تھا کہ وہ کالے بلّے کے اچانک گود میں چڑھ آنے کی وجہ سے خوف میں مبتلا ہو کر بیہوش ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے رہ رہ کر بلّا آ رہا تھا۔ بلّے سے پہلی ملاقات کا منظر گویا اس کی آنکھوں میں منجمد ہو گیا تھا۔ وہ گلی کے درمیان بیٹھا اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی لال لال آنکھیں جانے ایسی کیا بات تھی کہ وہ چلتے چلتے ٹھٹک گئی تھی۔ پھر حسنہ، آیا سے اس کی سگی ماں بن گئی تھی۔ نیلم کا ذہن ابھی تک اسے اپنی سگی ماں قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ اب وہ اس دنیا میں نہ رہی تھی۔ اب سگے سوتیلے کا کوئی جھگڑا نہ رہا تھا لیکن اب بھی اس کا ذہن "نہیں نہیں" کی گردان کر رہا تھا۔ وہ بار بار نظریں اٹھا کر واجدہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ یقین کر لینا چاہتی ہو کہ اس کی سگی ماں کا انتقال نہیں ہوا، وہ اس کے ساتھ گاڑی میں سفر کر رہی ہے۔ وہ واجدہ کے علاوہ ماں کے روپ میں کسی اور کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

فیاض حسین ایک گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کالا بلّا اس کے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔ حسنہ کے کیے ہوئے الفاظ اور نیلم کی ہتھیلی چاٹتا ہوا وہ کالا بلّا بار بار اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ فیاض کا اسے ٹھوکر مارنا، عاشق بٹ کا لاٹھی سے مارنا اور پھر اس کا جسم بلّم سے چھیدنا اور بلّم کا اس کے جسم سے آر پار ہونا اسے سب یاد تھا۔ کیسا خوفناک منظر تھا وہ۔

واجدہ کو حسنہ کی موت کا بہت صدمہ تھا۔ حسنہ اس کی محسن تھی۔ اس نے اس کے لئے بہت بڑا ایثار کیا تھا وہ اسے کیسے بھول سکتی تھی۔ بار بار اس کی آنکھوں میں حسنہ کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ کیسی حسین عورت کیسی چڑیل جیسی ہو کر رہ گئی تھی۔ ٹی بی کوئی ایسا مرض تو نہیں جس کا علاج نہ ہو سکے۔ اگر اسے پہلے سے حسنہ کی بیماری کا پتہ چل جاتا تو وہ سیدپور آ کر اسے اپنے ساتھ لے جاتی۔ لاہور میں وہ اس کا علاج کرواتی اور پھر وہ اسے ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھ لیتی۔ وہ جانتی تھی کہ حسنہ کوئی بی بیوں ہی نہیں ہو گئی تھی۔ تنہائی نے زہر ہلاہل کا کام کیا تھا۔ تنہائی اس کے پھیپھڑوں کو چاٹ گئی تھی۔ حسنہ کو یاد کر کے واجدہ کی آنکھیں بار بار بھیگ جاتی تھیں۔

ڈرائیور بڑی مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اسے بس یہی فکر تھی کہ وہ لاہور خیریت سے پہنچ جائے۔ راستے میں گاڑی خراب نہ ہو، اگرچہ گاڑی نئی تھی، پھر بھی کوئی پرابلم کھڑی ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ کوئی آدھی رات کے بعد وہ لوگ لاہور پہنچ گئے۔

گھر کے گیٹ پر گاڑی رکتے ہی کالے بلّے نے گاڑی کی چھت سے درخت پر چھلانگ لگائی اور وہ ان لوگوں کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے خود داخل ہو گیا۔ واجدہ کو پھولوں، پودوں اور درختوں کا بہت شوق تھا۔ یہ آم کا درخت تھا جس کا تنا گیٹ کے اندر تھا وہ اتنا پھیلا ہوا تھا کہ اس کی شاخیں آدھی سڑک پر تھیں اور آدھی گھر کے اندر۔ لہٰذا کالے بلّے کو اس آم کے درخت سے گھر میں جانے میں کوئی دقت

Urdufans.com

پیش نہ آئی۔

گاڑی سے اتر کر ڈرائیور نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ فیاض حسین جاگتے ہوئے گھبرا اپنے ونٹر کے چہرا ہی ولی محمد کو چھوڑ گیا تھا تاکہ گھر کی حفاظت رہے۔ وہ اس وقت لمبی تان کر سو رہا تھا۔ کئی لمبی گھنٹیاں دینے پر اچانک اس کی آنکھ کھلی وہ گہری نیند میں تھا۔ پہلے تو اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ آواز کیسی ہے جب اسے احساس ہوا کہ یہ گھنٹی کی آواز ہے دروازے پر کوئی موجود ہے تو وہ گھبرا کر اٹھ کر بھاگا۔

گیٹ کھولنے سے پہلے اس نے آواز دے کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"ہاں ولی محمد گیٹ کھولو، ہم لوگ ہیں۔" فیاض حسین نے جواب دیا۔

فیاض حسین کی آواز پہچان کر ولی محمد نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

گھر میں داخل ہو کر نیلم نے سکون کا سانس لیا۔ وہ کمرے میں جا کر وہم سے اپنے بیڈ پر لیٹ گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں بیڈ پر پھیلا لئے اور آنکھیں بند کر کے گہرے سانس لینے لگی۔

تب اچانک اسے احساس ہوا جیسے اس کے سرہانے کوئی ہے۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور ڈرتے ڈرتے چاروں طرف دیکھا کمرے میں کوئی نہ تھا۔

ابھی وہ دوبارہ آنکھیں بند کرنے والی تھی کہ اچانک کمرے میں لائٹ بجھ گئی۔ اسے خیال آیا کہ بجلی چلی گئی ہے لیکن اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور راہداری میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بجلی موجود ہے پھر اس کے کمرے کی لائٹ آف کیسے ہو گئی۔

وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی اس نے بجلی کا بٹن دیکھا وہ آن تھا اس نے دوبارہ اسے آن آف کیا لیکن ٹیوب نہ جلی۔ اس نے سوچا ٹیوب میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے بیڈ کے سرہانے رکھا نیل لیمپ جلانا چاہا تو ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور کمرے کا دروازہ چرچراتا ہوا ایک دھماکے کے ساتھ بند ہو گیا۔

کمرے میں اندھیرا گھپ ہو گیا ایک لمحے کو وہ کانپ کر رہ گئی دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے جلدی سے نیل لیمپ کا بلب روشن کر دیا اور پھر آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلا تو اس کے ساتھ ہی کمرے کی ٹیوب لائٹ جل اٹھی۔

ٹیوب لائٹ کے نیچے شوکیس کے اوپر ایک بڑی سے گڑیا رکھی تھی۔ یہ نیلم کے بچپن کی یادگار تھی۔ اسے گڑیوں سے کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ اس شوق کو دیکھ کر فیاض حسین نے ایک قیمتی جاپانی گڑیا اسے لا کر دی تھی۔ یہ گڑیا ایک نوزائیدہ بچے کے برابر تھی۔ اس کے اندر ایک کیسٹ لگا ہوا تھا وہ چند جملے بھی بولتی تھی۔ اتنا عرصہ گزر جانے سے اس کا ٹیپ خراب ہو گیا تھا اس کا رنگ و روغن بھی اڑ گیا لیکن سونے جاگنے کی عادت ختم نہ ہوئی تھی۔ لٹانے سے اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں بند ہو جاتی تھیں اور اسے اٹھانے سے آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ نیلم کو اس کی آنکھیں بہت پسند تھیں۔ لہٰذا وہ اسے ہمیشہ کھڑا کر رکھتی تھی تاکہ اس کی آنکھیں کھلی رہیں۔ اس گڑیا کے ساتھ خیر اب تو بچپن جیسی وارفتگی نہ رہی تھی لیکن اب بھی کبھی وہ اسے اپنے ہاتھ میں اٹھا کر دیکھ لیتی تھی۔

اس وقت بھی شوکیس پر کھڑی گڑیا پر اس کی نظر پڑی تو جانے کیوں اس کا جی چاہا کہ وہ اسے اٹھا کر دیکھے وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھی۔

Urdufanz.com

ابھی وہ اس سے دو قدم کے فاصلے پر تھی کہ اس کے قدم جم کر رہ گئے وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی اور اتنے زور سے چیخی کہ پورے گھر میں اس کی چیخ گونج گئی۔ وہ لڑکھڑا کر بیڈ پر گری اور اس نے اپنے ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا۔

چیخ سن کر فیاض اور واجدہ اس کے کمرے کی طرف بھاگے۔ کمرے میں آکر دیکھا تو نیلم کو بیڈ پر سہمی بنا ہوا پایا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"کیا ہوا بیٹا۔" فیاض حسین نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"نیلم میری بیٹی، میری جان، تجھے کیا ہوا۔" واجدہ نے اس کے نزدیک بیٹھ کر اس کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹانے چاہے۔

"نہیں امی نہیں۔" وہ خوفزدہ ہو کر بولی۔ "امی وہ شوکیس..... گڑیا..... وہ ڈھانچہ۔"

نیلم بے ربط انداز میں بولی، واجدہ اور فیاض کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"گڑیا، ڈھانچہ۔" واجدہ نے سوالیہ انداز میں دہرایا۔ "نیلم تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تم نے کچھ دیکھا ہے۔"

"ہاں امی گڑیا کی جگہ ایک ڈھانچہ رکھا ہے۔"

"کہاں ہے بیٹی ڈھانچہ، تمہاری گڑیا اپنی جگہ شوکیس پر موجود ہے۔" واجدہ نے اسے بتایا۔

یہ سن کر نیلم نے اپنے چاند چہرے سے ہاتھوں کا بادل ہٹایا اور ڈرتے ڈرتے گڑیا کو دیکھا واقعی اب وہاں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے خوفزدہ ہوا جائے۔ اس کی جاپانی گڑیا اس کی بچپن کی ساتھی اپنی انہی بڑی بڑی آنکھوں سے چہرہ پر دھیمی مسکراہٹ سجائے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تو نے کیا دیکھا تھا بیٹی۔"

"امی ابھی ابھی جب میں اپنی گڑیا کو اٹھانے کے لئے اس کی طرف بڑھ رہی تھی تو امی میں آپ کو کیا بتاؤں کہ کیسا خوفناک ڈھانچہ میں نے دیکھا تھا۔ امی کسی مردے کی سوکھی کھوپڑی کی طرح اس کا چہرہ تھا، آنکھوں کی جگہ گہرے گڑھے تھے۔ سارے بال تھے اور بالوں کی چوٹیاں ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی پسلیاں نکلی ہوئی تھیں اور جسم کسی دیمک زدہ لکڑی کی طرح اس کے جسم پر بے شمار سوراخ تھے۔ لمبے لمبے سوکھے ہاتھ پاؤں، کھلا ہوا منہ اور ان سے جھانکتے دانت۔ امی اس کا سائز میری گڑیا جیسا تھا۔ پتہ نہیں وہ بیٹھا تھا یا کھڑا تھا۔" نیلم اس ڈھانچے کے بارے میں بتاتے بتاتے کانپنے لگی۔

"اری چل بیوقوف، کیا بے پر کی ہانک رہی ہے۔"

واجدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اس ڈھانچے کے بارے میں سن کر خود اندر سے لرز گئی تھی۔

"امی، آپ کو یقین نہیں آرہا۔" نیلم نے روہانسو ہو کر کہا۔

"ارے چل ایسے ہی تیرا وہم ہوگا۔ یہاں کہاں ڈھانچہ، ہوتا تو کہاں غائب ہو جاتا۔"

"امی خدا کی قسم، میں نے ڈھانچہ دیکھا ہے۔" نیلم نے واجدہ کو یقین دلانے کیلئے قسم کھائی۔

"اچھا اب قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آرام سے سو جاؤ۔"

Urdufans.com

"امی آپ کو معلوم ہے جب میں کمرے میں آکر لیٹی تو کیا ہوا۔"

"ہاں، کیا ہوا؟" اس مرتبہ فیاض حسین نے پوچھا۔

"ابو خود بخود کمرے کی لائٹ آف ہوگئی۔" نیلم نے فیاض کو بتایا۔

"خود بخود۔" فیاض حسین نے سوال کیا۔

"جی ابو خود بخود اور کمرے کا دروازہ ایک تیز ہوا کے جھونکے سے بند ہوگیا اور جب میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو لائٹ خود بخود جل گئی۔ یہ سب کیا ہے، کیا ہو رہا ہے۔" نیلم نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس سوال کا کسی کے پاس جواب نہ تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ واجدہ اور فیاض تو پہلے ہی الجھے ہوئے تھے ان کے دماغ ماؤف تھے سیدپور جاکر انہوں نے بڑی غلطی کی تھی۔

اس رات نیلم تنہا اپنے کمرے میں نہ سو سکی۔ وہ بہت خوفزدہ ہوگئی تھی۔ واجدہ کو اس کے ساتھ اس کے بیڈ پر سونا پڑا۔ وہ واجدہ سے لپٹ کر سوئی۔

سیدپور سے واپس آنے کے بعد نیلم کی کچھ عجیب سی کیفیت ہوگئی تھی۔ وہ گھبرائی گھبرائی رہنے لگی تھی۔ سر میں درد مستقل رہنے لگا تھا۔ بھوک کم ہوتی جارہی تھی۔ اس کی سرخ سفید رنگت پھیکی پڑنے لگی تھی۔ فیاض حسین نے نیلم کو لاہور کے اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھایا لیکن کوئی نیلم کے مرض کو نہ سمجھ سکا۔ سب نے اسے "کوئی بیماری نہیں" کا سرٹیفکیٹ دیدیا۔ لیکن وہ تھی کہ دن بدن گھلتی جارہی تھی۔ اس کا نفسیاتی علاج بھی کرایا گیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ سر کا درد کم ہوا نہ بھوک کھلی، سرخ رنگت زرد ہوتی رہی۔

اس طرح ایک ماہ گزر گیا۔

وہ جو سیدپور سے ساتھ آیا تھا وہ اسی گھر میں مقیم تھا وہ کسی کو نظر نہ آتا تھا لیکن اس نے سب کو اپنی نظروں میں رکھا ہوا تھا۔ نیلم خاص طور پر اس کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ اسے دیکھے بغیر اسے چین نہ آتا تھا۔ وہ اس کی رگوں میں اندھیرا بن کر اتر رہا تھا۔ نیلم بیمار ہو رہی تھی لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کس کی بیمار ہے۔

ایک دن کیا ہوا۔

شام کو نیلم نے اپنے ٹیلر کے پاس کپڑے دینے جانا تھا۔ کپڑے تبدیل کر کے جب اس نے جوتے ڈھونڈے تو اچانک جوتا غائب تھا۔ اس نے سرخ جوتے کی تلاش میں پورا کمرہ چھان مارا لیکن وہ نہ ملا پھر اس نے سوچا کہ پیلے سینڈل پہن لے۔ ان کپڑوں سے وہ بھی میچ کر رہے تھے۔ پیلے سینڈل کا ڈبہ کھول کر دیکھا تو وہاں بھی وہی تماشا تھا۔ اس ڈبے سے بھی ایک سینڈل غائب تھا۔ یا اللہ یہ دونوں جوتوں کا ایک ایک پیر کہاں گیا اس نے اپنے کمرے کے علاوہ پورا گھر چھان مارا لیکن جوتے کہیں نہ ملے۔

نیلم کو اس قدر پریشان دیکھ کر واجدہ نے اس سے پوچھا۔ "کیا ہوا بیٹی۔"

"امی ڈبوں سے میرے جوتے غائب ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں جوتوں کا ایک ایک پیر غائب ہے۔ نہ لال والا جوتا ہے جو میں نے ابھی انار کلی سے لیا تھا اور نہ پیلا والا سینڈل ہے جو آپ خرید کر لائی تھیں۔" نیلم نے واجدہ کو بتایا۔

واجدہ نے اس کے گمشدہ جوتوں کو ادھر ادھر ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ ملنے تھے نہ ملے۔ تب

واجدہ نے کہا۔ "نیلم چھوڑ کچھ اور پہن لے۔"

نیلم کے پاس جوتوں کی کیا کمی تھی۔ وہ کچھ بھی پہن سکتی تھی لیکن مسئلہ میچنگ کا تھا کوئی اور جوتا پہننے کے لئے اسے ڈریس تبدیل کرنا پڑتا۔ اسے استری کرنا پڑتی اور اس وقت وہ استری کے موڈ میں نہ تھی۔

تب اس کی مشکل کو واجدہ نے آسان کیا۔ اس کے کپڑوں پر استری کر دی۔ نیلم ڈریس تبدیل کر کے گھر سے نکلی۔ گاڑی گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ وہ چابی گھماتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر درخت کے تنے پر پڑی وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

اس کے دونوں گمشدہ جوتے، درخت کی سوکھی ٹہنیوں پر رکھے ہوئے تھے۔ گمشدہ جوتے دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہوئی لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ یہ جوتے درخت تک کیسے پہنچے اور سوکھی ٹہنیوں پر اب تک ٹکے ہوئے کیسے تھے۔ جوتے اونچائی پر رکھے ہوئے تھے۔ اتنی اونچائی پر کہ انہیں ہاتھ بڑھا کر نہیں اتارا جاسکتا تھا۔

ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ان جوتوں کو کیسے اتارے اس کی نظر پتوں پر پڑی۔ دو بڑے پتوں کے پیچھے اسے کوئی جھانکتا نظر آیا۔ وہ کوئی کالا سا تنگڑو ٹائپ مرد تھا۔ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

اب نیلم سے یہاں نہ رکا گیا۔ وہ دھڑکتے دل اور لرزتی ٹانگوں کے ساتھ گھر کے اندر بھاگی۔ راہداری میں اسے واجدہ مل گئی، نیلم کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی۔

"کیا ہوا ابھی تم گئی نہیں۔"

"امی باہر پتوں میں کوئی مرد چھپا ہوا ہے۔"

"آؤ میرے ساتھ مجھے دکھاؤ۔" واجدہ نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور امی میرے جوتے مل گئے۔ وہ آم کے درخت کی سوکھی ٹہنیوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔" نیلم نے چلتے چلتے بتایا۔

واجدہ نے باہر آکر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے جھاڑیوں میں اچھی طرح دیکھ لیا البتہ نیلم کے جوتے جوں کے توں سوکھی ٹہنیوں پر رکھے ہوئے تھے۔

"کہاں ہے کوئی مرد۔"

"امی ان پتوں کے پیچھے تھا اور مجھے بڑا گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔"

"اچھا جاؤ اندر سے کوئی ڈنڈا وغیرہ لاؤ۔" واجدہ نے درخت کے تنے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "جی اچھا امی۔" یہ کہہ کر نیلم گھر میں داخل ہوئی۔

اسٹور میں چند مچھر دانی کے ڈنڈے پڑے ہوئے تھے جب وہ اسٹور میں داخل ہوئی اور اس نے لائٹ جلانے کے لئے بٹن پر ہاتھ رکھا تو کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

کسی نے نیلم کا ہاتھ کیا پکڑا گویا اس پر قیامت گزر گئی۔

اسٹور میں دن کے وقت بھی اندھیرا رہتا تھا، اس وقت تو خیر مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ اندھیرا گہرا ہو گیا

تھا۔ نیلم نے اندھیرا دور کرنے کے لئے بلب روشن کرنا چاہا۔ بٹن اسٹور میں داخل ہوتے ہی داہنی جانب تھا۔ نیلم نے اندازے سے بٹن پر ہاتھ رکھا اور ابھی اس نے بٹن آن کرنے کے لئے ہاتھ کا دباؤ ڈالا ہی تھا کہ اس کا خوبصورت نرم نازم اور گورا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں چلا گیا۔ وہ لائٹ نہ جلا سکی۔

اس کے ہاتھ پر کسی نے نرمی سے گرفت کی تھی یہ گرفت غیر مردانہ نہ تھی۔ کسی نے بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ کو پکڑا تھا۔ بہت پیار سے چھوا تھا۔

"امی۔" وہ بُری طرح چیخی اور پھر باہر کی طرف بھاگی۔ واجدہ ابھی باہر ہی تھی۔ وہ نیلم کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ ڈنڈا لائے تو وہ اس کے جوتوں کو اتارے۔ نیلم کو بغیر ڈنڈے کے اور بدحواس ہو کر اپنی طرف آتا دیکھ کر واجدہ پریشان ہو گئی۔

"کیا ہوا نیلم۔" اس نے پوچھا۔

"امی اسٹور میں کوئی ہے، میں نے لائٹ جلانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔" نیلم نے لمبے لمبے سانس لے کر جلدی جلدی بتایا۔

"ارے، تو تو بہت ہی ڈرنے لگی ہے، آ میرے ساتھ۔" واجدہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر کی طرف چلی۔ واجدہ نے محسوس کیا کہ نیلم کا ہاتھ بالکل ٹھنڈا تھا۔

اسٹور کے اندر پہنچ کر واجدہ نے لائٹ جلائی وہاں ایسی کوئی چیز نہ تھی جو اس کا ہاتھ پکڑتی۔

"کیا ہے یہاں؟" واجدہ نے نیلم سے پوچھا۔

اس بات کا وہ کیا جواب دیتی، اس نے کچھ دیکھا ہوتا تو جواب دیتی۔ اس نے محض محسوس کیا تھا اور اس وقت بھی وہ ایک بات محسوس کر رہی تھی اس نے واجدہ کا بازو پکڑ کر ایک گہرا سانس لیا۔

"امی، آپ کو خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔" نیلم نے ایک اور گہرا سانس لیتے ہوئے واجدہ سے پوچھا۔

"ہاں کوئی خوشبو آ تو رہی ہے۔" واجدہ نے لمبا سانس لیا۔

"کیسی خوشبو ہے یہ۔" نیلم نے سوال کیا۔

"یہ تو گلاب کے پھولوں جیسی معلوم ہوتی ہے۔" واجدہ نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "اسٹور میں یہ خوشبو کہاں سے آ گئی۔"

"امی، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" نیلم، واجدہ کے بازو سے لپٹ گئی۔

"پگلی اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے کوئی خوشبو سے بھی ڈرتا ہے۔"

"امی، یہاں کچھ دیر پہلے ضرور کوئی تھا۔" نیلم کی آواز میں لرزش تھی۔

"ارمی کوئی نہیں تھا، وہ محض تیرا وہم تھا تجھے تو باہر بھی کوئی آدمی نظر آیا تھا۔ پتہ نہیں تجھے کیا ہو گیا تجھے ہر وقت کچھ نہ کچھ نظر آتا رہتا ہے۔"

"امی، میں سچ کہہ رہی ہوں اس کے ہاتھ کا لمس اب تک مجھے محسوس ہو رہا ہے۔ وہ کوئی بہت گرم ہاتھ تھا، بخار زدہ۔" نیلم نے اپنے ہاتھ کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

واجدہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک ڈنڈا نکالا۔ وہ خوشبو ابھی تک

Urdufans.com

آرہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا اسٹور میں منوں گلاب رکھے ہوں۔

ڈبڑا نکال کر واجدہ باہر آئی۔ پھر وہ گھر کے بڑے دروازے سے باہر نکلی۔ نیلم اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔

ورخت کے تنے پر اب وہ جوتے نہ تھے وہ زمین پر پڑے ہوئے تھے شاید ہوا کے جھونکے سے نیچے آگرے تھے۔ نیلم نے اپنے دونوں جوتے اٹھائے انہیں الٹ پلٹ کر دیکھا وہ صحیح سلامت تھے۔

نیلم اس دن ٹیلر کے پاس نہ جاسکی۔ وہ اتنی خوفزدہ ہوگئی تھی کہ اس کا باہر نکلنے کو جی نہ چاہا۔ وہ نیلیو رین کھول کر بیٹھ گئی۔ نیلیو رین سے کوئی موسیقی کا پروگرام آرہا تھا۔

واجدہ کچن میں تھی وہ رات کے کھانے میں مصروف تھی۔ حسنہ کے جانے کے بعد اس نے کوئی باقاعدہ ملازمہ نہ رکھی تھی۔ جھاڑو، پونچھے اور کپڑے دھونے کے لئے ایک ماسی رکھی ہوئی تھی۔ جو صبح کام کر کے چلی جاتی تھی۔ فیاض حسین نے بارہا کہا تھا کہ کھانے پکانے کے لئے بھی کوئی ملازمہ رکھ لو خود ہی کچن میں کھبی رہتی ہو لیکن واجدہ اس کے لئے راضی نہ ہوئی۔ وہ خود ہی کھانا پکانا چاہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ کھانے کے انتظامات میں مصروف تھی۔

نیلیو رین دیکھتے دیکھتے اچانک نیلم کو محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے آس پاس موجود ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نیلیو رین اسکرین سے نظریں ہٹا کر دائیں بائیں دیکھا کوئی نہ تھا۔

وہ پھر نیلیو رین دیکھنے لگی۔ لیکن اس کا سکون لٹ چکا تھا۔ وہ بے چین ہوگئی تھی۔ پھر اسے اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے چہرے کے نزدیک لمبا سانس لیا ہو۔

وہ فوراً اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف سہمی سہمی نظروں سے دیکھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا اس کا دل بڑی تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا۔

اب اس سے کمرے میں نہ رکا گیا۔ اس نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے نیلیو رین آف کیا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ اسے معلوم تھا کہ واجدہ اس وقت کہاں ہوگی۔ وہ سیدھی باورچی خانے میں پہنچی واجدہ وہاں موجود تھی۔ وہ سبزی کاٹ رہی تھی۔

"لایئے امی میں کاٹ دوں سبزی۔" نیلم نے واجدہ کے نزدیک پہنچ کر کہا۔

"اچھا۔" واجدہ نے ہنس کر نیلم کو ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔ "تمہیں سبزی کاٹنے سے کب سے دلچسپی ہوگئی۔"

"ابھی سے۔" نیلم نے سرسری سا جواب دیا۔

"تم نے نیلیو رین کیوں بند کر دیا۔ اتنا اچھا گانا آرہا تھا۔" واجدہ نے پوچھا۔

"آپ سن رہی تھیں کیا۔ نیلیو رین کھول دوں۔" نیلم نے کہا۔

"نہیں تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے نیلیو رین کیوں بند کیا جبکہ تم موسیقی کے پروگراموں پر جان دیتی ہو اور اس وقت تو تمہارا پسندیدہ فنکار اسکرین پر تھا۔"

"سچ بتادوں۔" نیلم نے واجدہ کی آنکھوں میں دیکھا۔

"ہاں بتاؤ۔" واجدہ نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے کمرے میں ڈر لگ رہا تھا۔" نیلم، واجدہ کے نزدیک ہو کر بولی۔

"نیلم اب تم بڑی ہوگئی ہو۔" واجدہ نے ہنس کر کہا۔

"ہاں، امّی میں جانتی ہوں کہ بڑی ہوگئی ہوں، بچی نہیں رہی ہوں لیکن میں کیا کروں مجھے ڈر لگتا ہے اور جب سے ہم سید پور گئے ہیں تب سے خوفزدہ کر دینے والے واقعات کا سلسلہ شروع ہے۔ امی یہ سب کیا ہو رہا ہے۔"

"کہیں کچھ نہیں ہو رہا۔" واجدہ نے بے نیازی سے کہا۔ "آؤ چلو ٹی وی لاؤنج چلتے ہیں میں وہیں بیٹھ کر سبزی کاٹ لوں گی۔ پروگرام بھی دیکھ لوں گی۔"

"ٹھیک ہے چلیں۔" نیلم، واجدہ کے پیچھے پیچھے ہولی۔

ٹی وی لاؤنج میں آکر نیلم نے صوفے پر پڑا ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور ٹی وی کھول دیا۔ نیلیوشن کی اسکرین فوراً روشن ہوگئی اور ایک روشن روشن چہرہ چھوٹی اسکرین پر نمودار ہوگیا۔

واجدہ اپنی سبزی کے ساتھ نیچے قالین پر بیٹھ گئی۔ نیلم صوفے پر برا جمان ہوگئی وہ کچھ دیر پہلے اسی جگہ بیٹھی تھی جب اسے یہ احساس ہوا تھا کہ کمرے میں کوئی ہے۔ پھر کسی نے اس کے بہت نزدیک لمبا سا سانس لیا تھا۔ نیلم نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا اسے کہیں کچھ نظر نہ آیا۔ اب کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس بھی ختم ہوگیا تھا۔ واجدہ بھی سامنے بیٹھی تھی پھر بھی اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

جب سے وہ سید پور سے آئی تھی۔ اس کے دل کا سکون لٹ گیا تھا ہر وقت اس کے سر میں درد رہنے لگا تھا۔ بعض وقت یہ درد اس قدر شدت اختیار کر لیتا کہ نیلم تڑپ تڑپ جاتی۔ وہ دوپٹے سے اپنا سر کس کر باندھ لیتی۔ پھر بھی اٹھتی ہوئی ٹیسوں میں افاقہ نہ ہوتا۔ واجدہ گھنٹوں اس کا سر دباتی لیکن درد جوں کا توں رہتا۔ جب نیلم کے سر میں شدت کا درد اٹھتا تو اس کی آنکھیں ایک دم سرخ ہو جاتیں وہ آنکھیں کھولتی تو اس آنکھوں کو دیکھ کر ڈر لگتا۔ درد کا یہ دورہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک چلتا پھر اس پر غنودگی طاری ہو جاتی اور وہ سو جاتی۔ سو کر اٹھتی تو اس کی طبیعت سنبھل چکی ہوتی۔ درد کی شدت ختم ہو جاتی لیکن وہ بالکل ختم نہ ہوتا ہلکا درد مستقل رہتا۔

فیاض حسین نے شہر کے کسی بڑے ڈاکٹر کو نہ چھوڑا تھا۔ سب نے نیلم کا بغور معائنہ کیا تھا سر کے متعدد ایکسرے بھی لئے گئے تھے لیکن کسی ڈاکٹر کو درد کی وجہ سمجھ میں نہ آئی تھی۔ نیلم کا دوائیں کھا کھا کر برا حال ہوگیا تھا۔ تھک ہار کر اس نے علاج چھوڑ دیا۔

اب سید پور سے آئے ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ سر درد کے ساتھ اس کی بھوک بھی مٹتی جا رہی تھی۔ نیلم خوش خوراک لڑکی تھی۔ کھانے کی شوقین بھی تھی لیکن اب اسے کچھ اچھا نہ لگتا تھا۔ واجدہ نے کھانا سامنے رکھ دیا تو کھا لیا ورنہ کوئی پروا نہ کی۔ ناشتہ کیا کیا نہ کیا۔ رات کا کھانا بھی تقریباً چھوٹ گیا تھا۔ کھانا پینا چھوٹا تو اس کی صحت پر بھی اثر پڑا سرخ سفید رنگت زرد ہونے لگی۔ مرجھانے لگی۔

ایک طرف نیلم کی دماغی اور جسمانی حالت بگڑتی جا رہی تھی تو دوسری طرف گھر میں عجیب و غریب واقعات پیش آ رہے تھے۔ کبھی دھانچہ نظر آ گیا تو کبھی ہوتے غائب ہو کر درخت پر جا ٹنگے اسٹور میں کسی نے اس کا ہاتھ تھام لیا تو کبھی گلاب کی خوشبو پھیل گئی۔

Urdufans.com

یہ خوف اب اس کے ساتھ مستقل چپٹ گیا تھا کہ ہر لمحہ کوئی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ نیلم اب باتھ روم میں جاتی تو اندر سے دروازہ بند نہ کرتی۔ خوف کی وجہ سے وہ دروازہ بند کر ہی نہیں سکتی تھی۔ رات کو اس نے اپنے کمرے میں سونا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ واجدہ کے ساتھ سوتی تھی۔ فیاض الگ سونے لگا تھا۔ بھیانک خوابوں نے اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ رات کو سوتے سوتے چیخ کر اٹھ جاتی۔ رات نیلم اپنے کمرے میں نہ سوتی تھی لیکن صبح اٹھ کر جب وہ اپنے کمرے میں جاتی تو اسے تکیے پر ایک تازہ گلاب رکھا ہوا ملتا۔

اب ایک واقعہ اور پیش آنے لگا تھا۔ رات نیلم اپنے کمرے میں نہ سوتی تھی لیکن صبح اٹھ کر جب وہ اپنے کمرے میں جاتی تو اسے تکیے پر ایک تازہ گلاب رکھا ہوا نظر آیا تو وہ بے اختیار اس پھول کی طرف بڑھی۔ اس نے پھول کو اٹھا کر سونگھا۔ بڑی مسحور کن خوشبو تھی۔، پھر جب پہلے دن اسے اپنے تکیے پر گلاب کا ایک بے حد خوبصورت اور تروتازہ پھول رکھا ہوا نظر آیا تو وہ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ میں گلاب کا پھول نہ ہو کوئی بچھو ہو۔ اس احساس کے ساتھ اس نے گلاب کا پھول بستر پر پھینک دیا اور اپنے کمرے سے نکل گئی۔

پھر اس نے گلاب کے پھول کے بارے میں واجدہ سے پوچھا۔ "امی آپ نے رکھا ہے وہ گلاب کا پھول۔"

"کونسا بیٹی؟" واجدہ نے پلٹ کر سوال کیا۔

"میرے کمرے میں تکیے پر۔" نیلم نے بتایا۔

"میں نے تو کوئی پھول نہیں رکھا۔ آج تو میں باہر گارڈن میں بھی نہیں گئی۔ پھول کہاں سے رکھتی۔"

"امی پھر کس نے رکھا ہے وہ گلاب کا پھول؟" نیلم پریشان ہونے لگی۔

"اپنے ابو سے پوچھ لو، شاید انہوں نے رکھا ہو۔" واجدہ نے کہا۔

فیاض حسین شیو بنا رہا تھا کہ نیلم اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ نیلم کو صبح صبح اپنے کمرے میں آتے دیکھ کر فیاض حسین مسکرایا اور بولا۔ "ارے بھئی نیلم پری نے آج صبح صبح کیسے دیدار کرا دیا۔"

"ابو آپ کے تحفے کا شکریہ۔" نیلم نے اندھیرے کا تیر چھوڑا۔

"کس تحفے کی بات کر رہی ہو نیلم۔" فیاض حسین نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"اس گلاب کے پھول کی جو آپ نے میرے کمرے میں، بیڈ کے تکیے پر رکھا۔" نیلم نے بڑے یقین سے کہا۔

"لیکن نیلم میں نے تو کوئی پھول تمہارے تکیے پر نہیں رکھا۔" فیاض حسین بولا۔

"ابو پھر وہ میرے تکیے پر کس نے رکھا، امی بھی منع کر رہی ہیں۔" نیلم نے فکر مندی سے کہا۔

"ذرا وہ پھول لا کر دکھاؤ مجھے۔" فیاض حسین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"جی ابھی لائی۔" کہنے تو اس نے کہہ دیا لیکن اپنے کمرے میں جانے کی اب اس میں ہمت نہ تھی اس نے واجدہ کو کچن سے اپنے ساتھ لیا کمرے میں آئی۔ وہ گلاب کا پھول جوں کا توں بیڈ پر پڑا ہوا تھا۔

"ارے، یہ تو زرد گلاب ہے۔" واجدہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر وہ پھول اٹھا لیا۔ "ہمارے

urdufanz.com

گارڈن میں تو زرد گلاب کا کوئی پودا نہیں۔"

"پھر یہ کہاں سے آیا۔" نیلم نے فکر مند ہو کر پوچھا۔ "چلیں ابو کو دکھائیں۔"

وہ گلاب کا پھول کس نے تکیے پر رکھا۔ کہاں سے آیا۔ یہ کوئی نہ بتا سکا۔

لیکن اب یہ روز کا معمول بن چکا تھا۔ صبح ہی صبح گلاب کا ایک تازہ پھول نیلم کے تکیے پر رکھا ہوتا۔ بعض وقت یہ پھول اس قدر تازہ ہوتا کہ اس پر شبنم کے قطرے صاف چمکتے نظر آتے۔ خوشبو بھی گلاب کے عام پھول کے مقابلے میں تیز اور مسحور کن ہوتی۔ یہ گلاب کے پھول مختلف رنگوں میں ہوتے۔ کبھی کالا گلاب ہوتا تو کبھی گہرا سرخ یہ سارے گلاب کے پھول اس گھر کے گارڈن کے نہ تھے۔ اتنے بڑے اور خوبصورت گلاب ان کے گارڈن میں کہاں کھلتے تھے۔

جب کئی دن تکیے پر گلاب کا پھول ملتا رہا اور سب یہ معلوم کرنے میں ناکام ہو گئے کہ یہ پھول کہاں سے آتا ہے، کون رکھ جاتا ہے۔ تو ایک دن فیاض حسین نے نیلم کے کمرے کو مقفل کر دیا۔

پھر رات کو بھی اس نے کئی مرتبہ اٹھ کر دیکھا۔ کمرے کا دروازہ بدستور بند پایا لیکن صبح کو جب اس نے کمرے کا تالا کھولا اور اندر داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تکیے پر ایک کالا گلاب موجود تھا۔ اس گلاب پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس قدر تازہ تھا وہ اس کی خوشبو پورے کمرے میں بسی ہوئی تھی۔

نیلم کے کمرے میں ایک کھڑکی تھی۔ فیاض حسین نے اسے چیک کیا وہ اندر سے بدستور بند تھی۔ ابھی وہ کالے گلاب کو دیکھ کر حیران اور پریشان ہی ہو رہا تھا کہ واجدہ کمرے میں آ گئی۔ اس نے تکیے پر پھول رکھا دیکھا تو سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"دروازہ بند ہونے کے باوجود؟" واجدہ نے فیاض کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ہاں دروازہ مقفل ہونے کے باوجود یہ گلاب کا پھول یہاں موجود ہے۔ عقل دنگ ہے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ گلاب کا پھول کہاں سے آیا۔" فیاض حیران ہو رہا تھا۔

"فیاض یہ مجھے کسی انسان کا کام نہیں معلوم دیتا۔" واجدہ پریشان ہو کر بولی۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اب ایک آخری بات اور رہ گئی ہے۔" فیاض نے کہا۔

"وہ کیا ہے۔" واجدہ نے پوچھا۔

"کمرے کے ہر طرح نگرانی کر کے دیکھ لی ہے۔ اب سوچتا ہوں کہ اس کمرے میں ایک رات گزار کر دیکھ لوں۔ کسی پردے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جاؤں اور صبح تک بیٹھا رہا ہوں۔ پھر دیکھوں کہ یہ پھول کہاں سے آتا ہے، کون رکھتا ہے۔" فیاض حسین نے جواب دیا۔

"ہائے نہیں فیاض۔" واجدہ اپنا دل پکڑ کر بولی۔ "میں تمہیں تنہا کمرے میں نہیں رہنے دوں گی۔"

"ارے کچھ نہیں ہو گا۔" فیاض نے بے نیازی سے کہا۔

"نہ فیاض ایسا سوچنا بھی نہیں۔ میں تمہیں کسی قیمت پر کمرے میں اکیلا نہیں رہنے دوں گی۔"

"اچھا ایسا کرو دونوں رہیں گے۔" فیاض حسین نے مسکرا کر کہا۔

"نا بابا میرے بس کا نہیں ہے۔ خدانخواستہ کچھ نظر آ گیا تو میرا تو ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ فیاض ایسا

Urdufans.com

کیوں نہیں کرتے کہ اس کمرے میں ایک رات کسی اور کو سلا دو۔" "لیکن کس کو سلاؤں، کون سونے کی ہمت کرے گا۔" فیاض حسین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔" "ایسے بھی سلاؤ اسے بتانا کچھ نہیں۔ بغیر کچھ بتائے سونے کو کہہ دینا۔" واجدہ نے ترکیب بتائی۔

"کس سے کہوں سونے کو۔" فیاض حسین نے سوچتے ہوئے کہا۔ "واجدہ نے مشورہ دیا۔

"اپنے دفتر کے چپراسی ولی محمد سے کیوں نہیں کہہ دیتے۔" خاموشی سے آکر سو جائے گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے اس سے کہوں گا تو وہ کوئی سوال بھی نہیں کرے گا۔ ولی محمد تم اپنی اور ہوا بھی یہی۔ شام کو جب دفتر بند کرنے کا وقت ہو تو فیاض نے ولی محمد سے کہا۔ "ولی محمد تم اپنی بیوی کو بتا کر میرے گھر آجاؤ۔ رات کو تم نے وہیں رہنا ہے۔"

ولی محمد بہت سیدھا آدمی تھا اس نے پلٹ کر نہیں پوچھا۔ "کیوں صاحب جی۔" بلکہ سعادت مندی سے بولا۔ "بہت بہتر صاحب جی۔"

"آٹھ بجے تک پہنچ جانا کھانا گھر پر ہی کھا لینا۔" فیاض حسین نے ہدایت کی۔ ولی محمد ٹھیک آٹھ بجے فیاض حسین کے گھر پہنچ گیا۔ واجدہ نے اسے کھانا کھلایا۔ کھانا کھا کر ولی محمد نے پوچھا۔ "صاحب جی کہاں سونا ہے۔"

تب واجدہ نے اسے نیلم کا کمرہ دکھایا۔ ایک نیکی دیا۔ ولی محمد بیڈ کے برابر نیچے قالین پر لیٹ گیا۔

"ولی محمد ایک بات بتاؤ تمہیں اکیلے کمرے میں سونے سے ڈر تو نہیں لگتا۔" واجدہ نے پوچھا۔

"نہیں بیگم صاحب ڈر کس بات کا۔" ولی محمد نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "میں تو اس گھر میں اکیلا سویا ہوں جب آپ لوگ سیدپور گئے ہوئے تھے آج تو اس گھر میں آپ لوگ بھی موجود ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے مجھے یہ بات یاد ہی نہیں رہی۔ اچھا تم سو جاؤ۔" یہ کہہ کر واجدہ کمرے سے نکل آئی۔

"فیاض، یہ ولی محمد تو آرام سے سو جائے گا۔" واجدہ نے فیاض کے کمرے میں آکر کہا۔ "پھر ہمیں یہ کیسے معلوم ہو گا کہ یہ پھول کس نے رکھا۔"

"پھر کیا کرنا چاہئے۔"

"اسے اصل حالات سے آگاہ کر دیں، اگر وہ خوفزدہ ہو جائے تو تم بھی اس کے ساتھ سو جانا اور اگر وہ سارے واقعات سن کر خوفزدہ نہ ہو تو اس سے کہنا کہ رات کو سوئے نہیں۔ پردے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جائے اور رات بھر کمرے کی نگرانی کرے۔"

فیاض حسین نے واجدہ کی ہدایت کے مطابق ولی محمد کو گلاب کے پھول کی کہانی سنا دی۔ یہ ساری کہانی سن کر ولی محمد کو ذرا بھی ڈر نہ لگا بلکہ اس کے اندر خوف کے بجائے تجسس جاگا۔ وہ بولا۔ "صاحب جی آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں رات بھر بیٹھ کر کمرے کی نگرانی کروں گا میں دیکھتا ہوں کہ اس کمرے میں کوا

urdufans.com

پھول رکھ کر جاتا ہے۔ میں اس کو ایسی پھینٹی لگاؤں گا کہ پھر زندگی بھر کے لئے پھول رکھنا چھوڑ دے گا۔"

"فیاض حسین نے کمرے کی ٹیوب لائٹ جلادی اور اسے رات بھر جلتی رہنے کی ہدایت دے کر کمرے سے باہر آگیا۔

ولی محمد نے فیاض حسین سے یہ کہنے کو تو کہہ دیا کہ وہ رات بھر جاگ کر نگرانی کرے گا لیکن وہ نیند کا بڑا کچا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے کھانا بھی کچھ ضرورت سے زیادہ کھالیا تو کھانے کا نشہ بڑھنے لگا۔ کچھ دیر تو وہ نیند سے لڑتا رہا۔ کبھی اٹھا کبھی لیٹا اور کبھی بیٹھا اور کبھی ٹہلا۔ آخر کب تک پھر نیند نے بلی بن کر ایک چوزے کی طرح دبوچ لیا۔ وہ قالین پر پڑ کر گہری نیند سو گیا۔ دروازہ اس نے اندر سے بند کر لیا تھا لہٰذا اس بات کا خطرہ نہ تھا کہ فیاض کمرے میں آکر اسے سوتا ہوا پکڑ لے گا۔

کوئی تین بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے خود کو اجنبی جگہ پایا۔

کھردری چارپائی کی جگہ وہ قالین پر لیٹا ہوا تھا۔ ذرا حواس بحال ہوئے تو اسے یاد آیا کہ وہ اپنے مالک کے گھر آیا ہوا ہے اسے کمرے کی نگرانی کے لئے سلایا گیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ جاگ کر رات گزارنے کے بجائے آرام سے پڑ کر سو گیا تھا۔ اتنی دیر میں تو کوئی پھول رکھ کر بھی چلا گیا ہوگا۔ ولی محمد نے فوراً پلٹ کر بیڈ کی طرف دیکھا۔

بیڈ خالی تھا شکر تھا ابھی تک کسی نے شرارت نہیں کی تھی۔

پھر ولی محمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا بیڈ کے نزدیک آیا اس نے سوچا کہ نیچے قالین پر لیٹنے کے بجائے بیڈ پر کیوں نہ لیٹ جائے۔ ایسا نرم ملائم بستر روز روز کہاں نصیب ہوتا ہے۔ ابھی وہ بیڈ پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ ایک زنانے دار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اس کا منہ پھر گیا۔ وہ اپنے گال سہلاتا ہوا پیچھے ہٹا اس کا جسم کانپنے لگا تھا۔ اس نے خوفزدہ انداز میں چاروں طرف دیکھا مگر کمرے میں تھپڑ مارنے والا کہیں نظر نہ آیا۔

پھر اچانک اس کی نظر بیڈ پر پڑی اسے دیکھ کر ولی محمد کی چیخ نکل گئی۔

وہ کوئی انتہائی بدشکل آدمی تھا۔ بیڈ پر نیم دراز تھا۔ اس کے چہرے اور سر پر جگہ جگہ زخموں کے نشانات تھے جن سے سرخ سرخ خون ٹپک رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں چمڑے کا دستانہ پہنے ہوئے تھا انگلیوں کی جگہ نوکیلی کیلیں نکلی ہوئی تھیں۔

ولی محمد اس بدہیئت آدمی کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا وہ چیختا ہوا دروازے کی طرف بھاگا۔ اس نے جلدی سے دروازے کی چٹخنی کھولی اور گیلری میں بھاگا۔

پہلی ہی چیخ پر فیاض حسین کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ فوراً اٹھ کر باہر آیا۔ ولی محمد اسے دیکھ کر تیزی سے اس سے چمٹ گیا۔

فیاض حسین نے بمشکل اسے اپنے سے الگ کیا اور بولا۔ "کیا ہوا ولی محمد؟"

"صاحب جی وہ ..... وہ ..... ۔" ولی محمد کی سانس چڑھی ہوئی تھی۔ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"کیا۔ وہ۔ وہ۔" فیاض نے نرمی سے پوچھا۔

"صاحب جی کمرے میں کوئی ہے۔" ولی محمد ہکلا کر بولا۔

"کمرے میں کون ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

"نہیں صاحب جی میں ادھر نہیں جاؤں گا۔ وہ، وہ بڑی ڈراؤنی شکل کا آدمی ہے۔"

آوازیں سن کر واجدہ کی بھی آنکھ کھل گئی وہ بھی اپنے کمرے سے نکل آئی اور دونوں کو راہداری میں کھڑے دیکھ کر بولی "کیا ہوا؟"

"کمرے سے چیختا ہوا نکلا ہے۔ میں اس سے یہی پوچھ رہا ہوں۔ یہ بتا رہا ہے کہ کوئی ڈراؤنی شکل کا آدمی کمرے میں موجود ہے۔"

"ہائے میرے اللہ۔" واجدہ خوفزدہ ہوگئی۔

"میں دیکھتا ہوں جاکر کون ہے کمرے میں۔" یہ کہہ کر فیاض حسین تیزی سے آگے بڑھا۔

واجدہ اور ولی محمد اسے ٹوکتے روکتے ہی رہ گئے۔

"ولی محمد صاحب کے پیچھے جاؤ۔" واجدہ نے ولی محمد کو ہدایت کی۔

"بیگم صاحبہ میں۔" ولی محمد کی سٹی گم ہوگئی۔

"ہاں جلدی جاؤ، بھاگو۔" واجدہ نے ذرا غصے سے کہا۔

ابھی وہ ہلا بھی نہ تھا کہ فیاض فوراً واپس آگیا۔

"وہاں تو کچھ نہیں ہے۔" اس نے بتایا۔

یہ سن کر ولی محمد کو کچھ اطمینان ہوا وہ جلدی سے کمرے کی طرف بڑھا پھر اس نے کمرے میں ڈرتے ڈرتے قدم رکھا۔ اب واقعی وہاں کوئی نہ تھا۔

ولی محمد نے جو کچھ دیکھا تھا اس کی تفصیل اس نے فیاض حسین کو بتائی۔

"مجھے لگتا ہے ولی محمد تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہے۔" فیاض حسین نے اظہار خیال کیا۔

"نہیں صاحب جی وہ خواب ہرگز نہیں تھا میں نے جو کچھ دیکھا ہے اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"پھر وہ کہاں گیا؟" فیاض حسین نے پوچھا۔

"صاحب جی کسی نے میرے تھپڑ بھی مارا تھا۔" ولی محمد نے انکشاف کیا۔

"تھپڑ۔" فیاض حسین نے حیران ہوکر پوچھا۔

"جی صاحب جی، یہاں اس طرف۔" ولی محمد نے داہنا گال فیاض حسین کی طرف کیا۔

فیاض حسین نے اس کا چہرہ دیکھا تو وہ دنگ رہ گیا اس کے دائیں گال پر انگلیوں کے نشانات بنے ہوئے تھے۔ اب اسے یقین آگیا کہ ولی محمد نے جو کچھ دیکھا ہے وہ خواب نہیں بلکہ حقیقت میں دیکھا ہے۔

ولی محمد بڑی مشکل میں تھا اسے اگر یہ معلوم ہوتا کہ یہاں آکر ایسے خوفناک واقعات سے دوچار ہوجائے گا تو وہ ہرگز کمرے میں سونے کی ہامی نہ بھرتا۔

صبح نزدیک تھی فیاض حسین نے صبح ہونے تک نیلم کے کمرے میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ولی محمد اب اس کمرے میں اکیلا جانے کو بالکل تیار نہ تھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ فیاض بھی اس کے ساتھ ہوگا تو

کمرے میں جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ بیڈ ابھی تک خالی پڑا تھا۔ بیچنے پر کوئی پھول نہ تھا۔

فیاض حسین نے کمرے میں پہنچ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ گھڑی پہلے ہی بند تھی۔ کمرے میں ٹیوب روشن تھی۔ فیاض حسین نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے اسٹول اٹھایا اور اسے ایک کونے میں رکھ کر اس پر بیٹھ گیا۔ ولی محمد اس کے نزدیک ہی قالین پر بیٹھ گیا۔

ولی محمد نیند کا کچا تھا لیکن اب اس کی آنکھوں میں نیند کہاں، دہشت کی وجہ سے کبھی وہ اپنے رخسار پر ہاتھ پھیرتا اور کبھی پھٹی پھٹی نظروں سے بیڈ کو دیکھنے لگتا۔ فیاض حسین ٹانگ پر ٹانگ رکھے اسٹول پر بیٹھا تھا اس کی نظریں مسلسل بیچ پر تھیں۔

صبح تک کوئی واقعہ ظہور پذیر نہ ہوا کوئی اندر آیا نہ بیچ پر پھول رکھا۔

سات بجے کے قریب واجدہ نے کمرے کا دروازہ زور زور سے بجایا فیاض حسین اٹھا اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھولتے ہی اسے واجدہ کا پریشان چہرہ نظر آیا۔ اس کے پیچھے نیلم تھی۔ اس کے چہرے پر بھی اطمینان نہ تھا۔

"واجدہ خیریت تو ہے۔" فیاض حسین نے دروازے سے ہٹ کر انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔

"پہلے تم بتاؤ۔" واجدہ یہ کہہ کر اندر آئی اس نے سب سے پہلے بیچ پر نظر ڈالی۔

"ادھر تو خیریت ہے تمہارے سامنے تکیہ ہے دیکھ لو پھول نہیں ہے۔" فیاض حسین نے کہا۔

"لیکن ہمارے کمرے میں خیریت نہیں ہے وہاں سائیڈ ٹیبل پر جدھر نیلم سو رہی تھی ایک کالے رنگ کا تر و تازہ گلاب موجود ہے۔"

"ارے۔" فیاض حسین حیران ہو کر کمرے کی طرف بھاگا۔ وہاں واقعی سائیڈ ٹیبل پر ایک خوشنما پھول موجود تھا اور اس کی بھینی بھینی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

"کچھ دیکھا تم لوگوں نے۔" فیاض حسین نے پوچھا۔

"میں تو سو رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم۔" واجدہ نے کہا۔

"اور تم نیلم۔" فیاض حسین نے نیلم سے پوچھا۔

"ابو میں بھی سو رہی تھی میں نے بھی کچھ نہیں دیکھا۔" نیلم نے جواب دیا۔

"ہم وہاں اس کا انتظار کرتے رہے اور وہ یہاں آکر اپنا کام دکھا گیا۔"

"ابو کون ہے وہ؟"

"کیا معلوم بیٹا کون ہے وہ۔"

"ابو یہ پھول کس قدر خوبصورت ہے۔" نیلم یہ کہہ کر کالے گلاب کی طرف بڑھی۔

"نا نا۔" فیاض حسین نے اسے تنبیہہ کی۔ "اس پھول کو ہاتھ مت لگانا۔"

"لیکن کیوں ابو؟"

"نیلم تمہارے ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں اس میں بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" واجدہ نے ڈانٹا۔

"جی اچھا امی۔" نیلم نے سعادت مندی سے کہا۔

Urdufans.com

وہ کالا عقاب شام تک وہاں رکھا رہا۔

فیاض حسین نے اپنے جاننے والوں سے تذکرہ کر رکھا تھا۔ آج وہ گھر سے یہ سوچ کر نکلا تھا کہ شام کو گھر میں کسی عامل کے ساتھ ہی گھسے گا۔

"حالات اب اتنے سنگین ہو گئے تھے کہ کسی عامل کو بلائے بغیر چارہ نہ تھا۔

لگن سچی ہو تو پھر حالات بھی خود بخود ویسے ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ دفتر پہنچا تو "صادق فلمز" کے منیجر نے فیاض کو ایک عامل کا پتہ بتایا۔ یہ عامل کاروباری آدمی نہ تھا بلکہ بہت کم لوگ جانتے تھے کہ وہ عامل بھی ہے۔ وہ ایک پریس میں ملازم تھے اور شاہ نور اسٹوڈیوز کے عقب میں جو آبادی تھی وہاں ان کی رہائش تھی نام تھا ان کا فتح محمد۔

شام کو گھر پہنچنے سے پہلے فیاض حسین نے واجدہ کو فون کر دیا تھا اسے بتا دیا تھا کہ وہ شام کو ایک عامل فتح محمد کے ساتھ گھر آئے گا لہٰذا نیلم کا کہیں باہر جانے کا پروگرام ہو تو اسے جانے نہ دینا۔

واجدہ اب بڑی بے چینی سے عامل کا انتظار کر رہی تھی۔ شام ہو چکی تھی نیلم اپنے کمرے میں موجود تھی، واجدہ بھی اس کے ساتھ بیٹھی تھی وہ دونوں ادھر اُدھر کی باتوں میں مشغول تھیں کہ گھنٹی بجی۔

واجدہ اٹھنے لگی تو نیلم نے اسے روک دیا۔ "ٹھہریں امی میں جاتی ہوں گیٹ کھولنے۔"

"نہیں بیٹی تم مت جاؤ فیاض کے ساتھ کوئی اور صاحب بھی ہوں گے۔" یہ کہہ کر واجدہ اٹھ گئی۔

اس نے باہر جا کر دروازہ کھولا تو فیاض کے ساتھ ایک دبلے پتلے آدمی کو پایا۔ پچاس سال کا ایک سانولا سا آدمی تھا۔ بالکل ایک عام سا آدمی اسے دیکھ کر واجدہ بڑی حیران ہوئی۔ یہ فیاض، عامل کے نام پر کس آدمی کو پکڑ لائے ہیں۔ اس نے سوچا پھر وہ فوراً ہی دروازے سے پلٹ آئی۔ فیاض حسین نے فتح محمد کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ فتح محمد نے صوفے پر بیٹھ کر ٹانگیں اوپر کر لیں۔ وہ بے تکلفی سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور بولا۔ "گھر میں کوئی چھوٹا آئینہ ہو گا۔"

"ہاں ہو گا۔" فیاض حسین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

پھر فیاض حسین نے ایک چھوٹا سا آئینہ فتح محمد کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ فتح محمد نے آئینے کا اسٹینڈ سیدھا کیا اور اسے اس زاویئے سے میز پر رکھا کہ اسے اپنی شکل آئینے میں دکھائی دیتی رہے۔

اب فتح محمد کی نظر آئینے پر تھی اور وہ انگلیوں پر کوئی وظیفہ پڑھ رہا تھا۔

اچانک ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر فیاض حسین چونکا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں واجدہ کھڑی تھی۔ واجدہ نے کچھ بولنا چاہا تو فیاض حسین نے اسے انگلی کے اشارے سے بولنے سے منع کر دیا۔ فتح محمد بہت توجہ سے کچھ پڑھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں آئینے کو گھور رہی تھیں۔

فیاض حسین نہیں چاہتا تھا کہ واجدہ کی آواز سے فتح محمد کی توجہ بٹ جائے۔ وہ خود اٹھ کر دروازے پر پہنچ گیا اور واجدہ کو اشارے سے باہر نکال لے گیا۔

پھر اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کر کے واجدہ سے پوچھا۔ "ہاں، کیا ہوا؟"

"میں یہ پوچھ رہی تھی کہ عامل صاحب کتنی دیر یہاں رہیں گے۔" واجدہ نے کہا۔

"مجھے معلوم نہیں۔" فیاض حسین نے کہا۔ "لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"میرا مطلب ہے کہ اگر کھانا وغیرہ کھا کر جائیں گے تو کھانے کا انتظام کروں۔"

میرا خیال ہے کہ کھانا نہیں کھائیں گے۔ پھر بھی جاتے ہوئے ان سے اصرار کرلیں گے۔" فیاض حسین نے خیال ظاہر کا۔ "ویسے ایک آدمی کے کھانے کا کیا انتظام۔ گھر میں اتنا کھانا تو ہوتا ہی ہے کہ ایک دو آدمی زائد کھا سکیں۔"

"اگر وہ کھاتے تو ذرا اہتمام کرلیتی۔ ایک دو سالن اور پکالیتی۔" واجدہ نے ملائمیت سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تم اہتمام کرلو۔ وہ کھائیں گو تو کھالیں گے ان کا وظیفہ ختم ہوجائے گا تو پھر میں بات کرلوں گا۔" فیاض حسین نے کہا۔

فتح محمد کا وظیفہ جلدی ختم نہ ہوا تقریباً ایک گھنٹے تک چلا۔ فتح محمد انگلیوں پر کچھ پڑھتا رہا اور اس کی آنکھیں آئینے کو گھورتی رہیں۔

وظیفہ پڑھتے پڑھتے اچانک فتح محمد نے فیاض حسین کو دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے پانی لانے کو کہا۔ فیاض حسین جلدی سے اٹھ کر ایک گلاس پانی لے آیا۔ اور اس نے گلاس آئینے کے برابر رکھ دیا۔ فتح محمد نے وظیفہ ختم کر کے جھک کر آئینے پر تین پھونکیں ماریں پھر آئینہ دیکھ کر مسکرایا۔ جیسے اس نے آئینے میں کچھ دیکھا ہو اس کے بعد اس نے گلاس اٹھایا اور غٹ غٹ کر کے سارا پانی پی لیا۔

"لڑکی کہاں ہے؟" فتح محمد نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"گھر میں اندر۔" فیاض حسین نے بتایا۔

"اس کے سر کا ایک بال چاہئے۔" فتح محمد نے کہا۔

"میں لے کر آتا ہوں۔" فیاض حسین اٹھتا ہوا بولا۔ "لڑکی کو تو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"نہیں لڑکی کو لانے کی ضرورت نہیں، صرف اس کے سر کا ایک بال چاہئے۔" فتح محمد نے کہا۔

فیاض حسین کو نیلم کے سر کا بال لانے میں چند سیکنڈ لگے۔ وہ بال لا کر اس نے فتح محمد کے سامنے کر دیا۔ "لیجئے۔"

فتح محمد نے فیاض کے ہاتھ سے نیلم کے سر کا بال لے لیا۔ پہلے اس نے اسے روشنی کی طرف کر کے دیکھا پھر بال کا ایک سرا اس نے اپنی انگلی میں لپیٹ لیا۔

پھر اس نے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ اب وہ پڑھتا جاتا تھا اور بال کو انگلی پر لپیٹتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ سارا بال اس کی انگلی پر لپٹ گیا پھر اس نے انگوٹھے سے بال کے سر کو دبالیا تاکہ وہ کھل نہ سکے۔

فیاض حسین اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اچانک فتح محمد کھڑا ہو گیا اس کی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بالکل سیدھا کھڑا تھا جیسے اسے زمین میں کسی بلی کی طرح گاڑ دیا گیا ہو۔

پھر وہ چلا۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔

وہ کسی ایسے معمول کی طرح قدم اٹھا رہا تھا جس پر مسمریزم کر دیا گیا ہو۔

فیاض حسین خاموشی سے اس کے پیچھے ہولیا۔ فتح محمد نے بند دروازے کو کھولا اور باہر نکل گیا۔ فیاض

Urdufans.com

کا خیال تھا کہ اس کا رخ گھر سے باہر کی طرف کو ہو گا لیکن ایسا نہ ہوا وہ گھر کے اندر جا رہا تھا۔ فیاض اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

فتح محمد نیم کے کمرے میں گیا نہ ان کے بیڈ روم میں، نہ وہ ٹی وی لاؤنج میں گیا۔ اس کا رخ اسٹور کی طرف تھا۔ فتح محمد نے میکانیکی انداز میں اسٹور کا دروازہ کھولا اور اس میں داخل ہو گیا۔

فیاض حسین جب تک دروازے کے نزدیک پہنچا اس وقت تک دروازہ اندر سے بند ہو چکا تھا۔

اچانک اندر سے "میاؤں" کی خوفناک آواز آئی پھر ایسا محسوس ہوا جیسے دو شخص آپس میں گتھم گتھا ہو گئے ہیں اندر سے چیزوں کے گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں کچھ دیر مزید اندر سے آوازیں آتی رہیں پھر ایک دم سناٹا چھا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اسٹور کا دروازہ کھلا۔ فتح محمد اسٹور سے برآمد ہوا۔ فیاض حسین ان کی شکل دیکھتے ہی کانپ گیا وہ کسی چھپکلی کی طرح زرد ہو رہا تھا اس کے چہرے کی متانت میں کوئی فرق نہ آیا تھا وہی سنجیدگی طاری تھی، جیسی اسٹور میں داخل ہوتے وقت تھی۔ اس کے سفید کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔

"پانی ..... ۔" فتح محمد نے بڑی بے چینی سے کہا۔

فیاض حسین فوراً ایک گلاس پانی لے آیا۔ فتح محمد اتنی دیر میں ڈرائنگ روم میں پہنچ چکا تھا۔ فیاض حسین نے اس کو پانی لے جا کر دیا فتح محمد نے بڑی بے تابی سے گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا اور بڑی تیزی سے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا پھر فیاض کی طرف گلاس بڑھاتا ہوا بولا۔ "اور۔"

فیاض حسین اس مرتبہ جگ بھر کر لے آیا اس نے ایک گلاس پانی اسے اور پیش کیا۔

فتح محمد نے پانی غٹ غٹ پی لیا اور گلاس فیاض کی طرف بڑھاتا ہوا بولا "اور، میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ پیٹ میں آگ لگی ہے۔"

اس طرح فتح محمد نے چار گلاس پانی کے پیئے۔ تب کہیں جا کر اس کے حواس بحال ہوئے۔

"یہ کیا ہوا؟" فیاض حسین نے اس کے کپڑوں پر پڑے ہوئے سرخ دھبوں کے بارے میں پوچھا۔

"یہ خون کے دھبے ہیں۔" فتح محمد نے بڑے پُراسرار انداز میں کہا۔

"آپ کو چوٹ لگی ہے۔" فیاض حسین نے فکر مندی سے پوچھا۔

"ہاں، وہ مجھے چوٹ دے گیا ہے۔ وہ بہت زبردست ہے۔" فتح محمد نے گول مول جواب دیا۔

"کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟" فیاض حسین نے پوچھا۔

"میرا مشورہ مانیں گے؟" فتح محمد نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

"جی فرمائیں۔" فیاض حسین نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"آپ اپنی لڑکی کی جتنا جلد ممکن ہو سکے شادی کر دیں۔" فتح محمد نے ہدایت کی۔

"ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے۔" فیاض حسین نے بتایا۔

Urdufans.com

"کیا آپ کو اپنی لڑکی کی زندگی عزیز نہیں۔" فتح محمد نے تنبیہ کی۔

"وہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔" فیاض حسین نے گھبرا کر کہا۔ "اس سے زیادہ عزیز کون ہوگا۔"

"پھر میں جو کہہ رہا ہوں وہ کریں۔ شادی بھی اس کی کہیں دور ہونا چاہئے اس پر زبردست اثر ہے۔ وہ دن بدن اسے اپنے گھیرے میں لیتا جا رہا ہے۔" فتح محمد نے بڑے پراسرار انداز میں کہا۔

"آپ کچھ کریں نا۔ جو کہیں گے حاضر کر دوں گا۔" فیاض حسین بولا۔

"پیسوں سے یہ اثر دور نہ ہوگا۔ اس کے لئے بہت محنت کرنا پڑے گی۔ اتنی محنت میری بساط سے باہر ہے۔" فتح محمد نے بڑے مایوسانہ انداز میں گردن ہلائی۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔"

"ارے۔ ارے۔" فیاض حسین نے چونک کر کہا۔ "آپ بیٹھیں تو۔ کھانا کھا کر جائیے گا۔"

"نہیں کھانا میں نہ کھاؤں گا۔" فتح محمد نے کھڑے ہوتے ہوئے دلچسپی سے کہا۔

"کوئی نذر و نیاز۔" فیاض حسین نے پوچھا۔

"میں کوئی پیر نہیں ہوں، فقیر آدمی ہوں۔" فتح محمد نے بڑی انکساری سے کہا۔

"آپ نے یہاں تک آنے کی زحمت کی کوئی فیس وغیرہ۔" فیاض حسین نے گھما کر پھر سوال کیا۔

"نہیں، فیاض صاحب مجھے کچھ نہیں چاہئے۔" فتح محمد ڈرائنگ روم سے باہر نکلتا ہوا بولا۔ "میں نے جو ہدایت کی ہے اس پر فوراً عمل کریں۔ ورنہ آپ کی لڑکی کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

یہ کہہ کر فتح محمد ایک لمحہ نہ رکا۔ وہ کچھ خوفزدہ سا محسوس ہو رہا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد اس گھر سے نکل جائے۔

فتح محمد کو وہ گیٹ تک چھوڑ کر آیا۔ فیاض حسین بہت پریشان تھا۔ نیلم کے بارے میں فتح محمد جو بتا کر گیا تھا وہ اذیت میں مبتلا کر دینے والا تھا۔ اس کے علاوہ فتح محمد کی جو درگت یہاں بنی تھی اور اس کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے جو پڑ گئے تھے۔ یہ سب فیاض حسین کو حیران اور پریشان کرنے کے لئے کافی تھے۔

فیاض حسین نے دروازے میں قدم رکھا تو واجدہ سامنے کھڑی تھی۔ وہ بولی۔ "کیا عامل صاحب چلے گئے۔"

"ہاں چلے گئے....." فیاض حسین نے جواب دیا۔

"کیا وہ اسٹور میں بھی گئے تھے۔" واجدہ نے سوال کیا۔

"ہاں، گئے تھے۔"

"اسٹور میں وہ کیوں گئے تھے۔" واجدہ نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ وہاں کیوں گئے تھے۔ بس بیٹھے بیٹھے خود بخود اٹھ کر اسٹور میں داخل ہو گئے تھے پھر جب وہ اندر سے باہر آئے تو ان کے ہوش اڑے ہوئے تھے اور لباس پر خون کے دھبے تھے۔"

"خون کے دھبے۔" واجدہ کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ "کیا وہ زخمی ہو گئے تھے۔"

"نہیں ان کے جسم پر کوئی زخم نہ تھا۔" فیاض حسین نے وضاحت کی۔

"کیا بتایا انہوں نے۔" واجدہ نے پوچھا۔

Urdufans.com

"ابھی صاف بات نہیں کی۔ بس اتنا بتایا کہ نیلم پر زبردست اثر ہے اس کی جلد از جلد شادی نہ کی تو
اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔" فیاض حسین نے فکرمندی سے کہا۔
"اثر ہے تو اسے دور کریں۔ انہیں یہاں کس لئے بلایا تھا۔" واجدہ ذرا خفگی سے بولی۔
"میرا خیال ہے کہ معالجہ ان کے بس سے باہر ہے۔ وہ یہاں سے ذرے ذرے سمیٹے سمیٹے سے گئے
ہیں۔" واجدہ پریشان ہو گئی۔
"فیاض پھر کیا ہو گا؟" واجدہ نے پوچھا۔
"تو پہلے ذرا اسٹور میں جا کر دیکھتے ہیں۔ بعد میں پھر کچھ اور سوچیں گے۔"
"نہیں بھئی۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ جانے وہاں کیا ہو۔" واجدہ نے سہم کر کہا۔
"اچھا تم رہو۔ میں الماری سے ریوالور نکال کر لاتا ہوں۔" فیاض حسین یہ کہہ کر الماری کی طرف
بڑھ گیا۔ اس نے الماری سے اپنا ریوالور نکالا۔ اسے چیک کیا وہ لوڈ تھا۔
"تم یہیں بیٹھو۔ میں اکیلا دیکھ کر آتا ہوں۔" فیاض حسین اسٹور کی طرف جاتے ہوئے بولا۔
ریوالور کی وجہ سے کچھ واجدہ کی ہمت بندھ گئی۔ وہ اپنے شوہر کے پیچھے پیچھے چل دی۔
فیاض حسین نے ہینڈل گھما کر پہلے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ پھر سیدھے ہاتھ میں ریوالور تان کر،
دروازے میں زور سے لات ماری۔ دروازہ زور سے دیوار کے ساتھ لگا۔ ایک دھماکا سا ہوا۔
دروازہ کھلتے دیکھ کر واجدہ کا دل حلق میں آ گیا۔ وہ جلدی سے فیاض حسین کے پیچھے چھپ گئی۔
اسٹور میں کچھ نہ تھا۔ فیاض حسین نے اندر جا کر اسٹور کی لائٹ جلائی اور ادھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی چیز نہ
تھی اس نے اپنے پیر سے ٹین کی پیٹی میں ٹھوکر ماری لیکن وہاں سے کوئی چیز برآمد نہ ہوئی۔
اب ہمت کر کے واجدہ بھی اندر آ گئی تھی وہ غور سے فرش کو دیکھ رہی تھی فرش صاف تھا۔
"یہاں تو کچھ نہیں ہے۔" واجدہ نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔
"لیکن میں نے خود کسی بلّے کی غراہٹ سنی تھی اور پھر چیزوں کے گرنے کی آواز آئی تھی جیسے دو شخص
آپس میں گتھم گتھا ہو گئے ہوں۔ یہ کیفیت بس تھوڑی دیر رہی تھی اس کے بعد سناٹا چھا گیا تھا۔ پھر فتح محمد
بلڈی کی طرح ہو کر یہاں سے نکلے تھے۔ لباس پر خون کے چھینٹے بھی تھے۔" فیاض حسین نے بتایا۔
"اگر یہاں لڑائی ہوئی ہوتی تو چیزیں ادھر اُدھر پھیلی ملتیں۔ یہاں تو سب چیزیں اپنے ٹھکانوں پر رکھی
ہیں۔ پھر یہاں خون کے قطرے بھی نہیں دکھائی دیتے۔" واجدہ نے کہا۔
"اوہ۔ کس کا خون؟" اچانک نیلم نے آ کر پوچھا۔
"اسٹور کے دروازے پر اچانک ہی نیلم نمودار ہو گئی تھی۔ اسے دروازے پر دیکھ کر دونوں گھبرا
گئے۔ فیاض حسین کی نیلم کی طرف پشت تھی اس لئے وہ اس کے ہاتھ میں ریوالور نہ دیکھ سکی۔ فیاض
حسین نے موقع غنیمت جان کر۔ ریوالور فوراً ٹوٹی میز کی دراز میں ڈال دیا تھا۔
پھر فیاض اسی کی طرف مسکراتا ہوا پلٹا تھا اور اس نے اسے مطمئن کرنے کے لئے ایسے ہی ایک چوہے
بلّی کی کہانی سنا دی تھی۔ اس بلّی کی جو ایک موٹا سا چوہا منہ میں دبا کر اسٹور میں داخل ہو گئی تھی۔ اور اب وہ
اسے نکالنے کے لئے اسٹور میں داخل ہو رہے تھے۔
نیلم بھی اس بلّی اور زخمی چوہے کی تلاش میں ان کی مدد کرنے لگی۔ اس نے اسٹور کے سارے کونے

Urdufans.com

کھدرے دیکھ ڈالے مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔ وہاں کچھ ہوتا تو نظر آتا۔

نیلم کو دوسری طرف متوجہ دیکھ کر فیاض حسین نے دراز سے ریوالور نکالا اور واپس اپنے کمرے میں آگیا۔

بہر دست نیلم کی فوری شادی کا مسئلہ تھا۔ فتح محمد نے تو تنبیہ کی ہی تھی۔ فتح محمد کے علاوہ ایک ڈاکٹر نے بھی فوری شادی کا مشورہ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نیلم شادی کے بعد نارمل ہو جائے گی۔ اب ہر صورت میں نیلم کی شادی کرنا تھی لیکن اتنی جلدی شادی کیسے ممکن تھی۔ انہوں نے تو اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ نیلم فائنل ایئر میں تھی۔ دو ماہ بعد اس کے امتحان ہونے والے تھے۔ امتحان کے بعد فوراً اس کی شادی ہو جانا چاہئے تھی لیکن اس قدر جلد کوئی قابل قدر رشتہ ملنا کہاں آسان تھا۔

دونوں میاں بیوی سر جوڑ کر بیٹھے۔ کئی لڑکے زیر بحث آئے لیکن سب سے اچھا لڑکا اکبر کا تھا۔ اکبر کو ان دونوں میاں بیوی نے اچھی طرح دیکھ رکھا تھا۔ نیلم بھی اکبر سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ ایک دو مرتبہ کراچی رہ آئی تھی۔ اکبر بھی لاہور کا پیکر لگا گیا تھا۔ اکبر، نیلم سے شادی کرنے کا شدید خواہشمند تھا۔ پسند نیلم بھی کرتی تھی۔ صابرہ نے دبے لفظوں میں واجدہ سے نیلم کا رشتہ مانگا بھی تھا لیکن واجدہ نے آج تک اس رشتے کے سلسلے میں کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خاندان میں ایک سے ایک لڑکا موجود تھا۔ لڑکی ابھی زیر تعلیم تھی۔ بے حد حسین تھی۔ دولت مند باپ کی اکلوتی اولاد تھی پھر اس کے لئے کسی خاص رشتے پر غور کرنے کی ابھی کیا ضرورت تھی۔ لہٰذا اکبر کا رشتہ، دوسرے رشتوں کی طرح ابھی "زیر غور" تھا اور اب وہ دونوں اس بات پر خوش تھے کہ انہوں نے اس رشتے کو منع نہیں کیا تھا۔

ان حالات میں یہی رشتہ سب سے موزوں تھا۔ ان دونوں نے آپس میں تو یہ رشتہ طے کر لیا تھا اب نیلم سے اس رشتے کے بارے میں رائے لینا تھی۔

نیلم بہت سیدھی اور فرمانبردار قسم کی لڑکی تھی۔ واجدہ نے جب اس سے اکبر کے بارے میں پوچھا۔ "اکبر کیسا لڑکا ہے۔"

تو نیلم نے سوال کا مطلب سمجھے بغیر مسکرا کر کہہ دیا۔ "بہت اچھا۔"

"تیرے ابو، اس سے تیری شادی کرنا چاہتے ہیں۔" واجدہ نے صاف صاف بات کی۔

"مجھے ابو کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں۔" نیلم نے ہنس کر کہا۔

"شکر ہے خدا کا۔" واجدہ نے آنکھیں بند کر کے کہا۔ "تو نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ تو امتحان سے فارغ ہو جا۔ اس کے فوراً بعد تیری شادی ہو جائے گی۔"

"ارے امی، اتنی جلدی۔ میں تو واقعی آپ پر بوجھ معلوم ہوتی ہوں۔" نیلم نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں، میری جان تو ایسی لڑکی ہے جس کا کوئی بوجھ نہیں۔ تو پھول کی طرح ہلکی ہے۔" واجدہ نے اسے اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "لیکن اب حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں سب یہی کہتے ہیں کہ نیلم کی جس قدر جلدی ہو سکے شادی کر دو۔"

"ارے امی، لوگوں کی کیا بات کرتی ہیں ان کا تو کام ہی مشورے دینا ہے پھر شادی ان کے لئے ہر مرض کا علاج ہے۔ شادی نہ ہو گئی کسی حکیم کا مجرب نسخہ ہو گئی۔ کسی دید کی بوٹی ہو گئی۔ کسی عامل کا تعویذ ہو گئی۔ اندھیرے کا جگنو ہو گئی۔ کھل جا سم سم ہو گئی۔ ادھر لڑکی کو چھینک آئی ادھر رشتے دار پکار اٹھائے

Urdufans.com

ہے اس کی شادی کر دو۔ اس کی چیخیں بند ہو جائیں گی۔ کسی لڑکی کے سر میں درد ہو فوراً پاس پڑوس کے لوگ مفت مشورہ دینے آ جائیں گے بس اس کی شادی کرو۔ اس کا سر کا درد جاتا رہے گا۔" نیلم نے ہنس کر کہا۔

"چل زیادہ باتیں نہ بنا۔" واجدہ نے اس کے رخسار پر چپت لگائی۔ "شادی واقعی سو دکھوں کا ایک مداوا ہے۔"

"امی، میرا خیال ہے کہ جس کو کوئی غم نہ ہو، وہ شادی کر لے۔ اللہ نے چاہا تو کبھی اس کے پاس خوشی نہ آئے گی۔" نیلم ہنس کر بولی۔

"اچھا، میری دادی، اب تو چپ ہو جا۔ میں نے مان لیا کہ جب سو بے وقوف مرے تھے تو پیدا ہوئی تھی۔"

"امی، سو بے وقوف نہیں، عقل مند کہئے۔" نیلم نے ہنستے ہوئے کہا۔

نیلم کو ہنستا دیکھ کر واجدہ اسے بغور دیکھنے لگی اس نے ایک عرصے کے بعد اپنی بیٹی کے چہرے پر ہنسی دیکھی تھی۔ واجدہ نے اس کی پیشانی چوم کر گلے سے لگایا پھر دل ہی دل میں نیلم کے بخت اچھے ہونے کی دعائیں کر ڈالیں۔

لیکن اس کے بخت اچھے نہ ہوئے۔ اس کی تقدیر نہ بدلی۔ قسمت اچھی نہ ہوئی۔

چار ماہ بعد نیلم کی اکبر سے شادی ہو گئی۔

یہ تھے وہ حالات اور واقعات جن سے فیاض، واجدہ اور نیلم گزرے تھے۔ فیاض نے اب کوئی بات نہ چھپائی تھی بلکہ ہر بات تفصیل سے بتا دی تھی۔

سب لوگ ان واقعات کو بڑی توجہ، حیرت اور دلچسپی سے سن رہے تھے۔ جب فیاض نے اپنی داستان غم ہی و تکمل پر سناٹا طاری ہو گیا۔ کچھ دیر تک کسی نے کسی سے بات نہ کی۔ ہر شخص اپنی جگہ ششدر رہ گیا تھا۔

فرقان ماموں نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس وقت رات کے ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔ کمرے میں اس قدر سناٹا تھا کہ گھڑی کی ٹک ٹک صاف سنائی دے رہی تھی، اچانک یہ ٹک ٹک بند ہو گئی۔ گھڑی کا پنڈولم ساکت ہو گیا۔ یوں جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔

سردی میں یکایک اضافہ ہو گیا تھا ہر شخص اپنی جگہ بیٹھا، اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔

سارے واقعات سن کر صابرہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے سسکیاں بھرنے لگی۔ اسے روتا دیکھ کر واجدہ بھی چپ نہ رہ سکی وہ بھی زور زور سے رونے لگی۔

واجدہ کے رونے کی آواز سن کر صابرہ نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹایا اور اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے سے جھٹکے سے صاف کیا اور واجدہ کو غصے سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم کیوں رو رہی ہو؟"

"صابرہ، مجھے معاف کر دو۔" واجدہ نے اسے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔

"تمہیں معاف کر دوں۔" صابرہ نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچتے ہوئے کہا۔ "اتنا کچھ ہو گیا اور تم نے ہمیں خبر بھی نہ لگنے دی۔"

Urdufans.com

"صابرہ، تمہیں اگر ہم بتا بھی دیتے تو اس سے تمہیں کیا فرق پڑتا۔ تمہیں ایسی باتوں پر یقین کب ہے۔" واحدہ نے کہا۔

"ہاں، جن، بھوتوں کو میں بالکل نہیں مانتی۔ مجھے واقعی اس بات سے کوئی فرق نہ پڑتا لیکن اپنی ہونے کے ناتے تمہارا فرض تھا کہ ایک ایک بات ہمیں صاف صاف بتا دیتیں۔ تم نے ہم سے وہ راز بھی چھپائے رکھا کہ نیلم تمہاری بیٹی نہیں ہے۔ چلو جن بھوتوں کے بارے میں تم مجھے بتا دیتیں تو بقول تمہارے مجھے کوئی فرق نہ پڑتا لیکن اگر مجھے شادی سے پہلے یہ معلوم ہو جاتا کہ نیلم مانگے کا اجالا ہے تو میں اپنے بیٹے کی پگڑ شادی نہ کرتی۔ خاندان کی کیا لڑکیاں مر گئی ہیں جو میں ایک ملازم کی لڑکی کو بہو بنا کر اپنے خاندان کو خوامخواہ بٹہ لگا لیتی۔ تم نے بہت بڑا کیا ہے واحدہ میرے ساتھ، میں تمہیں کبھی نہ بخشوں گی۔" یہ کہہ کر صابرہ غصے سے اٹھنے لگی۔

ماموں فرقان جو ان دونوں کی باتوں کو بڑے صبر سے سن رہے تھے خاموش تماشائی نہ رہ سکے۔ وہ جانتے تھے کہ واحدہ نے نیلم کے بارے میں دھوکے میں رکھ کر ان لوگوں پر بڑا ظلم کیا تھا۔ لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے صرف معاف کرنا سیکھا تھا۔ بگڑی ہوئی بات کو بنانا سیکھا تھا۔

"صابرہ، بیٹھو۔" ماموں فرقان نے نرمی سے کہا۔

"نہیں، ماموں، اب میں نہیں بیٹھوں گی، مجھے نیند آ رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

"تمہیں واقعی نیند آ رہی ہے۔" ماموں نے ہنس کر کہا۔ "میرا تو خیال ہے کہ تمہاری نیند کوسوں دور بھاگ گئی ہو گی۔"

"ویسے، ان لوگوں نے کام تو ایسے ہی کئے ہیں۔" صابرہ نے غصے سے کہا۔

"صابرہ، میں ایک بات جانتا ہوں کہ اگر تم واحدہ کی جگہ ہوتیں تو تم بھی یہی کرتیں۔"

"نا، ماموں یہ نہ کہیں۔" صابرہ نے خفگی سے کہا۔ "میں ہرگز ایسا نہ کرتی۔ اول تو میں کسی اور کی لڑکی کو گود لیتی ہی نہیں اگر لیتی تو دنیا والوں کو یا کم از کم لڑکی کے سسرال والوں کو ضرور اس سے آگاہ کر دیتی۔ ماموں یہ تو صریحاً دھوکا ہے۔"

"صابرہ ایسا نہ کہو، اب تو ساری باتیں تمہارے سامنے آ گئی ہیں، یہ لوگ اپنی اس حرکت پر نادم بھی ہیں۔ تم سے واحدہ نے معافی بھی مانگ لی ہے۔ میرے خیال میں تمہیں معاف کر دینا چاہئے۔"

"آپ نہیں جانتے ماموں کہ میرے دل میں کیسی آگ لگی ہے۔ اس نے میری سگی بہن ہوتے ہوئے سوتیلی بہن کا سا سلوک کیا ہے میرے ساتھ، اب میں بھی اسے سوتیلی بن کر دکھاؤں گی۔" یہ کہہ کر صابرہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

"جاؤ، باہر اسے سمجھاؤ۔" ماموں فرقان نے صابرہ کے کمرے سے چلے جانے کے بعد کہا۔

"ماموں، اس وقت وہ بہت غصے میں ہے۔ کچھ نہیں سمجھے گی۔ جانے کیا سے کیا ہو جائے۔" علی نے ماموں فرقان کو بتایا۔

"باہر صاحب، کیا ہو جائے گا۔" فیاض حسین نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ لوگ نیلم کو طلاق دلوا دیں گے۔" فیاض حسین کا لہجہ تیکھا

Urdufans.com

"ٹھیک ہے آپ دلوادیں طلاق۔ ایسی ذلت سے تو بیٹی کا باپ کے گھر بیٹھ جانا زیادہ بہتر تھا۔"

"تم کہہ رہے ہو، فیاض۔" ماموں فرقان نے مداخلت کی۔

"اب ماموں دیکھیں نا۔ ہم نے ساری بات صاف صاف بتادی، اپنی غلطی کی معافی بھی مانگ لی۔ پھر بھی ان لوگوں کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ اب وہ سوتیلی بہن بن کر دکھانے کی دھمکی دے کر گئی ہیں۔ جانے یہ لوگ میری بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ میری بیٹی بہت معصوم اور سیدھی ہے۔ قصور ہمارا ہے۔ اسے ہمارے قصور کی سزا کیوں ملے۔"

"ارے کچھ نہیں ہوگا۔ میں صابرہ کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ دل کی بہت اچھی ہے۔ بس ذرا غصے میں آگئی ہے۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہوجائے گی۔ اب آپ لوگ اپنے غصے پر قابو رکھیں کسی کا کچھ نہ بگڑے گا، نیلم مفت میں ماری جائے گی۔ وہ پہلے ہی عذاب میں مبتلا ہے۔" ماموں فرقان نے ملائمت سے کہا۔

پھر ماموں فرقان نے فیاض اور بابر دونوں کو اچھی طرح سمجھایا۔ صابرہ اور واجدہ کو بھی اونچ نیچ سمجھائی۔ اب کافی وقت ہوگیا تھا سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ ماموں فرقان نے اپنے گھر جانے کی اجازت لی۔ بابر علی انہیں گھر تک چھوڑنے گیا۔

ماموں فرقان کے جانے کے بعد صابرہ، اکبر کو اپنے کمرے میں لے گئی اور اس کو ایک ایک بات کہہ سنائی۔ اکبر بہت توجہ سے اپنی ماں کی بات سنتا رہا۔ نیلم کون تھی اور وہ کن مرحلوں سے گزری تھی اور یہ لوگ اکبر سے نیلم کی شادی کرنے پر اچانک کس طرح راضی ہوگئے تھے۔

صابرہ نے اپنے بیٹے کو یہ ساری داستان اس انداز سے سنائی تھی کہ وہ نیلم کو ایک وبال سمجھنے لگے اور گھبرا کر اسے چھوڑنے کا تہیہ کرلے لیکن ساری داستان سن کر اکبر نے ایک گہرا سانس لیا اور بس۔ جب اکبر کے دل میں آگ نہ بھڑکی تو صابرہ کو بہت غصہ آیا اس کے دل میں آگ بھڑکی ہوئی تھی اور وہ ہر قیمت پر واجدہ سے انتقام لینا چاہتی تھی اب تو اسے نیلم سے بھی نفرت ہوگئی تھی۔ وہ کسی ملازمہ کی بیٹی کو بہو سمجھنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی۔

"ہاں، اکبر اب کیا کریں۔" صابرہ نے پوچھا۔

"کیا کرنا ہے امی؟" اکبر نے بات کو سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھا۔

"کل یہ لوگ نیلم کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔" صابرہ نے بتایا۔

"تو لے جانے دیں، جاکر لے آؤں گا۔" اکبر نے معصومیت سے کہا۔

"ہاں لے جانے میں تو کوئی حرج نہیں لیکن میں چاہ رہی تھی کہ لے جارہے ہیں تو بس لے جائیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" اکبر کی سمجھ میں واقعی کچھ نہ آیا۔

"ہمیشہ کے لئے لے جائیں۔" صابرہ نے دو ٹوک انداز میں بات کی۔

"نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" اکبر گھبرا گیا۔

Urdufans.com

"تجھے نیلم کو طلاق دینا ہوگی۔"

صابرہ کے دل کی بات بالآخر زبان پر آگئی۔

"اس کا قصور کیا ہے؟" اکبر نے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"اس کے والدین نے ہم سے جھوٹ بولا۔" صابرہ نے جرم بتایا۔

"وہ والدین نے بولا، نیلم نے تو نہیں۔" اکبر نے جرح کی۔

"نیلم ایک ملازمہ کی بیٹی ہے۔ میں اسے اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی۔" صابرہ نے دوسرا جرم بتایا۔

"امی، کچھ بھی ہو، میں نیلم کو طلاق نہیں دوں گا۔" اکبر نے جرأت مندی سے فیصلہ سنایا۔

"ارے بے وقوف تجھے پتہ نہیں کہ اس پر جن کا سایہ ہے۔" صابرہ نے اسے خوفزدہ کرنا چاہا۔

"امی آپ جن بھوتوں کی کب سے قائل ہوگئیں۔" اکبر نے ہنس کر کہا۔

"اکبر مجھ سے بحث نہ کر۔" صابرہ کو غصہ آگیا۔

"امی، پھر آپ بھی مجھے کسی کام کے لئے مجبور نہ کریں۔" اکبر نے مستحکم انداز میں کہا۔

اکبر صابرہ کا بہت لاڈلا بیٹا تھا کیوں نہ ہوتا، وہ اکلوتا بیٹا تھا۔ صابرہ کو پکی امید تھی کہ وہ اس کی ہدایت پر آنکھ بند کر کے عمل کرے گا اور صبح ہوتے ہی نیلم کو طلاق دیدے گا۔ اور یہ ممکن تھا کہ وہ ماں کی محبت میں نیلم کو چھوڑ بیٹھتا۔ وہ تو بھلا ہو، فرقان ماموں کا انہوں نے اس گھر میں باوِ سموم چلتی دیکھ لی تھی۔ اس لئے انہوں نے جانے سے پہلے اکبر کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا اسے مضبوط کر دیا تھا کہ وہ کسی قیمت پر نیلم کو نہیں چھوڑے گا۔

ساری باتیں سن کر اکبر نے کہا تھا۔ "ماموں، اس جن کا کیا ہوگا۔ جو اس پر آتا ہے۔"

"اس جن کی فکر نہ کرو، اس جن کو میں بھگاؤں گا۔" ماموں فرقان نے یقین دلایا۔

"اگر آپ نے جن سے نجات دلادی تو پھر میں کبھی نیلم کو نہ چھوڑوں گا۔" اکبر نے کہا۔

جب اکبر نیلم کو چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہ ہوا تو صابرہ نے اسے غصے میں اپنے کمرے سے چلے جانے کو کہا۔ "دفع ہو جا یہاں سے۔"

اکبر خاموشی سے اس کے کمرے سے نکل آیا۔ اکبر کے چلے جانے کے بعد صابرہ تکیے میں منہ دے کر رونے لگی۔

اکبر نے صبح اٹھ کر سب سے پہلا یہ کام کیا کہ وہ گاڑی لے کر گھر سے نکل گیا۔ وہ ماموں فرقان کے گھر عزیز آباد پہنچا۔ ماموں فرقان دکان پر جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ گھر کی گھنٹی بجی۔

ماموں فرقان نے منہ دھوتے ہوئے آواز لگائی۔ "دیکھو بیٹا کون ہے دروازے پر۔"

شمسہ باورچی خانے میں تھی۔ وہ اپنے ابو کی آواز سن کر دروازے کی طرف لپکی دروازہ کھولا تو سامنے اکبر کھڑا تھا۔

"آیئے، آیئے اکبر میاں۔" شمسہ عمر میں اس سے دو سال چھوٹی تھی لیکن رشتے میں اس کی پھوپھی ہوتی تھی لہٰذا وہ رشتے کی مناسبت سے اسے چھوٹا ہی سمجھ کر برتاؤ کرتی۔

Urdufans.com

"سلام پھوپھی جان۔" اکبر اسے جان بوجھ کر بڑا بنانے کی کوشش کرتا۔
"جیتے رہو۔" شمسہ بجائے شرمانے کے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیتی۔
"کون ہے بھئی شمسہ۔" ماموں فرقان نے اندر سے پوچھا۔
"ابو، اکبر آئے ہیں۔" شمسہ نے بتایا۔
"چلو اکبر اچھے وقت پر آیا ہے۔ ابھی میں نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔" ماموں فرقان نے کہا۔
"ماموں، میں ناشتہ ہی کرنے آیا ہوں۔" اکبر نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
"کیوں کیا امی نے گھر سے نکال دیا۔" شمسہ نے چھیڑا۔
"ہاں کچھ ایسا ہی سمجھ لیں۔" اکبر نے پھیکے لہجے میں کہا۔
ناشتے کے بعد اکبر نے ماموں فرقان کو رات کی ساری روداد سنائی، ماموں فرقان یہ سن کر پریشان ہوگئے۔
اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ماموں فرقان نے جلدی سے اٹھ کر ریسیور اٹھایا اور بڑی ملائمت سے کہا۔ "ہیلو۔"
"ہیلو" کے جواب میں ادھر سے جو کہا گیا اسے سن کر ماموں فرقان نے اکبر کو فکر مندی سے دیکھا۔ "ماموں کس کا فون ہے؟" اکبر نے پریشان ہو کر پوچھا۔
"تمہارے ابو ہیں فون پر۔" ماموں فرقان نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"کیا کہہ رہے ہیں؟" اکبر نے پریشان ہو کر پوچھا۔
"صابرہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تمہیں فوراً گھر بلایا ہے۔ گاڑی تمہارے پاس ہے، صابرہ کو اسپتال لے جانا ہے۔" ماموں فرقان نے بتایا۔
اسپتال کا نام سن کر اکبر کو سردی میں پسینہ آگیا۔ "کیا ہوا امی کو۔ لائیے ذرا مجھے فون دیجئے۔"
ماموں فرقان نے خاموشی سے اس کے ہاتھ میں ریسیور تھما دیا۔
"جی ابو! کیا ہوا امی کو۔" اکبر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔
"بیٹے، آپ فوراً گھر آئیں۔ فون پر وقت ضائع نہ کریں۔" بابر نے نرمی سے کہا۔
"اچھا ابو، میں فوراً یہاں سے نکل رہا ہوں۔" اکبر نے کھڑے ہوتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھا اور ماموں فرقان سے مخاطب ہوا۔ "ماموں میں چل رہا ہوں۔"
"ہاں ٹھیک ہے تم جاؤ، اسپتال پہنچ کر جو بھی صورت حال ہو، دکان پر مجھے بتا دینا۔"
"ٹھیک ہے، ماموں۔" اکبر نے گھر سے نکل کر عجلت میں گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی سے سڑک پر آگیا۔
اکبر کے انکار سے صابرہ بہت دلبرداشتہ ہوئی تھی۔ صدمہ تو اسے اس بات کا بھی کم نہ تھا کہ نیلم ایک ملازمہ کی اولاد تھی اور واجدہ نے اسے دھوکا دیا تھا۔ اس صدمے کے ساتھ ہی اکبر نے نیلم کو طلاق دینے سے انکار کر کے صابرہ کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔

Urdufans.com

صابرہ یہ کاری ضرب برداشت نہ کر سکی۔ وہ رات بھر روتی رہی۔ صبح کچھ دیر کو اس کی آنکھ لگ گئی۔ پھر اٹھی تو اٹھا نہ گیا۔ وہ شاید ڈیپریشن کا شکار تھی۔

اسے فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔ اسپتال میں فوری طور پر اسے ڈرپ لگائی گئی۔ طاقتور انجکشن اور ادویات دی گئیں۔ شام تک اس کی طبیعت بحال ہوگئی۔

فیاض اور واجدہ، دو بجے کی فلائٹ سے نیلم کو لے جانے والے تھے لیکن صابرہ کے اسپتال پہنچ جانے کی وجہ سے فیاض نے سیٹیں کینسل کرادیں۔ دونوں نے اسپتال جانا چاہا لیکن بابر جانتا تھا کہ اگر وہ دونوں اسپتال پہنچے تو صابرہ انہیں دیکھ کر غصے میں آجائے گی۔ ڈاکٹروں نے پہلے ہی تنبیہہ کر رکھی تھی کہ مریضہ کے مزاج کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔ بابر علی نے دونوں کو نرمی سے سمجھا دیا کہ کہ وہ اسپتال نہ جائیں۔ ڈاکٹروں نے مریضہ سے ملنے پر پابندی لگادی ہے۔

دوپہر کو ماموں فرقان اسپتال پہنچ گئے۔ ماموں فرقان کو دیکھ کر صابرہ دھیرے سے مسکرائی۔ ماموں فرقان کی شخصیت ایسی تھی کہ ان کا چہرہ دیکھ کر لوگوں کے دل میں پھول کھل جاتے تھے ان کے اندر ایسی مقناطیسی کشش موجود تھی۔ جو بھی انہیں دیکھتا، اس کا دل ان کی طرف کھنچتا۔ ماموں فرقان کے احترام میں صابرہ نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اسے سختی سے منع کر دیا۔

"صابرہ لیٹی رہو، اٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔" ماموں فرقان نے ایک کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہاں بھئی کیا پریشانی ہے تمہیں؟"

"مجھے تو کوئی پریشانی نہیں۔" صابرہ نے مسکرا کر کہا۔

"پھر غصہ ہوگا۔" ماموں فرقان بولے۔

"نہیں غصہ بھی نہیں۔" صابرہ نے اپنے چہرے سے بال ہٹاتے ہوئے کہا۔

"پھر آپ یہاں اسپتال میں کس خوشی میں تشریف لائی ہیں۔" ماموں فرقان نے ہنس کر پوچھا۔

"میں خود تو نہیں آئی، یہ لوگ لائے ہیں۔" صابرہ نے بابر اور اکبر کی طرف اشارہ کیا۔

"اگر ہم لوگ اسپتال نہ لاتے تو یہ اب تک چل بسی ہوتیں۔" بابر نے مذاق میں کہا۔

"ہاں آپ تو یہی دعا کریں گے۔" صابرہ نے بابر کو ترچھی نظروں سے دیکھا۔

ماموں فرقان نے لڑائی کے آثار دیکھے تو فوراً درمیان میں آگئے۔ "اچھا بھئی، لڑائی نہیں ہوگی۔ یہ اسپتال ہے۔ اسے گھر سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ اچھا بابر یہ بتاؤ نیلم کا کیا ہوا؟"

"نیلم گھر میں ہے، وہ لوگ آج نہیں گئے۔ صابرہ کی وجہ سے رک گئے ہو سکتا ہے کل جائیں۔" بابر نے بتایا۔

"صابرہ کے بارے میں ڈاکٹروں نے کیا کہا ہے۔" ماموں فرقان نے بابر سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ شام تک یہاں سے نکال دی جائیں گی۔" بابر نے پھر شوخی دکھائی۔

"دیکھیں ماموں انہیں سمجھائیں۔" صابرہ نے خفگی سے کہا۔

"بابر تمہارا کیا پروگرام ہے؟ تم اپنی عاقبت خراب کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو۔"

Urdufans.com

"اچھا ماموں آپ بھی، کیوں نہیں آخر ماموں کس کے ہیں۔" صابرہ نے اس مرتبہ ماموں فرقان کو بھی لپیٹ میں لیا۔ "اس بات کا احساس کر لیں کہ میں اسپتال میں ہوں۔"

ماموں فرقان کچھ دیر اور بیٹھے، خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ پھر وہ اجازت لے کر چلے گئے۔ شام کو ڈاکٹر نے صابرہ کو گھر جانے کی اجازت دیدی۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ کسی مسئلے پر زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مکمل آرام کی ضرورت ہے۔

صابرہ کو خاصی نقاہت ہو گئی تھی۔ وہ ایک ہی دن میں برسوں کی مریضہ محسوس ہونے لگی تھی۔ گھر آنے سے پہلے ہی صابرہ نے بابر کو ہدایت کر دی تھی کہ واجدہ اور فیاض میرے سامنے نہ آئیں۔ مجھے ان کی شکلیں دیکھ کر ہی غصہ آنے لگتا ہے۔

بابر عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ ایک طرف بیوی تھی، دوسری طرف بہنیے کی سسرال والے تھے۔ سسرال سے پہلے وہ اس کی سالی تھی، دہرار شتہ تھا۔ وہ کس طرح ان سے کہتا کہ صابرہ کے کمرے میں نہ جائیں۔ وہ آپ لوگوں کی شکلیں دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔ اسپتال تک تو بات نبھ گئی تھی۔ وہاں تو ڈاکٹروں کی آڑ لے لی گئی تھی۔ ملاقاتی ممنوع قرار دے دیئے گئے لیکن اب جبکہ وہ گھر پر آگئی تھی تو انہیں ملنے سے کیسے روکا جاتا لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ فیاض اور واجدہ کو صاف صاف بتا دیا جائے۔

تب بابر کافی دیر تک انہیں بتانے کیلئے مناسب الفاظ تلاش کرتا رہا لیکن وہ کتنے ہی میٹھے الفاظ ڈھونڈ لیتا، کیسا ہی رس بھرا لہجہ اختیار کر لیتا، لفظوں کے ہیر پھیر اور لہجے کی تبدیلی سے مفہوم تو نہیں بدل سکتا تھا۔

جب واجدہ نے صابرہ کے گھر آنے کے بعد اس کے کمرے میں جانے کی کوشش کی تو بابر، واجدہ کا نرمی سے ہاتھ پکڑ کر اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ ان کے پیچھے پیچھے فیاض تھا۔

"واجدہ ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گی۔" بابر نے ملائمت سے کہا۔

"نہیں بابر بھائی آپ کہیں میں کیوں برا مانوں گی بھلا۔" واجدہ نے اسے یقین دلایا۔

"تم صابرہ کے کمرے میں مت جاؤ۔ وہ اس وقت پاگل ہو رہی ہے اسے نہ کچھ دکھائی دے رہا ہے اور نہ سنائی دے رہا ہے اور جب آدمی کو کچھ دکھائی نہ دے، سنائی نہ دے تو ایسے آدمی کے سامنے جانے سے کیا فائدہ۔ میں جانتا ہوں وہ تمہاری سگی بہن ہے، تمہارا دل اس کے لئے تڑپتا ہو گا۔ تم اسے دیکھنا چاہتی ہو گی لیکن واجدہ ایسی عیادت کا کیا فائدہ جو مریضہ کو تسلی دینے کے بجائے نقصان پہنچا دے۔ صابرہ کو اس بات سے بہت دکھ پہنچا ہے اب وہ تمہارا، فیاض کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔" بابر نے دل پر پتھر رکھ کر یہ سب کہا۔

یہ سب سن کر فیاض کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ وہ چور سا ہو گیا۔

واجدہ یہ سب سن کر بے اختیار رو پڑی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس نے نیلم کے بارے میں حقائق نہ بتلا کر غلطی کی تھی۔ جرم کیا تھا لیکن اس نے اپنے اس جرم کی صابرہ سے معافی مانگ لی تھی پھر تو اسے معاف کر دینا چاہئے تھا۔

Urdufans.com

تب فیاض حسین ایک عزم کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس نے صوفے کے نزدیک پہنچ کر واجدہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "واجدہ"۔

واجدہ نے اپنا سر اوپر اٹھایا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ بمشکل اس کے حلق سے آواز نکلی۔ "جی"۔

"واجدہ، اپنے آنسو پونچھ لو۔ اٹھو یہاں سے چلیں۔ ابھی وقت ہے۔ اپنی پرس چلو۔ تیار کرو۔ ہم راشد کی فلائٹ سے لاہور نکل جائیں گے۔ چلو جلدی کرو۔ تیاری کرو یہاں کافی عزت افزائی ہو گئی۔ یہ کہہ کر فیاض کمرے سے نکل گیا۔ باہر اسے روکنا چاہتا تھا لیکن روک نہ سکا۔

واجدہ نے آنسو بھری آنکھوں سے باہر کو دیکھا اور بڑے درد سے بولی۔ "فیاض ٹھیک کہہ رہے ہیں باہر بھائی، ہمیں اب اس گھر میں نہیں رکنا چاہئے۔"

باہر گونگا ہو گیا وہ نہ تو یہ کہہ سکا کہ ٹھیک ہے چلے جاؤ نہ یہ کہہ سکا کہ مت جاؤ۔

واجدہ اپنے آنسو پونچھتی اٹھی اور تیز تیز قدموں سے کمرے سے نکل گئی۔

اکبر اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹا ہوا تھا وہ اس اذیتناک صورت کے بارے میں سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا وہ نیلم کو کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ نیلم اس کے خوابوں کی شہزادی تھی۔ اس نے نیلم کے خواب دیکھے تھے اور یہ اتفاق تھا کہ وہ حاصل ہو گئی تھی۔ اب اپنے خوابوں کی شہزادی کو کیسے چھوڑ دیتا۔

اکبر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے اپنے لٹتے ہوئے کارواں کے نظارے میں محو تھا کہ اچانک اسے احساس ہوا جیسے کسی نے اس کا نام لے کر آواز دی ہو۔

وہ یک دم چونک پڑا چونک کر اس نے اپنی آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا دروازے پر نیلم کھڑی تھی۔ "آؤ نیلم میرے خوابوں کی شہزادی میرے نزدیک آؤ۔" اکبر نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"امی ابو جا رہے ہیں۔" نیلم نے بیڈ کے نزدیک پہنچ کر کہا۔ "مجھ سے انہوں نے تیاری کرنے کو کہا ہے۔"

"کہاں جا رہے ہیں؟" اکبر نے چونک کر پوچھا۔

"لاہور اور کہاں؟" نیلم نے سپاٹ لہجے میں بتایا۔

"اس وقت۔" اکبر حیران ہوا۔

"ابو بہت غصے میں ہیں، اب وہ یہاں سے فوراً چلے جانا چاہتے ہیں۔ ویسے جانا تو ہے ہی کل نہ گئے آج چلے گئے۔"

"اچھا۔" اکبر نے ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا وہ اور کیا کر سکتا تھا۔

چند لمحوں تک وہ نیلم کو پلک جھپکائے بنا ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اس کے اس طرح دیکھنے سے نیلم شرما گئی۔ "اس طرح کیوں گھور رہے ہیں مجھے؟"

"نیلم، تم جانتی ہو، نہیں تم کہاں جانتی ہو گی۔ نیلم یہ دنیا والے تمہیں مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں لیکن نیلم میں نے قسم کھائی ہے چاہے کچھ بھی ہو جائے میں تمہیں کھونے نہ دوں گا۔ میں نے تمہیں پوری

Urdufans.com

آزمائش سے حاصل کیا ہے۔" اکبر بڑبڑائی ہو گیا۔

"اکبر میں خود بھی یہی چاہتی ہوں میں تمہاری ہوں۔ تمہاری رہنا چاہتی ہوں۔" نیلم نے بے اختیار کہا۔

جب نیلم، اکبر کی ہونے کا عہد کر رہی تھی تو اسی وقت کہیں سے "میاؤں" کی خوفناک آواز آئی اور اسے لگا جیسے کسی نے دونوں ہاتھوں سے گلا پکڑ لیا ہو۔ گلا گھونٹنے کا احساس بس چند لمحوں کے لئے ہوا وہ اپنے دونوں ہاتھ گلے کے پاس لے کر "اوہ۔" کر کے رہ گئی۔

"کیا ہوا نیلم؟" اکبر نے اس کی ازلی ہوئی رحمت دیکھ لی تھی۔

"کچھ نہیں۔" نیلم نے اپنی کیفیت چھپالی۔ "گلے میں کچھ خراش سی محسوس ہوئی۔"

"ابھی میاؤں کی آواز بھی آئی تھی۔" اکبر نے فکرمند ہو کر کمرے میں ادھر اُدھر نگاہ ڈالی۔

"میں نے نہیں سنی۔" نیلم نے یہاں بھی جھوٹ بولا۔

اکبر نے بیڈ کے نیچے ادھر اُدھر کالے بلے کو تلاش کیا لیکن وہ اسے کہیں نظر نہ آیا۔

"کیا امی کو تم لوگوں کے جانے کا معلوم ہے۔" اکبر نے پوچھا۔

"نہیں۔" نیلم نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا میں جا کر بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے سے نکل کر صابرہ کے کمرے میں پہنچا۔

صابرہ بیڈ پر سیدھی لیٹی ہوئی چھت کو گھور رہی تھی۔

"امی۔ خالہ۔ خالو ابھی جا رہے ہیں۔" اکبر نے فکرمندی سے کہا۔

"تو میں کیا کروں، جانے دو۔" صابرہ نے بے نیازی سے کہا۔

"امی آپ ان سے بات کر لیں نا۔" اکبر نے ماں کے پاؤں پکڑ لئے۔

"بات کرنا تو دور کی بات ہے میں تو ان لوگوں کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" صابرہ بولی۔

"آخر کب تک۔" اکبر نے پوچھا۔

"ساری زندگی۔" صابرہ نے بڑے یقین سے کہا۔ "کیا تو مجھ سے واقف نہیں۔"

اکبر اپنی ماں کی عادت سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ کیا صابرہ کی ضد سے گھر کا ہر فرد واقف تھا۔ وہ ایک بار جو فیصلہ کر لیتی صحیح یا غلط، اس پر زندگی بھر کاربند رہتی۔ اب اس نے اپنی سگی بہن اور بہنوئی کی شکل نہ دیکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو دنیا کا کوئی آدمی اسے اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

اکبر خاموشی سے سر جھکائے اس کے کمرے سے نکل آیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس موضوع پر اپنے باپ سے بات کرے وہ باہر کو سارے گھر میں تلاش کرتا رہا بالآخر ڈرائنگ روم میں پہنچا بابر ابھی تک وہیں بیٹھا تھا وہ صوفے پر نیم دراز تھا اور سوچوں میں گم تھا۔

دروازے پر آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا۔ اکبر کو دروازے پر پا کر اس نے سر کے اشارے سے اسے نزدیک بلایا لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔

"ابو۔" اکبر کی آواز میں لرزش تھی۔

"میں جانتا ہوں اکبر تم یہاں کیوں آئے ہو۔ کیا کہنے آئے ہو جو ہوتا ہے ہونے دو۔"

"ابو۔ وہ لوگ جا رہے ہیں۔ اپنے ساتھ نیلم کو بھی لے جا رہے ہیں۔" اکبر نے فکرمندی سے

کہا۔
"جانے وہ نیلم من کی بچی ہے وہ اپنی بچی کو لے جا رہے ہیں۔" بابر نے لاپروائی سے کہا۔
"لیکن وہ اس طرح۔" اکبر کے لہجے میں افسوس تھا۔
"وہ اس طرح جائیں گے۔" بابر نے غصے سے کہا۔
جائیں گے تو اور کس طرح جائیں گے۔ ماموں فرقان کا فون آگیا۔
ابھی یہ لوگ باتیں ہی کر رہے تھے کہ ماموں فرقان کی صورت حال بتائی۔ ماموں فرقان یہ سب سن کر بولے۔
بابر نے من کی بات سننے سے پہلے گھر کی صورت حال بتائی۔ ماموں فرقان یہ سب سن کر بولے۔
"یہ تو بہت برا ہوا۔ صابرہ کو کیا ہو گیا ہے اتنی ضد اچھی نہیں ہوتی۔"
"ماموں میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ صابرہ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔"
"اچھا بابر تم یوں کرو کہ ان لوگوں کو روکو میں آرہا ہوں۔ جب تک میں نہ آجاؤں وہ گھر سے جائیں نہیں۔ نیلم کو ہرقیمت پر روکنا ہے۔ اسے ان کے ساتھ نہیں جانے دینا ہے۔"
"کیوں ماموں۔" بابر نے پریشان ہو کر پوچھا۔
"یہ میں آکر بتاتا ہوں۔ مختصر اتنا سن لو کہ دادا خضر نہیں چاہتے کہ نیلم کراچی چھوڑے۔ اگر وہ کراچی سے چلی گئی تو پھر کبھی لوٹ کر نہیں آسکے گی۔" ماموں فرقان نے انکشاف کیا۔ "تفصیل میں آکر بتاتا ہوں۔ تم انہیں میرے کشن پہنچنے تک روکے رکھو۔"
"اچھا ٹھیک ہے۔ ماموں آپ آئیں میں انہیں اس وقت تک کے لئے روکتا ہوں۔"
ٹیلیفون بند کر کے بابر نے اکبر کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے بولا۔ "بیٹے، واجدہ کو بلاؤ۔"
اکبر چاہتا تھا کہ وہ باپ سے ماموں فرقان کے فون کے بارے میں معلوم کرے کہ انہوں نے کیا کہا ہے لیکن اس کی ہمت نہ پڑی۔ وہ خاموشی سے ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔
تھوڑی دیر کے بعد وہ واجدہ کے ساتھ کمرے میں واپس آیا۔ واجدہ کے ہاتھ پر ساڑھی لگی ہوئی تھی شاید وہ اسے تہہ کرتے کرتے اکبر کے ساتھ آگئی تھی۔
"جی بابر بھائی۔" واجدہ اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔
بابر نے دیکھا کہ واجدہ کی آنکھوں میں اب بھی آنسو تیر رہے تھے۔
"بیٹھو واجدہ۔" بابر نے اپنے نزدیک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
"نہیں۔ بابر بھائی اب بیٹھنے کا وقت نہیں ہے اپنے کپڑے سمیٹ رہی ہوں۔"
"واجدہ، ماموں فرقان کا فون آیا تھا وہ ابھی آنے والے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھ سے ملے بغیر گھر سے نہ جائیں۔ وہ کچھ نیلم کے بارے میں بھی کہہ رہے تھے۔ تفصیل وہ آکر بتائیں گے اگر مناسب سمجھو تو آدھا گھنٹہ رک جاؤ اتنی دیر میں وہ یہاں ضرور پہنچ جائیں گے۔"
ماموں فرقان کا نام سن کر واجدہ نرم پڑ گئی اس نے کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے۔"
یہ کہہ کر وہ خاموشی سے پلٹی اور کمرے سے نکل گئی۔

ہلکے کے مطابق ماموں فرقان آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے واجدہ اور فیاض سے ڈرائنگ روم بند کر کے بات کی۔ باہر علی ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔

وہ دونوں ایک منٹ بھی اس گھر میں رکنے کو تیار نہ تھے۔ جبکہ ماموں فرقان چاہتے تھے کہ وہ رات کی فلائٹ سے لاہور نہ جائیں۔ انہیں لاہور ایمرجنسی پر وقت ہوگی۔ ماموں فرقان کے سمجھانے سے وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ رات کی فلائٹ سے واپس نہیں جائیں گے۔ صبح دن کی فلائٹ سے چلے جائیں گے لیکن اب یہاں نہیں رکیں۔ رات کسی ہوٹل میں جا کر گزاریں گے۔

ماموں فرقان پھر راز گئے انہوں نے اپنے پر خلوص رویے سے انہیں اس بات پر قائل کر لیا کہ وہ بے شک اس گھر میں نہ رہیں لیکن ہوٹل بھی نہ جائیں وہ رات کو ان کے گھر رہیں پھر انہوں نے نیلم کے بارے میں بھی بات کی لیکن تفصیلات بتانے سے انکار کر دیا۔ کہا کہ پہلے میرے ساتھ گھر چلو وہاں جا کر بات ہوگی۔

ماموں فرقان نے ایسا پتہ پھینک دیا تھا جس کا کوئی توڑ نہ تھا۔ نیلم میں واجدہ اور فیاض کی جان تھی۔ نیلم کے بارے میں انہوں نے ایسی بات کہہ دی تھی کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان کے ساتھ چلے جائیں۔

ماموں فرقان تینوں کو اپنے ساتھ لے کر عزیز آباد پہنچ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا گھر ان لوگوں کی نظر میں چھوٹا دکھائی دے گا لیکن ان کا دل چھوٹا نہ تھا۔ وہ بڑے دل کے مالک تھے۔ ان کا دل دریا اور دماغ سمندر تھا۔ ان کی شخصیت شجر سایہ دار کی سی تھی۔ فیاض حسین اپنے شہر کا ایک بڑا آدمی تھا لیکن اس میں تکبر نہ تھا یہی حال واجدہ کا تھا۔ واجدہ تو فیاض حسین سے اس معاملے میں دو ہاتھ آگے تھی۔ وہ اپنے سے چھوٹے لوگوں کی عزت کرنا خوب جانتی تھی اس کی اسی عادت نے تو اسے نیلم دلوائی تھی۔ حسنہ کو اس نے کبھی ملازمہ نہ سمجھا تھا یہی وجہ تھی کہ حسنہ، اس کے حسن سلوک پر مرمٹی تھی اور اپنے جگر کا ٹکڑا اس کے حوالے کر کے چلی گئی تھی۔ کسی نے سچ کہا کہ تلوار کا گھاؤ بھر جاتا ہے لیکن لفظوں کا گھاؤ کبھی نہیں بھرتا۔

عزیز آباد پہنچ کر واجدہ اور فیاض نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ ماموں فرقان کے ایک سو بیس گز کے مکان کی دونوں میاں بیوی نے کچھ اس طرح تعریف کی کہ انہیں اپنا مکان محل معلوم ہونے لگا۔

شمسہ نے نیلم کو دیکھتے ہی گلے لگا لیا۔ نیلم بھی اس طرح شمسہ کے گلے لگی جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔

ممانی ریحانہ نے بھی واجدہ کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جیسے ان کی آمد کی منتظر تھیں۔ گھر میں ایک ہنسی خوشی کا ماحول تھا۔ واجدہ کو اس ماحول میں بڑا سکون ملا۔ جب سے وہ کراچی آئی تھی جیسے سولی پر لٹکی رہی تھی۔ اس کے دماغ کی رگیں کھنچ رہی تھیں۔ اب جا کر اس کے تنے ہوئے اعصاب کو راحت کا احساس ہوا۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ سب لوگ ایک کمرے میں اکٹھا ہو گئے۔ رات گئے تک خوش گپیاں چلتی رہیں۔

UrduFans.com

دوسرے دن دوپہر کی فلائٹ سے واجدہ اور فیاض لاہور چلے گئے۔ نیلم کو انہیں مجبوراً چھوڑنا پڑا تھا۔ دادا غفور کی یہی ہدایت تھی ان کا خیال تھا کہ نیلم اگر یہاں سے چلی گئی تو سخت نقصان میں رہے گی۔ دادا غفور کی یہی ہدایت تھی ان کا خیال تھا کہ نیلم اگر یہاں سے چلی گئی تو سخت نقصان میں رہے گی۔ دادا غفور چاہتے تھے کہ اس جن سے نجات کے لئے کوئی قربانی پیش کر دی جائے۔ کوئی بکرا یا مرغا۔ کچھ نہ کچھ ایسا کیا جائے۔ اس عمل کے لئے نیلم کا نظروں کے سامنے رہنا ضروری تھا۔ جاتے ہوئے واجدہ نے نیلم کو ماموں فرقان کے سپرد کر دیا۔ اس عمل کو ایئرپورٹ چھوڑ کر آئے تھے۔ جاتے ہوئے واجدہ نے نیلم کو ماموں فرقان کے سپرد کر دیا۔ ان دونوں کو ایئرپورٹ چھوڑ کر آئے تھے۔ "ماموں فرقان۔ نیلم کو شہد کی طرح سمجھتا میں اسے محض آپ کے سپرد کر رہے ہیں۔ ان دونوں نے جاتے ہوئے کہا تھا۔

سارے چھوڑے جا رہی ہوں۔" نیلم کی فکر مت کرو، یہ مجھے شہد سے بھی زیادہ عزیز رہے گی۔"

"ہاں، واجدہ تم اطمینان سے جاؤ۔ بلکہ انہوں نے جو کہا تھا اسے اپنے دل پر لکھ لیا تھا۔

ماموں فرقان نے یہ الفاظ رسماً نہیں کہے تھے بلکہ انہوں نے جو کہا تھا اسے اپنے دل پر لکھ لیا تھا۔

جب یہ لوگ گھر سے نکلے تھے تو صابرہ کو کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ اس نے یہی قیاس کر لیا تھا کہ واجدہ اور فیاض نیلم کو لے کر لاہور جا چکے ہیں۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ ایئرپورٹ نہیں ماموں فرقان کے گھر چلے گئے ہیں اور یہ کہ نیلم اپنے والدین کے ساتھ لاہور نہیں گئی ہے ماموں فرقان کے یہاں ہے۔

اور یہ بات اسے اس وقت معلوم ہوئی جب ماموں فرقان شام کو نیلم کے ساتھ گلشن پہنچے۔

واجدہ اور فیاض ساڑھے بارہ بجے کے قریب ایئرپورٹ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ایک بجے کے قریب ان لوگوں نے کھانا کھایا پھر سہ پہر کو ماموں فرقان نیلم کو لے کر دادا غفور کے گھر برنس روڈ پہنچے۔

دادا غفور کی یہی ہدایت تھی کہ وہ نیلم کو دیکھنا چاہتے تھے۔

برنس روڈ جاتے ہوئے ماموں فرقان، نیلم کو بغور دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بس یہی کہا تھا کہ دادا غفور ان کے دور کے رشتے داروں میں سے ہیں۔ وہ بہت دن سے بلا رہے تھے ہم نے سوچا کہ آج ان کے گھر چلا جائے۔ تم بھی آئی ہو سوچا کہ تمہیں بھی ساتھ لے چلیں۔ تم نے وہ علاقہ نہیں دیکھا ہوگا۔ تمہاری سیر ہو جائے گی۔

ماموں فرقان ٹیکسی میں آگے بیٹھے ہوئے تھے۔ پیچھے ممانی ریحانہ اور شمسہ تھیں۔ نیلم ان دونوں کے درمیان میں تھی۔ ماموں فرقان نے نیلم کو درمیان میں قصداً بٹھایا تھا۔

ٹیکسی تیزی سے برنس روڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ماموں فرقان، نیلم کو گزرنے والی سڑکوں اور جگہوں کے نام بتاتے جا رہے تھے۔

صدر سے نکلنے کے بعد اچانک نیلم کا رنگ بدلا اس نے گھبرا کر ماموں فرقان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ "ماموں آپ مجھے کہاں لئے جا رہے ہیں؟"

"بیٹا ہم نے آپ کو بتایا تو تھا کہ ہم دادا غفور کے یہاں جا رہے ہیں۔"

"نہیں ماموں، میں کہیں نہیں جاؤں گی مجھے آپ یہیں اتار دیں۔" نیلم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

ماموں فرقان اس کے لہجے کی تبدیلی کو محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں اس کی

دھوں میں دیکھتے ہوئے کچھ پڑھنا شروع کیا۔

"وہ کو جیسی میں کہیں نہیں جاؤ گی؟" نیلم نے اچانک دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ممانی ریحانہ نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ماموں فرقان کا اسے درمیان میں ہٹانا کام آگیا۔ اس بات کا امکان تھا کہ وہ اگر کنارے پر بیٹھی ہوتی تو اب تک کب کا ٹیکسی کا دروازہ کھول چکی ہوتی۔ پھر ٹیکسی والے نیلم کی بات سن کر ٹیکسی والے نے فرقان ماموں کی طرف دیکھا جیسے پوچھنا چاہتا ہو کیا معاملہ ہے۔

"ٹیکسی مت روکنا۔ یہ بات ماموں فرقان نے ٹیکسی والے کو اشارے سے سمجھائی۔

ماموں فرقان کچھ پڑھ رہے تھے اس لئے زبان سے کچھ بولنا نہیں چاہتے تھے۔

"نیلم پریشان مت ہو بیٹے۔" ممانی ریحانہ نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

نیلم نے اپنا سر فوراً ممانی کے کندھے سے اٹھالیا اور ایک مرتبہ پھر ٹیکسی کا دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے گھر واپس لے چلیں۔" نیلم نے ماموں فرقان سے التجا کی۔

ماموں فرقان نے اشارے سے نیلم کو قریب آنے کو کہا جیسے وہ اسے آہستگی سے کچھ بتانا چاہتے ہوں۔ نیلم ان کا اشارہ پاکر جب آگے کی طرف جھکی تو ماموں فرقان نے اس کے چہرے پر زور سے پھونک ماری۔

نیلم نے ایک جھرجھری سی لی۔ پھر وہ بڑے اطمینان سے سیٹ سے کمر لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ جو اس کا رنگ بدل گیا تھا اور بار بار ٹیکسی سے اترنے کی کوشش کر رہی تھی ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اور سمندر کی طرح خاموش ہو گئی۔

برنس روڈ کا علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ ماموں فرقان نے بائیں جانب ٹیکسی مڑوائی اور پھر تھوڑا سا اندر جاکر اسے روکنے کو کہا۔ ٹیکسی سے اتر کر ماموں فرقان نے کرایہ ادا کیا اور پھر وہ لوگ بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

دادا غفور کے گھر والوں نے نیلم کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نیلم نے ان لوگوں کو دیکھ کر بظاہر خوشی کا اظہار کیا لیکن اس کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

ماموں فرقان نے دادا غفور کے کمرے میں جاکر نیلم کی آمد اور اس کی کیفیت کے بارے میں بتایا اور بولے۔ "دادا غفور، نیلم کو جلد دیکھ لیجئے کہیں اس کی حالت نہ بگڑ جائے۔"

"ارے فرقان تم فکر نہ کرو۔ وہ اب آگئی ہے یہ گھر کسی قلعے کی طرح ہے بالکل محفوظ۔ اس گھر میں کوئی غیر انسانی مخلوق پر بھی نہیں مار سکتی۔" دادا غفور نے بے نیازی سے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" ماموں فرقان نے سنجیدگی سے کہا۔

"جانتے ہو تو پھر پریشان کیوں ہوتے ہو۔"

"پریشان اس لئے ہوں کہ اس کی ماں اسے میرے سپرد کر کے گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے بخیریت اس کے گھر پہنچا دوں۔"

Urdufans.com

"اچھا بھئی ٹاٹ باٹ اے۔" دادا غفور نے کہا۔

ماموں فرقان قہقہہ لگا کر ہنسے۔ نیلم دادا غفور کی پوتیوں کے ساتھ ہنستے ہنستے کمرے میں آئے۔ ماموں فرقان نے اس کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ معصوف تھی۔ ماموں فرقان کا چہرہ دیکھتے ہی وہ سہم گئی۔

جیسے ہی ماموں فرقان نے اس کی کیفیت کو محسوس کیا، وہ خوش ہو کر بولے۔ "ہاں بھئی تمہیں شروع ہو جانا چاہئے۔ تم لڑکیوں میں یہ ایک بہت بڑی خامی ہے کہ جلد ایک دوسرے سے گھل مل جاتی ہو۔ آؤ نیلم۔ دادا غفور کو سلام کرو۔ وہ تمہارے بارے میں بتا رہے تھے۔"

نیلم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے میں چلتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے ماموں۔" نیلم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے میں چلتی ہوں۔"

نیلم کمرے میں داخل ہوئی تو انہوں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا اور خوش ہو کر بولے۔ "آؤ نیلم بیٹے آؤ۔ ادھر آجاؤ میرے پاس۔"

"آداب دادا۔" نیلم نے آنکھیں جھکائے آداب کیا۔

"جیتی رہو بیٹی۔" دادا غفور نے دعا دی۔

نیلم سکڑ سمٹ کر دادا غفور کے پاس چوکی پر بیٹھ گئی۔ دادا غفور گاؤ تکیئے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے آگے جھک کر نیلم کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ "کیسی ہو بیٹی؟"

"جی ٹھیک ہوں۔ دادا۔"

دادا غفور نے اپنی کالی واسکٹ کی جیب میں سے ایک سو روپے کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ "لو بیٹے یہ رکھ لو۔"

"ارے دادا اس کی کیا ضرورت تھی۔" نیلم نے دھیرے سے کہا۔

"نیلم تکلف نہ کرو۔ فوراً نوٹ پکڑ لو۔ تم بڑی خوش قسمت ہو کہ تمہیں منہ دکھائی کے سو روپے مل رہے ہیں۔ ذرا اپنی ممانی ریحانہ سے پوچھنا وہ آج تک روتی ہے اسے دادا غفور نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو پانچ روپے لگائے تھے۔" ماموں فرقان نے ہنس کر کہا۔

دادا غفور مسکرا دیئے مگر بولے کچھ نہیں۔ پھر انہوں نے تکیئے کے نیچے سے تسبیح نکالی اور وہ اندر سے کسی کو آواز دینے ہی والے تھے کہ ماموں فرقان بولے۔ "دادا پانی لاؤں کیا۔"

"ہاں، ایک گلاس پانی چاہئے۔" دادا غفور نے کہا۔

ماموں فرقان پانی لینے اندر چلے گئے۔ جب پانی لے کر آئے تو دادا تسبیح پڑھنے میں مشغول ہو چکے تھے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے پانی اپنے نزدیک رکھنے کو کہا۔ ماموں فرقان نے گلاس چوکی پر رکھ دیا۔

تسبیح مکمل کرنے کے بعد دادا غفور نے گلاس اٹھا کر پھونکیں ماریں اور نیلم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ "لو نیلم یہ پانی پی لو۔"

پانی کے گلاس کو نیلم نے غور سے دیکھا۔ گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے ذرا جھجکی۔ "دادا مجھے پیاس نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا۔ جتنا پی سکتی ہو پی لو۔"

Urdufans.com

"نیلم یہ پانی فوراً پی لو تمہارے سر میں ہر وقت درد رہتا ہے ٹھیک ہو جائے گا۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"اچھا ماموں۔" نیلم نے دادا غفور کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

گلاس کو اپنی آنکھوں کے سامنے کر کے اسے گھورنے لگی۔

"پانی میں کچھ پڑا ہوا ہے کیا نیلم۔" دادا غفور نے پوچھا۔

"یہی دیکھ رہی ہوں۔" نیلم نے گلاس کو بدستور گھورتے ہوئے کہا۔

"لاؤ مجھے دکھاؤ۔ میں دیکھوں۔" ماموں فرقان نے ہاتھ بڑھایا۔

نیلم نے گلاس ماموں فرقان کے ہاتھ میں دے دیا۔ انہوں نے ذرا اوپر روشنی میں کر کے گلاس کو دیکھا پانی بالکل صاف تھا۔ اس میں کوئی تنکا وغیرہ نہ تھا۔

"نیلم پانی بالکل صاف ہے پی لو۔" ماموں فرقان نے گلاس نیلم کی طرف بڑھایا۔

نیلم نے گلاس پھر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے اپنی آنکھوں کے سامنے کر کے بغور دیکھنے لگی۔

"بیٹے وہم نہ کرو۔ پانی پی لو۔" اس مرتبہ دادا غفور بولے۔

لیکن نیلم نے پانی نہ پیا۔ وہ بدستور اسے گھورتی رہی۔

ماموں فرقان نے دادا غفور کی آنکھوں میں دیکھا۔ دادا غفور کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

"نیلم پانی پی لو جلدی کرو۔" ماموں فرقان نے ذرا تحکمانہ لہجہ اختیار کیا۔

"اسے تو خود کیوں نہیں پی لیتا۔ مجھے بے وقوف سمجھتا ہے۔" اچانک نیلم کا لب و لہجہ بدل گیا۔ اس نے مردانہ آواز میں کہا اور اس پانی کو ماموں فرقان کے منہ پر پھینک دیا۔

پورے گلاس کا پانی ماموں فرقان کے چہرے اور لباس پر پڑا تو وہ ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔

ماموں فرقان کی گھبراہٹ سے نیلم بڑی محظوظ ہوئی اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور مذاق اڑاتے ہوئے بولی۔ "بس فرقان ایک گلاس پانی سے ڈر گئے؟ اب ہم جا رہے ہیں۔"

نیلم جو ہونق بن گئی تھی اپنی اصلی حالت پر آ گئی۔ اب نہ آنکھیں پھٹی رہیں اور نہ رنگ لال انگارہ رہا ..... نہ مردانہ آواز رہی۔

اسے ہوش آیا تو سب سے پہلے اس نے اپنا دوپٹہ درست کیا جو شانے سے ڈھلک چکا تھا۔ دوپٹہ درست کر کے اس نے ماموں فرقان کی طرف دیکھا اسے وہ بھیگے ہوئے نظر آئے۔ نیلم نے حیرت سے انہیں دیکھا اور نقاہت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "یہ کیا ہوا ماموں؟"

"بیٹی تمہیں نہیں معلوم؟" ماموں فرقان نے ہنس کر دادا غفور کی طرف دیکھا وہ کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔

"مجھے معلوم ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتی؟" نیلم نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔

"سر کیوں پکڑ رہی ہو؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"ماموں میرے سر میں ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔" نیلم نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

Urdufans.com

تب ہی دادا غفور نے ماموں فرقان کو اشارہ کیا کہ وہ گلاس میں اور پانی لے آئیں۔ ماموں فرقان نے
شیشے کا خالی گلاس اٹھایا اور اندر سے دوبارہ پانی لے آئے۔ دادا غفور نے اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور
گلاس نیلم کی طرف بڑھا دیا۔
"لو بیٹا پانی پی لو تمہارے سر کا درد ٹھیک ہو جائے گا۔"
نیلم نے فوراً گلاس اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جلدی سے پانی پی گئی۔ پانی پی کر اسے کچھ سکون محسوس
ہوا پھر سے جو سر درد پھیل گئی تھی وہ کم ہوئی ذرا بشاشت آئی پھر وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "دادا جی میں اندر
جاؤں۔"
"ہاں ٹھیک ہے بیٹا تم اندر جاؤ۔" دادا غفور نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
نیلم نے بڑی فرمانبرداری سے ذرا آگے ہو کر ان کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ دادا غفور نے اس کے سر
پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ "بیٹا فکر نہ کرنا تمہیں بہت جلد اس موذی سے نجات مل جائے گی۔"
"کس موذی سے دادا؟" نیلم نے حیران ہو کر پوچھا۔
"اس موذی سے بیٹا جو خود کو سید پور کا بتاتا ہے۔ اس کا نام ابھی نہیں معلوم، وہ بھی کر لیں گے۔
بہر حال تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہم بہت ہیں اسے سمجھنے کیلئے۔" دادا غفور نے بڑے یقین
سے کہا۔
"اچھا دادا شکریہ۔" نیلم کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی بہر حال وہ مدد کرنے کو کہہ رہے تھے لہٰذا ان کا شکریہ
ادا کرنا ضروری تھا سو اس نے کر دیا۔
پھر وہ دادا غفور کو "خدا حافظ" کہہ کر اس کمرے میں چلی گئی جہاں خواتین بیٹھی تھیں۔
"فرقان اس لڑکی کیلئے کچھ کرو اس نے اس پر خاصا قبضہ جما لیا ہے۔" دادا غفور نے نیلم کے جانے
کے بعد کہا۔
"آپ بتائیں کیا کروں؟" ماموں فرقان خود پریشان تھے۔
"ایک رات قبرستان میں گزار لو گے؟" دادا غفور نے پوچھا۔
"گزار لوں گا۔" ماموں فرقان نے اس طرح کہا جیسے یہ ان کے لئے معمولی بات ہو۔

"ڈر دگے تو نہیں؟" دادا غفور ہنسے۔

"دادا غفور میں بچہ تھوڑی ہوں۔" ماموں فرقان نے سنجیدگی سے کہا۔

"جانتا ہوں۔" دادا غفور نے ہنس کر کہا۔ "بھائی قبرستان ایسی جگہ ہے جہاں اچھے اچھوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے تم نے تو وہاں پوری رات گزارنا ہے۔ میں یہ کام خود کرتا لیکن بڑھاپے نے اب اس قابل نہیں رکھا ہے کہ اتنا لمبا عمل کر سکوں۔"

"دادا غفور آپ فکر نہ کریں۔" ماموں فرقان نے کہا۔ "میں بھی اگرچہ جوان نہیں لیکن ایک رات ضرور گزار لوں گا. قبرستان میں۔"

پھر دادا غفور نے ماموں فرقان کو بتایا کہ قبرستان میں بیٹھ کر کیا پڑھنا ہے۔ کس طرح عمل کرنا ہے وہاں کس قسم کی صورت حال پیش آ سکتی ہے. ایسی صورتوں میں کیا کرنا ہو گا۔

Urdufans.com

ماموں فرقان نے تمام باتوں کو اپنی طرح سمجھ لیا جو چیزیں وہاں پڑھنا تھیں انہیں ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا اس کے بعد دادا غفور سے اجازت لے کر ان کے کمرے سے باہر آ گئے۔

دادا غفور اپنے کمرے سے مشکل سے نکلتے تھے۔ گھر میں کوئی بھی آتا جاتا وہ ان سے ملنے ان کے کمرے میں جاتا پھر وہ اسے اپنے کمرے سے ہی رخصت کر دیتے تھے لیکن اس دن جانے کیا ہوا کہ نیلم جب گھر سے جانے لگی تو دادا غفور اسے سیڑھیوں تک چھوڑنے آئے اور بار بار پریشان نہ ہونے کی تلقین کرتے رہے۔

"نیلم تم بہت خوش قسمت ہو کہ دادا غفور تمہیں گھر کے باہر تک چھوڑنے آئے۔" ماموں فرقان نے سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔

"واقعی یہ بات تو ہے دادا غفور بھلا کہاں اپنے کمرے سے نکلتے ہیں۔ چاہے کوئی آئے کوئی جائے۔" ریحانہ ممانی نے تائید کی۔

نیچے اتر کر سڑک پر آئے تو فوراً ہی ایک ٹیکسی مل گئی۔

ماموں فرقان نے پہلے اپنے گھر والوں کو عزیز آباد چھوڑا پھر اسی ٹیکسی میں نیلم کو اس کے گھر گلشن پہنچایا جب وہ گلشن پہنچی تو مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔

گیٹ صابرہ نے کھولا سامنے ماموں فرقان اور نیلم کو پایا تو وہ کچھ حیران ہوئی اس کے خیال کے مطابق واجدہ اور فیاض لاہور جا چکے تھے اور ان کے ساتھ نیلم بھی چلی گئی تھی۔ نیلم کو ماموں فرقان کے ساتھ گھر کے دروازے پر دیکھنا تو حیران ہونا لازمی امر تھا۔

نیلم کو دیکھ کر وہ دروازے پر رکی نہیں۔ اس نے ماموں فرقان کو جلدی سے سلام کیا اور تیزی سے اندر چلی گئی۔

ماموں فرقان، صابرہ کے تعاقب میں اس کے کمرے تک پہنچ گئے۔ نیلم اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ماموں فرقان کو اپنے کمرے میں دیکھ کر وہ کچھ نہ بولی خاموش رہی۔

"صابرہ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"ماموں میں ٹھیک ہوں۔" صابرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "آپ یہ بتائیں کہ نیلم لاہور کیوں نہیں گئی؟"

"گئی تھی۔" ماموں فرقان نے صابرہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"گئی تھی تو پھر واپس کیوں آ گئی؟"

"اسے اپنی ساس یاد آ رہی تھی اس لئے ایئرپورٹ سے واپس آ گئی۔" ماموں فرقان نے یہ بات کچھ اس طرح کہی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی صابرہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"ماموں سچ بتائیں نا۔" صابرہ نے اپنی مسکراہٹ پر قابو پانے کی کوشش میں اپنا منہ بگاڑ لیا۔

"اچھا ذرا میں مغرب کی نماز پڑھ لوں پھر آ کر سچ سچ بتاتا ہوں تم جب تک اپنے اندر حوصلہ پیدا کر لو۔" یہ کہہ کر ماموں کمرے سے نکل گئے۔

قریبی مسجد میں ماموں فرقان نے نماز پڑھی۔ گھر واپس آئے تو بابر اور اکبر بھی شوروم سے واپس

آ چکے تھے۔

راشدہ، نیلم کے کمرے میں بیٹھی اس سے محو گفتگو تھی۔ اسے نیلم کے لاہور نہ جانے کی بڑی وجہ پتہ چل چکی تھی۔ وہ اس سے ماموں فرقان اور دادا غفور کے گھر کے حالات سن رہی تھی۔

اکبر باتھ روم میں منہ دھونے میں مصروف تھا۔ بابر کپڑے تبدیل کر کے ایک کرسی پر بیٹھا موبائل پر کسی سے مختصر تھا۔ صابرہ اپنے کمرے میں تھی اور ابھی مصلے سے اٹھی تھی۔

ماموں فرقان نے سب سے پہلے بابر علی سے علیک سلیک کی۔ دادا غفور کے گھر جو بیتی تھی وہ سنا چکے تھے۔ وہ اٹھ کر صابرہ کے پاس چلے گئے۔ صابرہ کے کمرے میں راشدہ بھی موجود تھی وہ چائے کا خالی کپ اٹھانے آئی تھی۔ ماموں فرقان، بابر علی کے ساتھ چائے پی چکے تھے۔ راشدہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ ماموں فرقان نے دادا غفور کے گھر کی روداد بیان کی اسے یہ بتایا کہ وہاں کیا ہوا۔ دادا غفور نے نیلم کو لاہور جانے سے کیوں روکا۔ ماموں فرقان نے صابرہ کو یہ بھی بتایا کہ فیاض اور واجدہ رات کو ان کے گھر رہے اور دوسرے دن دوپہر کی فلائٹ سے لاہور گئے۔ صابرہ بڑے صبر سے ماموں فرقان کی زبانی تمام کہانی سنتی رہی۔ ماموں فرقان نے ساری داستان سنا کر صابرہ سے کہا۔ "نیلم کے والدین تو خیر واپس لاہور چلے ہی گئے اب شاید وہ کبھی واپس نہ آئیں۔"

"تو نہ آئیں۔ جائیں بھاڑ میں میں کون سی ان کیلئے مری جا رہی ہوں۔" صابرہ کو ایک دم غصہ آگیا۔

"ہاں میں جانتا ہوں کہ تم ان کے لئے مری نہیں جاؤ گی کوئٹہ جاؤ گی۔" ماموں فرقان نے اس کے غصے پر کوئی توجہ نہ دی بات کو ہنسی میں اڑانے کی کوشش کی۔

"او ہو ماموں۔" صابرہ نے زچ ہو کر کہا۔ "آپ تو حد کرتے ہیں۔"

"میری بات دراصل ادھوری رہ گئی۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ فیاض اور واجدہ تو اب چلے ہی گئے دونوں صورتیں تمہیں اب نظر نہیں آئیں گی۔ اب ایک صورت گھر میں رہ گئی ہے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم نیلم کو معاف کر دو؟"

"معاف کرنے کو میں اسے کیا کہہ رہی ہوں، اسے کیا کہہ سکتی ہوں۔" صابرہ نے بڑی لاتعلقی سے کہا۔

"اس سے محبت نہیں کر سکتیں تو نفرت بھی نہ کرو۔ وہ بہت معصوم اور سیدھی سادی سی لڑکی ہے۔ پہلے ہی عذاب میں مبتلا ہے اگر اس گھر سے اسے نفرت ملی تو وہ کہیں کی نہ رہے گی، پاگل ہو جائے گی۔"

"ارے ماموں وہ کوئی عذاب و ذاب میں مبتلا نہیں ہے یہ سب ڈھونگ رچا رکھا ہے اس نے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ اس پر جن کا سایہ نہیں ہے وہ ڈرامہ کر رہی ہے؟" ماموں فرقان نے حیرت سے کہا۔

"میں تو یہی سمجھتی ہوں۔" صابرہ نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔

"صابرہ تم بہت بے وقوف ہو تم کچھ نہیں سمجھتیں، تمہیں اس وقت سمجھ آئے گی جب وقت تمہارا

Urdufans.com

ہاتھ سے نکل پکا ہوگا۔" ماموں فرقان نے کسی قدر غصے سے کہا۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

پھر ماموں فرقان نے صابرہ کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔

کوئی اور وقت ہوتا تو صابرہ، ماموں فرقان کو اس طرح ناراض ہو کر کمرے سے کبھی نہ جانے دیتی لیکن اس وقت اسے نیلم کی طرفداری بالکل پسند نہ آئی۔ ماموں فرقان کی زبانی نیلم کی تعریف اور حمایت میں کلمات سن کر اس کا ذہن سلگ اٹھا تھا، دہن تلخ ہو گیا تھا۔ اعصاب میں اینٹھن پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے اس نے ماموں فرقان کو جانے دیا۔

وہ کچھ دیر بیڈ پر بیٹھی رہی پھر وہ تکیے کا سہارا لے کر نیم دراز ہو گئی اس کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ کھڑکیاں بھی بند تھیں اور ان پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ آج سردی خاصی تھی شام ہوتے ہی سرد ہواؤں کا مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ صابرہ نے اپنا نرم ملائم کمبل اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔

اس کی نظریں چھت کو گھور رہی تھیں اور اس کا دماغ نیلم میں الجھا ہوا تھا اس نے بیٹھے بٹھائے گھر میں ایک عذاب پال لیا تھا آخر کیا ضرورت تھی اتنی دور شادی کرنے کی۔ کراچی میں لڑکیوں کی کیا کمی تھی۔ دور کے ڈھول ہمیشہ سہانے ہوتے ہیں یہاں کی لڑکی ہوتی تو دیکھی بھالی ہوتی اس طرح کا فریب تو نہ کھاتی۔

اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا اس کے چہرے پر تھپڑ کی طرح پڑا۔

اس کے سرہانے والی کھڑکی کا ایک پٹ کھل گیا تھا اتنی تیز ہوا آ رہی تھی کہ اس پر پڑا ہوا پردہ اونچا اڑ رہا تھا۔ یہ کھڑکی باہر باغ کی طرف کھلتی تھی۔

صابرہ کان سن کرنے والی ہوا سے بچنے کیلئے تیزی سے اٹھی اس نے جلدی سے کھڑکی کا پٹ بند کیا اور اسے بولٹ کر دیا۔

کھڑکی بند کر کے اس نے ہیٹر آن کر دیا وہ ہیٹر کا استعمال کبھی کبھی کرتی تھی لیکن اس وقت اسے کچھ اس طرح سردی محسوس ہوئی تھی کہ وہ ہیٹر آن کرنے پر مجبور ہو گئی تھی چند ہی سیکنڈوں میں ہیٹر کے تار شعلوں کی طرح چمکنے لگے۔ صابرہ نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے کر دیئے کچھ دیر وہ اسی طرح کھڑی رہی، ہاتھوں کو گرمی محسوس ہوئی تھی لیکن جسم میں سردی تیر کی طرح گھس رہی تھی۔

وہ فوراً بیڈ پر آ گئی..... اس نے جلدی سے کمبل اپنے گرد لپیٹ لیا..... ابھی وہ اچھی طرح کمبل اپنے گرد لپیٹ نہ پائی تھی کہ برف جما دینے والا ایک تیز جھونکا اس کے سر کو لگا۔

کھڑکی کا پٹ پھر کھل گیا تھا..... اور اس سے اتنی تیز ہوا اندر آ رہی تھی کہ پردہ بھی خاصا اونچا اڑ رہا تھا۔ صابرہ کو بڑی حیرت ہوئی..... کھڑکی کو اس نے اچھی طرح بند کر کے بولٹ کیا تھا لیکن وہ اس طرح کھل گئی تھی جیسے بولٹ ہی نہ تھی۔

صابرہ نے جلدی سے اٹھ کر پھر کھڑکی اچھی طرح بند کی اور چٹخنی چڑھا دی..... لیکن ابھی کھڑکی بند کر کے بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ کھڑکی پھر کھل گئی اور اس میں سے یخ بستہ ہوائیں اندر آنے لگیں۔

اب کچھ صابرہ کو خوف محسوس ہوا یہ کیا ہو رہا تھا..... کھڑکی چٹخنی چڑھائے جانے کے باوجود کیوں کھل رہی تھی..... اس کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہ تھی..... اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

Urdufans.com

وہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی

اس نے کمبل پھینک دیا

اب صابرہ نے کھڑکی بند نہ کی

کھڑکی سے ہوا آتی تھی جو ہوا آ رہی تھی کہ صابرہ کو کمبل کے اوپر اپنے پر کچھ بوجھ

بھی پھیلا

اس کے جسم میں کپکپاہٹ دوڑنے لگی تھی۔

عین اسی وقت کھڑکی کے پٹ بھیانک طور پر کھلے اور چار دیواری کے اندر

ان کا ٹکرانا سنائی دیا۔ کھڑکی پر چھلانگ لگائی اور بند کے نیچے چلا گیا۔

پھر جیسے سوراخ سے نکل کر فرش پر چھلانگ لگائی اور بند کے نیچے چلا گیا۔

جیسے ایک زوردار دھماکا سا ہوا

کھڑکی اپنے آپ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گئی

اس نے بہت کر کے کمبل سے

کھڑکی کے اچانک بند ہونے کی وجہ سے صابرہ کا دل لرز اٹھا

اپنا منہ نکالا اور کھڑکی کی طرف دیکھا

اب کھڑکی اس طرح بند تھی جیسے کبھی کھلی ہی نہ ہو۔

صابرہ نے اٹھ کر اسے ایک مرتبہ پھر بولٹ کرنا چاہا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی کہ کھڑکی پر چٹخنی

چڑھی ہوئی تھی۔

کھڑکی کا چٹخنی بند ہونے کے باوجود بار بار کھلنا

اب اسے اپنی صحیح الدماغی پر شک ہونے لگا

کھلی کھڑکی کا بند ہو جانا اور چٹخنی بند ہو جانا

اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی

ہو

کوئی بھیانک خواب۔

وہ اپنے دماغ کو جھٹک کر پھر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔

لیٹتے لیٹتے اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے برابر کوئی لیٹا ہے۔ صابرہ نے فوراً اپنے چہرے سے

کمبل ہٹایا اور مڑ کر پیچھے دیکھا ..... کوئی نہ تھا۔ اسے اس احمقانہ خیال پر ندامت ہوئی ..... لیکن

آرام سے لیٹ گئی ..... اس مرتبہ اس نے اپنا منہ کمبل سے نہ ڈھکا ..... کمبل صرف گردن تک

لے لیا۔

پھر اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کے برابر کوئی لیٹا ہے ..... اب اس احساس میں یہ اضافہ ہوا کہ

برابر لیٹنے والا کوئی کفن پوش ہے ..... جیسے کفن پوش لاش۔

وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی ..... اس نے بیڈ پر چاروں طرف دیکھا ..... اسے کچھ نظر نہ آیا .....

پھر اس نے کمرے کے چاروں کونوں پر نظر ڈالی ..... کمرے میں کوئی تبدیلی نہ تھی۔

وہ اپنے وہم پر اندر ہی اندر مسکرائی ..... اس نے لاحول پڑھی ..... اور پھر کمبل اوڑھ لیا۔

کمبل اوڑھ کر لیٹتے ہی، وہ احساس پھر جاگ اٹھا ..... جیسے کوئی کفن اوڑھے اس کے برابر لیٹا ہے۔

اب اسے "کھڑ کھڑ" کی آواز بھی سنائی دی ..... جیسے کسی نے کروٹ لی ہو ..... یہ کھڑ کھڑاہٹ

بالکل کورے لٹھے جیسی تھی ..... اس کے برابر جو کوئی بھی تھا ..... وہ کفن پوش ضرور تھا لیکن مُردہ

نہ تھا۔

اس احساس نے اس کے جسم پر لرزا طاری کر دیا ..... وہ کمبل پھینک کر اٹھنے لگی لیکن اس سے اٹھا

نہ گیا ..... اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کفن پوش شخص اس کے اوپر سوار ہو گیا ہو ..... اس کا گلا دبا

رہا ہو ..... صابرہ نے چیخنا چاہا لیکن اس کی چیخ گھٹ کر رہ گئی۔

وہ ایک سخت سردی میں پیچھے ہو گئی تھی
دل بڑے زور زور سے دھک دھک کر رہا
پیچھے چھوڑ کر باہر آجائے گا۔
احساس کہ کوئی گھنی پوش شخص اس کے اوپر سوار ہو کر گاڑی چلا رہا ہے۔ بس چند لمحوں رہا۔
لیکن یہ چند لمحے اس پر قیامت بن کر ٹوٹے
وہ ایک ہولناک تجربے سے گزر گئی
وہ کمبل پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے دروازہ
اس
کی سمت کمرے سے نکل گئی۔
تھا کر کمرے میں وہ اپنے چپل پہننا بھی بھول گئی تھی۔
اس تیزی میں وہ اپنے چپل پہننا بھی بھول گئی تھی۔
کمرے سے باہر نکلی تو اسے راشدہ مل گئی ..... راشدہ اپنی ماں کے ہوش اڑے ہوئے دیکھے تو اس
کے اپنے ہوش اڑ گئے ..... وہ گھبرا کر بولی ..... "امی۔ امی کیا ہوا؟"
"تیرے ابو کہاں ہیں؟" صابرہ نے لمبے لمبے سانس لے کر کہا۔
"امی وی لاؤنج میں ہیں۔" راشدہ نے بتایا ..... پھر اس کی نظریں ماں کے پیروں پر پڑی تو یہ دیکھ کر
وہ حیران ہو گئی کہ صابرہ کے پیر میں چپل نہ تھی ..... صابرہ ان عورتوں میں سے تھی جو فرش پر ننگے
پاؤں رکھنا گناہ سمجھتی ہیں .....
"امی آپ کے چپل کہاں ہیں؟" راشدہ نے پوچھا۔
"وہ کمرے میں ہیں، میں ذرا تیرے ابو سے بات کرلوں۔" صابرہ نے بتایا۔
"میں آپ کے چپل لے آؤں" راشدہ نے پوچھا۔
"نہ، نہ تم میرے کمرے میں نہ جانا۔" صابرہ یہ کہتی ہوئی لاؤنج کی طرف چلی گئی۔
راشدہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ صابرہ پر ایسی کیا افتاد پڑی کہ وہ چپل پہنے بغیر کمرے سے نکل آئی اور
اب اسے بھی کمرے میں جانے سے منع کر گئی تھیں۔
راشدہ کو ویسے ہی خاصا ڈر لگتا تھا اور جب سے شادی ہوئی تھی تب سے تو ڈرانے والے واقعات کا ایک
لامتناہی سلسلہ چل نکلا تھا ..... وہ خواہش کے باوجود کمرے میں نہ گئی ..... اس نے نیلم کے کمرے
کا رخ کیا۔
صابرہ لاؤنج میں پہنچی تو بابر کو اطمینان سے صوفے پر لیٹے ٹی وی دیکھتے ہوئے پایا۔
صابرہ نے بڑھ کر ٹی وی بند کر دیا۔ بابر علی کو اس کی اس حرکت پر غصہ آگیا۔ ٹی وی بند کرنے سے
پہلے اسے اخلاقاً اس سے پوچھنا چاہئے تھا۔
"صابرہ یہ کیا بیہودگی .....!" بابر نے غصے سے کہا مگر وہ اپنی بات پوری نہ کر پایا۔
صابرہ جب ٹیلیوژن بند کر کے اس کی طرف پلٹی تو بابر اپنا غصہ بھول گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں
اڑی ہوئی تھیں۔
"صابرہ تمہیں کیا ہوا؟" بابر علی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
صابرہ خاموشی سے اس کے برابر بیٹھ گئی ..... بابر علی کو محسوس ہوا کہ اس کے جسم میں لرزش

"صابرہ تم کانپ رہی ہو؟" بابر نے گھبرا کر کہا۔

"بابر۔ میں اس وقت بہت پریشان ہوں کیا ماموں فرقان چلے گئے۔"

پوچھا۔

"ہاں۔ وہ تو چلے گئے اکبر انہیں چھوڑنے گیا ہے۔" بابر علی نے کہا۔ "لیکن تم پریشان کیوں ہو؟"

تب صابرہ نے کمرے میں اس کے ساتھ جو گزری تھی۔ ایک ایک بات تفصیل سے بتادی۔ اور بولا "یہ سب تم کر رہی ہو۔"

بابر علی نے ساری داستان سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا

تم تو ایسی باتوں کی قائل ہی نہیں۔ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے

ہے۔"

خیر بابر علی اس کی تسلی کے لئے اس کے ساتھ کمرے میں گیا جو کچھ صابرہ نے بتایا تھا اسے سن کر وہ بھی خوفزدہ ہو گیا تھا لیکن بیوی کے سامنے بہادری کا خول چڑھائے وہ دروازہ کھول کر ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے میں کچھ نہ تھا ہر چیز معمول کے مطابق تھی۔

صابرہ نے کمرے میں آکر اپنے چپل پہنے..... کمرے میں ادھر ادھر غور سے دیکھا اس نے پردہ ہٹا کر کھڑکی کو دیکھا..... وہ جوں کی توں بند تھی اور چٹخنی بھی بند تھی..... ایسا لگتا تھا جیسے وہ کھڑکی کبھی کھلی ہی نہ ہو۔

پھر اکبر کے آنے پر اس نے ساری روداد سنائی۔ ساری کہانی سن کر، اس نے بھی وہی بات کہی۔

"ارے امی آپ کو وہم ہوا ہوگا۔"

صابرہ نے گھر کے جس فرد سے بھی اس بات کا ذکر کیا..... اس نے جواب میں یہی کہا

"آپ کو وہم ہوا ہے۔"

جیسے جیسے گھر کے افراد "آپ کو وہم ہوا ہے۔" کہتے جاتے ویسے ویسے صابرہ کو یقین ہوتا جاتا تھا کہ کمرے میں اس نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا تھا، اس میں بڑی صداقت تھی۔ بند کھڑکی کا خود بخود کھلنا اور کھلی کھڑکی کا خود بخود بند ہو جانا۔ پھر اس کفن پوش ہیولے کا سینے پر چڑھ بیٹھنا اور گلا گھونٹنا کورے بستر کی کھڑکھڑاہٹ..... کیا یہ سب وہم تھا۔

اس کا جی چاہا کہ ماموں فرقان کو فون کر کے یہ سب بتائے مگر ماموں فرقان تو اس کے کمرے سے غصہ ہو کر گئے تھے..... ان کے جانے کے بعد ہی تو یہ سب عذاب نازل ہوا تھا۔ وہ باوجود خواہش کے انہیں فون نہ کر سکی۔

اکبر، ماموں فرقان کو گھر چھوڑ کر واپسی میں ایک مووی لے آیا تھا۔ کھانا کھا کر سب لوگ لاؤنج میں جمع ہو گئے تھے..... اکبر اس مووی کو لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔

صابرہ نے کوئی گھنٹہ بھر تو اس فلم کو دیکھا..... اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ اسے تھکن ہونے لگی وہ سونے کے لئے اٹھ گئی۔ اٹھتے ہوئے اس نے چاہا کہ نیلم یا راشدہ اس کے ساتھ آجائے

urdufans.com

وہ دونوں فلم میں اس طرح مگن تھیں کہ صابرہ کو انہیں اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔
جب سے ماموں فرقان نے منع کیا تھا کہ اکبر نیلم کے پاس نہ جائے تب سے وہ نیلم کو اپنے
پاس سلانے لگی تھی راشدہ کا جی چاہتا تو وہ بھی ان دونوں کے درمیان گھس کر لیٹ جاتی
پر صابرہ کا وہ تینوں بآسانی بیڈ پر آجاتی تھیں۔
صابرہ جب اٹھنے لگی تو بابر نے کہا۔ "سونے جارہی ہو؟"
"ہاں، طبیعت بوجھل ہورہی ہے۔" صابرہ نے نقاہت سے کہا۔
"ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو ..... وہ رات والا کیپسول کھا لینا اور نیند کی گولی بھی لے
لینا۔" یہ کہہ کر صابرہ ٹی وی لاؤنج سے نکل آئی۔ صابرہ نے کچن سے ایک گلاس پانی
"اچھا"
لیا اور اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ پھر اس کی دراز سے اپنی دوائیں
نکالیں کیپسول اور نیند کی گولی کھائی ..... دراز بند کر کے اسے نے سوچا لائٹ بند کر دے
اور سو جائے وہ لائٹ بند کرنے کیلئے اٹھی ..... ایک دم اس کے ذہن میں کورے لٹھے کی
کھڑکھڑاہٹ آگئی ..... اس نے لائٹ بند کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔
بیڈ پر لیٹ کر اس نے کمبل اچھی طرح اوڑھا اور اسے جو کچھ یاد تھا پڑھنے لگی۔ پڑھنے کے بعد اس نے
اپنے سینے پر پھونک ماری اور کمبل میں منہ ڈھک لیا ..... وہ بری طرح تھکی ہوئی تھی ..... پھر جلد ہی
نیند کی گولی نے اپنا اثر دکھایا ..... وہ چند منٹوں میں ہی گہری نیند سو گئی۔
وہ کالا بلا پورے اطمینان سے پیر پھیلائے لیٹا ہوا تھا اور اپنی دم کو بار بار قالین پر مار رہا تھا۔
صابرہ جانے کتنی دیر سوئی ہوگی۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ شدت کی پیاس
لگی تھی اس نے اپنے چہرے سے کمبل ہٹایا اور گلاس کے لئے ہاتھ بڑھایا۔
کمبل ہٹاتے ہی اسے کچھ نظر نہ آیا ..... کمرے میں اندھیرا تھا ..... شاید لائٹ چلی گئی تھی .....
پھر اس نے غور کیا تو ٹی وی لاؤنج سے مکالموں کی آواز آرہی تھی ..... فلم چل رہی تھی۔ اس کا مطلب
ہے کہ لائٹ گئی نہیں، شاید بابر کمرے میں آیا ہوگا ..... یہ دیکھنے کہ وہ سوئی کہ نہیں اور کیونکہ صابرہ
کمرے کی لائٹ بجھا کر سونے کی عادی تھی، اس لئے وہ لائٹ بند کر کے چلا گیا ہوگا۔ صابرہ نے دروازہ کھلا
چھوڑا تھا، لیکن اب دروازہ بھی بند تھا ..... جاتے ہوئے وہ دروازہ بھی بند کر کے چلا گیا ہوگا تاکہ فلم کی
آوازوں سے اس کی نیند خراب نہ ہو ..... یہ سوچ کر اسے کچھ اطمینان سا ہوا۔
اس نے اندھیرے میں اندازے سے سائیڈ ٹیبل کی طرف ہاتھ بڑھایا ..... اس کی انگلیاں گلاس
سے ٹکرائیں ..... اس نے فوراً گلاس اٹھا لیا اور تھوڑا سا سر اونچا کر کے غٹ غٹ کر کے پانی پی
لیا۔
ابھی اس نے پانی کے دو گھونٹ ہی لئے ہوں گے کہ اس کی عجیب حالت ہوگئی ..... گلاس میں
پانی نہ تھا، کوئی بھاری چیز تھی ..... اس کا ذائقہ بھی نمکین سا تھا اور اس میں سے عجیب سی بو آرہی
تھی۔
صابرہ تڑپ کر اٹھی ..... گلاس ہاتھ میں لئے لئے وہ سوئچ بورڈ کی طرف آئی ..... اس

Urdufans.com

کمرہ روشن ہوا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ کمرے میں
جلدی سے لائٹ آن کی
پانی نہ تھا۔
گلاس میں خون تھا۔ گلاس کے گلاس خون سے آدھا گلاس بھرا ہوا تھا
وہ گھونسٹ وہ پی گئی
تھی۔
اسے ابکائی شروع ہو گئی
اس احساس کے آتے ہی اس نے پانی کی جگہ خون پیا ہے
اسے ایک ہڈی تنے ہوئی
اس کے منہ سے
گلاس پھینک کر ہاتھ روم کی طرف بھاگی
خون فوارے کی طرح نکلا تھا۔
وہ وہیں چکرا کر گر گئی۔ کالا بلا بدستور بیڈ کے نیچے سکون سے آرام
اس نے اتنا خون دیکھا تھا کیا
سے لیٹا تھا اور زور زور سے اپنی دم کو قالین پر مار رہا تھا۔
فلم ختم ہونے کے بعد جب راشدہ اور نیلم کمرے میں سونے کے لئے آئی تو انہوں نے بیڈ خالی
دیکھا
البتہ باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔
"امی۔" راشدہ نے آواز لگائی اور وہ باتھ روم کی طرف بڑھی۔
جب وہ دروازے پر پہنچی تو اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔
"ہائے امی" ۔ "یہ کہہ کر راشدہ دوڑی ۔ صابرہ باتھ روم کے فرش پر بے سدھ پڑی
تھی۔
"نیلم جلدی سے ابو کو بلاؤ....." راشدہ نے نیلم سے کہا۔
نیلم فوراً تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔
راشدہ نے فرش پر بیٹھ کر صابرہ کے جسم کو ہلایا جلایا۔ صابرہ کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی
اس کی آنکھیں بند تھیں۔
چند لمحوں میں بابر اور اکبر بھی کمرے میں آ گئے۔ دونوں نے مل کر صابرہ کو باتھ روم کے فرش سے
اٹھایا اور بیڈ پر ڈالا..... پھر بابر نے اسے زور زور سے ہلا کر آوازیں دیں..... "صابرہ،
صابرہ۔"
"امی، امی۔" ادھر راشدہ بھی تڑپ تڑپ کر آوازیں دے رہی تھی۔
کچھ دیر بعد اس کے جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں..... آنکھیں
کھول کر دیکھا تو اپنوں کو اپنے گرد پایا..... وہ سب پریشان چہرے لئے اسے تک رہے تھے۔
"کیا ہوا صابرہ۔" بابر نے تشویش سے پوچھا۔
"امی، آپ باتھ روم میں بیہوش پڑی تھیں۔" راشدہ نے بتایا۔
"باتھ روم کا نام سن کر صابرہ کو خون کی قے یاد آئی..... یہ یاد آیا کہ اس نے پانی کی جگہ خون
پی لیا تھا۔
یہ خیال آتے ہی اس کا جی پھر متلانے لگا..... اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔
"نہیں لیٹی رہو۔" بابر علی نے اسے لیٹے رہنے کی تلقین کی۔
"امی آپ کو کیا ہوا تھا، چکر آ گئے تھے کیا؟" اکبر نے پوچھا۔

"میں دوا کھا کر آرام سے سو گئی تھی پھر جانے کتنی دیر بعد میری اچانک آنکھ کھل مجھے سخت پیاس لگی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا حالانکہ میں نے لائٹ کھلی چھوڑ دی تھی پھر میں نے اندھیرے میں گلاس ٹٹولا اور اسے اٹھا کر پانی پی لیا۔ پانی کے ابھی میں نے دو گھونٹ ہی پیئے تھے کہ مجھے عجیب سا واہمہ محسوس ہوا..... میں نے جلدی سے اٹھ کر لائٹ جلائی ..... گلاس میں پانی نہ تھا۔ خون تھا۔ میرا جی متلایا..... میں باتھ روم میں بھاگی وہاں میرے منہ سے خون اس طرح نکلا جیسے کسی فوارے سے نکلتا ہے۔ خون دیکھ کر پھر مجھے ہوش نہ رہا۔" صابرہ پر جو گزری تھی وہ اس نے آہستہ آہستہ کہہ سنائی۔

بابر نے فوراً گلاس کی طرف دیکھا جو سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ اس میں خون نام کی کوئی چیز نہ تھی صاف شفاف پانی تھا۔

پھر وہ بغیر کچھ کہے باتھ روم میں گیا..... اس نے واش بیسن اور اس کے آس پاس بغور دیکھا فرش کا معائنہ بھی کیا..... وہاں بھی اسے ایک قطرہ خون کا نظر نہ آیا۔

تب وہ اطمینان سے واپس آیا اور بولا۔ "صابرہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ..... نہ تو گلاس میں خون ہے اور نہ ہی باتھ روم میں خون کا کوئی قطرہ موجود ہے۔"

"صابرہ نے فوراً پلٹ کر گلاس کی طرف دیکھا..... واقعی اس میں خون نہ تھا..... اس میں آدھا گلاس پانی موجود تھا..... پھر اٹھ کر باتھ روم گئی..... وہاں بھی کچھ نہ تھا..... اس نے اپنے کپڑوں کو بھی بغور دیکھا مگر کہیں خون کا ایک چھینٹا بھی نظر نہ آیا..... وہ ذہنی اذیت کا شکار ہو گئی..... بیڈ پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" صابرہ نے گویا خود کلامی کی۔ "وہ سب میری آنکھوں نے دیکھا تھا۔"

"صابرہ تم نے ضرور کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔" بابر نے رائے ظاہر کی۔

"نہیں، وہ خواب نہیں تھا۔" صابرہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"پھر تم وہم کا شکار ہوئی ہو۔" بابر علی نے کہا۔ "یہ تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔"

وہ اس بات کا کیا جواب دیتی..... اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا..... بس سوال ہی سوال تھے۔

بابر اور اکبر کے جانے کے بعد راشدہ اور نیلم اپنے اپنے کمبلوں میں سکڑ سمٹ کر لیٹ گئیں..... صابرہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی..... وہ آنکھیں کھولے چھت کو گھور رہی تھی..... کمرے کی لائٹ روشن تھی..... سامنے دیوار گیر گھڑی میں دو بج رہے تھے..... نیلم اور راشدہ کمبلوں میں منہ چھپائے سو رہی تھیں۔

پانی کی جگہ خون پینے کا احساس اس کے ذہن سے مٹائے نہیں مٹ رہا تھا..... اس کے اعصاب پر شدید اضطرابی کیفیت طاری تھی..... وہ بار بار کروٹیں لے رہی تھی اور اپنے دل کو مختلف تاویلیں دے کر سمجھا رہی تھی۔ لیکن اس کا دل اس خون کو وہم کا کرشمہ ماننے کو تیار نہ تھا..... خون کا وہ ذائقہ

UrduFans.com

تک اس کی زبان پر تھا۔
سوچتے سوچتے اس نے کسی نے کمرے کی لائٹ بجھا دی ہو۔ کمرے میں گہری تاریکی پھیل گئی
اسے محسوس ہوا جیسے کسی گہری قبر میں ہے تنہا ہے
اسے یوں لگا جیسے وہ اس گھر میں تنہا ہے لیکن وہاں کسی کو نہیں پاتی
اپنے ہاتھوں سے دائیں بائیں ٹٹول کر دیکھتی ہے لیکن وہاں کسی کو نہیں پاتی
ہے اور نہ راشدہ۔
اچانک اس کے چہرے کے قریب کوئی زور سے سانس لیتا ہے اور بڑے پُراسرار انداز میں کہتا ہے۔
"تم مرجاؤ گی۔"
صابرہ پر سکتے کا سا طاری ہو جاتا ہے اس کا جسم اکڑ جاتا ہے وہ اپنے ہاتھ پاؤں ہلانا چاہتی ہے لیکن نہیں ہلا پاتی وہ چیخنا چاہتی ہے لیکن اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ جاتی ہے۔
وہ پُراسرار آواز مسلسل اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔
کوئی ٹھہرے گہرے سانس لے کر کہہ رہا تھا۔
"تم مرجاؤ گی۔"
"تم مرجاؤ گی۔"
"تم مرجاؤ گی۔"
"تم مرجاؤ گی۔" کی گردان ابھی جاری تھی اور صابرہ اپنے جکڑے ہوئے جسم کو حرکت دینے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ پھر وہ بڑے زور سے چیخی۔
اس کی گھٹی گھٹی چیخیں سن کر راشدہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے صابرہ کو جھنجھوڑ ڈالا۔
"امی۔ امی۔"
"ہاں کیا ہے؟" صابرہ نے ایکدم آنکھیں کھول دیں۔
"امی آپ چیخ رہی تھیں۔ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھیں۔"
"راشدہ، مجھے ذرا پانی دے۔" صابرہ نے اپنے گلے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ خشک ہو رہا تھا۔
راشدہ نے اٹھ کر، صابرہ کو پانی دیا۔ صابرہ نے پانی کا پورا گلاس ایک ہی سانس میں پی لیا۔ وہ پسینے پسینے ہو رہی تھی۔ قبر کی تاریکی اور اس کی آواز یاد کر کے اس کے رونگٹے کھڑے ہوئے جا رہے تھے۔
صابرہ پھٹی پھٹی نظروں سے راشدہ کو دیکھ رہی تھی۔ شور کی آواز سن کر نیلم کی بھی آنکھ کھل گئی تھی لیکن وہ خاموش لیٹی تھی۔
"امی، آپ مجھے اس طرح نہ دیکھیں، مجھے ڈر لگنے لگے گا۔" راشدہ نے خوفزدہ ہو کر کہا۔
صابرہ نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی رہی۔ اسے وہ آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ آواز اسے اپنے دماغ کے کسی گوشے میں سنائی دے رہی تھی۔
وہی پُراسرار آواز "تم مرجاؤ گی۔"
"راشدہ کیا تجھے کوئی آواز سنائی دے رہی ہے۔"

Urdufans.com

راشدہ نے خود سے کوئی آواز سننے کی کوشش کی لیکن اسے کوئی آواز سنائی نہ دی۔
"نہیں، امی مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ نیلم کیا تمہیں کوئی آواز سنائی دے رہی ہے۔"
راشدہ نے پوچھا۔
"نہیں تو۔" نیلم نے سادگی سے کہا۔
"امی کیا ابو کو بلاؤں۔" راشدہ نے پوچھا۔
"ہاں۔" صابرہ نے مختصر سا جواب دیا۔ اس کے کان کسی نہ سنائی دینے والی آواز پر لگے ہوئے تھے۔
صابرہ کو وہ آواز برابر سنائی دے رہی تھی ہلکی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے کوئی تنبیہ کر رہا تھا۔
"تم مر جاؤ گی۔"
بابر، راشدہ کے بلاوے پر آنکھیں ملتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ "ہاں، صابرہ خیریت تو ہے۔"
بابر جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، وہ صدا آنی بند ہو گئی۔ اب اس کے دماغ میں دور تک سناٹے کا راج تھا۔
صابرہ نے بابر کو خواب میں جو دیکھا تھا اور سنا تھا اس کی تفصیل بتائی۔
"اس کا مطلب ہے کہ تم نے ایک بھیانک خواب دیکھا۔" صابرہ کی ساری بات سن کر بابر بولا۔
"نہیں، بابر وہ خواب نہیں تھا، وہ آواز تو مجھے جاگنے کے بعد بھی سنائی دیتی رہی تھی۔ وہ آواز تمہارے کمرے میں داخل ہوتے ہی بند ہوئی ہے۔ میں اس کو خواب میں کیسے سمجھ لوں، وہم کیسے مان لوں۔"
"صابرہ کیا تمہیں ڈر محسوس ہو رہا ہے؟" بابر نے پوچھا۔
"نہیں، میں خوفزدہ نہیں ہوں۔"
"پھر آرام سے سو جاؤ، صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔" یہ کہہ کر بابر کمرے سے نکل گیا۔
بابر کا یوں کمرے سے چلے جانا، صابرہ کو اچھا نہ لگا۔ وہ اگرچہ خوفزدہ نہ تھی لیکن وہ چاہ رہی تھی کہ بابر کچھ دیر اس کے پاس بیٹھتا۔ اس سے اس کی حالت کے بارے میں سوالات کرتا۔ خیر کوئی بات نہیں اس نے سوچا۔ وہ جانتی تھی کہ بابر کو سوتے سے اٹھا دیا جائے تو اس کا موڈ خراب ہو جاتا ہے اس کے سر میں درد ہو جاتا ہے۔
بابر کے جانے کے بعد راشدہ اور نیلم نے بھی اپنے اپنے کمبل سنبھال لئے اور اوڑھ کر لیٹ گئیں۔
صابرہ ان دونوں کے درمیان بیڈ کی بیک سے ٹیکنے لگا کر بیٹھ گئی۔ اس وقت خاصی سردی ہو رہی تھی صابرہ نے گھڑی پر نظر کی۔ چار بج رہے تھے۔
گھڑی سے نظر ہٹائی تو کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ ایک دم بہت گہرا اندھیرا ہو گیا۔
پھر کسی نے صابرہ کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتا ہوا لے چلا۔ صابرہ اس کے ساتھ کھنچی چلی جا رہی تھی۔ آس پاس کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ جانے کتنا فاصلہ طے کرنے کے بعد صابرہ

pdfans.com

زمین پر دھکا دے دیا گیا۔ پھر اسے جبڑے سے پکڑ لیا گیا۔ اب وہ کروٹ کے بل لیٹی تھی اور اسے اپنی پشت پر ایک بھاری بھرکم وجود بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی سانس بھی بند ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

"صابرہ۔" "پھر کوئی مخاطب ہوا۔ "تمہیں ہم پر یقین نہیں ہے نا۔ لیکن اب تمہیں ہمارے ہونے کا یقین آجائے گا۔ آج کے بعد سے تم ہماری بے عزتی نہیں کر سکو گی۔"

اس کی آواز بند ہوئی تو آگ کی تپش اسے اپنے بالکل قریب محسوس ہوئی۔ اسے "چرچر" سی آواز سنائی دی۔ اسے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے بال جلائے جا رہے ہوں۔

پھر ایک دم روشنی ہوئی۔ وہ اپنے کمرے میں موجود تھی۔ اب نہ تاریکی تھی نہ آگ کی تپش تھی نہ کوئی اسے جبڑے سے پکڑے ہوئے تھا۔

یہ خواب نہ تھا وہ ابھی سوئی نہ تھی۔ بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا اور اس کے ساتھ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اس کے بعد کوئی اسے گھسیٹتا ہوا لے گیا تھا۔ آگ کی تپش بالوں کا جلنا، وہ تعفن۔ اس کے بعد تاریکی چھٹی تو وہ ویسے ہی بستر پر بیٹھی تھی۔

یہ سب کیا تھا۔ اس نے سوچتے ہوئے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ تھرا اٹھی۔ "نہیں۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر سنگھار میز کے سامنے آئی۔ وہاں وہ بھیانک حقیقت پوری طرح اس پر آشکار ہوئی۔ پیچھے سے اس کے سارے بال جل چکے تھے۔ صابرہ کے بال بہت اچھے تھے۔ گھنے بھی تھے اور لمبے بھی۔ اسے اپنے بال بہت عزیز تھے وہ ان کی بڑی حفاظت کرتی تھی۔ اب انہی بالوں کا ایسا حشر ہوا کہ وہ تھرا اٹھی تھی۔

دماغ کے کسی گوشے میں اب بھی وہ آواز گونج رہی تھی۔ "صابرہ، تمہیں ہمارے ہونے کا یقین نہیں ہے نا، لیکن اب تمہیں ہمارے ہونے کا یقین آجائے گا۔ آج کے بعد سے تم ہماری بے عزتی نہیں کر سکو گی۔"

وہ خوفناک کالا بلا بیڈ کے نیچے اطمینان سے بیٹھا اپنی بھاری دُم کو بار بار قالین پر مار رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اس نے کھڑے ہو کر ایک بھرپور انگڑائی لی اور بیڈ کے نیچے سے نکل آیا۔

صابرہ آئینے کے سامنے کھڑی، بار بار اپنی گردن موڑ موڑ کر جھلسے ہوئے بالوں کا ماتم کر رہی تھی۔ اس کے خوبصورت بالوں کا نہ صرف ستیاناس ہو گیا تھا، بلکہ بال اس طرح جھلسائے گئے تھے کہ اس کے سر کی پشت پر کھال تک دکھائی دینے لگی تھی۔

وہ اپنے جلے ہوئے بالوں کو دیکھتی جاتی تھی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے جاتے تھے۔

ایک مرتبہ جو اس نے اپنی آنسو بھری آنکھوں کو صاف کر کے آئینہ دیکھا تو اپنی پشت پر ایک انتہائی بھیانک چہرے کو پایا۔ وہ چہرہ اس سے دو فٹ بلند تھا۔

وہ عجیب چہرہ تھا، آدھا شیر کا تھا اور آدھا انسان کا۔ اس کے پورے جسم پر بڑے بڑے بال تھے اس نے اپنے دونوں ہاتھ، صابرہ کی گردن کی طرف بڑھائے اور اپنا بھیانک منہ کھولا۔

صابرہ بڑے دل گردے کی مالک تھی۔ پورے خاندان میں نڈر مشہور تھی۔ عورتیں اس کی جرأت اور بہادری کی مثالیں دیتی تھیں۔ آج وہی صابرہ خوف کی علامت بنی ہوئی تھی۔ اس کے اعصاب جواب دے

Urdufans.com

چیخ۔ اسے اس طرح گھبرا اور ستایا گیا تھا کہ وہ تو بہ مانگ رہی تھی۔

اس بھیانک چہرے کو وہ مزید برداشت نہ کر سکی۔ اس سے پہلے کہ وہ آدھا شیر آدھا انسان اسے کچلتا وہ بار پھر بیہوش ہو گئی۔

چیخ کے سناٹے میں اس کی چیخ پورے گھر میں گونج گئی۔

ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ بابر اور اکبر بھی اپنے کمروں سے آ گئے۔

راشدہ اور نیلم گھبرا کر بیہوش اور اس کے بالوں کو جھلسا ہوا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

سارے لوگ صابرہ کو بیہوش ہوتے ہی کالا بلا اپنی اصلی حالت میں آ گیا اور بڑے شاہانہ انداز سے چہلتا ہوا بیڈ کے

صابرہ کے بیہوش ہوتے ہی کالا بلا اپنی اصلی حالت میں آ گیا اور بڑے شاہانہ انداز سے چہلتا ہوا بیڈ کے نیچے داخل ہو گیا۔ پھر اس نے چاروں پیر پھیلا لئے اور بڑی آسودگی سے اپنے اگلے دونوں پاؤں چاٹنے

لگا۔ جیسے پیروں میں شدید لگا ہو۔

صابرہ کوئی آدھے گھنٹے کی کوششوں سے ہوش میں آئی لیکن اس کے ہوش میں آنا نہ آنا برابر ہی تھا۔

وہ ہوش میں آ کر خاموشی سے خلا میں گھورتی رہی۔

صبح ہوتے ہوتے اس کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ اس پر نڈھالی سی کیفیت طاری تھی۔

وقفے وقفے سے اس کے ہونٹوں سے بس ایک ہی بات نکل رہی تھی۔

"ہاں، میں تمہیں مانتی ہوں، تم ہو، تمہارے ہونے کا اقرار کرتی ہوں بس اب مجھے معاف کر دو۔"

گھر والوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، کس کے ہونے کا اقرار کر رہی ہے۔ کس سے معافی مانگ رہی ہے۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کے بال کس طرح جھلس گئے تھے۔ پھر اس نے ایسی دہشت ناک چیخ کیا دیکھ کر ماری تھی۔

ہوش میں آنے کے بعد اس نے کچھ نہ بتایا تھا۔ بس وہ خلا میں گھورتی یا پھر کسی کے ہونے کا اقرار کرتی رہی تھی۔

اس کی نڈھالی کیفیت کو دیکھ کر بابر اور اکبر کو اسے اسپتال لے جانا پڑا۔

جب ڈاکٹر معائنے کے لئے آیا تو صابرہ بیڈ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی اور ہنس کر بولی۔ "تم ڈاکٹر ہو۔"

"جی ہاں، میں ڈاکٹر ہوں۔" ڈاکٹر نے بڑے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

"ارے تم کیا خاک ڈاکٹر ہو، تمہیں جنوں کے بارے میں تو کچھ پتہ نہیں ہے۔" صابرہ نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"جنوں کے بارے۔" ڈاکٹر نے سوچتے ہوئے کہا۔ "پہلے آپ بتائیں آپ کیا جانتی ہیں۔"

"میں بہت کچھ جانتی ہوں۔ میں ان کے ہونے کا اقرار کرتی ہوں، میں ان کو مانتی ہوں۔ اے ڈاکٹر کیا تم جنوں کو مانتے ہو، دیکھو جھوٹ مت بولنا۔"

"نہیں، میں جھوٹ کیوں بولوں گا، آپ کی طرح میں بھی جنوں پر یقین رکھتا ہوں۔"

"تم بہت اچھے ہو، ڈاکٹر۔" صابرہ نے خوش ہو کر کہا۔

"اب آپ اجازت دیں تو آپ کا معائنہ کر لیں۔"

Urdufans.com

"ہاں کیوں نہیں۔ تو میں لیٹ جاتی ہوں۔ تم بھی طرح میرا معائنہ کرو۔" یہ کہہ کر صابرہ لیٹ گئی۔

ڈاکٹر نے آلہ بھی کانوں سے لگایا ہی تھا کہ صابرہ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ڈاکٹر نے آلہ بھی کانوں سے لگایا ہی تھا کہ صابرہ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اے ڈاکٹر، کیا تم نے کبھی جن دیکھے ہیں۔"

"نہیں۔ میں نے جن نہیں دیکھے۔ بس ان کے بارے میں پڑھا اور سنا ہے۔" ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔

"پھر جنہیں ان کے بارے میں کیسے یقین آئے گا۔" صابرہ نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

"کسی چیز کو جاننے کیلئے اس کا دیکھنا ضروری نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے دلیل دی۔

"لیکن ڈاکٹر بغیر دیکھے یقین بھی تو نہیں آتا۔" صابرہ نے دلیل کو رد کیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ نے جن دیکھے ہیں۔" ڈاکٹر نے ہنس کر پوچھا۔

"ہاں، میں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ میں بہت کچھ جانتی ہوں میں ان کے ہونے کا اقرار کرتی ہوں۔ میں انہیں مانتی ہوں۔" صابرہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا اور خاموشی سے بیڈ پر لیٹ گئی۔

ڈاکٹر نے اس کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ صابرہ سے اس کی حالت کے بارے میں بہت سے سوالات کئے لیکن اس نے سارے سوالات کا ایک ہی جواب دیا۔

"ہاں، میں ان کے ہونے کا اقرار کرتی ہوں، میں انہیں مانتی ہوں۔"

ڈاکٹر کیلئے یہ کیس منفرد نوعیت کا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے صابرہ کو مسکن دوائیں دے کر سلا دیا، اور اس کیس کو شہر کے ایک بڑے ماہر نفسیات کے حوالے کر دیا۔

لیکن وہ ہر سوال کا ایک ہی جواب دیتی رہی۔

"ڈاکٹر کبھی تم نے جن دیکھے ہیں۔ نہیں دیکھے میں نے دیکھے ہیں۔"

"کیسے ہوتے ہیں جن ذرا بتائیں تو۔" وہ پوچھتا۔

"جن دیکھنا ہے تو میرے جلے ہوئے، جھلسے ہوئے بالوں کو دیکھ لو اور عبرت پکڑو۔ اگر تم نے ان کے ہونے کا اقرار نہ کیا تو یاد رکھو بہت نقصان اٹھاؤ گے۔" صابرہ بہت افسردہ ہو کر کہتی۔ بس وہ اسی طرح کی بہکی بہکی باتیں کرتی رہی۔ ڈاکٹر کے ہر سوال کے جواب میں وہ جن کا تذکرہ کرتی رہی بس ایک ہی بات دہراتی رہی۔

بالآخر ڈاکٹر تھک ہار گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ بابر نے اپنی بیوی کے بارے میں جو باتیں بتائی تھیں۔ وہ ڈاکٹر کے حلق سے نہیں اتر رہی تھیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ بیٹھے بٹھائے خود بخود اس کے بال جھلس گئے۔

آج کے زمانے میں بھلا جن کہاں۔ اور یہ جن ہوتی کیا بلا ہے۔ وہ ان عورتوں کو خوب جانتا تھا۔ وہ ایسے ایسے جن خود تخلیق کر لیا کرتی ہیں کہ لوگوں کے ہوش اڑ جائیں۔ اب تک جو واقعات اس کے علم میں آئے تھے اس سے اس نے ساس بہو کے درمیان چپقلش کا اندازہ کیا تھا۔ یہ ایک اذیت پسندی کیس تھا۔ یہ بال صابرہ نے خود ہی جلا لئے تھے اور اب "جن جن" کہہ کر سب کو ڈرا رہی تھی۔

Urdufans.com

بہرحال کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے مریضہ کی تحلیل نفسی بہت ضروری تھی اور تحلیل نفسی کے لئے وہ بالکل تیار تھی۔ اس کے پاس تو سوالوں کا ایک ہی جواب تھا۔

"ہاں، میں نے جن دیکھے ہیں، میں ان پر یقین رکھتی ہوں۔"

فی الحال ڈاکٹر نے اسے کچھ دوائیں لکھ دیں۔ یہ سب دوائیں ذہنی سکون کے لئے تھیں دو دن بعد آنے کا کہہ کر اور چند ہدایات دے کر ڈاکٹر چلا گیا۔

دوائیں کھا کر صابرہ دوپہر تک پرسکون انداز میں سوتی رہی پھر اس کی آنکھ کھلی تو سامنے ماموں کو پایا۔ دائیں جانب کروٹ کھائی تو ماموں فرقان کو دیکھا بائیں جانب اکبر تھا۔

ماموں فرقان کو دیکھ کر صابرہ نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ماموں فرقان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ صابرہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے پھر وہ سسک سسک کر رو پڑی۔

صابرہ کو روتے دیکھ کر ماموں فرقان کا دل کٹ گیا۔ لیکن وہ پتھر بنے خاموش بیٹھے رہے۔ وہ چاہ رہے تھے کہ وہ رو لے تاکہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ یہ ندامت کے آنسو تھے جو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ یہ پشیمانی تھی جو آنکھوں کے رستے نکل رہی تھی۔

ماموں فرقان نے اس کے جھلسے ہوئے بالوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس کا یہ حشر ہونے پر انہیں دل ہی دل میں افسوس تھا۔ جب وہ کافی رو لی تو ماموں فرقان نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے سر ہاتھ رکھا اور بولے۔ "صابرہ فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ماموں آپ مجھے معاف کر دیں۔" صابرہ نے سسکتے ہوئے کہا۔

"تم مجھ سے کس بات کی معافی مانگ رہی ہو، تم نے مجھے تو کچھ نہیں کہا۔" ماموں فرقان مسکرا کر بولے۔

"ماموں میں غلطی پر تھی۔ میں اگر آپ کا کہا مان لیتی تو آج میرا یہ حشر نہ ہوتا۔" صابرہ نے کہا۔

"اب تمہیں یقین آگیا۔" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"ہاں، ماموں۔" صابرہ نے بڑا اور ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔ "میں نے بہت کچھ دیکھ لیا ہے، بہت کچھ بھگت لیا ہے۔ اب میں کسی بات کا انکار نہیں کر سکتی۔" اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"تم نے ایک ہی دن میں توبہ مانگ لی، پریشان ہو گئیں، ذرا اس معصوم بچی کا خیال کرو جو چھ ماہ سے اس طرح کے حالات سے دوچار ہے اور تم اسے محض "ڈرامہ" سمجھتی رہی ہو۔" ماموں فرقان نے

کہا۔

"ہاں، ماموں میں غلطی پر تھی۔ اسی بات کی میں آپ سے معافی مانگ رہی ہوں۔"

"کیا تم نے نیلم کو معاف کر دیا۔" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"ہاں، میں نے صدق دل سے اسے معاف کر دیا مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ فیاض کی بیٹی ہے کسی ملازمہ کی مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ وہ اب اس گھر کی بہو ہے۔ ہماری عزت ہے۔"

"واہ رے، انقلاب زمانہ۔" بابر علی نے ہنس کر کہا۔

Urdufans.com

"شکر ہے ای۔" اکبر کے دل سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ صابرہ نے اکبر کو قریب کرتے اس کا سر اپنے سر سے لگا لیا۔ "میرا بچہ۔"

"میرا مظلوم بیٹا کہو۔" بابر علی نے پھر جتلایا۔

"ہاں۔ یہ بات تو سچ ہے، واقعی اکبر بڑا مظلوم ہے۔ بیچارہ۔ شادی کر کے بھی کچھ ہاتھ نہ آیا۔" شادی کر کے بھی کچھ ہاتھ نہ آیا۔ بالآخر فرح اس کے قریب آ کر بولا۔ "ہاں۔ یہ بات تو سچ ہے، واقعی اکبر بڑا مظلوم ہے۔ بیچارہ۔ شادی کر کے بھی کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر صابرہ کا بیٹا ہے نا۔ بالآخر فرح اس کے قریب آ کر بولا۔

اچھی بات ہے کہ میرے کام لے رہا ہے۔" آخر صابرہ کا بیٹا ہے نا۔ بالآخر فرح اس کے قریب آ کر بولا۔ "ہاں۔ یہ بات تو سچ ہے، واقعی اکبر بڑا مظلوم ہے۔ بیچارہ۔ شادی کر کے بھی کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر صابرہ کا بیٹا ہے نا۔ بالآخر فرح اس کے قریب آ کر بولا۔ "ہاں۔ یہ بات تو سچ ہے، واقعی اکبر بڑا مظلوم ہے۔ بیچارہ۔ شادی کر کے بھی کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر صابرہ کا بیٹا ہے نا۔ بالآخر فرح اس کے قریب آ کر بولا۔

اچھی بات ہے کہ میرے کام لے رہا ہے۔" اچھی بات ہے کہ میرے کام لے رہا ہے۔" اکبر کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

گی۔ "ماموں فرقان نے اکبر کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ماموں، میں آپ کا بیٹا فرمانبردار ہوں۔ "اکبر

"بس ماموں آپ بیسا کہتے جا رہے ہیں، کرتا جا رہا ہوں، میں آپ کا بیٹا فرمانبردار ہوں۔ "اکبر بولا۔

"میں جانتا ہوں، اکبر صاحب۔" ماموں فرقان نے ہنس کر کہا۔

"نیلم اور راشدہ کہاں ہیں۔" صابرہ نے پوچھا۔

"گھر پر۔" اکبر نے کہا۔

"ہائے انہیں گھر پر اکیلا چھوڑ دیا۔" صابرہ نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"نہیں، وہ اکیلی نہیں ہیں، ان کے ساتھ شمسہ ہے، تمہاری ممانی ہیں۔" ماموں فرقان نے بتایا۔

"ممانی آئی ہیں، وہ تو گھر سے کبھی کبھی نکلتی ہیں۔ آپ انہیں یہاں کیوں نہیں لائے۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں کیا صورت حال ہے، وہ تو آنے کو کہہ رہی تھیں لیکن میں نے خود ہی انہیں گھر پر چھوڑ دیا اور اکبر کو ساتھ لے کر یہاں آ گیا۔" ماموں فرقان نے وضاحت کی۔

"امی، آپ اسپتال میں کب تک رہیں گی۔ گھر چلیں نا۔" اکبر نے کہا۔

"چلو۔" صابرہ نے ہنس کر کہا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ایسے ہی چلو، پہلے ڈاکٹر سے پوچھ لیں۔ شام تک یہاں رہو۔ شام کو ڈاکٹر سے بات کریں گے۔" بابر نے کہا۔

شام کو ڈاکٹر نے دیکھا تو صابرہ کو بہت اچھا پایا۔ جب وہ اسپتال لائی گئی تھی تو اس پر ایک ہذیانی کیفیت طاری تھا۔ اب وہ پورے ہوش میں آ چکی تھی۔ پرسکون ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے چند دوائیں اور چند ہدایات دے کر اسپتال سے جانے کی اجازت دے دی۔

صابرہ گھر پہنچی تو سب سے پہلے اس نے نیلم کو گلے لگا لیا۔ "میری بچی، میری بیٹی۔" کہہ کر اس کی پیشانی اور رخساروں کو چوما۔

صابرہ کا بدلا ہوا روپ دیکھ کر نیلم بھی اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکی۔ وہ تو پہلے ہی سے بھری ہوئی تھی سسک سسک کر رو پڑی۔ جیسے وقت رخصت ہو۔

ماموں فرقان، ممانی ریحانہ اور شمسہ کو یہ منظر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔

"اے بھئی، یہ رونا دھونا ہی چلتا رہے گا یا چائے وائے بھی چلے گی۔" ماموں فرقان نے ہنس کہا۔

"ماموں، چائے آپ کو ابھی ملتی ہے۔" راشدہ نے کہا۔

Urdufans.com

"ہاں، بھئی جلدی بلاؤ جائے تاکہ ہم لوگ چلیں۔" ماموں فرقان نے کہا۔
"ماموں آپ جائیں گے کہیں، اتنے دنوں کے بعد تو ممانی آئی ہیں، میں کھانا کھائے بغیر نہ جانے دوں گی۔" صابرہ نے کہا۔
"بیٹی۔ کھانے والے کے چکر میں، بہت دیر ہو جائے گی۔ پھر سواری ملنی مشکل ہو جاتی ہے۔" ماموں فرقان نے کہا۔
"آپ رکئے۔ جیسی کی فکر نہ کریں، اکبر آپ کو چھوڑ کر آئے گا۔" صابرہ نے ہنس کر کہا۔
"اچھا جیسی والا بھی یہیں موجود ہے۔" اس مرتبہ شمسہ چہک کر بولی۔
اس بات پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ فیلم اور اکبر کی شادی کے بعد یہ پہلا قہقہہ تھا جو اس گھر میں گونجا تھا۔
اس گھر میں خوشیاں روٹھ گئی تھیں۔ ہر طرف خوف، غصے اور اداسی کا راج تھا۔ نظریں اگ رہی تھیں، خوف پھل پھول رہا تھا، گھر کے مکین ایک دوسرے کے چہروں سے بیزار ہو گئے تھے۔
اس گھر میں آج خوشی کا پہلا قہقہہ گونجا تو سب ہی نے اس بات کو محسوس کیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔
کھانے سے فارغ ہو کر جب اکبر، ماموں فرقان اور ان کے گھر والوں کو عزیز آباد چھوڑنے جا رہا تھا تو اس نے راستے میں ماموں فرقان سے پوچھا۔ "ماموں آپ قبرستان کب جائیں گے۔"
"بیٹے، مرنے کے بعد جاؤں گا۔" ماموں فرقان نہایت سنجیدگی اور معصومیت سے بولے۔
"اللہ نہ کرے ابو، آپ کیسی بات کرتے ہیں۔" شمسہ جو پیچھے بیٹھی تھی، تڑپ کر بولی۔
"ماموں میرا مطلب تھا کہ آپ اس عمل کے لئے کب قبرستان جائیں گے۔" اکبر نے شرمندہ ہو کر کہا۔
"ہاں تو یوں بولو۔" ماموں فرقان ہنس کر بولے۔ "اس عمل کے لئے چودھویں رات کا ہونا بہت ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج چاند کی دس گیارہ تاریخ ہے۔ کیوں ریحانہ؟" انہوں نے اپنی بیوی سے تصدیق چاہی۔
"جی آج دس تاریخ ہے۔" ممانی ریحانہ نے جواب دیا۔ "دیکھا اکبر، عورتیں تاریخ کے معاملے میں کتنی تیز ہوتی ہیں۔ انہیں دن یاد نہیں رہتے، لیکن یہ تاریخ کو کبھی نہیں بھولتیں۔" ماموں فرقان نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔
"کون کہتا ہے، ہمیں دن یاد نہیں رہتے۔ آپ کے ساتھ گزارے ہوئے مجھے اچھے برے دن اچھی طرح یاد ہیں۔" ممانی ریحانہ نے بات سے بات پیدا کی۔
"واہ ممانی واہ، آپ نے کیا لاجواب بات کی، دل خوش کر دیا۔" اکبر نے خوش ہو کر کہا۔
"بھائی جمیے، یہ یاد رکھو کہ قبرستان جا کر عمل میں نے کرنا ہے، تمہاری ممانی نے نہیں۔" ماموں فرقان نے تنبیہہ کی۔
"اور اس کے لئے تمہیں اپنے ماموں کے پاؤں دبانے ہوں گے، گھر چل کر۔" ممانی ریحانہ ہنس کر کہا۔
"پاؤں دبا دے گا تو کیا ہو جائے گا، جنت کمائے گا، میں آخر اس کا دادا ہوں۔" ماموں فرقان

Urdufans.com

بولے۔

بس اسی طرح ہنسی مذاق کی باتیں کرتے عزیز آباد آگیا۔ اکبر کچھ دیر ماموں فرقان کے گھر بیٹھے پھر ماموں ہمیں اکبر کو لاہور فون کیا۔ فیاض اور واجدہ کو اس نے ساری روداد سنائی۔ واجدہ کو صابرہ سے رات کو اکبر نے لاہور فون کیا۔ فیاض اور واجدہ کو اس نے ساری روداد سنائی۔ واجدہ کو صابرہ سے ہال چلنے کا بھی افسوس ہوا وہاں اس بات کی خوشی ہوئی کہ اس نے نیلم کو معاف کر دیا تھا۔ اکبر نے اصرار کر کے صابرہ اور واجدہ کی بات کرادی۔ دونوں بہنوں نے فون پر بات کی۔ روتی زیادہ رہیں۔ نیلم نے بھی بات کی۔ پھر اکبر نے فون پر بات کی۔ روتی زیادہ رہیں۔

صابرہ کو اپنے ہال چلنے کا بے حد صدمہ تھا۔ وہ ہال چلے بھی عجیب طرح سے تھے۔ اس کی بیماری چھپا لی گئی تھی۔ اور سر کے پیچھے ایک چھوٹا چاند بن گیا۔ کمال دکھائی دینے لگی تھی۔ ہل گئی تھی اور سر کے پیچھے ایک چھوٹا چاند بن گیا۔ کمال دکھائی دینے لگی تھی۔

صابرہ نے اس سلسلے میں کئی ماہر ڈاکٹروں کو دکھایا تھا۔ سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ آئندہ وہ اس بچہ نہیں نکلیں گے۔ یہ سن کر وہ اور پریشان ہو جاتی تھی۔

جس کام کا فرقان ماموں نے بیڑا اٹھایا تھا وہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ چاندنی رات میں آدھی رات کو قبرستان جا کر عمل کرنا بڑی جان جوکھوں کا کام تھا۔ ممانی ریحانہ ڈری ڈری تھیں۔ انہوں نے دبی زبان سے اس عمل کی مخالفت کی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ ماموں فرقان دھن کے پکے ہیں، انہیں دنیا کی کوئی طاقت قبرستان میں عمل کرنے سے نہیں روک سکے گی۔ اس لئے ممانی ریحانہ نے پُرزور مخالف نہیں کی۔ وہ اتنا ضرور چاہتی تھیں کہ ماموں فرقان اکیلے قبرستان نہ جائیں۔ اکبر یا بابر ساتھ جائے۔

"نہیں، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ بابر کو اپنے ساتھ قبرستان لے جائیں۔" ممانی ریحانہ نے کہا۔

"وہ کیوں۔" ماموں فرقان نے حیرت سے پوچھا۔

"ایک سے دو بھلے۔" ممانی ریحانہ نے سادگی سے کہا۔

"مجھے قبرستان سے ڈر تھوڑے ہی لگتا ہے۔" ماموں فرقان بولے۔

"میں جانتی ہوں کہ آپ ایک نڈر آدمی ہیں، پھر بھی کیا حرج ہے اگر آپ کے ساتھ کوئی چلا جائے۔"

"میں پھر یکسوئی سے اپنا کام نہ کر پاؤں گا۔ میرا دھیان بٹ جائے گا۔"

"کیا ضروری ہے کہ جانے والا آپ کے پاس بیٹھے، وہ کچھ فاصلے سے بھی بیٹھ سکتا ہے۔" ممانی ریحانہ نے رائے دی۔

"پھر اس کی حفاظت کا ذمہ دار کون ہوگا۔" ماموں فرقان نے سنجیدگی سے کہا۔

"اور آپ کی حفاظت کا کون ذمہ دار ہوگا۔" ممانی ریحانہ خاموش نہ رہ سکیں۔

"مجھے کچھ نہیں ہوگا میں اپنی حفاظت آپ کر لوں گا، میں وہاں حصار کھینچ کر بیٹھوں گا۔" ماموں فرقان نے انہیں سمجھایا۔

ممانی ریحانہ حصار کا ذکر سن کر کسی حد تک مطمئن ہو گئیں پھر وہ ایک بیوی تھیں ان کا شوہر قبرستان

Urdufans.com

یہ بار ایک خطرناک عمل کرنے والا تھا ان کی پریشانی فطری تھی۔
پھر وہ گھر میں کی وہ رات بھی آئی جس کا ماموں فرقان کو انتظار تھا۔
اس رات ماموں فرقان نے عشاء کی نماز اپنے کمرے میں پڑھی۔ نماز کے بعد وہ کافی دیر تک وظیفہ پڑھتے رہے۔ کھانا انہوں نے آج مغرب کے وقت کھالیا تھا۔
وہ کوئی ساڑھے گیارہ بجے تک پڑھتے رہے پھر خاموشی سے اپنے کمرے سے برآمد ہوئے انہوں نے ممانی ریحانہ کو آنکھ کے اشارے سے بتایا کہ وہ قبرستان جارہے ہیں۔ اب فجر کے وقت لوٹیں گے۔ وہ دروازے کی کنڈی لگالیں۔
ممانی ریحانہ انہیں دروازے تک چھوڑنے آئی۔ ممانی ریحانہ نے ان کی حفاظت کے لئے کچھ پڑھ کر ان کی طرف پھونک ماری اور خدا حافظ کہہ کر دروازہ بند کرلیا۔
ماموں فرقان پیدل ہی قبرستان کی طرف چل دیئے۔ ان کے گھر سے قبرستان زیادہ دور نہ تھا کوئی آدھا میل کے فاصلے پر ہوگا۔ اس قبرستان کے کونے پر ایک مسجد تھی مسجد کے بعد ہی سنسان راستہ شروع ہوجاتا تھا۔
چاند اپنے شباب پر تھا وہ سامنے ایک سنہری تھال کی طرح ٹنگا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ٹھنڈی اور تیز روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جاڑوں کی چاندنی بڑی دلفریب ہوتی ہے لیکن قبرستان کے اس سناٹے میں یہ چاندنی بڑی پُراسرار محسوس ہورہی تھی۔ کچے راستے کے دونوں طرف اگی ہوئی گھنی جھاڑیاں پُرہیبت منظر پیش کررہی تھیں۔
ماموں فرقان کے ہاتھ میں تسبیح تھی وہ مسلسل پڑھتے ہوئے تیز تیز قدموں سے قبرستان میں بڑھے چلے جارہے تھے۔ راستے میں ایک دو کتے ملے تھے۔ انہوں نے دور سے بھونکنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر نزدیک آکر وہ یکدم خاموش ہوگئے تھے اور کان دبا کر جھاڑیوں میں گھس گئے تھے۔ قبروں کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا بارہ بجنے والے تھے یہ سردیوں کی روشن رات تھی اچھی خاصی سردی تھی۔ ماموں فرقان نے شلوار قمیض کے اوپر کوٹ پہنا ہوا تھا۔ قبرستان میں آکر سردی کا احساس زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے کوٹ کے بٹن بند کرلئے اور جیب سے دستانے نکال کر پہن لئے پھر انہوں نے کندھے سے کمبل اتار کر بائیں ہاتھ پر لیا اور بیٹھنے کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے لگے۔
تبھی چلتے چلتے ٹھوکر لگی ان کا سیدھا پاؤں کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا تھا اور وہ چیز آگے لڑھکتی چلی گئی تھی۔
ماموں فرقان نے اس لڑھکنے والی چیز پر نظر کی۔ اسے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو ٹھٹھک گئے۔
تبھی کسی نے بڑے غصے میں کہا..... "اندھے دیکھ کر چل۔" یہ آواز اس کھوپڑی سے آئی تھی جو ان کے پاؤں کی ٹھوکر سے لڑھک کر ایک طرف ہوگئی تھی۔
"حضرت آپ راستے میں کیوں پڑے ہیں؟" ماموں فرقان نے بغیر خوف میں مبتلا ہوئے کھوپڑی سے مخاطب ہوئے۔
"تو جانتا نہیں کہ یہ کیا ہے؟" ادھر سے آواز آئی۔
"ہاں. جانتا ہوں. یہ قبرستان ہے۔" ماموں فرقان نے پورے اطمینان سے کہا۔

Urdufans.com

"یہ ہمارا علاقہ ہے، ہماری مرضی ہم کہیں بھی گھومیں۔" ادھر سے سخت لہجے میں کہا گیا۔

"پتہ نہیں کب کے مرے ہوئے ہیں، ہڈیاں بھی گل گئی ہوں گی۔ ایک دیمک زدہ کھوپڑی بچی ہے لیکن اکڑ ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ حضرت آپ کا قیام کس طرف ہے میں آپ کے سراقدس کو آپ کی قیام گاہ تک چھوڑ دوں۔" ماموں فرقان نے ہنس کر کہا۔

"جا چلا جا، اپنا کام کر، زیادہ نستعلیق بننے کی کوشش نہ کر ورنہ پچھتائے گا۔"

ماموں فرقان نے پھر کوئی جواب نہ دیا کچھ پڑھ کر کھوپڑی کی طرف پھونکا۔ ایک شعلہ سا اٹھا اور پھر وہاں کچھ نہ رہا۔

تھوڑی دور جاکر ماموں فرقان نے ایک مناسب جگہ تلاش کی۔ وہاں چھوٹے چھوٹے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ انہیں وہاں سے اٹھا کر ادھر اُدھر پھینکا۔ جگہ صاف ہوگئی تو انہوں نے کوٹ کی جیب سے ایک چاقو نکالا وہ کوئی سات آٹھ انچ لمبے پھل کا رامپوری چاقو تھا۔ یہ چاقو ماموں فرقان کے پاس بہت عرصے سے تھا۔ یہ انہوں نے علیگڑھ کی نمائش سے خریدا تھا۔

چاقو کھول کر اس کی نوک سے زمین پر حصار کھینچا۔ حصار کھینچتے ہوئے وہ کچھ پڑھ رہے تھے ان کے کانوں میں کہیں دور سے گیدڑوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان آوازوں پر انہوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی وہ اپنے کام میں منہمک رہے۔ حصار کھینچنے کے بعد انہوں نے چاقو زمین میں گاڑ دیا۔

پھر انہوں نے کمبل کھولا اسے اپنے کندھوں پر ڈال لیا اور زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے۔

اکڑوں بیٹھتے ہی انہیں یوں لگا جیسے وہ کسی برف پوش پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھ گئے ہوں۔ انتہائی سردی تھی ان کے دانت بجنے لگے۔ جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ اچانک ہی ہواؤں کے تیز جھکڑ چلنے لگے۔ ماموں فرقان نے بائیں ہاتھ سے چاقو کے دستے کو تھام لیا اور بلند آواز سے کچھ پڑھنے لگے۔

یہ سردی کا احساس زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ جیسے جیسے وہ پڑھتے جاتے سردی کا احساس کم ہوتا جاتا پھر اتنا کم ہوا کہ انہیں گرمی سی محسوس ہونے لگی۔

اب انہوں نے چاقو سے اپنا ہاتھ ہٹالیا اور نظریں اس پر گاڑ دیں۔

گرمی آہستہ آہستہ بڑھتی جارہی تھی انہیں یہ محسوس ہورہا تھا کہ سامنے ہی کسی نے آگ بھڑکا دی ہو۔ ان کی نظریں چاقو پر تھیں لیکن انہیں اپنے سامنے آگ کے شعلے اپنی طرف بڑھتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔ ماموں فرقان نے اپنی توجہ ہٹانے کیلئے ایک مرتبہ پھر زور زور سے پڑھنا شروع کردیا۔ نظریں بدستور چاقو پر تھیں۔

اب آگ ان کے چاروں طرف پھیلتی جارہی تھی انہیں ہر طرف تپش محسوس ہورہی تھی۔

شعلوں کا رقص ان کے چاروں طرف جاری تھا۔ یہ شعلے ان کے نزدیک سے نزدیک تر ہوتے جارہے تھے۔ ان کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا تھا اس قدر تپش بڑھ گئی تھی۔

پھر وہ خطرناک لمحہ آیا۔

ان کے گرد شعلوں کا ناچ جاری تھا۔ یہ شیطانی آگ انہیں زندہ جلانے پر تلی ہوئی تھی۔

لیکن پھر وہ خطرناک لمحہ ان کے سر سے گزر گیا یہ جنسی آگ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی جیسے جیسے آگ کے شعلے ان کے نزدیک تر ہوتے گئے۔ ان کی تپش سرد ہوتی گئی یہاں تک کہ ان کے گرد ہونے والا شعلوں کا ناچ بالکل سرد پڑ گیا۔ ان کے چاروں طرف بھڑکی ہوئی آگ اس طرح ٹھنڈی پڑ گئی جیسے اس پر پانی سے لدا بادل برس پڑا ہو۔

ماموں فرقان نے سکون کا سانس لیا۔ یہ شعلوں کا ناچ اتنا بھیانک اور خوف میں مبتلا کر دینے والا تھا کہ اگر ماموں فرقان ذرا بھی کم ہمتی کا مظاہرہ کرتے اور آگ سے بچنے کیلئے بھاگ کھڑے ہوتے تو اس وقت وہ قبرستان میں راکھ بنے پڑے ہوتے۔ ڈھونڈنے والوں کو ان کی ہڈیاں بھی نہ ملتیں، اس قدر خطرناک آگ تھی وہ۔

ماموں فرقان ابھی تک اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے۔ اب وہ سرد زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے کمبل کو کندھوں سے اتار کر کمر کے گرد لپیٹ لیا اسے اپنے نیچے دبالیا اور ٹانگوں پر بھی پھیلالیا۔

تسبیح ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ بڑے اطمینان سے کچھ پڑھ کر ایک ایک دانہ ہاتھ سے چھوڑتے جاتے تھے۔

ایک گھنٹے تک کوئی واقعہ رونما نہ ہوا۔ قبرستان پر موت کا سناٹا طاری رہا۔ کبھی کبھی دور سے گیدڑوں اور کتوں کے رونے کی آوازیں سنائی دے جاتیں۔

کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب ماموں فرقان کے کانوں میں کچھ آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔ یہ کچھ انسانوں کے دھیرے دھیرے بولنے کی آوازیں تھیں۔ پھر انہیں سامنے سے روشنی دکھائی دی۔ کوئی شخص اپنے ہاتھ میں پیٹرومکس اٹھائے آہستہ آہستہ چلا آرہا تھا۔ انہوں نے نظر اٹھائی تو سامنے کوئی تیس چالیس آدمی نظر آئے وہ سب سفید کپڑوں میں تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے سب کے سب کفن پہنے ہیں ان کے کندھوں پر ایک جنازہ تھا پھر ان لوگوں نے ماموں فرقان کے نزدیک ہی اس جنازے کو رکھ دیا۔

اور وہ سارے لوگ جنازے کے چاروں طرف اکٹھا ہوگئے۔ پیٹرومکس زمین پر رکھ دیا گیا تھا۔ اس کی روشنی ان کفن پوشوں کے درمیان سے گزرتی، ماموں فرقان تک پہنچ رہی تھی۔

ماموں فرقان کا ہاتھ تسبیح دانوں سے کھیل رہا تھا اور ان کی نظریں سامنے تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ ان میں سے کئی لوگ قبر کھودنے میں لگے ہوئے ہیں۔ قبر بہت تیزی سے کھودی جارہی تھی۔ قبر کی تیاری کے بعد جنازے کو قبر میں اتار دیا گیا۔

جنازے کو قبر میں اتارے جانے کے ساتھ ہی ایک شور اٹھا۔ یہ بین کرنے کی آوازیں تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بہت سی عورتیں ایک ساتھ رو رہی ہوں۔ رونے کی آوازوں سے معلوم ہوا کہ وہ کفن پوش مرد نہ تھے۔ ساری عورتیں تھیں۔

یہ رونے کی آوازیں اس قدر تیز تھیں کہ پاس پڑوس کی آبادی تک پہنچ رہی ہوں گی۔ ہوسکتا ہے اس قبرستان کا گورکن بھی ان آوازوں کو سن کر یہاں تک پہنچ جائے۔

یکلخت رونے کی آوازیں بند ہوگئیں۔ پیٹرومکس بھی بجھا دیا گیا۔ اب ان کفن پوشوں نے چلنا شروع

کیا۔ ماموں فرقان نے دیکھا کہ وہ انہی کی طرف آرہے تھے۔ اب انہوں نے زور زور سے بولنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کیا بول رہے تھے۔ یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بہرحال اب ساری آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ سارے کفن پوش لوگ ماموں فرقان سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر بیٹھ گئے۔ تیس چالیس کفن پوش اس طرح آگے پیچھے بیٹھے اور کھڑے ہوگئے جیسا اپنا گروپ فوٹو بنوا رہے ہوں۔ ان کفن پوشوں کے چہرے نظر نہیں آرہے تھے۔ انہوں نے لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے ہوئے تھے۔

اب ماموں فرقان نے اپنی نظریں ان کفن پوشوں سے ہٹالیں اور اپنے چمکتے چاقو پر گاڑ دیں۔ وہ پڑھنے میں مصروف تھے۔

"یہ سامنے کون بیٹھا ہے۔" اچانک ان کے پیچھے سے آواز آئی اور یہ آواز بھی ان کے مرحوم والد کی تھی۔

"یہ..... یہ اپنا فرقان ہے، اسے نہیں پہچانتے۔" یہ ان کی مرحومہ والدہ کی آواز تھی۔ یہ آواز بھی ان کے عقب سے آئی تھی۔

یہ ایک ایسا نفسیاتی حربہ تھا کہ اگر وہ ان آوازوں کے فریب میں آکر پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے تو سارا کھیل بگڑ جاتا۔ ماموں فرقان خاموشی سے چاقو پر نظریں گاڑے، اپنا کام کرتے رہے۔

"فرقان، ارے او، فرقان۔" ان کی والدہ کی آواز آرہی تھی، بالکل ان کی ماں کا سا لہجہ تھا۔

"ارے تو تو بولتا کیوں نہیں، کیا تو اپنی ماں کو نہیں پہچانتا۔"

"اس سے پوچھو کہ یہ قبرستان میں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔" اس مرتبہ والد کی آواز آئی۔

"ہاں، ایسی سخت سردی میں تو یہاں کیا کر رہا ہے۔" والدہ نے براہ راست سوال کیا۔

"یہ جو کچھ بھی کر رہا ہے سخت بے وقوفی کر رہا ہے، اسے اپنے انجام کا نہیں پتہ۔" والد نے تنبیہ کی۔

"کیوں، کیوں!" والدہ کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ "کیا ہونے والا ہے، اس کے ساتھ۔"

ماموں فرقان نے اچانک ہاتھ بڑھا کر چاقو اپنے گرفت میں لے لیا پھر ایک جھٹکے سے اس چمکتے چاقو کو زمین سے نکال لیا کچھ پڑھ کر چاقو کی نوک پر تین بار پھونکیں ماریں۔ پھر اس کی نوک سے زمین پر ضرب کا نشان بنایا اور اپنا ہاتھ فضا میں بلند کر کے زور سے زمین میں گاڑ دیا۔

زمین میں چاقو کے دھنستے ہی چاروں طرف سے چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔

پھر یہ چیخیں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی گئیں۔ اب وہاں نہ کفن پوش رہے، نہ کوئی قبر تھی، نہ پیڑ کی روشنی۔ دور تک چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور سناٹے کا راج تھا۔

آدھے گھنٹے تک پھر سکون رہا، ماموں فرقان اطمینان سے اپنے کام میں مصروف رہے۔

ڈھائی بجے کے قریب انہوں نے چھم چھم کی آواز سنی یہ آواز دور سے آرہی تھی۔ جیسے کسی عورت

اپنے پیروں میں گھنگھرو باندھ رکھے ہوں اور وہ کمر لچکاتی ہوئی چلی آرہی ہو۔

گھنگھرو کی آواز کے ساتھ کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی پھر یہ دونوں آوازیں نزدیک آگئیں۔

ماموں فرقان نے نظریں اٹھائیں تو انہوں نے ایک عورت کو سامنے پایا۔ اس عورت کے ساتھ ایک کالا کتا تھا۔ اس کی سرخ زبان ایک فٹ باہر نکلی ہوئی تھی اور اس کی جسامت کسی گدھے سے کم نہ تھی۔ اس کتے کے گلے میں ایک زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ زنجیر کا ایک سرا اس عورت کے ہاتھ میں تھا۔ کتا اس سے آزاد ہونے کیلئے زور لگا رہا تھا۔ لیکن اس عورت نے اس کی زنجیر مضبوطی سے تھام رکھی تھی۔ وہ خونخوار کتا کسی شیر کی طرح غرا رہا تھا۔ وہ بار بار ماموں فرقان کی طرف جھپٹتا تھا لیکن ہر مرتبہ وہ عورت اس کتے کو پیچھے کھینچ لے جاتی تھی۔ جب وہ دو چار قدم پیچھے ہٹتی تو پھر چھن چھن گھنگھرو بج اٹھتے۔

اگر اس خونخوار کتے کی کسی طرح زنجیر اس عورت کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی تو وہ سیدھا ماموں فرقان پر چھلانگ لگاتا اور انہیں دو تین منٹ میں چیر پھاڑ کر رکھ دیتا۔

اتنے طاقتور کتے کو اس نازک عورت نے کس طرح قابو کیا ہوا تھا۔ اس بات پر حیرت تھی کچھ دیر یہ کھیل جاری رہا۔ وہ کتا غراتا ہوا ماموں فرقان کی طرف لپکتا پھر وہ عورت اسے پیچھے کھینچ لے جاتی۔

کتے کی غراہٹ اور گھنگھروؤں کی چھم چھم، چاندنی رات اور قبرستان کا سناٹا سب مل کر ایک خوفناک منظر پیش کر رہے تھے۔ یہ ایک ایسا منظر تھا کہ اگر کوئی معمولی دل گردے کا آدمی ہوتا تو حصار کے اندر بیٹھا بیٹھا خوف سے دم توڑ دیتا۔

ماموں فرقان کے جسم میں بھی ایک دو مرتبہ خوف کی لہر آئی تھی لیکن انہوں نے پورے اطمینان سے اسے اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ وہ اپنے کام میں منہمک تھے اور گرد و پیش میں جو ہو رہا تھا اس سے بھی بے خبر نہ تھے۔

اب اس عورت نے اپنے کتے کے ساتھ ماموں فرقان کا طواف شروع کر دیا تھا۔ کتے کی غراہٹ اور گھنگھروں کی چھم چھم اب انہیں اپنے چاروں طرف سنائی دے رہی تھی وہ دونوں ماموں فرقان کے اتنے نزدیک سے گزر رہے تھے کہ وظیفہ جاری رکھنے میں وقت پیش آرہی تھی اور شاید یہی اس عورت کا مقصد تھا کہ کسی طرح وظیفے میں خلل پڑ جائے۔

خیر وہ عورت ماموں فرقان کے وظیفے میں تو خلیل نہ ڈال سکی البتہ خود غائب ہو گئی۔ ماموں فرقان نے اچانک ہاتھ بڑھا کر چاقو اپنی گرفت میں لے لیا پھر ایک جھٹکے سے اس چمکتے چاقو کو زمین سے نکال لیا۔ کچھ پڑھ کر اس چاقو کی نوک پر تین مرتبہ پھونکیں ماریں، پھر اس نوک سے زمین پر ضرب کا نشان بنایا اور لمبا ہاتھ فضا میں بلند کر کے چاقو کو بہت زور سے زمین میں گاڑ دیا۔

چاقو کے زمین میں دھنستے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے اس چاقو کا پھل اس عورت کے سینے میں اتر گیا۔ ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ عورت کے ہاتھ سے اس کتے کی زنجیر چھوٹ گئی اور وہ کتا چھلانگیں مارتا قبروں درمیان غائب ہو گیا۔ اب وہاں عورت بھی نہ تھی۔

پھر کافی دیر سکون رہا۔ ماموں فرقان نے اطمینان کا سانس لیا اب چار بج رہے تھے۔ ان کا خیال تھا اب کوئی فتنہ کھڑا نہیں ہو گا۔

Urdufanspot.com

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ انہوں نے اپنے سامنے دو دیو ہیکل آدمیوں کو اپنے سامنے بیٹھے دیکھا۔ وہ خوفناک صورتوں والے آدمی تھے ان کے ہاتھ میں پھاوڑا اور کدال تھیں اور وہ اس طرح بیٹھے تھے جیسے کسی کی قبر کھودنے کے منتظر ہوں۔

"یہ جو بیٹھا ہے۔ اس کی قبر کھودنی ہے؟" ان میں سے ایک ماموں فرقان کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"ہاں۔ اسی کی کھودنی ہے۔" دوسرے نے تائید کی۔

"میرا خیال ہے کہ چھ فٹ لمبی قبر اس کیلئے ٹھیک رہے گی۔ یہ زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ فٹ کا ہو گا۔" ایک نے اپنا اندازہ پیش کیا۔

"اگر یہ ساڑھے پانچ فٹ کا ہے تو چھ فٹ کی قبر کھودنے کی کیا ضرورت ہے ساڑھے چار فٹ کی نہ رہے گی ذرا اس کو دبا کر رکھیں گے۔"

"ہاں۔ اس کو دبا کر ہی رکھنا چاہئے۔ اس نے لوگوں کو کافی پریشان کر رکھا ہے۔"

"یہ کیا کسی کو پریشان کرے گا۔ ابھی خود ہی پریشان ہو جائے گا۔" ایک نے کہا۔

"وہ کیسے۔" دوسرا بولا۔

"وہ ایسے کہ ہم ابھی یہاں اس کی قبر کھودیں گے اور اسے اٹھا کر اس میں ڈال دیں گے۔ اس کے گھر والے اسے ڈھونڈتے ہی رہیں گے کہ کہاں گیا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ آؤ پھر اپنا کام شروع کریں۔ وقت کم ہے صبح ہونے والی ہے۔ اس کام کو دن کے اجالے سے پہلے ہی ختم کرنا ہے۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

پھر ان دونوں دیو قامت آدمیوں نے پھاوڑا اور کدال اپنے ہاتھ میں پکڑ لئے اور زمین کھودنی شروع کر دی۔ وہ بہت تیزی سے مٹی کھود رہے تھے۔

یہ خوفناک باتیں سن کر ماموں فرقان کو ذرا بھی ڈر نہ لگا۔ وہ اپنے کام میں پوری طرح دلجمعی سے منہمک رہے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ وہ ان دونوں کی مکالمہ بازی پر دل ہی دل میں مسکراتے رہے۔

ان دونوں کا ڈرامہ جاری تھا۔ وہ بڑی تیزی سے قبر کھودنے میں لگے ہوئے تھے۔

قبر کھودتے کھودتے وہ رک جاتے۔ ماموں فرقان کی طرف اپنی لال لال بھیانک آنکھوں سے گھورتے اور پھر کھدائی میں مصروف ہو جاتے۔ جیسے کہہ رہے ہوں بچہ فکر نہ کر ابھی تیرا کام تمام کرتے ہیں۔

ماموں فرقان کچھ دیر تک اس ڈرامے کو برداشت کرتے رہے لیکن آخر کب تک؟

انہوں نے پھر وہی عمل دہرایا۔ جیسے ہی چاقو زمین سے نکال کر زمین میں گاڑا تو اس کے ساتھ ہی وہ دونوں خبیث صورت گورکن ہوا ہو گئے اب نہ وہاں کھدی ہوئی قبر رہی نہ پھاوڑا اور کدال۔

فجر کی اذان ہونے والی تھی۔

انہوں نے اپنے وظیفے کا ننانوے فیصد حصہ مکمل کر لیا تھا۔ وہ بہت خوش تھے بس اب فجر کی نماز پڑھ کر وظیفے کا ایک فیصد حصہ مکمل کرنا باقی تھا۔

ہاتھی نکل گیا تھا، دُم باقی رہ گئی تھی۔ قبرستان کی یہ بھیانک رات بخیر و خوبی گزر گئی تھی۔ اب کوئی

خطرے کی بات نہ تھی۔

انہوں نے چاقو کو زمین سے نکال لیا اور کمبل جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی کمر تختہ بن گئی تھی۔ ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ پوری رات اس قدر سردی میں آلتی پالتی مار کر بیٹھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اتنی لمبی ٹانگیں لے کر قبرستان کی بلاؤں کا مقابلہ۔ ہڈیوں میں اتر جانے والے خوف سے نبرد آزما ہونا اور ثابت کے ساتھ واپس جانا بڑے جان جوکھوں کا کام تھا۔

مشکل عمل کیے جانا بڑے جان جوکھوں کے کام کو مکمل کر لیا تھا۔ یہ ساری تکلیف انہوں نے اس عورت کی لیے اٹھائی تھی جس کا زمانہ دشمن ہو گیا تھا۔ زمانے سے بڑا دشمن تو وہ جن تھا جو اس پر عاشق ہو گیا تھا اور اس لڑکی کو دن بدن تباہی کے دہانے کی طرف لئے جا رہا تھا۔

ماموں فرقان نے کھڑے ہو کر اپنی ٹانگوں اور کمر کو سیدھا کیا اور پھر چاقو کو ریوالور کی طرح تانے تیز تیز چلنے لگے۔

وہ غیریت سے قبرستان کی حدود سے نکل آئے۔ قبرستان سے نکلنے کے بعد انہوں نے چاقو بند کر کے جیب میں ڈال لیا اور تسبیح بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ میں لے لی۔

مسجد سامنے تھی۔ مسجد کی حدود میں قدم رکھا تو مؤذن نے اللہ کے بڑے ہونے کا اعلان کیا۔ ماموں فرقان پہلے مسجد کے بیت الخلاء میں گئے وہاں سے نکلے تو وضو کرنے بیٹھ گئے۔ وضو کرنے کی جگہ پر اندھیرا تھا۔ ایک کنڈور سا بلب کافی دور جل رہا تھا۔

ماموں فرقان نے وضو کیلئے نکا کھولا تو اس میں سے پانی نہ نکلا۔ نلکے کا ایک لڑکا ماموں فرقان کو دیکھ رہا تھا وہ فوراً ہی لوٹے میں پانی لئے ان کی طرف دوڑا اور بہت ادب سے بولا۔

"ماموں ٹنکی میں پانی نہیں ہے۔ میں ادھر بالٹی میں رکھا ہوا پانی لوٹے میں بھر لایا ہوں آیئے میں آپ کو وضو کرا دوں۔"

"ارے رضوان تم ہو، شکریہ بیٹا۔ لاؤ لوٹا مجھے دے دو میں خود کر لیتا ہوں وضو۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"نہیں ماموں میں کراؤں گا آپ کو وضو۔" رضوان نے بڑی محبت سے کہا۔

ماموں فرقان نے اس کی محبت کے آگے ہاتھ پھیلا دیئے۔ رضوان ان کے ہاتھ پر پانی ڈالنے لگا وہ اس طرح کھڑا ہوا کہ رہی سہی روشنی بھی رک گئی۔

خیر ماموں فرقان کو روشنی کا کیا کرنا تھا۔ انہوں نے جلدی جلدی وضو کیا اس لڑکے کا شکریہ ادا کیا اور کمبل سے اپنے منہ کو سکھاتے ہوئے صف پر کھڑے ہو گئے۔

نماز پڑھ کر، وہ اپنا وظیفہ مکمل کرنے بیٹھ گئے۔

جب وہ مسجد سے باہر آئے تو دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ وہ اپنا وظیفہ مکمل ہونے پر بہت خوش تھے تیزی سے گھر کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد گھر پہنچ کر سب سے پہلے دادا غفور کو ٹیلیفون کر کے ان کو یہ مژدۂ جانفزا سنائیں۔ اس کے بعد گلشن فون کر کے بابر کو بھی یہ خوشخبری سنائیں کہ اب نیلم کو بہت جلد اس عذاب

Digifans.com

نجات مل جائے گی۔ پہنچے تو پہلی ہی دستک پر گھر کا دروازہ کھل گیا۔ ممانی ریحانہ۔ ماموں کو دیکھ کر بولیں۔
ماموں فرقان گھر پہنچے تو آنکھیں بند کر کے تہہ دل سے اللہ کا شکر ادا کیا۔
ہوئیں۔ انہوں نے آنکھیں بند کر کے تہہ دل سے اللہ کا شکر ادا کیا۔
"کام ہو گیا؟" ممانی ریحانہ نے پوچھا۔
"ہاں جی۔" ماموں فرقان خوش ہو کر بولے۔
"کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔" ممانی ریحانہ رات کی روداد سننے کیلئے بے چین تھیں۔
"پہلے کچھ نہ پوچھو کہ رات کیسے گزری۔ اگر تم میرے ساتھ ہوتیں تو پہلے ہی حملے میں ہیرو بن جاتیں۔"
"کیا ہوا آخر کچھ سناؤ تو۔" ممانی ریحانہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔
"ابھی سناؤں گا پہلے ذرا دادا غفور سے بات کر لوں۔"
"دادا غفور سے بعد میں بات کرنا پہلے اکبر سے بات کر لو۔ وہ بہت بے چین ہو رہا ہے۔ اس کا اب تک دو مرتبہ فون آچکا ہے۔"
"اچھا ماموں فرقان نے مسکراتے ہوئے کہا۔" میں پہلے دادا غفور سے بات کروں گا۔"
یہ کہہ کر وہ دادا غفور کے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگے۔
ماموں فرقان۔ دادا غفور کو فون کر رہے تھے تو ادھر اکبر۔ ماموں فرقان کے گھر کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔
نیلم اس کے سامنے ہی بیٹھی تھی۔ وہ اکبر کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
"مجھے کیوں دیکھ رہی ہو۔ ایسے نہ دیکھا کرو مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔" اکبر نے نمبر گھماتے ہوئے ہنس کر کہا۔
بس اتنی دیر میں نیلم کی رنگت بدل گئی۔ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ تیوریاں چڑھ گئیں۔ اس کی آواز بدل گئی۔ وہ مردانہ آواز میں بولی۔ "اکبر، یہ تو کیا کر رہا ہے۔"
اس روپ میں اکبر نے اسے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ اس کی سٹی گم ہو گئی اس نے خوفزدہ ہو کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "وہ جی۔ میں ماموں فرقان سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔"
"ماموں فرقان کے چھچے۔" نیلم نے بڑے غصے سے کہا۔ "اس سے بعد میں بات کرنا پہلے ہم سے کر۔"
"جی۔ جی آپ فرمائیں۔" اکبر گھگھیا کر بولا۔
"تو کیا سمجھتا ہے۔ تیرا ماموں فرقان ہمارا کچھ بگاڑ لے گا۔ وہ بے وقوف ہے۔ وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس نے خواہ مخواہ قبرستان میں اپنی رات کالی کی۔ وہ ہمیں نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ ہمیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ البتہ اب ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔ اسے ایسی سزا دیں گے کہ وہ زندگی یاد رکھے گا۔ اب ہم جا رہے ہیں اسے ہمارا پیغام پہنچا دینا۔" نیلم نے یہ کہہ کر سر جھکا لیا۔
جب اس نے سر اٹھایا تو وہ نارمل ہو چکی تھی۔ اکبر اسے ہکا بکا دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم میں خوف

Urdufans.com

ے زیادہ طاری تھا۔
"نیلم نے اکبر کو اس قدر حیران پریشان دیکھا تو وہ خود بھی پریشان ہو گئی۔ گھبرا کر بولی۔
"کیا ہوا آپ کو، اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے۔ آپ ماموں کو ٹیلیفون کر رہے تھے۔ ٹیلیفون
کیا ہوا آپ کو، آپ کو کیا ہو گیا۔"
نرتے کرتے یہ آپ کو کچھ نہیں ہوا۔ ماموں کا نمبر ابھی ہے۔ ابھی دوبارہ کرتا ہوں۔" اکبر نے بڑی
نہیں۔ مجھے تو کچھ نہیں ہوا، تمہیں ضرور کچھ ہو گیا تھا۔ چند لمحوں میں
صورت سے کہا۔ اب وہ اسے کیا بتاتا کہ اسے کچھ نہیں ہوا، تمہیں ضرور کچھ ہو گیا تھا۔ چند لمحوں میں
صورت بدل گئی، صورت کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔ آواز بدل گئی تھی۔
تاری رحمت ماموں فرقان کا نمبر ملایا۔ اس اثناء میں وہ دادا غفور سے بات کر چکے تھے۔ ٹیلیفون کی
اکبر نے پھر ماموں فرقان کا نمبر ملایا۔ اس اثناء میں وہ دادا غفور سے بات کر چکے تھے۔ ٹیلیفون کی
گھنٹی بجتے ہی وہ سمجھ گئے کہ یہ اکبر کا فون ہے لہٰذا انہوں نے ریسیور اٹھاتے ہی ہیلو نہیں کہا بلکہ یوں
بولے۔
"جی، اکبر صاحب۔"
"جی، اکبر صاحب۔" وہ بولا۔ "ماموں آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ میرا فون ہے۔"
اکبر اپنا نام سن کر حیران رہ گیا۔ وہ بولا۔ "ماموں آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ میرا فون ہے۔"
"بس ایک اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔ یوں سمجھو کہ تکا لگ گیا۔" ماموں فرقان نے ہنس کر
کہا۔
"ماموں خیریت تو رہی۔ کام ہو گیا۔" اکبر اصل مقصد پر آیا۔
"ہاں، بالکل کام ہو گیا۔ میں نے ابھی دادا غفور سے بھی بات کر لی ہے۔ آئندہ کیا کرنا ہے۔ یہ سمجھ لیا
ہے۔ مجھے اس وقت نیند آ رہی ہے۔ ایک گھنٹے سو لوں۔ پھر دکان کا ایک چکر لگا کر تمہارے گھر آتا ہوں۔
نیلم تو ٹھیک ہے۔" ماموں فرقان نے پوچھا۔
"جی نیلم ٹھیک ہے۔ اس وقت میرے سامنے ہی بیٹھی ہے۔" اکبر نے بتایا۔
"اکبر تم کچھ پریشان معلوم ہو رہے ہو، تمہاری آواز سے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ کیا میرا اندازہ غلط
ہے۔"
"نہیں ماموں، آپ ٹھیک ہیں، آپ کا اندازہ صحیح ہے۔"
"بیٹا اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، انشاء اللہ اچھے دن آنے والے ہیں۔" ماموں فرقان
نے اسے تسلی دی۔
"ماموں، ابھی ابھی وہ دھمکی دے کر گیا ہے۔" اکبر نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔
"کون؟" ماموں فرقان نے پوچھا پھر وہ فوراً ہی سمجھ گئے۔ "اچھا، وہ، کیا وہ ظاہر ہوا تھا۔"
"جی ماموں۔" اکبر نے بتایا پھر بولا۔ "ماموں، آپ ایک منٹ ہولڈ کریں۔"
"اچھا۔" ماموں فرقان نے کہا پھر انہوں نے سنا کہ اکبر نیلم سے کہہ رہا تھا۔ "نیلم تم امی کے پاس
چلی میں ماموں سے بات کر کے آتا ہوں اور دیکھو ذرا دروازہ بند کر جانا۔"
پھر ماموں فرقان نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تو وہ بولے۔ "اکبر خیریت تو ہے۔"
"ماموں ابھی کچھ دیر پہلے میں آپ کو فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ نیلم کی اچانک آواز بدل گئی

Urdufans.com

مردانہ آواز میں بولے تھی۔ "
من و من اکبر نے ماموں فرقان کے گوش گزار کر دیا۔
پھر سلیم نے جو کچھ کہا تھا وہ "ماموں قبرستان میں تھا۔" ماموں فرقان نے سوچتے ہوئے کہا۔
"تو اس کو پتہ چل گیا کہ میں رات قبرستان میں تھا۔" "
نہ صرف اسے پتہ چل گیا بلکہ اس نے نہ بھولنے والی سزا دینے کی دھمکی بھی دے دی
ہے۔"
"میں دیکھ لوں گا اسے تم فکر نہ کرو۔ میں ابھی دو پہر تک پہنچتا ہوں تمہاری طرف۔"
"جی بہتر ماموں۔ آپ آیئے۔" اکبر نے کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔
ماموں فرقان نے دوپہر کو کھانا کھا کر جانا تھا لیکن وہ وہاں نہ جا سکے۔ اس کے بجائے اسپتال پہنچ گئے۔
وہ پوری رات کے جاگے ہوئے تھے پھر بیٹھے رہنے کی وجہ سے ان کے جسم کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ ممانی ریحانہ
حسن تھی۔ شدید نیند تھی۔ انہوں نے جلدی جلدی الٹا سیدھا ناشتہ کیا اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئیں اور وہ
کر سو گئے۔ سونے سے پہلے انہوں نے ممانی ریحانہ کو تاکید کی کہ وہ انہیں دو گھنٹے کے بعد اٹھا دیں۔ کہیں وہ
شام تک سوتے ہی نہ رہ جائیں۔
دو ڈھائی گھنٹے کے بعد جب ممانی ریحانہ نے انہیں اٹھانے کے لئے ان کے چہرے سے لحاف اٹھایا تو وہ
کانپ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔
یہ ماموں فرقان کا چہرہ ہی نہ تھا۔
ان کے پورے چہرے پر جگہ جگہ سفید داغ پڑے ہوئے تھے۔
ممانی ریحانہ نے انہیں گھبرا کر جھنجھوڑ دیا "ارے اٹھئے۔"
ماموں فرقان نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ ممانی کا پریشان چہرہ دیکھ کر بولے۔ "کیا ہوا؟"
"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ اپنے چہرہ کو دیکھئے۔ یہ آپ کو کیا ہوا؟" وہ گھبرا کر بولیں۔
ممانی ریحانہ نے انہیں آئینہ لا کر دیا۔ اتنی دیر میں وہ اپنا چہرہ ٹٹول چکے تھے۔ آئینہ جو دیکھا تو ان پر
لرزہ طاری ہو گیا۔ یہ ان کے چہرے کو کیا ہوا۔ یہ تو سفید سفید برص کے سے داغ تھے۔
پھر یہ داغ ان کے چہرے پر ہی نہ تھے بلکہ ہاتھ پیروں پر بھی تھے۔
اور یہ صرف محض سفید داغ ہی نہ تھے بلکہ یہ بڑے بڑے زخم سے تھے جن میں پیپ بھری ہوئی
تھی۔
ماموں فرقان فوراً اٹھ کر اسپتال پہنچے۔ وہاں ڈاکٹر نے انہیں اسپتال میں داخل کر لیا کیونکہ وہ داغ
بہت تیزی سے پھیل رہے تھے۔ آہستہ آہستہ پورا جسم ان داغوں کی لپیٹ میں آتا جا رہا تھا۔
ان داغوں میں سخت خارش ہو رہی تھی۔ وہ جیسے ہی کسی داغ کو کھجاتے فوراً مواد پھٹ پڑتا اور جہاں
جہاں مواد لگتا۔ وہاں ایک نیا داغ پیدا ہو جاتا۔
اکبر اور بابر کو جیسے ہی ماموں فرقان کے اسپتال میں داخل ہونے کا معلوم ہوا وہ فوراً بھاگے اسپتال
پہنچے۔ ممانی ریحانہ نے جو کچھ بتایا تھا اس سے کہیں زیادہ ماموں فرقان کی حالت خراب تھی۔
اور جوں جوں علاج ہو رہا تھا۔ ان کی حالت مزید خراب ہوتی جا رہی تھی۔

Urdufans.com

ہاسپٹل کو خطرناک قسم کی الرجی سمجھ کر اس کا علاج کر رہے تھے۔
لیکن وہ الرجی نہ تھی۔
دماغ جن میں مواد بھرا تھا۔ اب جسم کے چپے چپے پر پھیل گئے تھے۔
چہرہ، گردن، بازو، ٹانگیں حتیٰ کہ سر میں بھی، کوئی جسم کا ایسا حصہ نہ بچا تھا جہاں مواد سے بھرے یہ زخم
موجود نہ تھے۔ ان زخموں میں شدید قسم کی خارش تھی۔ ماموں فرقان کی حالت غیر ہوتی جا رہی
تھی۔
ڈاکٹروں کے دماغ چکرائے ہوئے تھے ساری دوائیں الٹا اثر دکھا رہی تھیں۔
ماموں فرقان کا ایک بیٹا تھا۔ عرفان۔ وہ حیدر آباد میں رہتا تھا۔ وہاں کے ایک بینک کا منیجر تھا وہ مہینے
کی ہر آخری جمعرات کو کراچی آتا تھا۔ شادی شدہ تھا۔ اس کے تین بچے تھے دو لڑکے اور لڑکی۔
ماموں فرقان کا بس ایک ہی نرکا تھا دوسری بیٹی تھی۔ شمسہ جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ عرفان
اور شمسہ کے درمیان آٹھ سال کا فرق تھا۔
عرفان اس جمعرات کو گھر آیا تو گھر آکر اسے معلوم ہوا کہ اباجی اسپتال میں داخل ہیں۔ ممانی ریحانہ
نے اپنے بیٹے کو سارے حالات سے روشناس کیا۔ انہوں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ تمہارے اباجی نے کل
کی رات قبرستان میں گزاری تھی۔
عرفان کے پاس گاڑی موجود تھی۔ وہ فوراً اسپتال پہنچا۔ کمرے میں داخل ہوا، تو اسے شدید بدبو کا
بھبکا آیا۔ اس نے فوراً اپنی جیب سے رومال نکال کر ناک پر رکھ لیا۔ کمرے میں باہر اور اکبر بھی موجود
تھے لیکن ان کی ناکوں پر رومال نہ تھے۔ بدبو بہرحال انہیں بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ برداشت
کر رہے تھے۔ عرفان کو اندازہ نہ تھا کہ یہ کیسی بدبو ہے جب اسے اندازہ ہوا کہ یہ بدبو ماموں فرقان کے
جسم پر پڑے ہوئے زخموں سے آرہی ہے تو اس نے ناک سے رومال ہٹا لیا۔
ماموں فرقان کی حالت ایک دن میں انتہائی خراب ہو گئی تھی۔ سارے ٹیسٹ لئے جا چکے تھے لیکن بیماری
کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ یہ داغ کیسے تھے، کیوں پڑ رہے تھے، کیوں پھیل رہے تھے۔
ماموں فرقان چند گھنٹوں میں شدید نوعیت کے کوڑھ کے مریض نظر آنے لگے تھے۔
وہ بڑے حوصلے والے آدمی تھے وہ بڑے حوصلے سے کام لے رہے تھے۔ عرفان اسپتال کے کمرے
میں داخل ہوا تو انہوں نے اس کا مسکرا کر استقبال کیا۔ "آؤ بیٹے۔"
"اباجی، یہ سب کیا ہے؟"
"پتہ نہیں بیٹا، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ تم ایک کام کرو۔" ماموں فرقان نے کہا۔
"جی اباجی، فرمائیں۔"
"تم گاڑی لائے ہو۔"
"جی ہاں ہے میرے پاس۔"
"ماموں آپ بتائیں کیا کام ہے، میری گاڑی باہر کھڑی ہے۔" باہر نے فوراً کہا۔
"نہیں، عرفان اپنی گاڑی میں چلا جائے گا۔"
"کہاں بھیجنا ہے۔ بتائیں آپ۔"

Urdufans.com

"بیٹا تم نے دادا غفور کا گھر تو دیکھا ہے۔"

"جی ابا جی دیکھا ہے۔"

"تم ایسا کرو، اکبر کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور دادا غفور کے گھر چلے جاؤ۔ ان سے کہنا کہ ہم نے اسپتال بلایا ہے۔ میرے بارے میں اکبر کو لے کر چلا جاتا ہوں۔" عرفان نے سعادتمندی سے کہا۔

"جی، بہتر ابا جی۔ میں اکبر کو لے کر سے نکل گئے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد واپس آئے تو ان پھر وہ دونوں تیزی سے اسپتال کے کمرے کے ساتھ دادا غفور بھی تھے۔

دادا غفور، ماموں فرقان کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ ممانی ریحانہ نے اگرچہ دوپہر کو انہیں ٹیلیفون پر ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا لیکن انہیں یہ اندازہ نہ تھا کہ ماموں فرقان کی حالت کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔ ایسی بری حالت ہو جائے گی۔

انہوں نے کمرے میں داخل ہو کر رسمی طور پر دو چار باتیں کیں۔ پھر سب لوگوں سے کمرہ خالی کرنے کو کہا۔

دادا غفور کا حکم سن کر باہر، اکبر اور عرفان کمرے سے باہر چلے آئے۔

"ہاں، فرقان اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔ یہ سب کیسے ہوا۔ صبح تو تم بہت خوش تھے۔"

"دادا غفور میں کیا بتاؤں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم یہ سب کیا ہے۔ ریحانہ نے مجھے اٹھایا تو میرے جسم پر داغ پیدا ہو چکے تھے۔"

"داغ، کیا کہتے ہیں۔" دادا غفور نے پوچھا۔

"ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ وہ اسے اب تک شدید قسم کی الرجی سمجھ رہے تھے لیکن اب وہ بھی مایوس ہو چکے ہیں۔"

"مجھے ذرا قبرستان کا حال تفصیل سے سناؤ۔" دادا غفور نے کہا۔

ماموں فرقان نے قبرستان میں جو بیتی تھی وہ جلدی جلدی تمام جزئیات کے ساتھ کہہ سنائی۔ پھر انہوں نے مسجد جانے اور وضو کرنے کا ذکر کیا تو دادا غفور کو جیسے ڈنک سا لگا۔

"اوہ، میرے اللہ۔" دادا غفور نے انتہائی فکر مند ہو کر کہا۔ "تمہیں وضو کرانے والا لڑکا کون تھا؟"

"وہ رضوان تھا، دادا غفور، میرے گھر کے نزدیک ہی رہتا ہے۔" ماموں فرقان نے بتایا۔

"تمہارا خیال ہے کہ وہ رضوان ہی تھا، تمہارا پڑوسی؟" دادا غفور نے تصدیق چاہی۔

"ہاں، بالکل۔" ماموں فرقان نے وثوق سے کہا۔ "بہت اچھا لڑکا ہے، بڑا سعادتمند۔"

"اب میری سمجھ میں ساری بات آگئی ہے۔" دادا غفور سوچتے ہوئے بولے۔

"وہ کیا دادا۔" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"فرقان تم سے بڑی بھول ہو گئی ہے۔" دادا غفور نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"دادا غفور، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔" ماموں فرقان پریشان ہو کر بولے۔

"ابھی دادا غفور کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ نیلم غصے میں بھری
کمرے میں داخل ہوئی۔
کمرے میں داخل ہوئی۔
نیلم جس انداز سے کمرے میں داخل ہوئی۔
اس کا چہرہ لوہے کی طرح تپا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں انگارے بھرے ہوئے تھے۔ ہونٹ نفرت
سے بھنچے ہوئے تھے وہ کچھ اس طرح کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ چند لمحوں کیلئے دادا غفور کی آنکھیں
بند ہو گئی تھیں۔ اس کے گلے میں دوپٹہ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ سردی کے باوجود بدن پر سوئٹر نہ تھا۔ پیروں
میں چپل یا سینڈل نہ تھے۔
اس حالت میں گھر سے اسپتال پہنچ گئی تھی۔
"دادا غفور تو اسے کیا بتانا چاہ رہا تھا۔ اب میرے سامنے بتا۔ میں بھی تو سنوں۔" نیلم نے مردانہ آواز میں
کہا۔ لہجے میں شدید غصہ ٹپک رہا تھا۔
"وہ ہماری آپس کی بات تھی۔" دادا غفور نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "آپ بتایئے۔ آپ کا
یہاں آنا ہوا اس وقت یہاں اسپتال میں۔"
"تم لوگ جو کھیل کھیل رہے ہو اس کا انجام دیکھ لیا اور یہ ابھی کچھ نہیں ہے۔ آگے آگے دیکھتے جاؤ
کیا ہوتا ہے۔ تم نے سید پور کے جن سے ٹکر لی ہے۔ اب دیکھو بات کہاں تک پہنچتی ہے۔ اس فرقان کا تو
میں وہ حشر کروں گا کہ زندگی بھر یاد کرے گا اور بڈھے چھوڑوں گا میں تجھے بھی نہیں۔ یہ فرقان تیرے
اشاروں پر ناچ رہا ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" نیلم غصے میں بولے چلی جا رہی تھی۔ "ہر بات کی
ایک حد ہوتی ہے۔ میں نے تم دونوں کو بہت طرح دینے کی کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ تم میری زبانی
تنبیہوں سے سنبھل جاؤ گے۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ گے لیکن تم لوگوں نے شاید مجھے کوئی پانی کا
بلبلہ سمجھ لیا ہے۔ تم لوگ پھونک مارو گے اور میں ہوا میں تحلیل ہو جاؤں گا۔ تم لوگوں نے دیکھ لیا کہ میں تم
لوگوں کے بس کا نہیں ہوں۔ میں تم لوگوں کے قابو میں آنے والی چیز نہیں ہوں۔ میرے راستے سے
ہٹ جاؤ ورنہ وہ تباہی پھیلے گی کہ دنیا دیکھے گی۔"
"میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں جواب دیں گے۔" دادا غفور نے اس کی خوفناک دھمکیوں کو نظر
انداز کرتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں کہو۔" نیلم کے لہجے میں وہی کرختگی تھی۔
"چلیں ہم لوگ تو آپ کے پیچھے پڑے ہیں، اس لئے آپ ہمیں نقصان پہنچانے کے درپے ہیں
لیکن اس لڑکی نے آپ کا کیا بگاڑا ہے کہ اس حالت میں آپ اسے کھینچے پھر رہے ہیں۔"
"ہم اس پر عاشق ہیں، اسے ہم کبھی نہیں چھوڑیں گے۔" واضح اور دوٹوک جواب ملا۔
"آپ کے ارادے کیا ہیں۔" پوچھا گیا۔
"تو ہمارے ارادے کیا پوچھتا ہے، قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہے۔ تو اپنا ارادہ بتا۔"
"ہمارے ارادے تو آپ کے سامنے ہیں، وہ تو فرقان سے ذرا سی چوک ہو گئی ورنہ اڑ گئے تھے
آپ۔" دادا غفور نے نیلم کے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے بڑے سکون سے کہا۔

"مرحبا ہمیں اڑانے والے۔" نیلم نے یہ کہہ کر قہقہہ لگایا اور دادا غفور کو گھور کر دیکھا۔
"چلیے مکمل ہونے کو تھا۔ بس فرحان سے ذرا سا احتیاطی ہو گئی۔ وہ عمل کے مکمل ہونے سے پہلے ہی
آپ کو پہچان نہ سکا۔ اس نے اپنا پروس کا لڑکا سمجھ کر وضو کر لیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ کیمیا والی سے
وضو کر رہا ہے۔" دادا غفور نے بتایا۔
"اس لئے بار بار سمجھا رہا ہوں کہ ہم سے ٹکر مت لو۔" نیلم نے خشک لہجے میں کہا۔
"پھر تو ہم نے آپ سے لے لی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جیت کس کی ہوتی ہے۔" دادا غفور نے نیلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
موٹے حروں سے ہم ڈرنے والے نہیں ہیں۔
کہا۔
"مجھے معلوم تھا کہ تم لوگ باز آنے والے لوگوں میں سے نہیں ہو۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اب تمہارے
کے خود ذمہ دار ہو گے۔ میں چلتا ہوں۔"
یہ کہہ کر نیلم مڑی اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گئی۔
دادا غفور اس کے پیچھے دروازے تک آئے انہوں نے دروازے سے نکل کر دیکھا نیلم کا کہیں نام و نشان
یں دور تک پتہ نہ تھا۔ وہ دروازے سے باہر نکلتے ہی غائب ہو گئی تھی۔
دادا غفور دروازہ بند کر کے واپس پلٹے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جواب میں ماموں فرحان نے
بھی مسکرانے کی کوشش۔
دادا غفور، ماموں فرقان کے قریب آ کر بیٹھ گئے اور بولے۔ "دیکھ لی تم نے اس کی چالاکی، تمہیں
اس نے ایسی جگہ گرفت میں لیا کہ تم خوشی کے نشے میں اسے پہچان بھی نہ سکے اور وہ بڑے اطمینان سے
گندے پانی سے وضو کرا کے چلتا بنا۔ ہمارا بنا بنایا کھیل بگاڑ گیا۔"
"مجھ سے واقعی بھول ہو گئی، اگر میں ذرا سا غور کر لیتا تو اسے پہچاننا کوئی مشکل کام نہ تھا۔" ماموں
فرقان نے افسردہ لہجے میں کہا۔
"خیر افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے جو ہو گیا سو ہو گیا۔ میں ان کی دھمکیوں سے بالکل خوفزدہ
نہیں ہوں۔ کیا تم ہو؟" دادا غفور نے مسکرا کر پوچھا۔
"دادا غفور آپ جانتے ہیں کہ میں نے توڑنا سیکھا ہی نہیں۔ میں اپنی دھن کا پکا ہوں۔ زرا ٹھیک
ہو جاؤں پھر کرتا ہوں اس کے خلاف کارروائی۔"
"فرقان تم ایسا کرو کہ اسپتال چھوڑ دو۔" دادا غفور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"کیوں دادا؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔
"دنیا کا کوئی ڈاکٹر تمہارا علاج نہیں کر سکتا ہے، تمہارا مرض ایسا ہے کہ کوئی دوا کارگر نہیں ہو سکتی
تمہیں روحانی علاج کی ضرورت ہے۔ تمہیں میرے ساتھ میرے گھر چلنا ہو گا۔" دادا غفور نے ماموں
فرقان کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔"
پھر دادا غفور کمرے سے باہر نکلے، باہر سے باہر، اکبر اور عرفان کو بلا کر لائے وہ لوگ لان میں بیٹھے
ہوئے گپ لگا رہے تھے۔ دادا غفور کو دیکھ کر فوراً کھڑے ہو گئے۔

Urdufans.com

جب وہ لوگ قریب آ گئے تو دادا غفور نے باہر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "باہر وہ آئی تھی۔"

"کون ماموں؟" باہر کی تیوری پر بل پڑ گیا۔

"نیلم اور کون۔" دادا غفور نے کہا۔

"یہاں اسپتال میں، کہاں ہے وہ، کس کے ساتھ آئی تھی۔"

"وہ اکیلی تھا آئی تھی، اس حالت میں کہ نہ اس کے گلے میں دوپٹہ تھا اور نہ پاؤں میں چپل۔" دادا غفور نے بتایا۔ "اور آئی نہیں لائی گئی تھی۔"

"کون لایا تھا اسے؟" اس مرتبہ اکبر نے پوچھا۔

"وہ جو خود کو سپر پور کا کہتا ہے اور اپنے آپ کو زبردست گردانتا ہے۔" دادا غفور نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

اکبر نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا اسے نیلم کہیں نظر نہ آئی۔ اس نے پوچھا۔ "دادا، نیلم کہاں ہے؟"

"جو لایا تھا، وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔" دادا غفور نے بتایا۔

"وہ ہم لوگوں کو بہت دھمکیاں دے کر گیا ہے۔" ماموں فرقان بولے۔

پھر دادا غفور نے باہر، اکبر اور عرفان کو نیلم کے آنے کی پوری روداد سنا دی۔ سارے کے سارے سناٹے میں آ گئے۔

"عرفان!" دادا غفور نے کچھ دیر کے بعد سناٹا توڑا۔

"جی، دادا۔" عرفان نے بڑی فرمانبرداری سے کہا۔

"تمہارے باپ کو اسپتال سے شفٹ کرنا ہے۔" دادا غفور بولے۔

"کہاں دادا؟" عرفان نے پوچھا۔

"میرے گھر۔" دادا غفور نے بتایا۔

"جی ٹھیک ہے۔"

"لیکن کیوں دادا، ماموں فرقان کی حالت ایسی نہیں ہے کہ انہیں گھر لے جایا جائے۔ ان کا ڈاکٹروں کے سامنے رہنا بہت ضروری ہے۔" باہر نے مداخلت کی۔

"یہ کیس ڈاکٹروں کے بس کا نہیں ہے، باہر۔" دادا غفور نے بڑے وثوق سے کہا۔

"پھر کس کے بس کا ہے۔" باہر نے پوچھا۔

"یہ میرے بس کا ہے، اسے میں ٹھیک کروں گا، یہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے دادا جیسی آپ کی مرضی۔ اکبر اور عرفان تم دونوں ماموں کو دادا کے گھر چھوڑ آؤ۔" باہر نے کہا۔

ماموں فرقان کو دادا غفور کے یہاں چھوڑ کر جب اکبر اپنے گھر لوٹا تو رات اپنی زلف کھول چکی تھی اس نے گیٹ پر گاڑی روک کر مخصوص انداز میں ہارن بجایا۔

تھوڑی دیر بعد گیٹ کھولنے کی آواز آئی پھر کسی نے گیٹ کھول دیا۔

Urdufans.com

ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اکبر نے دیکھا کہ نیلم سامنے کھڑی ہے وہ کالی شال اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کالی شال میں اس کا سفید چہرہ جگمگا رہا تھا۔ اکبر اس کے چہرے کے حسن میں کھو کر رہ گیا۔ وہ گاڑی اندر لانا بھی بھول گیا۔

تب نیلم نے حیرت سے کہا۔ "کیا ہوا گاڑی اندر لائیے نا۔"

"اوہ" جیسے ہوش میں آگیا پھر تھوڑی سی گاڑی اندر لاکر اس نے نیلم کے پاس روکی۔ نیلم گیٹ بند کرنے کے انتظار میں کھڑی تھی لیکن گاڑی ابھی پوری اندر نہ آئی، وہ گیٹ بند نہیں کر سکتی تھی۔

"کیا ہوا، یہاں کیوں رک گئے، گاڑی آگے بڑھائیے نا۔" نیلم نے ہنس کر کہا۔

"گاڑی تو بہت آگے بڑھ چکی ہے۔" اکبر نے عجیب انداز میں کہا۔

"کہاں آگے بڑھی ہے، گاڑی تو گیٹ میں اٹکی ہوئی ہے۔" نیلم نے مسکرا کر کہا۔

تب اکبر نے اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے گاڑی آگے بڑھائی۔ نیلم نے گیٹ بند کیا وہ واپس آئی تو اکبر اس کا منتظر تھا۔

"نیلم تم دو گھنٹے پہلے کیا گھر سے نکلی تھیں۔" اکبر نے پوچھا۔

"نہیں تو، آپ گھر سے نکلنے کی بات کر رہے ہیں، میں تو اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔" نیلم نے سادگی سے جواب دیا۔

"تمہیں اس بات کا پکا یقین ہے کہ تم گھر سے باہر نہیں نکلیں؟" اکبر نے پھر پوچھا۔

"اکبر آپ کو کیا ہو گیا ہے، کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" نیلم نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ اس کے لہجے کی سچائی بتا رہی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی ہے۔

اکبر نے پھر کچھ نہ کہا، خاموشی سے گھر میں داخل ہو گیا۔ پھر اس نے فرداً فرداً اشدہ اور صابرہ سے پوچھا۔ انہوں نے بھی نہ صرف نیلم کے باہر جانے کی تردید کی بلکہ حیرت کا اظہار کیا۔

اکبر چکرا کر رہ گیا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ جب نیلم گھر سے نکلی ہی نہیں تو پھر اسپتال پہنچنے والی نیلم کون تھی۔

یہی کیا، اب تک ہونے والی باتوں میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو سمجھ میں آجاتی۔

گھر میں پیش آنے والے واقعات عقل سے بالاتر تھے کوئی بات عقل میں نہیں آرہی تھی۔

دادا غفور، ماموں فرقان کو اسپتال سے نکال کر اپنے گھر لے گئے تھے۔ لوگ مریضوں کو گھر سے اسپتال پہنچاتے ہیں لیکن وہ مریض کو اسپتال سے گھر لے گئے تھے۔

گھر لے جاکر انہوں نے ماموں فرقان کو اپنے کمرے میں رکھا۔ ماموں فرقان کے جسم سے اتنی بدبو آرہی تھی کہ پاس کھڑا ہونا مشکل تھا۔ خود فرقان ماموں اپنے جسم کی بدبو سے سخت پریشان تھے لیکن دادا غفور نے اس بدبو کی ذرہ بھر پروا نہ کی۔ وہ بڑے آرام سے ان کے پاس بیٹھے تھے۔

انہوں نے کہیں سے نیم کے پتے منگوائے تھے نیم کے پتے آگئے تو انہوں نے ان پتوں کو پانی میں ابلوایا پھر اس ابلے ہوئے پانی کو چھان کر ایک جگ میں بھروالیا۔

اب یہ شیشے کا جگ ان کے سامنے رکھا تھا اور وہ اپنی چوکی پر بیٹھے ایک ہزار دانوں والی تسبیح پر کچھ پڑھ

Urdufans.com

رہے تھے ایک جھٹکے تک وہ بڑے انہماک سے پڑھتے رہے پڑھنے کے دوران وہ گاہے گاہے نظر اٹھا کر ماموں فرقان کی طرف دیکھ لیتے تھے دونوں کی نظریں ملتیں تو دادا غفور مسکرا اٹھتے۔ انہیں مسکراتے دیکھ کر ماموں فرقان کو زبردستی مسکرانا پڑتا۔ وہ اپنے جسم سے اٹھتی بدبو سے سخت بیزار ہو رہے تھے۔

دادا غفور نے تسبیح پھیرنے کے بعد پانی سے بھرا بگ اپنے سامنے کیا۔ پھر اس پر تین پھونکیں مار دیں۔

اس پڑھے ہوئے پانی سے انہوں نے آدھا گلاس بھرا اور ماموں فرقان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"لو فرقان۔ یہ پانی پی لو۔"

ماموں فرقان کے ہاتھ پر کئی داغ پڑے ہوئے تھے۔ ان سے پانی رس رہا تھا ماموں فرقان نے پہلے گلاس لینے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا پھر کچھ سوچ کر رک گئے اور بولے "دادا گلاس گندا ہو جائے گا۔ آپ مجھے خود ہی پلا دیں۔"

"لاؤ میں خود ہی پلا دیتا ہوں ذرا اپنی گردن اونچی کر لو۔" دادا غفور نے بڑی محبت سے کہا۔

ماموں فرقان نے اپنی گردن اٹھا کر وہ آدھا گلاس پڑھا ہوا پانی غٹا غٹ پی لیا۔

پانی پی کر انہیں بڑا سکون ملا۔ ان داغوں میں جو شدید قسم کی خارش ہو رہی تھی وہ فوراً بند ہو گئی۔

پھر دادا غفور نے ان کے نہانے کے لئے پانی گرم کروایا۔ اس گرم پانی میں انہوں نے جگ سے ایک گلاس پانی نکال کر اس میں ملا دیا اور فرقان ماموں کو ہدایت کی۔ "جاؤ۔ فرقان نہاؤ۔"

دادا غفور نے اپنے کپڑے غسلخانے میں لٹکا دیئے دونوں کے جسم تقریباً ایک جیسے تھے۔

ماموں فرقان اس گرم پانی سے خوب اچھی طرح نہائے۔ دادا غفور نے صابن لگانے سے منع کر دیا تھا اس لئے انہوں نے جسم پر صابن نہ لگایا۔

نہاتے ہی ان کے جسم میں تازگی سی آ گئی۔ انہوں نے اپنے جسم کو ایک تولیہ سے بہت احتیاط سے خشک کیا اور دادا غفور کے کپڑے پہن کر باہر آ گئے انہوں نے اپنے کپڑوں کو وہیں چھوڑ دیا۔

دادا غفور نے غسلخانے میں جا کر ماموں فرقان کے کپڑوں کو زمین پر رکھا اور دیا سلائی دکھا دی۔ کپڑے خشک تھے لیکن پھر بھی ان کپڑوں نے آگ نہ پکڑی۔ تھوڑے جلتے۔ پھر بجھ جاتے اور آگ کی جگہ دھواں رہ جاتا۔ کوشش کے باوجود جب ان کپڑوں نے آگ نہ پکڑی محض سلگ سلگ کر رہ گئے تو دادا غفور نے اندر سے مٹی کا تیل منگا کر ان کپڑوں پر چھڑک دیا اور پھر دیا سلائی دکھا دی۔

ماموں فرقان کے کپڑے جل اٹھے۔ دادا غفور نے ان کپڑوں کو ایک ڈنڈے کی نوک سے پلٹ پلٹ کر انہیں اچھی طرح جلا دیا کچھ دیر کے بعد وہاں جلے ہوئے کپڑوں کی راکھ رہ گئی۔

دادا غفور نے ان جلے ہوئے کپڑوں کی راکھ کو سمیٹا اور پھر ایک پلاسٹک کی تھیلی میں بھر لیا اور ماموں فرقان سے یہ کہہ کر میں ابھی آتا ہوں باہر نکل گئے۔

پلے ہوئے گیہوں کی راکھ کی جیسی انہوں نے گندے نالے میں پھینکی اور پھر وہ اپنے فلیٹ میں آ گئے۔

دادا غفور کمرے میں آئے تو انہوں نے ماموں فرقان کو بیڈ پر بیٹھا ہوا پایا۔ ماموں فرقان کے چہرے پر صفحہ تک پڑ گئی تھی اور رستے ہوئے زخم ایک دم خشک ہو گئے تھے۔ اب ان زخموں سے بہنا نہیں تھا۔ تھی۔ ماموں فرقان کے چہرے پر تازگی تھی۔

"داوا آپ نے تو کمال کر دیا۔" ماموں فرقان اب بولنے حال میں تھے؟" داوا غفور نے خوش مزاجی سے کہا

"ہاں، بھئی فرقان، ایسی کیا بات ہے۔ تم سے بھلا کیوں چھپاؤں گا۔" داوا غفور بولے۔

"اچھا۔" داوا غفور خوش ہو کر بولے۔ "بس تم وقفے وقفے سے جگ کا پانی پیتے رہو تمہارے زخم پر جو یہ داغ نظر آ رہے ہیں وہ جاتے رہیں گے۔"

"داوا آپ نے کیا پڑھا ہے مجھے بتائیں؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"ہاں بتا دوں گا۔ پہلے تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ۔ پھر بتا دوں گا۔"

"اس کا مطلب ہے آپ ٹال رہے ہیں مجھے بتانا نہیں چاہتے۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"ارے نہیں، فرقان، ایسی کیا بات ہے۔ تم سے بھلا کیوں چھپاؤں گا۔" داوا غفور بولے۔

"پھر بتائیں نا۔" ماموں فرقان نے ضد کی۔

"ارے بھئی اتنے بے صبرے نہ بنو تمہارے یہاں سے جانے سے پہلے تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔"

پھر ماموں فرقان نے زیادہ ضد نہ کی۔ انہیں معلوم تھا کہ داوا غفور نے بتانے کا وعدہ کر لیا ہے تو ضرور بتا دیں گے۔ ان پر خواہ مخواہ دباؤ ڈالنا، اصرار کرنا بے سود تھا۔

کھانے سے فارغ ہوئے تو بابر کا فون آ گیا۔ داوا غفور نے علیک سلیک کر کے ریسیور ماموں فرقان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ماموں فرقان نے ساری روداد بابر کو سنائی۔ ان کی صحت یابی سے بابر بہت خوش ہوا پھر فرداً فرداً سب نے بات کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں اکبر، صابرہ اور راشدہ کو اپنے بارے میں از سر نو بتانا پڑا۔

گلشن سے رابطہ منقطع ہوا تو عزیز آباد سے فون آ گیا۔

عرفان بہت پریشان تھا وہ مسلسل فون ملانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مسلسل انگیج مل رہا تھا اب وہ آخری بار ملا رہا تھا کہ ایک دم لائن مل گئی۔

گھر پر سب پریشان تھے اگرچہ داوا غفور نے عرفان سے کہہ دیا تھا کہ وہ اطمینان سے فرقان کو چھوڑ کر چلا جائے اور وہ اطمینان سے گھر چلا بھی گیا تھا لیکن گھر پر ممانی ریحانہ کو قرار نہ آیا۔

وہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح اپنے شوہر کی خیریت معلوم ہو جائے کیونکہ جس تیزی سے مرض بڑھ رہا تھا وہ انتہائی باعث تشویش تھا۔

بہرحال جب ممانی ریحانہ کی ماموں فرقان سے بات ہو گئی اور انہیں یہ معلوم ہوا کہ دو گھنٹے کے اندر ان کی کایا پلٹ گئی ہے۔ زخموں سے پانی رسنا بند ہو گیا ہے۔ جسم کی بدبو ختم ہو گئی ہے تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔

Urdufans.com

رات بھر ماموں فرقان سکون سے سوئے لیکن دادا غفور شاید ساری رات جاگتے رہے ان کی جب آنکھ کھلتی وہ دادا غفور کو سامنے چوکی پر بیٹھا پاتے۔ وہ کچھ پڑھ رہے ہوتے۔

جانے دادا غفور کب سوئے وہ رات بھر پڑھ پڑھ کر ماموں فرقان کے جسم پر پھونکیں مارتے رہے۔

صبح کو ماموں فرقان اٹھے تو بہت ہشاش بشاش تھے۔ اب ان کے جسم پر پڑے داغوں نے دھندلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ تیزی سے غائب ہو رہے تھے اسی تیزی سے جس تیزی سے وہ ابھرے تھے۔

صبح ہونے کے بعد ماموں فرقان نے جانا چاہا لیکن دادا غفور نے منع کر دیا۔ وہ بولے۔

"فرقان جانے کی ایسی کیا جلدی ہے۔ دکان تو تمہارے جائے بغیر بھی مکمل جائے گی پھر تمہارے دونوں سیلز مین بھی تمہارے بھروسے کے ہیں۔ اگر جانے کی بہت جلدی ہے تو شام تک چلے جانا۔"

ماموں فرقان، دادا غفور کی ہدایت پر رک گئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی ذرا سی غفلت سے مرض پھر پلٹ آئے۔

سہ پہر کو دادا غفور نے ایک تعویذ ان کے گلے میں لٹکایا ایک گنڈا بازو پر باندھا اور آدھا گلاس پڑھا ہوا پانی انہیں پلایا پھر بولے "فرقان اب تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔ میں نے تمہیں محفوظ کر دیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو اب یہ مرض پلٹ کر نہیں آئے گا۔ ہاں تین دن تک پڑھا ہوا پانی ضرور پیتے رہنا۔"

شام تک ان کے جسم کے داغ بہت حد تک غائب ہو گئے۔ بس اب کہیں کہیں ہلکے نشان باقی رہ گئے تھے۔ عرفان، ماموں فرقان کو لینے آیا تو وہ اپنے باپ کی حالت دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ کہاں ان کے جسم سے بدبو پھوٹ رہی تھی، زخم رس رہے تھے اور اب ایک ہی رات میں سب کچھ بدل گیا تھا نہ وہ زخم رہے تھے اور نہ بدبو۔ عرفان، ماموں فرقان کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

ماموں فرقان اور عرفان ابھی اپنے گھر پہنچے ہی تھے کہ ایک روح فرسا خبر سننے کو ملی۔

گھر پہنچ کر ماموں فرقان ابھی اپنے گھر والوں کو اپنے بارے میں بتا ہی رہے تھے کہ بیل بجی۔

بیل کی آواز سن کر شمسہ اٹھنے لگی تو ماموں فرقان نے اسے روک دیا اور عرفان سے مخاطب ہو کر بولے۔ "بیٹے آپ دیکھیں دروازے پر کون ہے؟"

عرفان فوراً ہی اٹھ گیا۔ اس نے جا کر گیٹ کھولا تو ایک پریشان شخص کو اپنے سامنے پایا۔

"جی فرمائیے۔" عرفان نے پوچھا۔

"ماموں فرقان گھر پر ہیں جی۔"

"ہاں، ہیں، آپ کا نام کیا ہے۔"

"میرا نام اشفاق ہے۔ میں دکان سے آیا ہوں، ذرا ماموں فرقان کو جلدی بلا دیجئے۔" اس پریشان شخص نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"اچھا آپ ٹھہریں میں ابھی انہیں بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر عرفان کمرے میں واپس آیا۔

"کون ہے بیٹا؟"

"ابو، کوئی اشفاق ہے کہہ رہا ہے دکان سے آیا ہوں۔ بہت پریشان دکھائی دے رہا ہے۔"

Urdufans.com

"اشفاق آیا ہے۔ اس وقت یہاں کیسے آگیا۔ اللہ رحم کرے۔" ماموں فرقان الجھن سے بولے۔

"عرفان ذرا تم بھی اپنے ابو کے ساتھ جاؤ۔ دیکھو کیا معاملہ ہے۔ یہ اشفاق کیوں آیا ہے۔" ریحانہ نے ماموں فرقان کے کمرے سے نکلنے کے بعد کہا۔

عرفان فوراً اٹھ کر بھاگا۔

اشفاق، ماموں فرقان کی دکان کا سیلز مین تھا۔ وہ اس پر بہت اعتماد کرتے تھے وہی گھر سے کچھ لے جاکر دکان کھولتا تھا اور رات کو گھر پہنچاتا تھا۔ ماموں فرقان مشکل سے چار پانچ گھنٹے دکان پر بیٹھتے تھے۔

ماموں فرقان کو دروازے پر دیکھ کر اشفاق کی عجیب کیفیت ہوگئی وہ بولنا چاہے تو بولا نہ جائے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ماموں فرقان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے ڈرائنگ روم میں لے آئے۔

عرفان کو پانی لانے کا اشارہ کیا۔

پانی پینے کے بعد اس میں کچھ ہمت پیدا ہوئی۔ تب ماموں فرقان نے کہا..... "ہاں، اب تم کیا معاملہ ہے۔ تم اتنے پریشان کیوں ہو۔"

"ماموں، بہت بڑا ہوا ہے۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیا ہوا۔" ماموں فرقان نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا۔

"ماموں، دکان میں آگ لگ گئی۔"

"آگ لگ گئی۔" ماموں فرقان کے ذہن میں سناٹا اترنے لگا۔ "مگر کیسے؟"

"بس جی بیٹھے بیٹھے، میں ایک خاتون کو کپڑا دکھا رہا تھا کہ اچانک تھان میں آگ لگ گئی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس مرتبہ عرفان بولا۔

"بس جی ایسا ہی ہوا ہے۔ میں نے ریشم کے تھان پر ایک شعلہ ضرور گرتے دیکھا تھا اس کے بعد فوراً ہی آگ بھڑک اٹھی اور آگ اتنی شدید تھی کہ ہم دکان سے ایک تھان بھی نہیں نکال سکے۔" اشفاق نے بڑے مردہ لہجے میں کہا۔

"پوری دکان جل گئی۔" عرفان نے پوچھا۔

"ہاں جی، پوری دکان جل کر خاک ہوگئی ہے۔"

"تو وہ اپنا کام کر گیا۔" ماموں فرقان نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس وقت ان کی آنکھوں کے سامنے نیلم آگئی تھی۔ اس کی غصیلی آواز ان کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ "تم لوگوں نے مجھے پانی کا بلبلہ سمجھ لیا ہے کہ پھونک مارو گے اور میں ہوا میں تحلیل ہو جاؤں گا۔ میں بہت زبردست جن ہوں۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ وہ تباہی پھیلے گی کہ دنیا دیکھے گی۔"

"وہ میری دکان میں شعلہ پھینک گیا تباہی پھیلا گیا، مجھے برباد کر گیا۔" ماموں فرقان آپ ہی آپ

Urdufans.com

بولے چلے جارہے تھے۔ ان کے لہجے میں بڑی اداسی تھی۔ بڑی دلسوزی تھی۔
ماموں فرقان کی دکان کیا جلی گویا ان کے دل کی دنیا اجڑ گئی۔ وہ لاکھوں کی پونجی میں آگئے۔ ایک تھوڑی بہت نقدی تھی یا وہ زیورات تھے جو انہوں نے خسر کیلئے بنوا کر رکھے تھے۔
اور ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ جو تھا وہ اتنا نہ تھا کہ دکان کو پھر سے بھر لیتے۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔
راشدہ نے حوصلہ دیا۔ "ابو جی۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں بینک سے قرض دلوادوں گا۔"
فرقان نے سنا تو وہ ماموں فرقان کے گھر آیا اس نے تسلی دی۔ "ماموں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو کتنے پیسے چاہئیں مجھے بتائیں۔"
بس یہ اللہ کا کرم تھا کہ وہ جس کے پاس جاتے جو بھی اس حادثے کے بارے میں سنتا فوراً ماموں کی مدد کے لئے تیار ہو جاتا۔ جن کپڑوں کی ملوں سے ان کا لین دین تھا ان کے مالکوں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ پریشان نہ ہونے کی تلقین کی اور کپڑا لے جانے کی پیشکش کی۔
پھر بازار والوں نے بھی حوصلہ بڑھایا۔ دکان داروں نے مل کر انہیں ایک موٹی رقم فراہم کرنے کی پیشکش کی۔ اتنی ڈھیر ساری ہمدردیاں پاکر ماموں فرقان کا حوصلہ دو چند ہو گیا وہ دکان چلنے کا غم بھول گئے۔
ایک ماہ کے اندر اندر انہوں نے دکان میں نیا رنگ و روغن کرالیا۔ دکان پہلے سے بھی کہیں خوبصورت نظر آنے لگی۔ کپڑا بھی خوب بھرا ہوا تھا۔
دکان کے افتتاح سے پہلے دادا غفور خود دکان پر آئے اور انہوں نے دو تین گھنٹے بیٹھ کر کچھ پڑھا تھا پھر دکان میں چاروں طرف کیلیں جڑ دیں تھی اب یہ دکان ہر طرح کی تخریب کاری سے محفوظ ہو گئی تھی۔
ماموں فرقان کو جو اس نے نقصان پہنچایا تھا ایک ماہ میں اس کی تلافی ہو گئی تھی۔ دادا غفور نے ماموں فرقان کو تباہ ہونے سے بچالیا تھا ورنہ اس نے برباد کرنے میں کسر کوئی نہ چھوڑی تھی۔
ماموں فرقان پر بس نہ چلنے یا ہونے والے نقصان کو برداشت کر لینے کے بعد اس نے ماموں کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ آج کل اس کی ساری توجہ نیلم پر تھی۔
ایک دن نیلم سہ پہر کو سو کر اٹھی تو اس نے اپنی سنگھار میز کے آئینے کے سامنے ایک لمبی اور موٹی موم بتی کو روشن دیکھا۔ موم بتی سرخ رنگ کی تھی اسے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ اس کے کمرے میں موم بتی کون روشن کر گیا۔
پہلے تو اس نے اٹھ کر موم بتی کو پھونک مار کر بجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اس کی پھونکوں سے نہ بجھی جیسے جیسے پھونک مارتی موم بتی کی لو ویسے ویسے اور بھڑک اٹھتی۔ پھر وہ جلتی موم بتی کو چھوڑ کر راشدہ کے پاس پہنچی اسے اپنے ساتھ کمرے میں بلا کر لائی۔
"کیا ہوا، کچھ بتاؤ تو۔" راستے میں راشدہ نے پوچھا.....
"کمرے میں چل کر تم خود دیکھ لو۔" نیلم نے سنجیدگی سے کہا۔

Urdufans.com

جب راشدہ نے نیلم کے کمرے میں قدم رکھا تو سب سے پہلے اس کی نظر جلتی موم بتی پر پڑی۔

"ارے۔ یہ موم بتی یہاں کس نے جلائی۔" راشدہ نے سوال کیا۔

"میں دکھانے میں تمہیں یہاں لائی تھی۔" نیلم نے کہا۔ "میں سمجھ رہی تھی کہ شاید موم بتی تم نے روشن کی ہو۔"

"نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ موم بتی کہاں سے آئی۔ اسے بجھا تو دو۔" یہ کہہ کر راشدہ آگے بڑھی۔

اس نے پہلے تو آہستہ سے ایک پھونک ماری۔ اس پھونک سے موم بتی کی لو محض جھلملا کر رہ گئی۔

پھر راشدہ نے ذرا زور سے پھونک ماری۔ اس کے بعد اس نے دو تین پھونکیں متواتر ماریں لیکن وہ جلتی موم بتی نہ بجھی۔ اس کی ہر پھونک پر موم بتی کی لو بھڑک کر رہ جاتی۔

"رہنے دو مت بجھاؤ۔" نیلم نے کسی انجانے خوف سے لرز کر کہا۔

"امی سے پوچھیں چل کر۔"

"ہاں چلو۔"

صابرہ کے علم میں جب یہ بات آئی تو نیلم کے کمرے میں کسی نے موم بتی روشن کر دی ہے اور وہ پھونک مارنے سے بھی نہیں بجھ رہی ہے تو وہ سہم گئی۔ اب وہ ایسی باتوں سے بہت ڈرنے لگی تھی وہ کمرے میں نہ گئی۔ اس نے نیلم سے کہا..... "بیٹی اپنے کمرے کا دروازہ بند کر آؤ۔ بابر اور اکبر آجائیں تو پھر دیکھیں گے۔"

"خالہ آپ تو راشدہ سے بھی زیادہ ڈرنے لگی ہیں۔" نیلم نے ہنس کر کہا۔

"ہاں بیٹی، ان باتوں سے ڈرنا ہی چاہئے۔ تجھے معلوم نہیں اس نے میرا کیا حشر کیا تھا پھر ماموں فرقان کے ساتھ کیا ہوا۔" صابرہ نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کی۔ "توبہ میری۔"

"خالہ، وہ ایک موم بتی ہے جو جل رہی ہے۔"

"موم بتی ہے تو بجھانے سے بجھتی کیوں نہیں۔" صابرہ نے چمک کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اچھی والی موم بتی ہے اسے بجھانے کے لئے زوردار پھونک چاہئے۔"

"وہ موم بتی تمہاری سنگھار میز پر رکھی کس نے اور جلائی کیوں۔" صابرہ نے پھر سوال کیا۔

"ہاں، یہ سوال آپ کا بجا ہے، یہ بات میری بھی سمجھ میں نہیں آرہی۔ اکبر بھی گھر میں نہیں ہیں جو ان پر شبہ کر لیا جاتا کہ شاید انہوں نے رکھی ہو۔"

"اکبر اور بابر تو صبح کے نکلے ہوئے ہیں۔"

"آؤ راشدہ ذرا دوبارہ چل کر دیکھتے ہیں کہ موم بتی بجھ گئی یا جل رہی ہے۔"

"نیلم آپ کو ڈر نہیں لگ رہا۔"

"موم بتی سے کیا ڈرنا۔"

"جانے وہ کس نے رکھی ہو۔"

"کسی نے بھی رکھی ہو؟ ہے تو موم بتی۔" نیلم نے خلاف توقع بے خوفی کا مظاہرہ کیا میں دیکھتی ہوں

ساجدہ اور راشدہ نے اسے جانے سے روکنا بھی چاہا مگر روک نہ سکیں۔ دونوں کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔

نیلم بڑے اطمینان سے اپنے کمرے کی طرف چلی۔

جب اس نے کمرے کے دروازے میں قدم رکھا تو حیران رہ گئی۔

وہ کیا مسحور کن خوشبو تھی۔

ایسی خوشبو کہ دماغ تک معطر ہو جائے۔ روح سرشار ہو جائے۔ جسم جھومنے لگے۔ رقص میں آ جائے۔

حسین خوشبو اس موم بتی سے آ رہی تھی جو اب بجھ چکی تھی۔ اس بجھی ہوئی شمع سے اگر بتی کی طرح دھواں اٹھ رہا تھا اور خوشبو پورے کمرے میں پھیل رہی تھی۔

اس سحر انگیز خوشبو نے نیلم پر ایسا جادو کیا کہ وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح کمرے میں داخل ہو گئی۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کمرے میں کیوں آئی تھی۔ کیا دیکھنے آئی تھی۔

نیلم ابھی سنگھار میز کے قریب ہی پہنچی تھی کہ کمرے کا دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ نیلم نے کوئی خیال نہ کیا۔ وہ الجھن کا شکار ہوئی نہ ڈری۔ اس کے دل و دماغ پر بس خوشبو نے بسیرا کر لیا تھا۔

وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ وہ بے خود ہوئی جاتی تھی اس پر نشہ سا طاری تھا۔ کیف آگیں لمحات اس کے دل پر ساون بھادوں کی طرح برس رہے تھے۔

وہ نشے میں جھومتی ہوئی بیڈ کی طرف بڑھی اور اس پر شہزادیوں کی طرح نیم دراز ہو گئی۔

سنگھار میز کے شفاف آئینے میں اسے اپنا پورا سراپا نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی قاتل آنکھوں سے خود کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک حسین دوشیزہ تھی لیکن اس وقت وہ بے حد حسین لگ رہی تھی اس قدر حسین کہ اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھے اور اپنے آپ کو چوم لے۔

پورے کمرے میں ہلکا ہلکا دھواں بھر چکا تھا۔ یہ حیرت کی بات تھی کہ اس دھوئیں سے دم نہیں گھٹ رہا تھا بلکہ یہ جی چاہ رہا تھا کہ لمبے لمبے سانس لے کر اس دھوئیں کو زیادہ سے زیادہ اپنے سینے میں اتار لیا جائے۔

آئینہ دیکھتے دیکھتے نیلم کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی آئینے میں ہے۔ وہ جو بھی تھا سفید ریشمی لباس میں تھا اور بہت پرکشش تھا۔

نیلم پر سرشاری طاری تھی اس نے اپنی نیم باز آنکھوں سے دیکھا۔ اسے ذرا بھی ڈر محسوس نہ ہوا وہ کون ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے اس نے پلٹ کر دیکھا لیکن ادھر کوئی نہ تھا۔

نیلم نے پھر آئینے کی جانب دیکھا، وہاں وہ موجود تھا اس مرتبہ وہ نیلم کو دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا تھا۔

نیلم نے پھر پلٹ کر دیکھا، وہاں کوئی موجود نہ تھا اور جب دوبارہ آئینے پر نظر ڈالی تو وہ وہاں کھڑا تھا وہ جو کوئی بھی تھا صرف آئینے کے اندر تھا، کمرے میں موجود نہ تھا۔

کمرے میں ہلکا ہلکا دھواں پھیلا ہوا تھا، کمرے کے گوشے گوشے میں خوشبو بسی ہوئی تھی۔ بڑا خواب آگیں ماحول تھا۔ اس دل موہنے والے ماحول میں کوئی پس منظر میں کھڑا مسکرا رہا تھا اس کا دھندلا دھندلا

Urdufans.com

وجود دل و دماغ پر چھا رہا تھا۔

نیلم نے آئینے پر نظریں گاڑ دیں۔ تب اس بت کافر نے جنبش کھائی وہ آئینے میں آگے کی طرف جھکا اس کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ تھی اور کالی سیاہ آنکھوں میں بیرے کی چمک تھی۔ پھر وہ آئینے سے اس طرح نکلا جیسے کوئی دروازے سے نکلتا ہے۔

وہ آئینے سے نکل کر اب بالکل اس کے مقابل آگیا۔

وہ چھ فٹ کا ایک پُروقار مرد تھا۔ سر پر سفید صافہ۔ گلے میں سچے موتیوں کی مالا۔ صاف پر دکھتا ہوا چہرا۔ چہرے کے یونانی نقوش۔ وہ کسی ملک کا شہزادہ معلوم ہو رہا تھا۔

نیلم نے اسے دیکھا تو بس دیکھتی رہ گئی۔ ایسا حسین مرد اس نے اپنی زندگی میں نہ دیکھا تھا وہ اس کی وجاہت میں گم ہو گئی۔ اس پُرکشش اور پُروقار شخصیت میں کھو گئی۔

وہ اسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی وہ جیسے پلکیں جھپکانا بھول گئی تھی۔ پتھر کی ہو گئی تھی۔

"کیا بات ہے۔ مجھے بیٹھنے کو بھی نہیں کہیں گی۔" شہزادہ بولا۔ وہ بولا کیا یوں سمجھو کہ دور تک گھنٹیاں بجتی چلی گئیں۔ ایسی سحر انگیز آواز اس نے کاہے کو سنی تھی۔

"جی۔" وہ ایک دم چونک اٹھی اس کی محویت ٹوٹی تب اسے احساس ہوا کہ وہ اس جوان رعنا کی سحر انگیز شخصیت میں کھو گئی تھی۔ اسے شرم آئی اسے اپنی محویت پر بڑی ندامت ہوئی۔ وہ لڑکی ہو کر اسے اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے لڑکے دیکھتے ہیں۔

"جی کیا۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مجھے بیٹھنے کو بھی نہیں کہیں گی۔"

"ہاں آپ بیٹھئے نا۔" نیلم نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

"کہاں بیٹھوں؟" اس نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"وہ کرسی لے لیجئے۔" نیلم نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے دیوار سے لگی کرسی کو پکڑ کر اٹھایا اور بیڈ کے نزدیک لا کر رکھ دی۔ پھر وہ شہزادوں کی طرح اس پر بیٹھ گیا۔ بڑی تمکنت۔ بڑی شان سے۔

"کون ہیں آپ؟" نیلم نے بڑی ملائیت سے پوچھا۔

"مجھے جانتی نہیں؟" شہزادے نے تھوڑی سے حیرت سے کہا۔

"نہیں۔ جانتی ہوتی تو پوچھتی کیوں۔" نیلم نے سادگی سے جواب دیا۔

"میرے بارے میں جاننا چاہتی ہیں؟" شہزادے نے سوال کیا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"ہوں۔" نیلم نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیوں آخر؟" پھر سوال ہوا۔

"مجھے نہیں معلوم کیوں۔ لیکن میں جاننا چاہتی ہوں۔" نیلم نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں آپ کو اچھا لگا ہوں۔" شہزادے نے اپنی چمکتی آنکھوں سے نیلم کو دیکھا۔

"شاید۔" نیلم نے سحر زدہ انداز میں کہا۔

"کیا واقعی؟" یہ سن کر شہزادہ ایک دم کھل اٹھا۔ "میں بڑا خوش نصیب ہوں۔"
"میں اس میں خوش نصیبی کی کیا بات ہے؟"
"میں اصل میں آپ کے سامنے ڈرتا ڈرتا آیا تھا۔ جانے کیا ہو۔ آپ کہیں مجھے ناپسند نہ کر دیں۔"
"قرب سے منہ پھیر لیں۔"
"قرب سے نفرت کیوں کروں گی بھلا۔"
"میں آپ سے بس ایک خوف سا تھا۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔
"میرے دل میں بس ایک خوف ہے۔"
"اب تو وہ خوف آپ کے دل میں نہ رہا۔"
"اب نہیں۔" وہ مسکرایا۔
"نہیں، اب نہیں۔" نیلم نے پوچھا۔
"آپ کا نام کیا ہے؟"
"میرا نام قرل ہے۔"
"قرل کا نام ہوا بھلا؟" نیلم نے حیران ہو کر سوال کیا۔
"یہ کیا نام آیا۔" وہ بولا۔
"پسند نہیں آیا۔" نیلم نے ملائمیت سے کہا۔
"کچھ عجیب سا ہے۔ کیا معنی ہوئے بھلا اس کے۔" نیلم نے ملائمیت سے کہا۔
"آپ کی دنیا میں سب سے زیادہ کیا چیز چمکتی ہے؟"
"میری دنیا میں۔" نیلم نے ایک لمحے کو سوچا پھر بولی۔ "سورج"۔
"قرل کے معنی سورج ہی کے ہیں آپ ٹھیک سمجھیں۔"
"میں نے اس طرح کا نام پہلی بار سنا ہے۔"
"آپ ٹھیک کہتی ہیں، آپ کی دنیا میں اس طرح کے نام کہاں ہوتے ہیں۔"
"یہ آپ میری دنیا، میری دنیا کیا کر رہے ہیں، کیا آپ اس دنیا کے نہیں ہیں۔"
"نہیں، میں اس دنیا کا نہیں ہوں لیکن آپ کی دنیا میں بسنا ضرور چاہتا ہوں۔"
"میری دنیا میں بسنا چاہتے ہیں۔" نیلم نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا اگر میری دنیا میں بسنا تھا تو پہلے آئے ہوتے۔"
"کیوں اب کیا ہوا؟"
"میری دنیا بس چکی ہے، میری شادی ہو چکی ہے۔" نیلم نے وضاحت کی۔
"ہاں، جانتا ہوں لیکن میں اس شادی کو مانتا نہیں، ویسے آپ نے شادی کرنے میں بہت جلدی کی، میرا انتظار بھی نہ کیا۔"
"مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ آئیں گے۔" وہ کیا کہہ رہی تھی، اسے معلوم نہ تھا۔
"اگر آپ کو معلوم ہوتا کہ میں آؤں گا تو آپ میرا انتظار کرتیں۔"
"شاید۔" نیلم نے اپنی مخمور نگاہوں سے اسے دیکھا۔
"یہ بات آپ یقین سے نہیں کہیں گی، خیر آپ اقرار کریں نہ کریں لیکن میں اپنی محبت کا اقرار کرتا ہوں۔" شہزادے نے بڑے والہانہ انداز میں کہا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کو کب سے

جانتا ہوں۔"

"نہیں مجھے معلوم نہیں۔"

"میں نے آپ کو پہلی بار سید پور کی ایک گلی میں دیکھا تھا۔ آپ کی حسین صورت دیکھ کر میں اپنے آپ میں نہ رہا۔ آپ کی دلکش چال کو دیکھ کر میں اپنا آپ بھول گیا۔ آپ کی زلف کا اسیر ہو گیا۔"

"لیکن آپ تو مجھے سید پور میں کہیں نظر نہیں آئے۔"

"میں آپ کے ساتھ ساتھ رہا۔ آپ کے بہت قریب لیکن آپ نے توجہ ہی نہ دی۔" اس نے شکوہ کیا۔

"یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ مجھے نظر آتے اور میں آپ کو نظر انداز کر دیتی، آپ اتنے خوبصورت شخص ہیں کہ دنیا کی کوئی لڑکی آپ کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔"

"کبھی اپنے بارے میں بھی غور کیا ہے۔"

"میں تو ایک معمولی سی لڑکی ہوں، ایک عام سی۔"

"آپ نے مجھے محصور کیا ہے اور مجھے حصار میں لینے والی لڑکی کبھی عام میں نہیں ہو سکتی۔ نیلم تم بہت خوبصورت ہو، تم میرے دل میں بس چکی ہو، تمہیں اب مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ تمہیں اب کوئی نہیں چھو سکتا۔" قرل آپ سے تم پر آ گیا۔ اس نے اسے اس کے نام سے مخاطب کیا۔

نیلم کو اپنا نام سن کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ اپنی پلکوں کا شامیانہ اٹھا کر بولی۔ "آپ میرے نام سے بھی واقف ہیں۔"

"میں نے کہا نا کہ میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے، تمہارے ساتھ ساتھ ہوں۔"

"حیرت ہے۔ آپ چھ ماہ سے میرے ساتھ ہیں اور کبھی نظر نہیں آئے۔"

قرل ابھی جواب میں کچھ کہنے والا تھا کہ دروازے پر بڑے زور سے دستک ہوئی۔

دستک کی آواز سن کر وہ کھڑا ہو گیا اور پھر آئینے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "اچھا نیلم اب ہم چلتے ہیں، جاتے جاتے میں اپنی محبت کی شمع جلائے جاتا ہوں۔ وہ دیکھو۔" یہ کہہ کر قرل نے ہاتھ اٹھایا۔

اس کا ہاتھ اٹھتے ہی سنگھار میز پر رکھی ہوئی موم بتی جل اٹھی۔

"یہ موم بتی میں نے یہاں رکھی تھی یہ میری محبت کی مظہر ہے اس شمع کو کوئی نہیں بجھا سکتا، جس طرح تمہاری محبت کو کوئی میرے دل سے نہیں نکال سکتا۔ اس شمع کو کمرے سے باہر نہ لے جانا۔ اسے بجھانے کی کوشش نہ کرنا، یہ شمع محبت میں نے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے روشن کر دی ہے۔"

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں، پھر ملیں گے۔" یہ کہہ کر قرل آئینے کی طرف بڑھا اور آئینے میں داخل ہو کر غائب ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد نیلم دروازے کی طرف بڑھی اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور دروازے پر

اکبر مسکرا اٹھا۔ اس مسکراہٹ میں عجیب پراسراریت تھی۔ اکبر مسکراہٹ کی اس تہہ تک نیلم اکبر کو دیکھ کر مسکرائی۔ اس وقت نیلم کے چہرے پر ایک ایسی چمک تھی جسے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا پہنچے بغیر نہ رہ سکا۔

نیلم نے اکبر کو دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا۔ وہ اندر آیا اور بولا۔ "یہ خوشبو کیسی ہے، بڑی مسحور کن ہے۔"

نیلم نے کوئی جواب نہ دیا وہ خاموشی سے بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔

"نیلم تم کمرے میں موم بتی دیکھنے آئی تھیں۔ پھر یہیں رہ گئیں، تم نے دروازہ بھی بند کرلیا کیا کررہی تھیں دروازہ بند کرکے۔" اکبر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کب آئے شوروم سے۔" نیلم نے اس کے سوال کا جواب گول کرکے اپنا سوال کردیا۔

"ابھی آیا ہوں۔ گھر آیا تو موم بتی کا قصہ معلوم ہوا۔ تمہارے بارے میں میں نے پوچھا تو امی نے بتایا کہ تم کمرے میں ہو۔ میں یہاں آیا تو کمرے کا دروازہ بند تھا۔" پھر اس کی نظر موم بتی پر پڑی۔ "ارے یہ تو جل رہی ہے۔"

"ہاں، اکبر یہ اب جلتی رہے گی۔ اسے اب کوئی نہیں بجھا سکتا ہے۔" نیلم نے عجیب لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب نیلم میں سمجھا نہیں۔" اکبر کے سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"میں نے کہا ہے اس شمع کو اب کوئی نہیں بجھا سکتا یہ جلتی رہے گی۔"

"میں بھی یہی پوچھ رہا ہوں کہ یہ کیا بات ہوئی بھلا یہ موم بتی کتنی دیر جلے گی، گھنٹے دو گھنٹے۔ اس کے بعد خود بخود بجھ جائے گی، لیکن تم کہہ رہی ہو کہ یہ جلتی رہے گی۔" اکبر نے کہا۔

"نہیں یہ عام موم بتی نہیں ہے۔" نیلم پراسرار لہجے میں بولی۔

"اسے لایا کون، یہ سنگھار میز پر آئی کس طرح کچھ پتہ چلا۔" اکبر نے پوچھا۔

"ہاں، مجھے سب معلوم ہوگیا ہے۔"

"ذرا مجھے بھی بتاؤ۔" اکبر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں کچھ بتا نہیں سکتی، مجھے کچھ نہیں معلوم۔" نیلم نے تشکیک بھرے لہجے میں کہا۔

"نیلم تم آج کیسی بہکی بہکی بات کررہی ہو، تمہیں کیا ہوگیا۔"

"مجھے تو کچھ نہیں ہوا، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" نیلم نے سنبھل کر کہا۔

"اچھا۔" اکبر نے طنزیہ انداز میں کہا اور خاموشی سے موم بتی کی طرف بڑھا۔

موم بتی کے قریب پہنچ کر اس نے اس کا معائنہ کیا وہ تقریباً ایک فٹ لمبی تھی۔ گولائی دو انچ رہی ہوگی۔ اس کا رنگ سرخ تھا وہ کافی دیر سے جل رہی تھی لیکن ایک قطرہ موم بھی نہیں پگھلا تھا۔

اس نے جھک کر پھونک ماری پہلے آہستہ سے، پھر زور سے لیکن موم بتی کا کچھ نہ بگڑا۔ اس کی

Urdufanz.com

پھونک کے ساتھ جھلملائی اور پھر سیدھی ہو گئی۔

اکبر کو بڑی حیرت ہوئی پھر اس نے لگاتار جلدی جلدی پھونکیں ماریں لیکن تجربہ وہی ڈھاک کے تین پات والا نکلا۔ پھونکوں سے وہ شمع بجھائی نہ گئی۔

اکبر اب سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے نیلم کی طرف دیکھا جو بڑے اطمینان سے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اکبر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نشے میں ہے اس کی آنکھوں میں لال لال ڈورے تیر رہے تھے۔ وہ نیلم کے قریب آکر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ نیلم غیر ارادی طور پر تھوڑا سا پرے کھسک گئی۔

"نیلم یہ سب کیا ہے۔ تم بولتی کیوں نہیں۔" اکبر کے لہجے میں بڑی الجھن تھی۔

"کیا بولوں۔ اکبر میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ اس شمع کو اب کوئی نہیں بجھا سکے گا۔" نیلم نے بڑے یقین سے کہا۔

"میں اسے بجھا کر چھوڑوں گا۔" اکبر کو بھی غصہ آگیا۔

"تو پھر اور کوشش کر دیکھو۔" نیلم نے اسے چیلنج کیا۔

"ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر اکبر کمرے سے نکل گیا۔ وہ سیدھا باورچی خانے میں گیا وہاں سے اسٹیل کی ایک پلیٹ اٹھائی اور فوراً واپس کمرے میں آگیا۔

راشدہ اور صابرہ نے اسے پلیٹ لے جاتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے ہولیں۔

اکبر نے سنگھار میز کے قریب پہنچ کر وہ اسٹیل کی پلیٹ اس موم بتی کے اوپر رکھ دی چند سیکنڈ کے بعد اٹھائی تو دبی ہوئی لو پھر سیدھی ہو گئی۔ موم بتی بدستور جلتی رہی پھر اس کی نظر اسٹیل کی پلیٹ پر پڑی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پلیٹ میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہو گیا تھا۔ موم بتی کی لو اس قدر تیز تھی کہ چند سیکنڈوں میں اس نے اسٹیل کو پگھلا کر رکھ دیا۔

اکبر نے چاہا کہ اس پلیٹ کو موم بتی پر کھینچ مارے لیکن صابرہ نے اس کے ارادے کو بھانپ لیا اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور گھبرا کر بولی۔ "نہیں بیٹا ایسا مت کرنا اگر یہ موم بتی پلیٹ لگنے کی وجہ سے سنگھار میز پر گر گئی تو یاد رکھو سنگھار میز جل کر راکھ ہو جائے گی۔ پورا گھر آگ کی لپیٹ میں آجائے گا۔"

"پھر امی میں ایسا کرتا ہوں کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک آتا ہوں۔" اکبر غصے میں بولا۔

"نہیں۔" نیلم ایک دم تڑپ کر بولی۔ "اس موم بتی کو کمرے سے باہر نہ لے جانا۔" اس کے لہجے میں خوف تھا۔

"کیوں۔" اکبر نے حیرت سے نیلم کو دیکھا۔ "کیا ہو جائے گا۔"

"کچھ نہیں معلوم کیا ہو جائے۔" نیلم کانپ اٹھی۔

"کیا عورتوں والی بات کرتی ہو۔" اکبر نے قدرے غصے سے کہا۔ "میں ابھی اسے اٹھا کر باہر پھینکتا ہوں۔"

"رہنے دو اکبر جب نیلم منع کر رہی ہے تو مان جاؤ۔" اس مرتبہ صابرہ نے کہا وہ لرز رہی تھی۔

"ارے امی کیا بات کرتی ہیں۔ آپ بھی نیلم کی باتوں میں آگئیں۔ یہ موم بتی ہے کوئی سانپ تو نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے موم بتی اٹھانے کیلئے ہاتھ میں پکڑلی۔

پھر وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا اس کی انگلیاں بری طرح جھلس گئی تھیں یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے موم بتی نہیں کوئی لال انگارہ سلاخ پکڑی ہو۔

اس کی انگلیاں اس بری طرح جلی تھیں کہ انگلیوں کی چوٹی تک دکھائی دینے لگی تھی۔ شدید جلن ہو رہی تھی، اکبر کمرے سے باہر نکل آیا۔ صابرہ نے دواؤں کی الماری سے ایک ٹیوب نکالی اور مرہم اس کی انگلیوں پر مل دیا۔ مرہم لگانے کے بعد بھی کافی دیر تک جلن نہ گئی۔ اکبر پورے گھر میں ادھر ادھر ٹہلتا پھرا اسے کسی کل چین نہ تھا پھر بہت دیر بعد اس کی جلن کم ہوئی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ صبح تک اس کی انگلیوں کے زخم بالکل ٹھیک ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد پھر کسی نے موم بتی کو ہاتھ لگانے کی کوشش نہ کی۔ اسے بجھانے کی کوشش نہ کی گئی۔ شمار میٹر رکھی دن رات جلتی رہی۔ جلنے کے باوجود وہ پگھلی۔ نہ چھوٹی ہوئی۔ جیسی پہلے دن تھی ویسی ہی رہی۔ سید پور کے جن نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ شمع میری محبت کی مظہر ہے اسے کوئی نہیں بجھا سکتا اور واقعی اسے کوئی نہیں بجھا سکا۔

ماموں فرقان بھی نہیں۔

جب سے ماموں فرقان کا عمل ناکام ہوا تھا اور وہ کوڑھ میں مبتلا کر دیئے گئے تھے اور ان کی دکان کو جلا کر راکھ کر دیا گیا تھا تب سے وہ کچھ سہم سے گئے تھے۔ موم بتی کا پتہ چلنے پر وہ گھش آئے ضرور تھے لیکن وہ حالات و واقعات سن کر اور موم بتی کو دیکھ کر واپس چلے گئے تھے۔ انہوں نے یہی مشورہ دیا تھا کہ اس شمع کو نہ چھیڑو تمہارا کیا لینا ہے اسے جلنے دو۔

تب سے گھر کے ہر فرد نے اس موم بتی کو اہمیت دینا چھوڑ دی تھی۔

اس حیرت انگیز موم بتی کو ماموں فرقان کے علاوہ خاندان کے کسی اور فرد نے نہ دیکھا گھر والوں نے اور کسی کو یہ بات بتائی بھی نہ تھی کہ خواہ مخواہ تماشا بنے گا۔ اگر کوئی خاندان کا فرد گھر آتا، پاس پڑوس کے یا ملنے جلنے والے دوست احباب آتے تو اس بیڈ روم کو بند کر دیا جاتا۔

جب سے اس بیڈ روم میں شمع روشن ہوئی تھی نیلم کی کیفیت بدل گئی تھی۔

اب وہ زیادہ تر اس بیڈ روم میں ہی رہتی تھی۔ ناشتہ کر لیا بیڈ روم میں آ گئی۔ کھانا کھا لیا پھر بیڈ روم میں آ گئی، رات کو تھوڑی بہت وی سی آر دیکھا اور پھر بیڈ روم کا رخ کیا۔

ایک تبدیلی اور اس میں آئی تھی اس نے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ پہلے وہ بیڈ روم سے بھاگتی تھی۔ رات کو صابرہ کے پاس سوتی تھی۔ بیڈ روم میں اکبر تنہا سوتا تھا لیکن اب وہ دن بھر بیڈ روم میں گھسے رہنا چاہتی تھی۔ رات کو البتہ وہ صابرہ کے ساتھ سو جاتی تھی۔

لیکن جس دن سے اس کمرے میں شمع روشن ہوئی تھی اس رات سے اکبر وہاں نہ سو سکا تھا۔

اس رات اکبر کا ہاتھ جلا ہوا تھا ویسے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔

کوئی بارہ بجے کے قریب اسے "میاؤں" کی خوفناک آواز آئی وہ لحاف میں سمٹ کر رہ گیا پھر کسی نے اس کے جسم پر سے لحاف اتار لیا لحاف دور قالین پر گرا۔

اکبر نے جب کروٹ لے کر لحاف کی طرف دیکھا تو وہ کانپ اٹھا وہ خوفناک کالا بلا لحاف کے اندر سے

Urdufans.com

نکالا اور دیکھتے ہی دیکھتے گدھے کے برابر ہو گیا پھر اس نے غرا کر اکبر کی طرف دیکھا اور اپنی اگلی دونوں ٹانگیں جھکا کر اس نے اکبر پر جست لگانے کے لئے پر تولے۔

اکبر کے ہوش اڑ گئے وہ گرتا پڑتا کمرے سے نکل بھاگا۔ اس رات کے بعد سے اکبر کی اپنے بیڈروم میں سونے کی ہمت نہ ہوئی۔

اب رات کو وہ بیڈروم خالی رہنے لگا نیلم، صابرہ اور راشدہ اکٹھا ایک کمرے میں سوتیں۔ اکبر گیسٹ روم میں سوتا اور باہر اپنے کمرے میں۔

رات کو اس بیڈروم کو مقفل کر دیا جاتا۔

ایک دن دوپہر کا کھانا کھا کر نیلم کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے اپنے بیڈروم میں آ کر لیٹی تو اس کے لیٹتے ہی کمرے میں معطر کن خوشبو پھیل گئی۔ اس خوشبو سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ اس خوشبو سے روح تک معطر ہو جاتی تھی۔ جسم و جان پر ایک کیف سا چھا جاتا تھا۔

اس خوشبو کے ساتھ ہی اس کمرے میں ہلکا ہلکا دھواں پھیلتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ چونک پڑی یہ تو کسی کے آنے کی علامات تھیں اس نے گھوم کر سنگھار میز کے آئینے کی طرف دیکھا وہاں وہ موجود تھا۔

نیلم فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔

وہ دھیرے دھیرے آئینے سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا وہ زرق برق لباس پہنے تھا۔ گلے میں سچے موتیوں کی مالا چمک رہی تھی۔ آج وہ صافہ باندھے ہوئے نہ تھا اس کے سنہری گھنگھریالے بال سونے کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی پیشانی پر سرخ رنگ کی ایک پٹی بندھی تھی اس پٹی کے درمیان ایک بڑا سا ہیرا لٹکا ہوا تھا۔

وہ شہزادوں کی طرح قدم اٹھاتا اس کے بیڈ کے نزدیک آ گیا۔ نیلم نے فوراً لحاف سمیٹ لیا۔ اس کے بیٹھنے کی جگہ بن گئی۔

"شکریہ۔" اس کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ آئی اس نے اپنی چمکتی آنکھوں سے نیلم کو دیکھا پھر وہ اس کے مقابل بیڈ پر بیٹھ گیا۔

وہ اس قدر حسین لگ رہا تھا کہ نیلم کوشش کے باوجود اس پر سے اپنی نظریں نہ ہٹا سکی۔

"اب مجھ سے ڈر تو نہیں لگتا۔" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں۔" نیلم نے فوراً کہا۔ "ڈرنے کی کیا بات ہے بھلا۔"

"اچھا۔" اس کے لہجے میں خوشی تھی۔

"آپ کئی دن کے بعد آئے ہیں۔" نیلم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"میرا انتظار تھا آپ کو؟" اس نے پوچھا۔

"اگر میں کہوں ہاں تو۔"

"تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

"اور اگر میں کہوں نا۔"

Urdufans.com

"تو میں انتظار کروں گا۔ اس وقت کا جب تم میرا انتظار کرو گی۔"

"قرل، تم کون ہو؟"

"تم نے میرا نام لیا مجھے تم کہا یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔"

"تم نے میرا نام لیا۔ مجھے تم کہا یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔"

"لیکن میرا سوال گم ہو گیا۔"

"تمہارا کچھ گم نہیں ہو گا۔ گم تو میں ہوا ہوں۔ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا ہوں۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے تمہارا چہرہ ہی دیکھ رہا ہوں مجھے اور کچھ نظر نہیں آتا۔"

"جب سے تمہیں دیکھا ہے تمہارا چہرہ ہی دیکھ رہا ہوں مجھے اور کچھ نظر نہیں آتا۔"

"میں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟" نیلم نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"قرل میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں کون ہوں۔ میں پھر بتاتا ہوں میں ایک جن ہوں ایک غیر مرئی۔"

"نیلم میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں کون ہوں۔ میں پھر بتاتا ہوں میں ایک جن ہوں ایک غیر مرئی۔"

"اس نے دھیرے سے کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" نیلم نے پوچھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" نیلم نے پوچھا۔

"میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہر لمحہ تم میرے سامنے بیٹھی رہو میں تمہیں دیکھتا رہوں۔ دیکھتا رہوں۔ یہاں تک کہ قیامت آ جائے۔"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہر لمحہ تم میرے سامنے بیٹھی رہو میں تمہیں دیکھتا رہوں۔ دیکھتا رہوں۔ یہاں تک کہ قیامت آ جائے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔" نیلم نے پریشان ہو کر کہا۔

"میری دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ ہاں تمہاری دنیا کی میں نہیں جانتا۔" قرل نے بے یقینی سے کہا۔

"میں چاہوں بھی تو ممکن نہیں۔" نیلم نے اپنی دنیا کی بات کی۔

"تم چاہو گی تو سب کچھ ممکن ہو جائے گا۔ تم چاہو تو۔" قرل نے راہ دکھائی۔

"میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ میرا شوہر ہے۔ میرے گھر والے ہیں اور ..." نیلم کی بات ادھوری رہ گئی۔

"تم یہ بھول جاؤ کہ تم شادی شدہ ہو۔ تم نے دیکھا کہ شادی کر کے اکبر کو کیا ملا اور اسے کچھ ملے گا بھی نہیں وہ تمہیں کچھ بھی نہیں سکتا اگر اس نے ایسا کیا تو تنا کا خود ذمہ دار ہو گا۔ نیلم میں تمہارے اور اپنے درمیان کسی تیسرے آدمی کا وجود برداشت نہیں کروں گا۔ یہ بات اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھا لو۔" قرل نے اسے سمجھایا۔

"میں کیا کروں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" نیلم الجھن کا شکار ہو گئی۔

"بس جیسا میں کہوں ویسا کرتی جاؤ۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"میرا شوہر اور میرے گھر والے؟" نیلم اپنے شوہر اور گھر والوں کیلئے پریشان تھی۔

"سب محفوظ رہیں گے اس وقت تک جب تک وہ میرا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ میرا راستہ روکنا اتنا آسان نہیں ہے۔ جن لوگوں نے میری راہ میں آنے کی کوشش کی۔ ان کا انجام بھی تم دیکھ چکی ہو۔" قرل نے صاف لہجے میں اسے بتایا۔

"مجھے اب اپنے انجام کی فکر ہے۔ میرا کیا ہو گا۔" نیلم نے فکرمندی سے کہا۔

Urdufans.com

"انجام کی فکر کسے ہے۔ محبت کی آنکھیں کہاں ہوتی ہیں۔ محبت اندھی ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ بے پروا ہیں کرتی۔ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ مجھے انجام کی فکر نہیں ہے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری دنیا والے میرا جینا حرام کر دیں گے۔ وہ مجھ سے تمہیں نہ چھین پائیں گے۔ میں یہ بڑے یقین سے کہہ رہا تھا۔ نیلم اپنی سنانا چاہتی تھی لیکن وہ سن نہیں رہا تھا۔ نیلم خاموش ہو گئی وہ نیلم کو دیکھتی رہی۔ قرل اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔

قرل کو دیکھتی رہی۔ قرل اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔

پھر وہ مسکراتا ہوا اٹھا اور آئینے میں غائب ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد نیلم لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی اور چھت کو گھورنے لگی اس کے ذہن میں عجیب کشمکش جاری تھی۔ چھت کو گھورتے گھورتے اس کی آنکھوں میں نیند اتر آئی وہ سو گئی۔

ایک دن سب لوگوں نے پکنک پر جانے کا پروگرام بنایا۔

اکبر کے دل میں بڑے ارمان تھے۔ نیلم سے شادی کی اس کو بے انتہا خوشی تھی۔

شادی کے بعد اس نے ایک ماہ کیلئے ہنی مون پر جانے کا پروگرام تیار کر لیا تھا لیکن اس کے سب پروگرام خاک میں مل گئے تھے۔ ہنی مون تو دور کی بات تھی ابھی اس کی زندگی میں سہاگ رات تک نہ آئی تھی۔ کراچی آتے ہی دہشت زدگی کے پے در پے واقعات پیش آئے تھے۔ اس طرح کے واقعات اندرون لاہور جاتے ہوئے ہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو آج تک جاری تھا۔

پچھلے دو چار دنوں سے کچھ گھر میں امن و امان تھا جب سے گھر میں شمع روشن ہوئی تھی تب سے گھر میں سکون ملا تھا البتہ نیلم بالکل خاموش ہو گئی تھی۔ وہ ہر وقت گم صم بیٹھی رہتی تھی کوئی اگر کچھ کہتا تو جواب دیتی۔

تب اکبر نے پکنک منانے کا پروگرام بنایا۔

ماموں کا گھرانہ اور بابر کے گھر والے اس پکنک میں شامل تھے۔ ایک کوسٹر کرائے پر لے لی گئی۔ ناشتے کے فوراً بعد ہی یہ لوگ گھر سے نکل گئے۔ آج سردی زیادہ نہ تھی بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سردیاں رخصت ہو گئی ہوں۔ کراچی کا موسم محبوب کے مزاج کی طرح ہے جانے کس وقت بدل جائے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

سمندر کے کنارے ایک ہٹ کرائے پر لے لی گئی۔ چھٹی کا دن تھا آہستہ آہستہ رش بڑھتا گیا۔

نیلم شادی سے پہلے جب کراچی آئی تھی تو وہ سمندر پر گئی ضرور تھی لیکن نہائی نہیں تھی جانے کیوں اس کی مچلتی لہروں سے بڑا ڈر لگتا تھا۔

لیکن اس دن اکبر نے اس کے دل سے سمندر کا خوف دور کر دیا۔ اس نے راشدہ، شمسہ اور نیلم کو اپنے ساتھ لیا اور سمندر کی طرف بڑھ گیا۔ نیلم سمندر میں اترنے سے جھجکنے لگی تو راشدہ اور شمسہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور وہ اسے کھینچتی ہوئی سمندر میں لے گئیں۔

نیلم کا خیال تھا کہ سمندر کا پانی ٹھنڈا ہو گا لیکن ایسا نہ تھا۔ سمندر کا پانی گرم تھا جب سمندر کی ایک بڑی لہر کنارے کو چھو کر واپس ہوئی تو نیلم کے پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ اس نے ڈر کر چیخ ماری، سمندر

ہیں اترنے کا نیلم کا پہلا تجربہ تھا اس کی چیخ سن کر راشدہ اور شمسہ نے خوب مذاق اڑایا اور اب وہ باتھ جھوڑ دینا تھوڑی دیر میں نیلم لہروں کی عادی ہو گئی وہ بھی شمسہ اور راشدہ کی طرح ان سے کھیلنے لگی۔

اکبر کو سمندر کی لہروں سے کھیلتے ہوئے دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی تھی وہ اس کے نزدیک ہی تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر نیلم کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ "آؤ نیلم آگے چلو۔"

نیلم نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی وہ کچھ سوچ کر خوف سے کانپ اٹھی تھی اس نے کہا نہ نیلم میں تمہارے اور اپنے درمیان کسی تیسرے آدمی کا وجود برداشت نہیں کروں گا۔ نیلم نے ٹھہر اکر کہا۔ "اکبر خدا کے لئے میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے۔"

لیکن اکبر پر جیسے جنون طاری ہو گیا تھا اس نے نیلم کا ہاتھ اور مضبوطی سے پکڑ لیا وہ اسے کھینچتا ہوا لے جذبا تھا آگے ہی آگے۔

یہاں تک کہ سمندر کی ایک بڑی لہر ان کے سروں پر آپہنچی۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس بڑی لہر نے دونوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ لہر اتنی پُرزور تھی کہ اکبر کے ہاتھ سے نیلم کا ہاتھ چھٹ گیا۔

جب وہ لہر واپس گئی تو اکیلا اکبر سمندر میں کھڑا ہانپ رہا تھا۔

نیلم کا کہیں پتہ نہ تھا۔

"ہائے۔ میری بچی۔" صابرہ نے نیلم کو سطح آب پر نہ پا کر اپنا دل تھام لیا۔

صابرہ اور ریحانہ ممانی سمندر کے کنارے پتھروں پر بیٹھی تھیں۔ وہ سمندر کی لہروں کا دور ہی سے نظارہ کر رہی تھیں انہیں سمندر میں نہانے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اس وقت نیلم اور اکبر کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔ بابر اور ماموں فرقان کنارے کے قریب ہی پانی میں بیٹھے تھے ان سے آگے راشدہ اور شمسہ تھیں جو ایک دوسرے پر پانی اچھال رہی تھیں۔

پانی میں سب سے آگے نیلم اور اکبر تھے۔

جب اکبر نیلم کا ہاتھ پکڑ کر اسے سمندر میں آگے کی طرف کھینچتا ہوا لے گیا تو یہ منظر گھر کے سب افراد دیکھ رہے تھے۔

ماموں فرقان نے اسے زیادہ آگے جانے سے آواز لگا کر منع بھی کیا تھا۔ "اکبر زیادہ آگے مت جاؤ۔"

مگر اکبر نے ماموں فرقان کی بات سنی کہاں تھی۔ اس پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ نیلم کو کھینچتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ شاید وہ نیلم کو لے کر سمندر کی لہروں میں گم ہو جانا چاہتا تھا۔

سمندر کی ایک بڑی لہر نے ایک جھٹکے سے انہیں جدا کر دیا۔ اکبر کے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے وہ لہر کے ساتھ بہہ گیا۔ اس کے کانوں اور آنکھوں میں پانی بھر گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے قدم ریت پر جمائے اور اپنی آنکھوں کا پانی جھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

چند لمحے تو اس کی سمجھ میں ہی کچھ نہ آیا کہ کیا ہوا۔ اس کا دماغ مختل ہو گیا پھر جب اسے یاد آیا تو وہ بے قرار ہو کر اپنے آس پاس دیکھنے لگا۔

وہ جس کا ہاتھ اس نے تھاما تھا۔ وہ اب کہیں نہیں تھی۔

ماموں فرقان کی آوازیں اس کے کان میں پڑ رہی تھیں۔ "اکبر، اکبر واپس آجاؤ۔ ایک خوفناک لہر تمہاری طرف بڑھ رہی ہے۔"

اکبر نے ماموں فرقان کی آواز پر سامنے نظریں اٹھا کر دیکھا تو واقعی ایک اونچی لہر اس کی طرف آرہی تھی لیکن اکبر نے اس پر دانہ کی وہ مضبوطی سے اپنے قدم جمائے کھڑا رہا اسے کسی لہر کی فکر نہ تھی وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیلم کو تلاش کر رہا تھا۔

اونچی نیچی لہروں پر نظریں جمائے ہوئے تھا، نیلم کہیں نظر آئے اور وہ اس کی طرف لپکے۔

اس بڑی لہر کے نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی ماموں فرقان، اکبر تک پہنچ گئے تھے اور اسے گھسیٹتے ہوئے کنارے کی طرف لے آئے۔

"ماموں، مجھے چھوڑ دیجئے، آپ کو معلوم نہیں کہ نیلم ڈوب گئی ہے۔"

"اکبر ہوش میں آؤ، سمندر اس وقت بہت بپھرا ہوا ہے تم اچھے تیراک بھی نہیں ہو، ڈوب جاؤ گے۔" ماموں فرقان نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا۔

خواتین کے چیخنے چلانے پر کئی مرد جو کنارے پر نہا رہے تھے، اس طرف بھاگے جہاں نیلم کو لہر نے ہڑپ کر لیا تھا۔ بابر محافظوں کی تلاش میں باؤلوں کی طرح ادھر اُدھر بھاگ رہا تھا لیکن محافظوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پھر کنارے پر گھومنے والے ایک دو غوطہ خوروں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی یہ غوطہ خور عوام میں سے تھے۔ اکبر سمندر میں جانے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا تب صابرہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"میرے لال ہوش میں آ۔ نیلم کو بچانے کے لئے بہت لوگ سمندر میں کود گئے ہیں۔ تو نہ جا۔"

"صابرہ ٹھیک کہہ رہی ہے تم مت جاؤ۔ تمہارے ہوش و حواس درست نہیں ہیں، تم زیادہ تیر نہ سکو گے۔" ماموں فرقان نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ نیلم بس اچانک ہی غائب ہو گئی تھی۔ سمندر میں ڈوبنے والا بار بار سطح آب پر آتا ہے لیکن وہ ایک مرتبہ بھی کہیں نظر نہ آئی۔

لوگوں نے اس بڑی لہر کو ان کے سروں سے گزرتے دیکھا تھا اور پھر نیلم اس طرح غائب ہو گئی تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی سمندری جانور اس کی ٹانگ گھسیٹ کر لے گیا ہو۔

غوطہ خوروں نے بڑی دیر تک اور بڑی دور تک نیلم کو تلاش کیا لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آئی۔

بالآخر سب تھک ہار، کر ایک ایک کر کے کنارے پر پہنچ گئے۔

ابھی نیلم کے ڈوبنے کے بارے میں قیاس آرائی ہو رہی تھی کہ اچانک کسی نے کہا۔ "نیلم تو ہٹ میں بیٹھی ہے۔"

یہ مژدۂ جانفزا سنانے والی راشدہ تھی۔ وہ باتھ روم جانے کیلئے ہٹ میں آئی تھی کہ اس کی نظر نیلم پر پڑی وہ فرش پر بیٹھی، ساکت آنکھوں سے کسی نظر نہ آنے والے نقطے کو گھور رہی تھی۔

اسے راشدہ کے آنے کا پتہ چلا، نہ جانے کا۔ وہ پتھر کی موروثی بنی خاموش بیٹھی رہی۔ راشدہ دوڑتی ہوئی واپس آئی۔ اس نے چیخ چیخ کر نیلم کے ہٹ میں موجود ہونے کا اعلان کیا۔

یہ سن کر سب سے پہلے اکبر ہٹ کی طرف بھاگا۔ "راشدہ، تم سچ کہہ رہی ہو نا۔"

"کیسے ہو سکتا ہے؟" بابر نے حیرت سے کہا اور تقریباً دوڑتے ہوئے ہٹ کی طرف چلا۔
"نیلم کے ساتھ سب ممکن ہے۔" ماموں فرقان نے گہرا سانس لے کر کہا وہ بھی تیز قدموں سے
ہٹ کی طرف چلے۔
"اللہ، تیرا شکر ہے۔" صابرہ نے اس خبر کو سن کر فوراً اللہ کا شکر ادا کیا اور ممانی ریحانہ سے بولی۔
"ممانی ریحانہ آپیں جلدی ہٹ میں چلیں۔"
ہٹ میں سب سے پہلے داخل ہونے والا اکبر تھا پھر بابر۔ اس کے بعد ماموں فرقان پہنچے اور پھر
ممانی ریحانہ۔
نیلم نے اب بیٹھے بیٹھے جھومنا شروع کر دیا تھا۔
نیلم نے اب کھل چکے تھے۔ اب وہ اس کے سر کے گھومنے کے ساتھ فضا میں لہرا رہے
تھے۔
وہ اپنے سر کو زور زور سے گھما رہی تھی۔
سب اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ کسی کی ہمت نہ تھی کہ وہ آگے بڑھتا اور اسے جھومنے سے روک
دیتا۔
پھر وہ خود ہی جھومتے جھومتے اچانک رک گئی اور اس نے اپنا سر جھکا لیا چند لمحے سجدے میں پڑی رہی
اس کے جسم پر کپکپی طاری تھی۔
پھر اس نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اٹھایا۔ اس نے ایک ایک کر کے اپنے سامنے کھڑے اہل خانہ کو
دیکھا۔ اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ راشدہ اور شمسہ اس کی آنکھیں دیکھ کر ماموں فرقان اور
بابر کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ یہ نیلم کی آنکھیں تھی ہی نہیں۔ یہ تو کسی خونی کی آنکھیں معلوم ہو رہی
تھیں۔ یہ خونی آنکھیں گھومتے گھومتے اکبر پر رک گئیں۔
"تو وہ تُو ہے۔" نیلم کی آواز بھی بدل گئی۔ وہ کرخت مردانہ آواز میں بولی۔
اکبر کچھ نہ بولا خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔
"میں نے تجھ کو پہلے منع نہیں کیا تھا کہ میرا ہاتھ نہ پکڑ، مگر تُو نہیں مانا۔ آخر تُو میرا ہاتھ کیوں پکڑتا ہے
تو باز کیوں نہیں آتا۔" وہ غصے سے بھرے سخت لہجے میں بول رہی تھی۔
"بس جی بچے سے غلطی ہو گئی۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔" ماموں فرقان نے فوراً بات کو سنبھالا
دیا۔
"فرقان تو کیوں بولتا ہے، یہ کیوں نہیں بولتا، کیا اس کے منہ میں زبان نہیں ہے۔" نیلم نے اسے
گھورا۔
تب ماموں فرقان نے اس کے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔ "اکبر معافی مانگ لو۔"
"میں نہیں مانگوں گا معافی؟ میں کس بات کی معافی مانگوں، میں نے کیا کیا ہے۔ میرا جرم کیا ہے۔ نیلم
بخار ہی ہے۔" اکبر نے غصے سے کہا۔
"لالے، تُو ہمارے سامنے اکڑتا ہے تُو جانتا نہیں کہ ہم نے اچھے اچھوں کی اکڑ نکال دی ہے۔ یہ
تمہارے برابر فرقان کھڑا ہے اس سے پوچھ۔ اپنی ماں صابرہ کے حال سے عبرت پکڑ۔" نیلم نے اپنی لال

اشارہ آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

ایک دم اکبر کے دماغ میں جیسے سی اٹھی وہ بے اختیار سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

"ہو ہمیں نہیں پتا۔ ہم اس سے منوا لیتے ہیں تجھے فوراً معافی مانگنا ہوگی اور آئندہ ہوگی۔ یاد رکھ ہم بہت زبردست ہیں۔"

اب صابرہ آگے بڑھی۔ وہ اپنے بیٹے کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اس نے اس کے کندھے نرمی سے دبایا اور گھبرائے لہجے میں بولی۔ "اکبر ضد مت کرو جو یہ کہتے ہیں فوراً مان لو۔"

اس کے سر میں اتنی شدت کا درد تھا کہ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے کسی آہنی شکنجے نے جکڑ لیا ہو۔ وہ بمشکل بولا۔ "ٹھیک ہے مجھ سے غلطی ہو گئی۔ معافی مانگ لوں گا۔"

"یہ ہوئی نہ بات۔" نیلم نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔ پھر بولی۔ "اچھا اب ہم جاتے ہیں۔"

یہ کہہ کر نیلم سجدے میں چلی گئی تھوڑی دیر کے بعد اس نے سر اٹھایا تو وہ نارمل ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے چاروں طرف بھیڑ دیکھی تو وہ گھبرا گئی۔ وہ فوراً اٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ صابرہ اور نعمانی ریحانہ فوراً اس کے پیچھے چلی گئیں۔

گھر کے افراد کے علاوہ کچھ تماشائی بھی ہٹ میں آ گئے تھے۔ جب انہوں نے یہ سنا کہ جس کو ہم سمندر میں ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ ہٹ میں بیٹھی ہے، تو ان کا تجسس جاگنا ایک فطری سی بات تھی۔ ان کی سمجھ میں بات کسی طرح نہیں آ رہی تھی کہ ایک لڑکی جو سمندر کی لہروں میں گم ہوئی تھی، وہ اچانک ہٹ میں کیسے آ گئی لیکن جب ان لوگوں نے اس کی حالت دیکھی اور انہیں اندازہ ہوا کہ لڑکی پر جن کا سایہ ہے تو ہر ایک کے ذہنوں میں کوئی سوال نہ رہا۔ وہ جن کی طاقت پر تبصرے کرتے ہوئے ہٹ سے نکل گئے۔

بابر نے ماموں فرقان کی طرف دیکھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"کیا سوچ رہے ہیں ماموں؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ اکبر نے معافی مانگ کر عقل مندی کا ثبوت دیا۔ ورنہ جانے کیا ہوتا۔" ماموں فرقان بولے۔

"ماموں، نیلم کی زندگی تو خراب ہوئی ہی، اس لڑکے کی زندگی بھی تباہ ہو گئی۔" بابر نے افسوس سے کہا۔

"وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔" ماموں فرقان نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "لیکن ایک بات یاد رکھو، اس کے سامنے اکڑنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا وہ کسی بھی وقت، کوئی بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

"میں اکبر کو سمجھا دوں گا۔" بابر نے کہا۔

"اکبر بہت سمجھدار لڑکا ہے۔ اس نے اب تک بہت صبر سے کام لیا ہے۔ بالآخر وہ انسان ہی ہے صبر کی بھی انتہا ہوتی ہے اسے اس بات کی بھی اجازت نہیں کہ وہ اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر سمندر میں جائے۔ اس سپید پور کے جن نے ہمیں عاجز کر دیا ہے۔ پتہ نہیں یہ کیا چاہتا ہے۔" ماموں فرقان افسردہ لہجے میں بولے۔

کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

صابرہ نے نیلم سے سمندر کا احوال دریافت کیا لیکن اس نے کچھ نہ بتایا، وہ خاموش بیٹھی رہی۔ پھر ماشدہ اور نسیم کے اصرار پر اس نے صرف اتنا کہا۔ "مجھے کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہوا مجھے بس اتنا ی یاد ہے کہ ایک بڑی لہر نے مجھے اپنے آغوش میں لے لیا تھا پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا میں یہاں ہوش میں یے آئی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ مجھے جب ہوش آیا تو آپ سب لوگ میرے گرد کھڑے تھے۔"

پھر مزید کسی نے نیلم سے اس معاملے میں کریدنہ کی۔ اسے جتنا معلوم تھا، وہ اس نے بتا دیا تھا۔

اس واقعہ نے اکبر کو بلا کر رکھ دیا تھا۔

اسے اندر ہی اندر بہت غصہ تھا اس نے ناکردہ گناہ کی معافی منگوائی گئی تھی اس نے کچھ بھی تو نہیں کیا تھا کہ سب کے سامنے اسے ہاتھ جوڑنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس کے ذہن میں آگ بھری تھی وہ ادھر ادھر ٹہل رہا تھا، کبھی وہ ہٹ کے ٹیرس پر جا کر کھڑا ہو جاتا اور سمندر میں ایک دوسرے کے پیچھے لپکتی لہروں کو گھورنے لگتا۔ ان لہروں کو ایک دوسرے کا تعاقب کرتے دیکھ کر اس کا دل کھول اٹھتا۔ وہ سمندر کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو جاتا پھر وہ اندر ہٹ میں آ جاتا۔ ماموں فرقان یا صابرہ کے پاس جا بیٹھتا بالکل خاموش۔ پھر وہاں سے اٹھ کر باہر آ جاتا۔ ہٹ کی سیڑھیاں اتر کر سمندر کے کنارے ریت پر بھاگنے لگتا۔ اس کی عجیب حالت تھی اس کا کہیں دل نہیں لگ رہا تھا۔ گھبراہٹ طاری تھی، حواس پر غصہ سوار تھا جب بھی اسے معافی مانگنے کا خیال آتا اس کے حلق میں کڑواہٹ گھل جاتی۔ اسے اپنی بے بسی کا احساس ہوتا اور جیسے جیسے اسے اپنی بے بسی کا احساس ہوتا ویسے ویسے اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگتی۔

اسے ماموں فرقان پر بھی غصہ تھا وہ اسے اب تک صبر کی تلقین کرتے رہے تھے اور وہ اب تک صبر سے کام لیتا رہا تھا لیکن انہوں نے کر کے کچھ نہ دیا۔ پوری رات قبرستان میں بھی گزاری اور ایک ذرا سی غلطی نے سارا معاملہ چوپٹ کر دیا۔ اگر وہ اس دن ذرا سی عقل مندی سے کام لے لیتے تو اب تک اس جن کا قصہ پاک ہو چکا ہوتا پھر اس کے سامنے داؤ اغنور کا چہرہ آ جاتا۔ انہوں نے بھی کچھ کر کے نہ دیا تھا بس باتیں ہی باتیں تھیں، میں یہ کر دوں گا، میں وہ کر دوں گا۔

اس کے خیال میں بات اب ان دونوں کے بس کی نہیں رہی تھی وہ جن ان دونوں پر حاوی آ گیا تھا، وہ دونوں اس کے سامنے بے بس ہو گئے تھے۔

یہ کیسی بے بسی اور بے چارگی تھی۔

اس کے دوست کہتے تھے کہ اکبر تو کس جنجال میں پھنس گیا ہے۔ نیلم کو اس کے گھر بھجوا دے اور دوسری شادی کر لے۔ نیلم گھر میں رہے گی تو گھر میں اسی طرح کی دہشت پھیلتی رہے گی۔ خوفناک واقعات پیش آتے رہیں گے، تجھے گھر میں ایک منٹ کو بھی سکون نہ ملے گا۔ پھر تجھے شادی کر کے کیا ملا۔ کیا فائدہ ہوا۔ تو نیلم سے اس طرح دور ہے جیسے وہ تیری بیوی ہی نہیں۔ یہ کس طرح کی شادی ہے۔

اس کے دوست اس سے جو کچھ کہتے، وہ سب سمجھتا تھا، سب جانتا تھا، جس طرح کے حالات سے وہ گزر رہا تھا ان کے کرب سے اچھی طرح واقف تھا لیکن وہ نیلم کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اگر اسے طلاق دینا ہوتی تو وہ اپنی ماں کے کہنے میں آ کر اسے کب کی طلاق دے چکا ہوتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح کے حالات سے دو چار کرنے میں نیلم کا کوئی ہاتھ نہ تھا وہ خود مجبور تھی وہ چابی والا کھلونا بن گئی تھی،

اس میں جتنی چابی بھر دی جاتی اس کے مطابق وہ بول کر خاموش ہو جاتی۔

نیلم کو وہ شادی سے پہلے سے پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کے لئے اس نے بڑی کوشش کی تھی۔ وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگی تھیں اس کا حسن قیامت ڈھانے والا تھا وہ جب بھی نیلم کو دیکھتا اس کی ہمیں اس کے چہرے پر جم جاتیں۔

نیلم اسے اپنی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی تو مسکرا کر کہتی۔ "بس بھی۔"

"کیا بس بھی۔" وہ جان کر ان جان بن جاتا۔

"کیا بس بھی۔"

"دیکھتے ہیں تو دیکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔" نیلم کو صاف کہنا پڑا۔

"نیلم تمہیں احساس ہے کہ تم کتنی خوبصورت ہو۔"

"نہیں تو۔" نیلم نے سادگی سے کہا۔ "مجھے تو کوئی احساس نہیں۔ بس عام سی لڑکی ہوں۔"

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ عام سی لڑکی ہو۔ اگر عام سی لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں تو پھر خاص کیا ہوتی ہوں گی۔" اکبر نے کہا۔

"آپ کے خیال میں کوئی خاص لڑکی ہوں۔" نیلم نے پوچھا۔

"ہاں۔ بہت خاص۔ ایک دم اٹریکٹو۔" اکبر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو بہت اچھی لگتی ہوں۔" نیلم نے ہنس کر پوچھا۔

"ہاں۔ بہت۔" اکبر نے والہانہ انداز میں کہا۔

نیلم، اکبر کو واقعی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ اس کی ایک ایک ادا پر صدقے واری جاتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس کے سامنے رہے۔ اگر کاروباری مجبوری نہ ہوتی تو وہ گھر میں بیٹھ جاتا اور اسے دیکھے جاتا۔

اتنی محبت۔ اتنا عشق اور اتنی چاہت کے باوجود وہ اس کیلئے ابھی تک شجر ممنوع بنی ہوئی تھی۔

یہ کیسا ظلم تھا۔

وہ اس کی ہو کر بھی۔ اس کی نہ تھی۔

یہ کیسی بے بسی تھی۔

اکبر کا دماغ گھوم رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا اگر اس وقت وہ جن اس کے سامنے آجائے تو وہ جانے کیا کر دے۔ اسے پھاڑ کھائے۔ اس جن نے اس کی زندگی عذاب کر دی تھی اور آج اس سے معافی منگوا کر اس کی انا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔

اکبر ریت پر بیٹھا بکراں سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی لہریں اس کے جسم کو چھو کر واپس جا رہی تھیں۔ پکنک کا مزہ ختم ہو گیا تھا۔ یہاں آتے ہی بدمزگی ہو گئی تھی۔

دوپہر کا کھانا جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ سب نے مل کر کھایا۔ اکبر نے دو چار لقمے زہر مار کئے پھر ان لوگوں نے اپنا سامان سمیٹا اور گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

گاڑی میں بھی اکبر سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا اس توہین کا اثر اس کے ذہن سے زائل ہی نہیں ہو رہا تھا۔

تب ماموں فرقان اٹھ کر اس کے پاس چلے گئے اس کے برابر والی سیٹ خالی تھی۔

ماموں فرقان کو اپنے نزدیک پا کر اس نے ایک مرتبہ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھا اور پھر اپنے

خیالوں میں گم ہو گیا۔

ماموں فرقان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے قریب کر لیا پھر انہوں نے اس کی تھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا تو انہوں نے دیکھا کہ اس کی پلکوں پر آنسو لرز رہے تھے۔

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ماموں فرقان کا دل کٹ گیا۔

"اس کیوں ہے بچے؟" ماموں فرقان نے خود اپنے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

"روتا کیوں ہے بچے؟" ماموں فرقان، میں کیا کروں۔ آپ دیکھ رہے ہیں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔" اکبر نے اپنی آنسو بھری آنکھوں سے ماموں فرقان کو دیکھا۔

"میں تیرے دکھ کو اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن رونے سے کام نہ بنے گا۔"

"میں کہاں رو رہا ہوں؟" اکبر نے اپنے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں شاباش۔" ماموں فرقان نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ "یہ بات ہوئی نا۔"

"ماموں فرقان، کیا اس جن سے نجات کا کوئی راستہ نہیں۔" اکبر نے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

ماموں فرقان نے فوراً اپنی آنکھیں جھکالیں وہ کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔ خفت آمیز لہجے میں بولے۔

"بس، بیٹا کیا بتاؤں ذرا سی چوک ہو گئی، ورنہ نجات تو تمہیں کب کی مل چکی ہوتی اس سے۔"

"میں کہاں رو رہا تھا، ہوا، اب آگے کی سوچیں، دادا غفور سے کچھ بات کریں؟"

"اچھا بیٹا میں ان کے پاس جاؤں گا۔ میں ان سے بات کروں گا لیکن تمہارے لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ نیلم سے دور رہنا، مجھے ڈر ہے، وہ کہیں تمہیں نقصان نہ پہنچا دے۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"ماموں فرقان یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ اب اس سے ڈرنے لگے ہیں۔" اکبر نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"نہیں، یہ بات نہیں ہے میں اس سے ڈرا نہیں ہوں لیکن محتاط ضرور ہو گیا ہوں۔"

"اچھا ماموں یہ بتائیں، وہ میرا کیا بگاڑے گا، کیا مجھے جان سے مار دے گا۔"

"نہیں، موت اور زندگی تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔" ماموں فرقان نے بڑے یقین سے کہا۔

"بس تو پھر۔"

"اکبر، تمہارے ذہن میں کیا بات آ رہی ہے، کہیں تم اس سے ٹکرانے کی تو نہیں سوچ رہے۔ بیٹا ایسا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ تم ایک لاوا اگلتے آتش فشاں کا کیا بگاڑ سکتے ہو، وہ ہم جیسے لوگوں کو جل دے گیا تم تو اس کے سامنے بچے ہو، جیسے ہاتھی کے سامنے ایک چیونٹی۔"

"لیکن ماموں فرقان کبھی کبھی ایک چیونٹی بھی ہاتھی کی جان کا عذاب بن جاتی ہے۔"

"ایسا کبھی اتفاق سے ہوتا ہے۔"

"کیا پتہ یہ اتفاق میرے ساتھ ہی پیش آ جائے۔"

"تم کیا سوچ رہے ہو، تم کیا کرنا چاہتے ہو۔"

"ابھی تو مجھے چنداں اندازہ نہیں کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں لیکن اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا مجھے غصہ آنے

لگا ہے، میں کچھ نہ کچھ کروں گا۔"

"بیٹا، تم جنوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کہ یہ کتنی خطرناک شے ہوتے ہیں۔ ان سے الجھنا آسان کام نہیں۔" ماموں فرقان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "کوئی غلط قدم اٹھانے سے پہلے مجھ سے ضرور پوچھ لینا۔"

بابر علی پچھلی سیٹ پر بیٹھا، ان دونوں کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ ان کی گفتگو میں اس سے اب تک کوئی مداخلت نہ کی تھی لیکن اکبر کے عزائم جان کر وہ چپ نہ رہ سکا۔ اسے اپنے بہنوئی کی ذہنی کیفیت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ وہ بے تابی کی انتہا پر پہنچا ہوا تھا۔ اب اس کا کچھ نہ کچھ تو ردعمل ہونا تھا لیکن بابر یہ جانتا تھا کہ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اکبر کا اس میں ہاتھ ڈالنا، شعلوں سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ اس نے اکبر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فوراً کہا۔ "بہنوئی، ماموں ٹھیک کہہ رہے ہیں تم پریشان کیوں ہوتے ہو، ہم موجود ہیں۔"

"ہاں، ابو، میں جانتا ہوں۔" یہ کہہ کر اکبر نے خاموشی اختیار کر لی، گہری خاموشی۔

اس گہری خاموشی میں ہزار مرچھپا ہوا تھا، اس نے اپنے طور پر طے کر لیا تھا کہ اب وہ خود کچھ کرے گا۔ ماموں فرقان اور دادا غفور سے اس نے جو توقعات وابستہ کر لی تھیں، وہ پانی پر لکیر ثابت ہوئی تھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ارادوں کو ظاہر کرے اس لئے اس نے مکمل سکوت اختیار کر لیا۔

پکنک سے واپسی پر سب پر گہری خاموشی طاری تھی۔ جتنا شور شرابا پکنک پر جاتے ہوئے تھا اتنا ہی سکوت واپسی پر طاری تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ لوگ پکنک سے نہ واپس ہوئے ہوں کسی کو دفنا کر آ رہے ہوں۔

گلشن پہنچ کر بابر کے گھر والے گاڑی سے اتر گئے جبکہ ماموں فرقان اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ بابر اور صابرہ نے چاہا بھی کہ وہ لوگ چائے وغیرہ پی کر جائیں لیکن ماموں فرقان راضی نہ ہوئے اس طرح وہ پکنک والی گاڑی میں اپنے گھر عزیز آباد روانہ ہو گئے۔

چائے کی سب کو طلب ہو رہی تھی۔ راشدہ نے چائے بنائی۔ چائے پی کر سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔

اکبر ٹی وی لاؤنج میں اکیلا بیٹھا، آج کا اخبار دیکھ رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

اکبر نے ریسیور اٹھایا اور بولا۔ "ہیلو۔"

"میں واجدہ بول رہی ہوں۔"

"جی خالہ آپ کیسی ہیں؟"

"بیٹے میں ٹھیک ہوں آج صبح سے میں مسلسل ٹیلیفون کرنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن لائن ملتی ہی نہ تھی کبھی ایںگیج ملتا اور کبھی کہیں اور لائن مل جاتی۔ ایک دو بار ایسا ہوا کہ گھنٹی بجتی رہی کسی نے اٹھایا نہیں۔ اب بڑی مشکل سے ملا ہے۔" واجدہ نے اپنی روداد سنائی۔

"خالہ جان، ہم لوگ گھر پر نہیں تھے۔ سمندر پر پکنک منانے گئے ہوئے تھے۔"

پکنک کا سن کر واجدہ کو بڑی خوشی ہوئی پکنک پر جانے کا مطلب تھا کہ گھر کے حالات پرسکون ہیں۔

پکنک پر گئے تھے۔" واجدہ نے خوشی کا اظہار کیا۔ "کون کون گیا تھا۔"

"ہم لوگ تھے اور ماموں فرقان کا گھرانہ۔"

"اچھا، تمہاری امی کا کیا حال ہے۔" واجدہ نے پوچھا۔

"اچھا، وہ ٹھیک ہیں؟"

"جی، وہ ٹھیک ہیں؟"

"نیلم کہاں ہے؟"

"وہ ابھی تو یہیں تھی۔ شاید آرام کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی گئی ہے میں بلاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اکبر نے ریسیور رکھا، پلٹ کر دیکھا تو صابرہ پیچھے کھڑی تھی۔

"اکبر کس کا فون ہے؟" صابرہ نے پوچھا۔

"امی، خالہ کا ہے۔ آپ جب تک بات کریں، میں نیلم کو بلا کر لاتا ہوں۔"

نیلم اپنے کمرے میں سونے کیلئے لیٹ چکی تھی۔ اکبر نے واجدہ کے فون کی اطلاع دی وہ فوراً اٹھ کر بھاگی جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو صابرہ، واجدہ کو سمندر پر پیش آنے والے واقعات کی تفصیل بتا رہی تھی۔ نیلم کو دیکھ کر اس نے جلدی جلدی اپنی بات ختم کی اور بولی۔ "لو، نیلم آگئی ہے۔ اس سے بات کرلو۔"

واجدہ کو جو خوشی ان کے پکنک پر جانے کا سن کر ہوئی تھی وہ وہاں پیش آنے والے واقعات سے ہوا ہوگئی تھی۔

نیلم نے ریسیور پکڑ کر اپنے کان سے لگایا۔ بڑے ادب سے اپنی ماں کو سلام کیا، پھر پوچھا۔ "امی آپ کیسی ہیں اور میرے ابو کا کیا حال ہے؟"

"ہم دونوں ٹھیک ہیں اور تمہیں یاد کرتے ہیں۔" واجدہ نے بڑی محبت سے کہا۔

"میری آنکھوں میں بھی آپ لوگ ہر وقت سمائے رہتے ہیں۔" نیلم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"نیلم تمہیں دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے، کیا کروں۔" واجدہ نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

"امی، میرا بھی یہی حال ہے، میں خود یہی چاہتی ہوں۔" نیلم نے کہا۔

"نیلم تم کچھ دنوں کیلئے اکبر کو لے کر لاہور آجاؤ، اگر اکبر کو فرصت نہ ہو تو میں انہیں بھیج دوں یہ تمہیں جاکر لے آئیں گے۔" واجدہ نے تجویز پیش کی۔

"ٹھیک ہے امی، لیکن اس معاملے میں دادا غفور سے پوچھنا ہوگا۔" نیلم نے کہا۔

"نیلم پھر تم ایسا کرو، ذرا صابرہ کو فون دو۔ میں ان سے بات کرتی ہوں۔" واجدہ بولی۔

"جی اچھا امی۔" یہ کہہ کر نیلم نے ریسیور صابرہ کی طرف بڑھایا۔ "امی آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔"

پھر واجدہ اور صابرہ کافی دیر تک فون پر بات کرتی رہیں۔ نیلم کو بہت تھکن ہو رہی تھی وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آگئی۔

ابھی اسے لیٹے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے اس کی آنکھوں میں نیند اتری ہی تھی کہ اسے کمرے میں کافور کن خوشبو پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کمرے میں خوشگوار دھواں بھرنے لگا تھا۔

وہ آگیا تھا۔

نیلم کی نیند اڑ گئی، وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دروازہ خود بخود بند ہو گیا تھا اور وہ اس کے بند کے کواڑ کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں بڑا سحر تھا۔ نیلم اس کی طرف بے خودی میں دیکھتی رہی۔

"کہاں جانے کا پروگرام بن رہا ہے؟" قرل نے سوال کیا۔

"امی چاہتی ہیں کہ میں ان کے پاس لاہور ہو آؤں۔" نیلم نے سادگی سے جواب دیا۔

"یہاں ہمیں اکیلا چھوڑ جائیں گی؟" قرل نے بڑی محبت سے سوال اٹھایا۔

"چند دنوں کی تو بات ہے۔" نیلم نے تسلی دی۔

"نہیں نیلم تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں بڑی مشکل سے تو میں نے حالات کو سازگار کیا ہے جب فضا سازگار ہو گئی ہے تو تم مجھے چھوڑ جانا چاہتی ہو۔ مجھ پر ایسا ظلم مت کرو۔ میں اب تمہاری جدائی کی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا۔ نیلم تم کان کھول کر سن لو، تمہیں چاہے غفور جانے کو کہے یا فرقان لیکن تم کراچی سے جاؤ گی نہیں، اس وقت تک جب تک میں تم سے جانے کو نہ کہوں۔ تم یہ بات اچھی طرح سمجھ ہو کہ میں جو کچھ کہہ دیتا ہوں، اس پر عمل بھی کروا لیتا ہوں۔" قرل نے کسی حد تک تحکمانہ لہجہ اختیار کیا۔

"میں، میں جانتی ہوں۔" نیلم نے اسے دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔

"جانتی ہو تو پھر انجان نہ بنو۔ آج کی رات ہم دونوں کے لئے بہت اہم ہے۔ میں اب چلتا ہوں، صابرہ اس طرف آ رہی ہے تم لاہور جانے سے صاف انکار کر دو گی۔"

یہ کہہ کر وہ آئینے میں غائب ہو گیا اس کے غائب ہوتے ہی کمرے کا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ چند لمحوں بعد صابرہ کمرے میں داخل ہوئی۔

کمرے میں زبردست خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ خوشبو آدمی کو پاگل کر دیتی تھی۔ صابرہ نے کمرے میں آ کر گہرے گہرے سانس لئے اور بولی۔ "بڑی پیاری خوشبو ہے کمرے میں کیا اسپرے کیا ہے تم نے۔"

"جی، میں نے کوئی چیز اسپرے نہیں کی۔" نیلم نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"پھر یہ خوشبو۔" وہ کہتے کہتے رک گئی، اس کی نظر جلتی موم بتی پر پڑی، جلتی موم بتی کو دیکھ کر وہ ایک دم خوفزدہ ہو گئی، اس نے پھر خوشبو کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔

"میں نے دادا غفور سے بات کر لی ہے، وہ کہتے ہیں کہ نیلم کا لاہور جانے میں کوئی حرج نہیں، چلی جائے۔ کل انہوں نے بابر کو بلایا ہے شاید کوئی تعویذ وغیرہ دیں گے تمہارے لئے۔" صابرہ نے بتایا۔

"لیکن خالہ میں لاہور نہیں جانا چاہتی۔" نیلم نے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ہیں، یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔" صابرہ یہ سن کر ایک دم پریشان ہو گئی۔ "آخر کیوں، اس فیصلے کی وجہ کیا ہے؟"

"وہ نہیں چاہتے کہ میں جاؤں۔" نیلم نے بڑے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"لیکن اکبر نے تو مجھ سے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ وہ تو تمہیں لاہور بھیجنے کیلئے راضی ہے بلکہ وہ خود تمہیں لاہور لے جانا چاہتا ہے۔"

"میں اکبر کی بات نہیں کر رہی ہوں۔" نیلم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"پھر کس کی بات کر رہی ہو۔" صابرہ کے چہرے پر الجھن تھی۔

"میں بات کر رہی ہوں....." نیلم کچھ بتاتے بتاتے ایک دم خاموش ہو گئی۔

اس کی نظریں آئینے پر جمی ہوئی تھیں۔

"ہاں، نیلم بولو، تم کہتے کہتے رک کیوں گئیں۔" صابرہ نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔

سنگھار میز کے آئینے کی طرف صابرہ کی پیٹھ تھی اس لئے اسے وہ نظر نہیں آ رہا تھا جو نیلم کو نظر آ رہا تھا۔ آئینے میں قرل تھا اور وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے بارے میں بتانے سے منع کر رہا تھا۔ نیلم کی آنکھیں بدستور آئینے پر جمی ہوئی تھیں۔ صابرہ نے اس قدر اشتیاق سے اسے آئینے کی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو اس نے گردن گھمائی۔

صابرہ کے گردن گھماتے ہی قرل آئینے سے غائب ہو گیا۔ صابرہ کو وہاں کچھ نظر نہ آیا تو وہ پھر نیلم کی طرف پلٹی اور بولی۔ "ہاں، نیلم بتاؤ، تم کس کی بات کر رہی تھیں۔"

"جی میں تو کسی کی بات نہیں کر رہی تھی۔" نیلم نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

"پھر تم لاہور جانے کی تیاری کرو، اکبر خود تمہارے ساتھ جائے گا۔" صابرہ نے اس کی ذہنی کیفیت کے پیش نظر اس سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھی۔ اس نے اپنی بات کہی اور کمرے سے نکل آئی۔

نیلم نے بھی اس سے زیادہ الجھنا پسند نہ کیا۔ اس نے اس کی بات سنی اور خاموش رہی۔

وہ جانتی تھی کہ قرل کی اجازت کے بغیر دنیا کا کوئی آدمی اسے لاہور نہیں لے جا سکتا۔

سمندر میں نہانے کی وجہ سے اس کے جسم پر ریت جمی ہوئی تھی۔ کچھ دیر آرام کرنے کی وجہ سے کسی حد تک تھکن کم ہو گئی تھی۔ ریت کی وجہ سے اسے بے چینی ہو رہی تھی اس لئے اس نے سوچا کہ جا کر نہا لے۔

وہ الماری سے اپنے کپڑے نکال کر باتھ روم میں گھس گئی۔

باتھ روم میں وہ بڑی دیر تک گرم پانی کا شاور لیتی رہی۔ نہا کر اسے بڑا سکون ملا نہاتے ہوئے اسے ایک دو بار یہ احساس ہوا تھا جیسے کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ لیکن اسے نظر کچھ نہ آیا وہ اسے اپنا وہم سمجھ کر باتھ روم سے باہر آ گئی تھی۔

باتھ روم میں ایک قد آدم آئینہ لگا ہوا تھا۔ نیلم خود کو کپڑوں سے بے نیاز کرتے وقت کبھی آئینے کے سامنے نہیں کھڑی ہوتی تھی۔ اسے بڑی شرم آتی تھی۔ اس نے آج تک اپنے خوبصورت جسم کو آئینے میں آنکھ بھر کر نہیں دیکھا تھا جب اسے یہ احساس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے تو اس نے ایک گہری نظر آئینے پر ڈالی۔ آئینے کے اندر دور تک کوئی نہ تھا تب اس کی نظر اپنے مرمریں جسم پر جم کر رہ گئی وہ کس قدر حسین جسم تھا، سانچے میں ڈھلا، تراشیدہ، آنچ دیتا ہوا۔ آج اسے پہلی بار اپنے جسم کی کشش کا اندازہ ہوا۔ اس نے گھبرا کر کچھ شرما کر اپنے شعلہ بدن کو تولیہ میں لپیٹ لیا۔

جب وہ باہر نکلی تو اکبر کمرے میں موجود تھا۔ وہ نہا دھو کر آیا تھا اور ملیشیا کلر کے ریشمیں شلوار سوٹ میں خاصا چمک رہا تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو چمکتی نگاہوں سے دیکھا۔

نیلم نے اپنے بالوں کو تولیہ میں لپیٹ کر جوڑا سا بنایا ہوا تھا۔ وہ اس وقت سرخ رنگ کے سوٹ میں تھی۔ اس کا سفید گلابی چہرہ جیسے نور کا ہالہ بنا ہوا تھا۔ آدمی دیکھے تو بس دیکھتا رہ جائے۔

اکبر نے جب اس کے سراپے پر نظر ڈالی تو اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی وہ اس کے سامنے ہوتے ہوئے بھی اس سے کس قدر دور تھی۔ وہ اس کیلئے شجر ممنوع تھی وہ اس شجر کے سائے میں کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ یہ اس پر کیسا ظلم تھا۔

اچانک اکبر کے دل میں ایک ابال سا اٹھا۔ دماغ پر غبار سا چھایا۔ جنون کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس نے سوچا وہ کیوں نہ آج ہمت کر کے شجر ممنوع کو چھولے۔ ویسے وہ اس طرح کی کئی کوششیں ماضی میں کر چکا تھا اور ہر مرتبہ کسی عذاب میں مبتلا کر دیا گیا تھا۔

آج ہی تو اس سے معافی منگوائی گئی تھی۔

لیکن اس وقت نیلم کو باتھ روم سے باہر آتے دیکھ کر جانے کیوں اس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے وہ شجر ممنوع کو چھونے چلا تھا۔

اکبر کی آنکھوں کے رنگ بدلتے دیکھ کر نیلم سہم سی گئی۔ اس نے جلدی سے الماری سے شال نکال کر اپنے جسم کو اچھی طرح لپیٹ لیا اور چہرے پر بلا کی سنجیدگی طاری کر لی اور اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر اپنے گیلے بالوں کو جھٹکنے لگی۔

اکبر کو اس کی یہ حرکت اچھی نہ لگی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

نیلم نے اچانک آئینے پر نگاہ ڈالی تو وہ سہم سی گئی اکبر اس کے پیچھے کھڑا تھا جانے اب کیا ہونے والا تھا۔ یہ اچھا ہوا کہ اکبر نے کچھ سوچ کر اسے چھونے کا ارادہ ملتوی کر دیا وہ دھیرے سے بولا "نیلم۔"

اس کی آواز سن کر نیلم نے پہلے اسے آئینے میں دیکھا پھر وہ اس کی طرف مڑ گئی۔ "جی۔"

"نیلم لگتا ہے جیسے تم میری بیوی نہیں ہو۔" اس کے لہجے میں بڑا دکھ تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔" نیلم نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں کچھ نہیں کہہ رہا تمہارا رویہ کہہ رہا ہے، تم دن بدن تبدیل ہوتی جا رہی ہو۔ اب تم میں پہلے جیسی بات نہیں رہی ہے۔ تم مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہو۔ پہلے میں تمہاری آنکھوں میں ہوتا تھا لیکن اب میں تمہاری آنکھوں سے ہٹتا جا رہا ہوں۔"

"یہ محض آپ کا احساس ہے۔" نیلم نے ایسے ہی بات کو ٹالنے کیلئے کہا..... "میں آپ کی ہوں ہمیشہ آپ کی رہوں گی۔"

"نیلم میں اب تم سے دور نہیں رہ سکتا۔" اکبر نے تڑپ کر کہا.....

"سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ میں بڑا ڈرتی ہوں خدانخواستہ آپ کو کوئی بڑا نقصان نہ پہنچ جائے۔" نیلم نے گھبرا کر کہا۔

بڑے نقصان کی بات سن کر اکبر سہم سا گیا وہ ہر مرتبہ اس طرح کی کوشش کے نتیجے میں نت نئے عذابوں میں مبتلا کیا گیا تھا۔ ماموں فرقان نے بہت واضح طور پر نیلم سے دور رہنے کی تنبیہہ کی تھی اور وہ اس

عمل بھی کر رہا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اس طرح کی کوشش میں وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔ کامیاب ہونے کی بس ایک ہی صورت تھی کہ نیلم کو اس خبیث سے نجات دلا دی جائے۔ اور اس پر قابو پانا اتنا آسان نہ تھا۔ دادا غفور اور ماموں فرقان جیسے لوگ اس معاملے میں ناکام ہو چکے تھے اس کی تو بساط ہی کیا تھی۔

اکبر کا سارا جنون جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس پر ایک دم اداسی کا دورہ پڑا۔ اس نے نیلم کو بڑی بے بسی اور حسرت سے دیکھا۔ پھر وہ سر جھکا کر کمرے سے نکل گیا۔

نیلم نے اسے اس طرح جاتے دیکھا تو اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

وہ اس کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتی تھی لیکن وہ اس کے لئے کر کچھ نہیں سکتی تھی۔

اکبر کے اس طرح حسرت زدہ انداز میں لوٹ جانے کے بعد نیلم نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے خوبصورت گھنگھریالے بالوں سے جلدی جلدی پانی جھٹکنے لگی تھی۔

شال اتار کر اس نے بیڈ پر اچھال دی اور اپنے شانوں پر تولیہ پھیلا کر ریشمیں خوبصورت بالوں کو اس پر چھوڑ دیا تاکہ گھنگھریالے بالوں سے فیض گیلی نہ ہو۔

اچانک اس کی نظر بیڈ کی چادر پر پڑی وہ بیڈ کے نیچے سے آہستہ آہستہ باہر آ رہا تھا۔

نیلم اسے دیکھ کر ایک دم جم کر کھڑی ہو گئی اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اسے دیکھ کر اس مرتبہ نیلم کو ذرا بھی خوف محسوس نہ ہوا۔

یہ وہی کالا بلا تھا جسے دیکھتے ہی جسم میں کپکپی دوڑ جاتی تھی لیکن اس وقت وہ بڑے اطمینان سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کالے بلے نے بیڈ کے نیچے سے نکل کر ایک زوردار انگڑائی لی اور پھر وہ نیلم کے قدموں میں لوٹنے لگا۔

کالے بلے کا سخت جسم اس کی نرم ملائم ٹانگوں سے رگڑ کھا رہا تھا۔ اسے گدگدی سی محسوس ہو رہی تھی وہ فوراً بیڈ پر بیٹھ گئی۔ تب کالے بلے نے اپنی سرخ سرخ زبان سے اس کے گورے گورے بے حد خوبصورت پیروں کو چاٹنا شروع کر دیا۔ نیلم نے جھرجھری سی لی۔ اس کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اس نے ایک کمزور سی کوشش کی اپنے پاؤں اٹھانے کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی آنکھوں میں رنگ اترنے لگے ایک نشہ تھا جو اس پر چھائے چلا جا رہا تھا۔

پھر اچانک ہی کمرے میں راشدہ داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔

راشدہ نے اپنے سامنے جو منظر دیکھا اسے دیکھ کر وہ کانپ اٹھی وہ کالا بلا نیلم کے پاؤں چاٹ رہا تھا اور نیلم اس بلے کو پرکیف نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

راشدہ کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا، ٹانگیں لرز اٹھیں، ہاتھ کانپ اٹھے، پیالی پھسل کر قالین پر گری اور وہ ایک چیخ مار کر الٹے قدموں واپس بھاگی۔

راشدہ کی چیخ سن کر نیلم نے اپنی مخمور نظریں دروازے کی طرف اٹھائیں اس نے راشدہ کو اس قدر بدحواس بھاگتے دیکھ کر اسے آواز دی۔

"راشدہ، راشدہ۔"

لیکن راشدہ بھلا کہاں رکنے والی تھی۔ اس نے صابرہ کے پاس پہنچ کر ہی دم لیا اور جب اس نے

صابرہ کو وہ سب بتایا جو وہ دیکھ کر آرہی تھی تو صابرہ لرز کر رہ گئی۔

راشدہ کے کمرے سے بھاگنے کے بعد کالے بلّے نے اپنی سرخ آنکھوں سے نیلم کو دیکھا اور پھر نیچے کے پیچھے گھس گیا۔

چند لمحوں بعد پورا گھر اس کے کمرے میں آگیا لیکن اب یہاں کچھ نہ تھا نیلم آئینے کے سامنے کرسی پر بیٹھی اپنے بالوں میں برش کر رہی تھی۔

"ہائے نیلم تم ٹھیک تو ہو۔" صابرہ نے جلدی سے اسے اپنے گلے لگالیا۔

"ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" نیلم نے یہ بات اس انداز سے مسکرا کر کہی کہ پھر کوئی اور سوال کرنے کی کسی میں ہمت نہ پڑی۔

کمرے میں اب کوئی چیز نہ تھی جس کے بارے میں سوال کیا جاتا۔ راشدہ نے جو منظر دیکھا تھا اس کے بارے میں خود نیلم کو کچھ کہنا چاہئے تھا لیکن وہ چپ تھی اس کی چپ میں بڑی پُراسراریت تھی۔ تب ان لوگوں نے قیاس کرلیا کہ راشدہ نے جو کچھ دیکھا تھا وہ اس کی نظر کا فریب تھا۔

یہ کوئی نہ جان سکا کہ یہ فریب خود نیلم نے دیا تھا۔

خود نیلم کو اپنے آپ پر حیرت تھی۔ اس کی کالے بلّے سے روح فنا ہوتی تھی وہ اس کی آواز سن لیتی یا اس کی منحوس شکل دیکھ لیتی تو لرز اٹھتی تھی لیکن آج جانے کیا ہوا تھا کہ اس کے دل سے کالے بلّے کا خوف اچانک نکل گیا تھا۔ اس کے قدموں میں لوٹا وہ کالا بلّا اسے اچھا لگا تھا۔

رات کو حسب معمول وہ صابرہ کے کمرے میں سوئی۔ رات کے وقت نیلم کے بیڈروم کو لاک کردیا جاتا تھا تو آج بھی کردیا گیا۔

نیلم بیڈ کے ایک کنارے پر تھی اس کے برابر صابرہ تھی اور صابرہ کے اس طرف راشدہ سو رہی تھی۔

اس رات نیلم کو نیند نہیں آرہی تھی وہ بار بار کروٹیں بدل رہی تھی۔

"کیا ہوا، نیلم نیند نہیں آرہی کیا۔" صابرہ نے اسے کروٹیں بدلتے دیکھ کر پوچھا۔

"جی۔" نیلم نے مختصر سا جواب دیا۔

"نیند کی گولی دے دوں۔" صابرہ نے کہا۔

"نہیں، نیند کی گولی کھا کر میری طبیعت عجیب سی ہوجاتی ہے۔" نیلم نے کہا..... "میں سوجاؤں گی۔ آخر کب تک نیند نہیں آئے گی، آپ سوجائیں۔"

پھر صابرہ کو نیند آگئی، راشدہ پہلے ہی سو چکی تھی۔

نیلم کو ابھی تک نیند نہیں آئی تھی۔ سامنے دیوار گیر گھڑی میں ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ ایک تو کچھ نیلم کو نیند نہیں آرہی تھی، دوسرے بار بار دماغ میں یہ خیال آرہا تھا کہ یہاں سے اٹھ کر اپنے بیڈروم میں چلی جائے۔ اس خواہش پر اسے خود حیرت تھی۔

یہ خیال سمندر کی لہروں کی طرح اس کے دل کے کناروں سے ٹکرا رہا تھا۔

یہ خواہش اس کے دل پر ساون بھادوں کی طرح برس رہی تھی۔

کوئی اسے بلا رہا تھا۔

پھر اس خواہش نے بپھرے سمندر کی شکل اختیار کرلیا۔ طوفانی موجیں ایک کے بعد ایک اس کے پتھر

دل پر سرپٹک رہی تھیں۔ کوئی اسے بلا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں کہیں دور وہ آواز سنائی دے رہی تھی۔

"آؤ نیلم ..... آؤ نیلم ..... آؤ نیلم۔"

پھر اس سے رہا نہ گیا۔ اس کا دل جیسے مچل اٹھا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے صابرہ اور راشدہ کے چہروں پر نظر ڈالی وہ دونوں بے خبر سو رہی تھیں۔

وہ بلاوا جو مسحور کن خوشبو کی طرح تھا، مسلسل اس کی سماعت پر شبنمی قطروں کی طرح برس رہا تھا۔ کوئی اسے آواز دے رہا تھا۔

"آؤ نیلم ..... آؤ نیلم ..... آؤ نیلم۔"

اس بلاوے میں کس قدر چاہت تھی، کس قدر پیاس تھی۔

وہ کھڑی ہوگئی۔ ایک مرتبہ پھر اس نے راشدہ اور صابرہ کے چہروں پر نظر ڈالی۔ کمرے میں زیرو واٹ کا نیلا بلب روشن تھا۔ اس نیلی روشنی میں دونوں کے چہرے صاف نظر آرہے تھے۔ وہ دونوں گہری نیند میں تھیں۔

وہ آواز ..... وہ خوشبو جیسی آواز، مسحور کن بلاوا مسلسل اس کے دروں پر دستک دے رہا تھا۔

"آؤ نیلم ..... آؤ نیلم ..... آؤ نیلم۔"

اب وہ کسی سحرزدہ معمول کی طرح چل پڑی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جارہی ہے لیکن پھر بھی وہ جارہی تھی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ مڑکر بیڈ پر نظر ڈالی اور پھر آہستگی سے دروازہ بند کردیا۔

اس کا رخ اپنے بیڈروم کی طرف تھا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ رات کو بیڈروم کو مقفل کردیا جاتا ہے اور چابی کہاں ہوتی ہے یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ بیڈروم کی طرف بڑھتے ہوئے یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ بیڈروم تو بند ہوگا۔ اس خیال کے آنے کے باوجود اس کے قدم رکے نہیں۔

وہ سحرزدہ معمول کی طرح آگے بڑھتی رہی۔

اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو دروازہ فوراً کھل گیا۔

وہ خوشگوار حیرت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوگئی اور پھر اس نے اندر جاکر دروازہ بند کرلیا۔

پھر سحر ہوئی وہ صبح کتنی قیامت خیز تھی۔

سب سے پہلے صابرہ کی آنکھ کھلی، گھر میں سب سے پہلے وہی اٹھتی تھی دودھ والا گیٹ بجا رہا تھا۔ صابرہ نے ایک نظر اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ راشدہ بیڈ پر موجود تھی لیکن نیلم نہیں تھی۔

صابرہ نے فکر نہ کی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ باتھ روم میں ہوگی۔

سب سے پہلے اس نے جاکر دودھ لیا کچن میں جاکر ہلکی آنچ پر دودھ رکھا۔ صحن سے اخبار اٹھایا اور پھر اپنے کمرے میں آگئی۔

نیلم اب بھی بیڈ پر نہ تھی۔

صابرہ نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا اور بیڈ پر بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگی۔
اخبار دیکھتے دیکھتے وہ اچانک فکرمند ہوگئی۔ نیلم اگر باتھ روم میں ہوتی تو اب تک نکل آتی۔ وہ
تھی۔ صابرہ نے اخبار ایک طرف ڈالا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر باتھ روم کے دروازے پر گئی۔ اس
سے دروازہ بجایا اور اپنے کان دروازے پر لگادیئے۔ اندر سے کوئی آہٹ نہ سنائی دی۔
پھر اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔
باتھ روم خالی پڑا تھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔
صابرہ تیزی سے واپس آئی اس نے راشدہ کو اٹھایا۔ راشدہ نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور حیرت
ہوئے بولی۔ "جی امی کیا ہوا؟"
"بیٹی، وہ نیلم نہیں ہے۔"
"امی وہ گھر میں ہی ہوں گی اور کہاں جائیں گی۔"
"مجھے تو خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔"
"امی اب آپ کو تو ہر وقت خطرہ محسوس ہوتا رہتا ہے۔ کس قدر ڈرپوک ہوگئی ہیں آپ۔" راشدہ
نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں دیکھتی ہوں جاکر۔"
راشدہ پورے گھر کا چکر لگا آئی۔ اس نے سب کمرے جھانک لئے لیکن نیلم کا بیڈروم نہ دیکھا کیونکہ
وہ رات کو اس نے خود لاک کیا تھا۔ یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھی کہ نیلم رات کو لاؤنج
کر اپنے کمرے میں چلی جائے گی۔
اب راشدہ کو بھی فکر ہوئی اس نے صابرہ سے گھبرا کر کہا۔ "امی، نیلم بھابھی تو گھر میں کہیں نہیں
ہیں۔"
"راشدہ تو جاکر ذرا اکبر کو اٹھا، میں باہر کو اٹھاتی ہوں۔" صابرہ پرتشویش لہجے میں بولی۔
دونوں کے کمرے مخالف سمتوں میں تھے۔ راشدہ گیسٹ روم کی طرف بھاگی۔ صابرہ نے باہر کے
کمرے کا رخ کیا۔ راستے میں نیلم کا بیڈروم پڑتا تھا۔
صابرہ نے چلتے چلتے ایسے ہی اس کے دروازے پر لگے ہینڈل کو گھما کر دیکھا۔
دروازہ فوراً کھل گیا۔
دروازہ کھلتے ہی کمرے کے اندر سے بڑی مسحور کن خوشبو آئی۔ صابرہ نے جلدی سے پورا دروازہ
کھول دیا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔
قالین پر گلاب کی پتیوں کی کوئی ایک فٹ اونچی تہہ جمی ہوئی تھی۔ پورے کمرے میں گلاب کی پتیوں کا
فرش بچھا ہوا تھا۔
بیڈ پر بھی ڈھیروں گلاب کی پتیاں بچھی ہوئی تھیں اور اس گلاب کی پتیوں کے نرم اور خوشبودار بستر پر
نیلم لیٹی ہوئی تھی۔
اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرے پر تازگی اور آسودگی تھی، وہ بڑی پرسکون نیند سو رہی تھی۔
اس کا جسم کپڑوں سے بےنیاز تھا، صابرہ نے جلدی سے بیڈ سے نیچے پڑے لحاف کو اس پر ڈال

رہا تھا۔ اکبر گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ "کہاں گئی نیلم۔"
پھر بابر پریشان ہوتا کمرے میں آیا۔ "صابرہ کیا ہوا؟"
کمرے میں جو دونوں نے قدم رکھا تو گلاب کی پتیوں نے ان کا سواگت کیا۔ مہکتا ہوا کمرہ۔ گلاب کی پتیوں کا وہ بستر۔ جلتی ہوئی شمع۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے سوئی ہوئی نیلم۔
کتنی کہانیاں تھیں جو آپ ہی آپ دل میں جنم لے رہی تھیں۔ ہونٹوں سے پھسل رہی تھیں۔
یہ ان کہی کہانیاں جو رات کا فسانہ بڑے سنجیدہ لہجے میں بیان کر رہی تھیں۔ ان کہانیوں کو سن کر۔ ان باتوں کو محسوس کر کے اکبر کے دل پر چھری سی چل رہی تھی۔ یہ سب کیا تھا۔ یہ سب کیا ہو گیا تھا۔
صابرہ پر لرزہ طاری تھا۔ بابر محو حیرت تھا۔ راشدہ کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔
سب کے سب سوئی ہوئی نیلم کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہاں نیلم نہ ہو۔ نیلم کی لاش پڑی ہو۔ یہ ایک بات ہے کہ کوئی رو نہیں رہا تھا۔ یا سب رو رہے تھے۔
اچانک نیلم نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔
یہ نیلم کی آنکھیں نہ تھیں۔ یہ کسی اور کی آنکھیں تھیں۔ لال انگارہ۔
"آپ لوگ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ دیکھتے نہیں کہ یہاں دلہن لیٹی ہے۔ آپ لوگ جائیں یہاں سے اسے آرام کرنے دیں۔" یہ نیلم کی آواز نہ تھی۔ یہ کسی اور کی آواز تھی۔ یہ سید پور کے جن کی آواز تھی۔
یہ سن کر سب سے پہلے صابرہ بھاگی۔ اس کے بعد راشدہ۔ پھر کمرے میں سے بابر نکلا اس کے بعد اکبر۔ کوئی گیارہ بجے تک "دلہن" کمرے میں آرام کرتی رہی۔
پھر وہ خود ہی کمرے سے باہر آ گئی۔
وہ سفید جوڑا پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں بیش قیمت ہیرے کا ہار تھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر خاموشی سے صابرہ کے کمرے میں چلی گئی۔
نیلم کسی سے ایک لفظ نہ بولی۔ نہ ہی کسی نے اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی۔
نیلم کے کمرے کی جب صفائی کی گئی تو اس میں سے منوں گلاب کی پتی برآمد ہوئی۔ جب بیڈ پر سے گلاب کی پتیوں کو صاف کیا گیا تو ایک اور حیرت انگیز بات سامنے آئی۔
پورے بیڈ پر نوٹوں کی گڈیاں بڑے سلیقے سے برابر برابر رکھی ہوئی تھیں۔
جب بابر نے ان نوٹوں کی گڈیوں کو شمار کیا تو کل رقم پچیس لاکھ بنی۔ ایک کروڑ کی چوتھائی۔
شبہ ہوا کہ یہ نوٹ جعلی ہوں گے لیکن یہ شبہ بھی غلط نکلا۔ وہ کرنسی کھری اور سچی تھی۔ اس سارے واقعہ کی ماموں فرقان کو اطلاع دی گئی۔
ماموں فرقان دکان سے سیدھے گلشن پہنچے۔ ابھی وہ گیٹ پار کر کے گھر میں داخل ہی ہو رہے تھے کہ نیم اندر سے ایک دم بپھری ہوئی برآمد ہوئی۔ وہ سخت غصے میں تھی۔
"فرقان تو کیوں آیا ہے۔ جا واپس چلا جا اور آئندہ اس گھر کی دہلیز پار نہ کرنا ورنہ تجھے وہ سزا دوں گا

کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ "نیلم اپنی لال لال آنکھیں نکالے، مردانہ آواز میں بول رہی تھی۔

ماموں فرقان کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ وہ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ وہ ہر طرح سے محفوظ تھے لیکن ان کے گھر والے تو محفوظ نہ تھے۔ وہ انہیں نقصان پہنچا سکتا تھا۔ کوئی بھی شعبدہ باز ہو، سب سے پہلے وہ اپنے گھر والوں کو ہی ہپناٹائز کرتا ہے۔ ماموں فرقان کے چلے جانے کے بعد نیلم نے باری باری اپنی انگارہ آنکھوں سے سب کو گھورا اور پھر مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس کی مسکراہٹ سے خباثت ٹپک رہی تھی۔

اکبر کا آج لاہور جانے کا پروگرام تھا۔ جہاز کے ٹکٹ لینے سے پہلے اس نے ایک مرتبہ نیلم سے بھی چلنے کیلئے پوچھا۔ "نیلم میں ریزرویشن کرانے جارہا ہوں۔"

"مجھے نہیں جانا کہیں۔ سمجھے۔"

نیلم نے جب مردانہ آواز میں آنکھیں تھما کر "سمجھے" کہا تو اکبر کو پسینہ آگیا۔

بابر نے لاہور فون کر دیا کہ نیلم نہیں آسکے گی۔ ساتھ ہی واجدہ کو سارے حالات سے مطلع کر دیا۔

واجدہ اور فیاض حسین گھبرا کر دوسرے دن کراچی پہنچ گئے۔

نیلم اپنے ماں باپ کو دیکھ کر ان سے لپٹ گئی اور لپٹی ہوئی بہت دیر تک سسک سسک کر روتی رہی۔

واجدہ کی بری حالت تھی۔ وہ بار بار نیلم کا سر اپنے کاندھے سے اٹھا کر اس کی پیشانی اور رخسار کو چومتی اور پھر "میری جان، میری بیٹی۔" کہہ کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتی۔

نیلم اگرچہ واجدہ کی سگی بیٹی نہ تھی لیکن اس نے ہمیشہ اس کو سگا ہی سمجھا تھا یا شاید سگوں سے بھی زیادہ۔ اس نے اسے بڑی توجہ اور بڑے پیار سے پالا تھا۔ نیلم کے اگر کانٹا بھی چبھ جاتا تو واجدہ کو یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے اپنے دل میں چھری گھس گئی ہے۔

نیلم کے بارے میں اسے فون پر جو کچھ معلوم ہوا تھا، اسے اس نے بولا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بڑی دیر تک اس کو اسی طرح چوم چوم کر روتی رہی۔

جب کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی تو فیاض حسین نے ماں بیٹی کو آہستگی سے الگ کیا۔ نیلم ماں سے جدا ہوئی تو وہ اپنے باپ سے لپٹ گئی۔ اب فیاض حسین بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے۔

پھر بڑی مشکل سے یہ آنسوؤں کی برسات بند ہوئی۔

صابرہ، نیلم اور واجدہ کو لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔ بابر، فیاض حسین کو لے کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ اکبر کبھی ماں کے پاس بیٹھ جاتا، کبھی وہ باپ کے پاس چلا جاتا۔

دونوں جگہ ایک ہی کہانی چل رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر جب سب لوگ اکٹھا ہوئے تو نیلم اچانک بیٹھے بیٹھے جھومنے لگی۔

پھر جھومتے جھومتے نیلم نے ایک دم سر اٹھایا اور واجدہ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے بولی۔

"ای۔"

"ہاں، بیٹا بولو۔" واجدہ صوفے سے نیچے اتر آئی اور پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر قالین پر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"امی، آپ انار کلی کی چاٹ کھائیں گی۔" نیلم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ابھی آواز بدلی تھی نہ ہچکیں۔

"بیٹا انار کلی لاہور میں ہے اور لاہور یہاں سے بہت دور ہے۔" واجدہ نے کہا۔

"یہ سب مجھے نہ بتائیں۔ آپ کھانے کا اقرار کریں۔"

"اچھا، اگر میں کھانے کا اقرار کروں۔ تو کیا تم مجھے چاٹ کھلا دو گی۔"

"جی بالکل۔" نیلم نے بڑی بے نیازی سے کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

"لیکن کیسے؟" واجدہ نے سوال کیا۔

"ایسے۔" نیلم نے یہ کہہ کر اپنا سیدھا ہاتھ آگے پھیلایا تو اس پر چاٹ کی پلیٹ نمودار ہو گئی۔

"لیں امی کھائیں۔" نیلم نے پلیٹ واجدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

واجدہ نے حیرت زدہ ہو کر پلیٹ لے لی۔ پھر اس نے پلیٹ میں رکھے ہوئے چمچے سے چاٹ کھائی یہ چاٹ کی پلیٹ واقعی انار کلی کی اس مخصوص دکان کی تھی جہاں وہ اکثر چاٹ کھایا کرتے تھے۔ اس دکان کی چاٹ کا ذائقہ ہی الگ تھا۔

پھر نیلم بار بار اپنا ہاتھ فضا میں پھیلاتی رہی۔ ہر بار اس کے ہتھیلی پر ایک پلیٹ نمودار ہو جاتی۔ جب سب لوگوں کے لئے چاٹ کی پلیٹ مکمل ہو گئی تو آخر میں۔ اس نے اپنے لئے چاٹ کی پلیٹ منگوائی۔ پھر وہ مزے لے لے کر چاٹ کھانے لگی۔

واجدہ اور فیاض دو دن کراچی میں رہے۔ وہ نیلم کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آئے تھے لیکن نیلم لاہور جانے کے لئے تیار نہ تھی۔ ان دو دنوں میں متعدد بار واجدہ نے نیلم سے لاہور جانے کے لئے کہا تھا پہلے تو وہ مسکرا کر ٹالتی رہی۔

لیکن جب واجدہ کا اصرار بڑھا اور اس نے فیصلہ کن انداز میں نیلم سے پوچھا۔ "ہاں بھئی۔ نیلم تمہارے ابو کو ریزرویشن کیلئے بھیج دوں۔"

تو اسے ایک دم جلال آ گیا۔ اس کی آنکھیں۔ اس کی نہ رہیں۔ اس کی آواز اس کی نہ رہی۔ آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں اور آواز مردانہ ہو گئی۔

"اری بے وقوف۔ کیوں اپنی جان کی دشمن ہوئی ہے۔ تو نیلم کو لاہور لے جانہ سکے گی۔ کیوں خواہ مخواہ اسے پریشان کر رہی ہے۔ تیری نیلم سے ملاقات ہو گئی۔ اسے بہت جان۔ جا اپنا رستہ لے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔ آپ ناراض نہ ہوں۔ میں آپ کی مرضی کے خلاف اسے کہیں نہیں لے جاؤں گی۔" واجدہ نے بڑی فرمانبرداری سے کہا۔

"یس پھر ٹھیک ہے۔ تو لوٹ جا۔"

اس جملے کے بعد واجدہ نے فیاض حسین سے واپس چلنے کو کہا۔ فیاض حسین کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنے دل کی بات واجدہ سے کہی۔ "ہم کیوں نہ نیلم کو کچھ بتائے بغیر اسے اپنے ساتھ لے

جائیں۔"

"ارے فیض فیاض. ایسا غضب نہ کرنا۔ وہ ہمیں برباد کر دے گا۔" واجدہ نے سہم کر کہا۔

پھر وہ دونوں بے بس ہو کر لاہور واپس لوٹ گئے۔ پچھلی مرتبہ داؤد غفور نے نیلم کو جانے سے منع کر دیا تھا اس مرتبہ سیتہ پور کا جن آڑے آگیا تھا۔

واجدہ اور فیاض حسین کے جانے کے بعد نیلم نے پھر سے پُراسرار خاموشی اختیار کر لی۔ کوئی اس سے لاکھ سوال کرتا۔ اگر اس کا جی چاہتا تو جواب دیتی ورنہ ہونٹ سیئے بیٹھی رہتی۔

شام کو پینے بھائے اسے جانے کیا سوجھی کہ اپنا عروسی جوڑا نکال کر استری کرنے لگی۔

راشدہ نے اسے جوڑا استری کرتے دیکھا تو صابرہ کو جا کر بتایا۔

صابرہ بھاگی ہوئی۔ نیلم کے کمرے میں آئی۔ اب وہ دوپٹے پر استری پھیر رہی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہو نیلم۔"

"اپنا جوڑا استری کر رہی ہوں۔"

"کیوں نیلم۔"

"پہنوں گی۔ آج شادی کا جوڑا پہننے کو جی چاہ رہا ہے۔" نیلم نے سادگی سے کہا۔

اور پھر اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

نیلم بڑی بے نیازی سے اپنے کپڑے استری کرنے میں مگن تھی۔ اس نے پلٹ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ صابرہ کمرے میں موجود ہے یا واپس چلی گئی۔

صابرہ سنگھار میز پر جلتی ہوئی موم بتی کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ یہ عجیب شمع تھی اسے جلتے ہوئے کئی دن ہو گئے تھے مگر مجال ہے جو ذرا سی بھی پگھلی ہو..... جانے وہ کس موم کی بنی تھی۔

"نیلم۔" صابرہ نے دھیرے سے پکارا۔

"جی۔" نیلم نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔

"بیٹی۔ یہ کپڑے تم کیوں استری کر رہی ہو۔ کیا اکبر نے کہا ہے؟" صابرہ نے سوال کیا۔

"نہیں اکبر نے کچھ نہیں کہا وہ کیا کہیں گے وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔" نیلم نے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔

"پھر آج اچانک عروسی جوڑے کا کیسے خیال آگیا۔" صابرہ نے کریدا۔

"ان کی خواہش ہے کہ آج میں دلہن کے روپ میں ان کے سامنے جاؤں۔" نیلم نے آہستگی سے کہا۔

"اُن کی؟" صابرہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "اکبر کی بات کر رہی ہو؟"

"ارے نہیں۔" نیلم نے استری کرتے ہوئے صابرہ کو مڑ کر دیکھا اس کے چہرے پر ایک عجیب پُراسرار مسکراہٹ تھی..... ایک عجیب سا تاب تھا۔

"پھر کس کی بات کر رہی ہو؟" صابرہ نے فکرمندی سے کہا۔

"میں تو ان کی بات کر رہی ہوں جو سامنے کھڑے ہیں۔" نیلم بڑے پُراسرار انداز میں بولی۔

"لیکن یہاں تو کوئی نہیں ہے۔" صابرہ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

صابرہ نے سنگھار میز کے آئینے میں دیکھا لیکن اسے وہاں کوئی نظر نہ آیا ..... لیکن وہ خوف میں مبتلا ہو گئی ..... پھر اچانک اس کی نظر جلتی ہوئی موم بتی پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ موم بتی کے برابر میں خوفناک کالا بلا اطمینان سے بیٹھا اپنے اگلے پاؤں چاٹ رہا ہے۔

وہ کالے بلے کو دیکھ کر صابرہ کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ فوراً حیرتی سے کمرے سے نکل آئی۔

کالے بلے کے جانے کے بعد کالے بلے نے سنگھار میز سے چھلانگ لگائی اور نیلم کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ نیلم کو ذرا بھی ڈر نہ لگا وہ اپنا کام کرتی رہی اور وہ اپنا کام کرتا رہا اس کے قدموں میں لوٹتا رہا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد نیلم اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نیلم کو اپنے کمرے میں جاتے دیکھا تو راشدہ نے فوراً صابرہ کو بتایا۔

"نیلم بھابھی اپنے کمرے میں گئی ہیں؟"

"لیکن رات کو تو وہ کبھی اپنے کمرے میں نہیں گئی۔" صابرہ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"اب جانے لگی ہیں؟" راشدہ بولی۔

"ذرا دیکھو تو کیا کر رہی ہے؟" صابرہ نے ہدایت کی۔

"اچھا دیکھتی ہوں۔" یہ کہہ کر راشدہ نے نیلم کے کمرے کا رخ کیا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا لاک نہ تھا۔ راشدہ نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر جھانکا کمرے میں نیلم کا کہیں پتہ نہ تھا۔

راشدہ کو بڑی حیرت ہوئی کہ نیلم اچانک کہاں غائب ہو گئی..... ابھی تو اس نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ نیلم کہاں غائب ہو گئی، باتھ روم کا دروازہ کھلا..... نیلم عروسی جوڑا پہنے وہاں سے برآمد ہوئی، اگرچہ نیلم نے راشدہ کو دروازے میں کھڑے دیکھ لیا تھا لیکن اس نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی..... وہ بڑے اطمینان سے سنگھار میز کے سامنے اسٹول پر بیٹھ گئی اور اپنے بالوں میں برش پھیرنے لگی..... بالوں کو سنوار کر اس نے ہلکا ہلکا میک اپ کرنا شروع کر دیا۔

راشدہ نے دروازہ آہستہ سے بند کر دیا اور پھر تیزی سے چلتی ہوئی صابرہ کے پاس پہنچی۔

"شادی کا جوڑا پہن چکی ہیں اور اب میک اپ کر رہی ہیں۔" راشدہ نے رپورٹ پیش کی۔

"کیا ہو گیا ہے اس لڑکی کو۔" صابرہ نے جھنجھلا کر کہا۔

"پتہ نہیں امی۔"

"بھلا بتاؤ یہ سونے کا وقت ہے یا بناؤ سنگھار کا..... وہ سونے کے بجائے دلہن بننے میں لگی ہے۔" صابرہ نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ "ذرا اس سے پوچھ کیا آج رات وہ اپنے کمرے میں ہی سوئے گی۔"

"امی آپ خود جا کر پوچھ لیں۔ مجھے ان کے کمرے میں جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

"اچھا چھوڑ اس سے کیا پوچھنا اس نے سونا ہو گا تو خود ہی آجائے گی ہمارے کمرے میں۔" صابرہ نے لاپروائی سے کہا۔ اصل بات یہ تھی کہ خود اس میں ہمت نہ تھی کہ نیلم کے کمرے میں جا کر بات کرے۔

رات کو گیارہ بجے کے قریب اکبر باہر سے واپس آیا۔ راشدہ نے گیٹ کھولا۔

"اکبر بھائی۔ ایک بات بتاؤں آپ کو۔" راشدہ سے رہا نہ گیا۔ اس نے فوراً رپورٹ پیش کرنے کی اجازت چاہی۔

"ہاں جی۔ ضرور بتائیں۔" اکبر نے خوشدلی سے کہا۔

"نیلم بھابھی آج دلہن بنی بیٹھی ہیں۔" راشدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہاں ہے وہ۔" اکبر نے پوچھا۔

"اپنے بیڈروم میں۔" راشدہ نے بتایا۔

"اچھا میں دیکھتا ہوں خود جاکر۔" اکبر نے کہا۔

اکبر سیدھا اپنے بیڈروم کی طرف گیا۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو وہ اندر سے لاک تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد دروازہ کھلا ..... دروازہ کھلتے ہی کمرے سے ایک مسحور کن خوشبو کا جھونکا آیا۔ اکبر نے قدم اندر بڑھانے کی کوشش کی لیکن نیلم نے اسے فوراً روک دیا اور بڑے غصے سے بولی۔

"کیوں آئے ہو یہاں۔ جاؤ یہاں سے۔"

پھر اس نے اکبر کو پیچھے دھکیل کر دروازہ بند کرلیا۔ اکبر نے اندر سے چٹخنی چڑھائے جانے کی آواز سنی۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازہ پھر سے کھٹکھٹائے یا واپس چلا جائے اتنے میں کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ صابرہ تھی اس نے بڑی نرمی سے اکبر کا ہاتھ تھاما اور اسے اپنی طرف کھینچنے لگی۔

"آجاؤ بیٹا۔" صابرہ نے آہستگی سے کہا۔

اکبر ایک گمبھیر خاموشی کے ساتھ اپنی ماں کے ہمراہ چلا آیا۔

وہ رات اکبر نے جیسے کانٹوں پر گزاری..... کبھی وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا..... کبھی ٹہلنے لگتا..... پھر ٹہلتے ٹہلتے دھم سے بیڈ پر گر پڑتا..... اور کسی زخمی پرندے کی طرح بستر پر تڑپنے لگتا۔

اسے جب بھی نیلم کا خیال آتا ..... اس کے دماغ میں آندھی سی چلنے لگتی وہ دلہن کا روپ دھارے دوسرے کمرے میں بند تھی اور وہ یہاں کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔

شادی سے پہلے اکبر نے کبھی خواب آور گولی کا استعمال نہیں کیا تھا لیکن شادی کے بعد وہ اکثر گولیوں کا استعمال کرنے لگا تھا۔ نیند نہ آتی تو وہ ٹی وی ٹرالی کو اپنے کمرے میں کھینچ لاتا اور کوئی فلم دیکھنے بیٹھ جاتا ..... لیکن ہوتا یوں کہ اس کی آنکھیں ٹی وی اسکرین پر ہوتیں لیکن دماغ کہیں اور ہوتا ..... پچھلے واقعات۔ گزرے ہوئے حادثات اس کے دماغ کی اسکرین پر نظر آرہے ہوتے ..... تب وہ جھنجھلا کر ٹی وی بند کردیتا اور ایک خواب آور گولی کھا کر سوتا ..... آج اس کے دل پر اس قدر بوجھ تھا کہ اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو آرہے تھے۔ گلا رندھ رندھ جاتا تھا اس کے کمرے میں ایک دلچسپ انگلش فلم پڑی تھی وہ اسے دیکھنے کے لئے آج لایا تھا لیکن اس وقت اس فلم کو دیکھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

جب ذہنی الجھن اور دل کا درد مزید سوا ہوا تو اس نے شیشی سے ایک نہیں چار گولیاں نکالیں ہاتھ روم میں جا کر پانی سے گلاس بھرا..... اور وہ دو دو کر کے گولیاں پانی سے نگل لیں۔

چار گولیاں کھاتے ہی ایک دم جسم میں سنسنی سی پھیل گئی وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے بستر پہ آیا اور دھیر ہو گیا اس نے بمشکل لحاف اوڑھا اسے اپنی آنکھوں کے سامنے گہرا اندھیرا محسوس ہو رہا تھا حالانکہ کمرے میں خوب روشنی تھی۔

اسے پسینہ آ رہا تھا اور وہ خود کو نرم نرم روئی میں دھنستا محسوس کر رہا تھا پھر اسے گرد و پیش کا ہوش نہ رہا۔

ہوش تو نیلم کو بھی نہ تھا..... اس کی رات کس طرح گزری تھی۔ یا شاید اسے بھی معلوم نہ تھا۔

اکبر نیند کی چار گولیاں کھا کر مدہوش ہوا تھا تو نیلم کے اس مسحور کن خوشبو نے ہوش چھین لئے تھے۔

صبح جب نیلم کی آنکھ کھلی تھی تو اس کے جسم میں سخت درد تھا جسم ٹوٹ رہا تھا تپ رہا تھا آنکھ کھلنے کے باوجود اس سے اٹھا نہ گیا..... اس کے ہاتھ پاؤں سے جیسے کسی نے جان نکال لی تھی..... وہ خاصی دیر اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑے لیٹی رہی..... اور گزری رات کے بارے میں سوچتی رہی۔

صبح کو جب اکبر کافی دیر تک اپنے کمرے سے نکل کر باہر نہ آیا تو صابرہ کو فکر ہوئی۔

ناشتہ میز پر لگ چکا تھا..... بابر علی ناشتہ کر رہا تھا اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔

"یہ اکبر کہاں رہ گیا۔" بالآخر اس نے پوچھا۔ "آج ناشتہ نہیں کرے گا؟"

"اکبر اپنے کمرے میں ہے..... شاید سو رہا ہے..... میں دیکھتی ہوں جا کر۔" یہ کہہ کر صابرہ اٹھ گئی۔

"ابو آپ کو چائے دوں۔" صابرہ کے جانے کے بعد راشدہ نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا آدھا کپ دیدو۔" بابر علی نے اپنا خالی کپ اس کے سامنے رکھا اور بولا۔ "نیلم بھی نظر نہیں آ رہی؟"

"بھابھی آج کل دیر سے اٹھتی ہیں، وہ اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔" راشدہ نے بتایا۔

"اچھا۔" بابر علی نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔

"سنیں۔" اچانک صابرہ کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ "ذرا اکبر کو دیکھیں اس کو کیا ہو گیا ہے۔"

"یا اللہ خیر۔" بابر نے فکر مند ہو کر کہا اور فوراً اٹھ گیا۔ "کیا ہوا۔"

"وہ بالکل بے سدھ پڑا ہے جیسے بیہوش ہو۔" صابرہ نے بتایا۔

بابر علی تیزی سے گیسٹ روم میں پہنچا..... اکبر واقعی اتنی گہری نیند میں تھا کہ اس پر بیہوشی کا گماں ہوتا تھا۔

بابر علی نے اس کا سر ہلا کر کئی آوازیں دیں۔ "اکبر، اکبر، بیٹے اکبر۔"

باپ کی آواز سن کر اکبر نے بمشکل آنکھ کھولی۔ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر چند سیکنڈوں بعد آنکھیں بند کر لیں اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ نیند سے بوجھل تھیں۔

اس کو دوبارہ سوتے دیکھ کر باہر علی نے اسے پھر ہلایا۔ "بیٹے، اکبر اٹھو، کیا شور و غل مچا ہوا ہے۔"
باپ کی آواز سن کر ایک مرتبہ اس نے پھر آنکھ کھولی اور آنکھیں چندھیا کر بولا۔ "ہیں۔"
اور اس کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔
"یہ کیا ہو گیا ہے اسے۔" باہر علی، صابرہ سے مخاطب ہوا۔ "اس قدر گہری نیند۔"
"کہیں اس نے خواب آور گولی تو نہیں کھالی ..... کئی راتوں سے بے خوابی کا شکار تھا۔ میں سنو۔"
اسے ایک گولی لینے کا مشورہ دیا تھا۔" صابرہ نے بتایا۔
"مجھے لگتا ہے اس نے ایک ساتھ کئی گولیاں کھالی ہیں، ایک گولی اس قدر گہری نیند نہیں لاتی۔"
باہر علی نے اکبر کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
اس دن کوئی بارہ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی ..... وہ بھی راشدہ کے شور مچانے پر۔
"اکبر بھائی، اٹھیں نا آخر کب تک سوئیں گے۔"
اکبر اس کی آواز پر اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن بیٹھا بیٹھا پھر جھومنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی نیند بھری تھی اسے اپنا جسم شکستہ سا محسوس ہو رہا تھا ..... گلا بے حد خشک تھا ..... زبان پر کانٹے سے چبھ رہے تھے۔
"ٹھہریئے، میں آپ کیلئے اسٹرانگ سی چائے بنا کر لاتی ہوں۔ ایسے نہیں کھلیں گی آپ کی آنکھیں ..... ادھر آپ سوئے ہوئے ادھر نیلم بھابھی بھی سوئی ہوئی ہیں ..... دونوں کو گرم گرم چائے دیتی ہوں ..... پھر شاید دونوں کی نیند اڑ جائے۔"
نیلم کا نام سن کر اکبر کی نیند فوراً اڑ گئی۔
اسے گزری رات کا فسانہ یاد آگیا۔ نیلم کا دلہن بننا ..... کمرے میں بند ہونا اور اسے دھتکار دینا ..... نیلم کی وہ غصیلی آواز اب بھی اس کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گھس رہی تھی۔
"کیوں آئے ہو یہاں، جاؤ یہاں سے۔"
"راشدہ چائے بنانے سے پہلے ٹھنڈا پانی پلا، میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔" اکبر نے راشدہ سے کہا اور اپنا گلا ہاتھ سے مسلنے لگا۔
"اتنی سردی میں ٹھنڈا پانی پئیں گے آپ۔" راشدہ نے حیرت سے کہا۔
"راشدہ بحث نہ کر۔" اکبر نے ڈانٹ کر کہا۔
"اچھا لاتی ہوں، غصہ تو نہ ہوں۔" راشدہ نے جلدی سے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔
راشدہ چند لمحوں میں فریج سے ایک ٹھنڈی بوتل نکال لائی۔ گلاس بھر کر اس نے اکبر کو پانی دیا۔
اکبر نے یخ پانی کو اتنی تیزی سے غٹاغٹ پیا کہ راشدہ حیران رہ گئی۔
"اور۔" اکبر نے گلاس آگے بڑھایا۔
اس طرح اکبر نے تین گلاس ٹھنڈے پانی کے پیئے اور پھر باتھ روم میں منہ ہاتھ دھونے کیلئے چلا گیا۔
منہ ہاتھ بھی اس نے ٹھنڈے پانی سے دھویا ..... منہ دھوتے ہوئے اسے خیال آیا کہ رات کو اس نے چار خواب آور گولیاں کھائی تھیں ..... پھر فوراً ہی اس کے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔

"کیا یہ خودکشی کی کوشش تھی؟"

اس کے ذہن نے اس سوال کا جواب دینے سے گریز کیا لیکن ضمیر کے کسی گوشے سے آواز آئی اگر واقعی ایسا تھا تو یہ بڑا خطرناک رجحان اس کے اندر پرورش پا رہا تھا۔

تبھی شاید ایسا ہی ہو ..... اکبر پہنچا تو راشدہ فی کوزی سے کیتلی ڈھکے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ میز پر صابرہ ناشتے کی میز پر جب اکبر پہنچا تو راشدہ فی کوزی سے کیتلی ڈھکے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ میز پر صابرہ بھی موجود تھی۔ اس نے ابھی ٹھیک سے ناشتہ نہیں کیا تھا جس شوہر کے ساتھ ایک کپ چائے پی تھی۔ اکبر کے کرسی پر بیٹھنے کے بعد راشدہ نے انڈے کی پلیٹ اس کے سامنے کی اور ایک نوٹ پر لکھنا لگانے لگی تو اکبر بولا۔

"نہیں راشدہ میں صرف چائے پیوں گا۔"

"کیوں، اکبر بارہ بجے اٹھے ہو، اب بھی بھوک نہیں لگی۔" صابرہ نے پوچھا۔

"نہیں امی اس وقت کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا ..... کچھ عجیب سے طبیعت ہو رہی ہے۔"

"ایک بات بتاؤں اکبر دیکھو جھوٹ مت بولنا۔"

"جی چار۔" اکبر نے پوری سچائی سے جواب دیا۔

"غضب خدا کا۔" صابرہ نے غصے سے کہا۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے اس بے وقوفی کا آخر کیا مقصد تھا۔ تم نہیں جانتے کہ ان گولیوں کا کیسا سخت ری ایکشن ہوتا ہے۔"

"ہاں، امی میں جانتا ہوں لیکن امی کیا آپ میرے ری ایکشن سے بھی واقف ہیں ..... مجھ پر کیا گزر رہی ہے، اسے جانتی ہیں۔"

"میں سب جانتی ہوں لیکن میں کیا کروں تم نے میری بات مانی ہی نہیں ..... اگر تم میری بات مان لیتے تو آج تمہیں چار اکٹھی گولیاں کھانے کی ضرورت نہ پڑتی۔" صابرہ نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"امی میں نے آپ کی کیا بات نہیں مانی۔" اکبر نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"کہاں مانی، میں نے کہا تھا نیلم کو طلاق دیدو، تم نے دی طلاق اسے۔"

"امی چھوڑیں اس بات کو۔" اکبر نے بے نیازی سے کہا۔

"کیوں اس بات کو کیوں چھوڑ دوں ..... اس گھر میں جو تباہی پھیلی ہے وہ صرف نیلم کی وجہ سے پھیلی ہے ..... ہمارا تو دن رات کا چین حرام ہو کر رہ گیا ہے۔"

"امی اس میں نیلم کا کیا قصور ہے، یہ واقعہ کسی بھی لڑکی کے ساتھ پیش آ سکتا ہے۔"

"ہم نے تمام دنیا کی لڑکیوں کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے کیا؟"

"فرض کریں امی خدانہ کرے ایسا ہو اگر آپ کی بیٹی راشدہ اس عذاب میں مبتلا کر دی جائے تو کیا آپ اُسے گھر سے نکال دیں گی۔"

"ارے تو، تو اس کی محبت میں دیوانہ ہو گیا ہے ..... احمقانہ باتیں کرنے لگا ہے ..... پھر جو منہ جی میں آتا ہے کر مجھ سے کیوں پوچھتا ہے۔" یہ کہہ کر صابرہ غصے میں بھری میز سے اٹھ کر چلی گئی۔

راشدہ اسے سہمی سہمی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شکایت تھی۔

"معاف کر دینا بہن میں نے تیرے بارے میں الٹی سیدھی بات کہہ دی ہے"

محض امی کو سمجھانا تھا ان کے پاس سارے مسائل کا بس ایک ہی حل ہے طلاق

راشدہ میں اسے طلاق نہیں دے سکتا میں اس کو اپنے سے الگ نہیں کر سکتا

بس میں نہیں ہے میں تو خود عذاب جھیل رہا ہوں امی سے کہنا مجھے مزید عذاب میں مبتلا نہ کریں۔

"وہ واقعی عذاب جھیل رہا تھا اور اس عذاب کی شدت کا اندازہ اس کے سوا کسی اور کو نہیں ہو سکتا تھا کسی اور کو کیسے ہو سکتا تھا جس پر گزرتی ہے بس وہی جانتا ہے۔

خواب آور گولیوں کی وجہ سے اس کا دماغ سن ہو رہا تھا۔ نیند کے اثرات ابھی باقی تھے لیکن اس نے سوچا کہ وہ گھر پر رہا تو اس کا دماغ مزید سن ہو جائے گا اس لئے وہ کپڑے تبدیل کر کے شوروم چلا گیا۔

نیلم جب اپنے کمرے سے نہا دھو کر نکلی تو اکبر گھر سے جا چکا تھا۔ وہ سیدھی کچن میں گئی۔ راشدہ نے اسے کچن میں جاتے دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے پہنچ گئی۔

"نیلم بھابھی آپ میز پر چلیں۔ میں لاتی ہوں ناشتہ۔" راشدہ نے کہا۔

نیلم چولہے پر کیتلی رکھ کر ماچس ڈھونڈ رہی تھی۔ راشدہ کے آجانے پر وہ خاموشی سے کچن سے نکل آئی اور ڈائننگ ٹیبل پر آکر بیٹھ گئی۔ اس نے راشدہ سے رسماً بھی نہ کہا کہ نہیں میں خود بناؤں گی ناشتہ۔

نیلم کو بڑی زبردست بھوک لگی تھی۔ اس نے ڈٹ کر ناشتہ کیا معمول سے کچھ زیادہ ہی کھایا پھر دو کپ چائے پی کر وہ خاموشی سے اٹھ گئی اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔

نیلم نے بڑی پُراسرار خاموشی اختیار کر لی تھی۔ زیادہ تر اس کا وقت اپنے بیڈروم میں ہی گزرتا اس کے بیڈروم میں جاتے ہوئے راشدہ ہچکچاتی..... صابرہ نے اس کمرے کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ راشدہ کبھی کبھار اس کے کمرے میں جھانک لیتی تھی لیکن اب اس نے بھی جانا چھوڑ دیا تھا۔ اس کمرے میں جاتے ہوئے اسے اب خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

نیلم اب بہت مشکل سے ہی کسی سے بات کرتی تھی۔ جو اس کے سامنے رکھ دیا جاتا وہ کھا لیتی اور اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ پہلے وہ کچن میں راشدہ اور صابرہ کا ہاتھ بٹا لیا کرتی تھی لیکن اب اس نے کچن کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

صابرہ کو اس بات پر بہت غصہ تھا اس کے اندر کی ساس بار بار بپھر اٹھتی تھی لیکن راشدہ اسے کنٹرول کر لیتی تھی۔

"لائیے امی میں کر دیتی ہوں۔"

"آخر تم یہ سب کب تک کرو گی۔ یہ سب کام نیلم کو کرنے چاہئیں آخر وہ اس گھر کی بہو ہے۔"

"امی وہ اس قابل کہاں ہیں کہ کچھ کام کر سکیں۔ انہیں بیٹھے بیٹھے دورہ پڑ جاتا ہے..... کیا آپ

نے اس دن نہیں دیکھا تھا جب وہ روٹیاں پکا رہی تھیں۔ وہ کھڑے کھڑے جھومنے لگی تھیں اور ان کے بچے نے ہاتھ پکڑ لی تھی وہ تو میں اتفاق سے وہاں پہنچ گئی تھی ورنہ وہ جھلس کر رہ جاتیں۔" راشدہ نے کہا۔

"پتہ نہیں اس گھر کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔"

"میں نے کیا نیلم بھابھی کا چہرہ غور سے دیکھا ہے۔"

"ہاں آپ نے کیا نیلم بھابھی کا چہرہ غور سے دیکھا ہے۔"

"ہاں تو کیوں؟"

"نہیں پہلے جیسی بات ہی نہیں رہی۔ دس پندرہ دن کے اندر ان کے چہرے پر مردنی سے چھا گئی ہے۔"

"ان میں اب کچھ ایسا لگتا ہے جیسے ہزاروں جونکیں روزانہ ان کا خون چوستی ہوں..... چہرے کی شادابی یوں لگتا ہے جیسے انہیں دیمک لگ گئی ہے۔"

"ایسا لگتا ہے جیسے انہیں دیمک لگ گئی ہے۔"

"راشدہ دیمک لگنے کو کہتی ہے۔" صابرہ نے اسے ٹوکا۔

"ہاں پڑ گئی ہے..... دیمک لگنے کو کہتی ہے۔" صابرہ نے اسے ٹوکا۔

"امی جانے کیوں انہیں دیکھ کر مجھے یہی احساس ہوتا ہے جیسے انہیں دیمک لگ گئی ہے۔"

"وہ ہر وقت تو دلہن بنی رہتی ہے۔" صابرہ نے غصے سے کہا۔

"وہ ہر وقت تو دلہن بنی رہتی ہے۔" صابرہ نے غصے سے کہا۔

شروع شروع میں اس وقت سے جب نیلم گلاب کی پتیوں کی سیج پر پائی گئی تھی اس نے یہ وتیرہ اپنا لیا تھا کہ شام ہوتے ہی وہ نہانے دھونے کپڑے استری کرنے اور دلہنوں کی طرح سجنے لگ جاتی پھر رفتہ رفتہ اس شدت میں کمی آ گئی۔ سجنی سنورتی وہ آج بھی تھی لیکن دلہنوں کی طرح نہیں۔

ان دس پندرہ دنوں میں اس میں بڑی تبدیلی آئی اس کا حسن ماند پڑتا جا رہا تھا۔ راشدہ کا اس کے بارے میں یہ خیال بالکل صحیح تھا وہ واقعی کسی دیمک زدہ لڑکی کی طرح دکھائی دینے لگی تھی۔

نیلم نے اکبر سے بھی بولنا چھوڑ دیا تھا وہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے لیکن اجنبیوں کی طرح..... وہ ان سیاروں کی مانند تھے جو ایک ہی سورج کے گرد گھومتے ہیں لیکن آپس میں کبھی نہیں ملتے۔ ایک دوسرے کے سامنے سے خاموشی سے گزر جاتے ہیں۔

ایک دن بابر اور اکبر شوروم سے واپس آئے تو گھر میں ہنگامہ تھا۔

وہ دونوں گاڑی کھڑی کر کے فوراً گھر کے اندر پہنچے تو معلوم ہوا کہ نیلم کو دورہ پڑا ہے۔

وہ ڈائننگ ٹیبل پر چڑھی بیٹھی تھی اور جھوم رہی تھی۔

جب وہ دونوں وہاں پہنچے تو نیلم نے سر اٹھایا اور مردانہ کرخت آواز میں بولی۔ "ہاں بابر تو آ گیا اکبر تو بھی آ گیا..... اب تم دونوں آ گئے ہو تو ایک بات غور سے سن لو..... تمہیں اس گھر کو خالی کرنا ہوگا۔"

"گھر خالی کرنا ہوگا۔" بابر نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر عمل کروانا بھی جانتے ہیں۔ ہمارے ایک اشارے پر اس گھر کا سامان سڑک پر جا سکتا ہے۔ لیکن فی الحال ہم ایسا نہیں کریں گے اگر تم لوگوں نے کل شام تک یہ گھر خالی نہ کیا تو دیکھ لینا کیا تماشا ہوتا ہے۔"

اکبر کو یہ سن کر بڑا غصہ آیا اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن بابر نے اسے اشارے سے سختی سے منع کر دیا۔

"لیکن ہم جائیں کہاں؟" بابر نے آہستگی سے کہا۔

"جہنم میں۔" نیلم نے اپنی لال لال آنکھوں سے بابر کو گھورا۔

"لیکن جناب آپ خود سوچیں اتنے کم وقت میں ہمارا مکان خالی کرنا کس طرح ممکن ہوگا۔ مکان خالی کرنے کیلئے دوسرا مکان ڈھونڈنا ہوگا۔ اتنی جلدی مکان کہاں مل جائے گا۔ اگر کل بھی کرایا پر مکان مل جائے تو سامان شفٹ کرنا اتنا آسان نہ ہوگا۔ آپ دس پندرہ دن کا وقت دے دیجئے۔" بابر نے نرمی سے کہا۔

"بالکل نہیں۔ کل شام تک ہر صورت میں مکان خالی کرنا ہوگا۔ میرے لئے یہ بہت آسان ہے کہ اس گھر کی ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دوں لیکن میں تم لوگوں کا نقصان نہیں چاہتا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم لوگ کرائے کے مکان میں جاؤ۔ اسی لئے میں نے تم لوگوں کو پچیس لاکھ روپے فراہم کر دیئے ہیں۔ اتنی رقم میں یقیناً اس علاقے میں ایک اچھا مکان مل جائے گا۔ اگر پیسوں کی کمی بیشی ہو تو وہ بھی فراہم کر دیئے جائیں گے۔ میں جو کر سکتا تھا وہ میں نے کر دیا ہے۔ یہ رعایت بھی میں نیلم کی وجہ سے دے رہا ہوں ورنہ میں چاہتا تو مکان بھی خالی ہو جاتا اور تم لوگوں کے ہاتھ بھی کچھ نہ آتا۔" نیلم نے کرخت سرد آواز میں کہا۔

"جی بہت بہتر ہم ہر قیمت پر کل شام تک یہ مکان خالی کر دیں گے۔" بابر علی نے بلا سوچے سمجھے ہامی بھر لی۔

"ہاں یہ ہوئی نا بات۔" نیلم نے خوش ہو کر کہا۔ "ویسے اپنے بیٹے کو بھی سمجھاؤ اس کے دماغ میں کیڑے رینگ رہے ہیں۔ یہ ہم سے ٹکر لینے کی سوچ رہا ہے یہ چاہتا ہے کہ مکان خالی نہ کیا جائے۔"

"ارے نہیں جناب۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں نے آپ سے مکان خالی کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ میں کل شام تک آپ کو مکان خالی کر کے دوں گا۔"

"جو لوگ ہمارے ساتھ سیدھے چلتے ہیں، ہم ایسے لوگوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ اب دیکھو کہ مکان خالی کرنے میں ہم تمہاری کس طرح مدد کرتے ہیں۔"

سیدپور کے جن نے اکبر کے بارے میں بڑی صحیح رائے قائم کی تھی۔ اسے مکان خالی کر کے جانے کے مسئلے پر شدید غصہ تھا۔ وہ کسی قیمت پر مکان چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔ وہ اس سے ٹکرانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جبکہ بابر علی نے خود ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ بابر ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا پھر اتنے عرصے میں اس گھر میں جو ہوا تھا وہ اس کے سامنے تھا۔ اس کے نزدیک جن کی بات مان لینا ہی عقل مندی تھی۔

نیلم جب نارمل ہو گئی تو اکبر نے اس مسئلے پر بابر سے بات کی۔

"ابو آپ نے مکان خالی کرنے کا وعدہ کیوں کر لیا۔ ہم کل شام تک کس طرح مکان خالی کریں گے۔ بارہ گھنٹے میں مکان کی تلاش اور پھر سامان کی منتقلی کس طرح ممکن ہے۔"

"دیکھیں بیٹا صبح کیا ہوتا ہے۔ تم پریشان نہ ہو میں سب بھگت لوں گا۔"

"لیکن ابو ہمیں چاہئے کہ ہم مکان خالی نہ کریں۔ یہ ہمارا ذاتی مکان ہے۔ آخر ہم اسے کیوں

چھوڑیں" خود کہیں اور شفٹ کیوں نہیں ہو جاتا۔"

"اکبر تم ذرا غور کرو تو اس نے ہمیں اس مکان کا معاوضہ ادا کر دیا ہے۔"

"ہمیں نہیں چاہئے اس کی رقم میں نے تو اس وقت بھی اس میں آگ لگانا چاہی تھی مگر آپ نے روک دیا تھا۔" اکبر نے خفگی سے کہا۔

"میں نے ٹھیک کیا تھا، دیکھ لو اب وہ روپیہ ہی ہمارے کام آئے گا۔ ہم اس کے مقابلے میں ایک چھوٹا گھر خرید لیں گے۔ رقم میں اگر کمی بیشی ہو تو وہ اسے پورا کرے گا۔"

"ابو میں اس طرح نہیں سوچنا چاہتا۔ میں رقم کو ہاتھ بھی لگانا نہیں چاہتا۔ ہمیں اس کی رقم کو اس کے منہ پر مار دینا چاہئے۔"

"بیٹے جوش سے کام نہیں چلے گا، ہمیں ہوش سے کام کرنا ہوگا۔ جذباتی نہ بنو اس طرح مسئلہ اور الجھ جائے گا میں اسے اشتعال میں لانا نہیں چاہتا۔" بابر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اکبر کیلئے خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اکبر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ سید پور کا جن کیا کھیل، کھیل رہا تھا وہ اس مکان کو کیوں خالی کرانا چاہتا تھا۔

کیا وہ نیلم کو چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

اس کے سر سے اپنا منحوس سایہ ہٹا لینا چاہتا تھا۔

اگر ایسا تھا تو پھر اس مکان کو خالی کر دینے میں کوئی حرج نہ تھا۔

لیکن اکبر کا دل جانے کیوں اس مفروضے پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس جن سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ خود بخود نیلم کو چھوڑ جائے گا۔ ایسا ہی تھا جیسے کسی بلی کا چوہے کو دیکھ کر اس کے پیچھے نہ بھاگنا۔

اس پوری رات اکبر کو نیند نہ آئی۔ وہ کمرے میں ٹہل ٹہل کر اور بستر پر کروٹیں بدل بدل کر سوچتا رہا یہاں تک کہ مسجدوں سے اذانوں کی آوازیں آنے لگیں۔

پھر جب بیدار ہونے کا وقت تھا تو اکبر کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی کچھ دیر بعد ہی گہری نیند سو گیا۔

بالکل خلاف معمول آج پہلے اٹھ گیا۔ اس نے صابرہ کو اٹھایا اور دونوں مل کر سوچنے لگے کہ کیا کیا جائے۔ مکان خالی کرنے کے لئے شام تک کا وقت تھا۔ اگر صرف ان لوگوں کو ہی مکان چھوڑنا ہوتا تو یہ معمولی مشکل نہ ہوتا۔ وہ اٹھ کر ماموں فرقان کے گھر چلے جاتے۔ ان کا مکان اگرچہ زیادہ بڑا نہ تھا پھر بھی یہاں کسی نہ کسی طرح گزارہ ہو جاتا۔ اس کے علاوہ ایک دو ٹھکانے اور بھی تھے۔

لیکن یہاں مسئلہ یہ تھا کہ مکان مع سامان شفٹ کرنا تھا اور سامان بھی اس گھر میں تھوڑا بہت نہ تھا پہلے ہی کم سامان تھا کہ نیلم کے جہیز نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔

صابرہ نے مشورہ دیا کہ آج کا اخبار دیکھو۔

ہفتے پہلے برائے فروخت مکانوں کے اشتہاروں پر نظر دوڑائی۔ اس کے بعد کرایہ پر خالی مکانوں

کے اشتہارات دیکھے۔ ایک اشتہار انھیں اپنے مطلب کا مل گیا۔ مکان گلشن میں تھا۔ انھوں نے
گئے فون پر بابر نے بات کی اور فوراً ہی صابرہ کو گاڑی میں بٹھا کر مکان دکھانے کیلئے
وہ اس مکان کو دیکھنے آنے والے پہلے کرایہ دار تھے۔ جلد ہی سارے معاملات طے ہو
جب وہ وہاں سے واپس آئے تو خالی گھر کی چابی ان کے ہاتھ میں تھی۔
بابر اور صابرہ جب خالی گھر کی چابی لے کر واپس پہنچے تو اکبر ابھی پڑا سو رہا تھا۔
راشدہ نے گھر کا گیٹ کھولا تو بابر نے سب سے پہلے اکبر کے بارے میں ہی سوال کیا۔ "وہ
اٹھا۔"
"نہیں۔ ابو وہ تو سو رہے ہیں۔" راشدہ نے جواب دیا۔
"اور نیلم۔" بابر نے پھر پوچھا۔
"وہ بھی نہیں اٹھیں۔ ان کا کمرہ بند ہے۔" راشدہ نے بتایا۔
"اچھا جا کر اکبر کو اٹھاؤ۔"
"مکان کا کیا بنا۔ ابو۔" راشدہ نے پوچھا۔
"مکان مل گیا ہے یہاں سے قریب ہی ہے اور اچھا ہے۔" بابر نے بتایا۔
"خدا کا شکر ہے۔" راشدہ نے سکون کا سانس لیا اور اکبر کو اٹھانے چل دی۔
جب وہ اکبر کے کمرے میں پہنچی تو دروازے میں ہی ٹھٹھک گئی۔ اس نے جو منظر دیکھا وہ یقین
تک ناقابل یقین تھا۔ اس نے جلدی اپنی آنکھوں کو مسلا مگر وہ منظر غائب نہ ہوا۔
راشدہ جب گھر کا گیٹ کھولنے گئی تھی اس وقت تک نیلم کا کمرہ بند تھا۔ نیلم اپنے کمرے سے
نہیں آئی تھی لیکن اس وقت نیلم، اکبر کے کمرے میں موجود تھی۔ وہ بیڈ پر اکبر کے سرہانے بیٹھی تھی۔
اکبر بے سدھ سو رہا تھا۔ نیلم اس کے چہرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ
اٹھا ہوا تھا شاید وہ اکبر کے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں پھیرنا چاہتی تھی۔
دروازے پر آہٹ پا کر نیلم ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور بڑی تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔
راشدہ نے اس کے چہرے پر نمایاں طور پر گھبراہٹ دیکھی۔ نیلم نے راشدہ سے کوئی بات نہ کی اور
نظریں بھی نہ ملائیں۔ وہ نظریں بچا کر اس کے سامنے سے گزر گئی۔ راشدہ نے بھی اس سے کوئی بات
کی۔ اس سے کوئی بات ہو ہی نہیں سکی۔ وہ نیلم کو اکبر کے سرہانے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔
نیلم کے کمرے سے چلے جانے کے بعد اس نے اکبر کو زور زور سے ہلا کر اٹھایا۔ "اکبر بھائی، اکبر
بھائی۔"
"کیا ہو گیا راشدہ خیریت تو ہے۔" اکبر نے آنکھیں کھولیں اور حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔
"اکبر بھائی، جلدی اٹھیں، آپ کو ابو بلا رہے ہیں، ہمیں مکان مل گیا ہے۔"
"مکان مل گیا ہے؟" اکبر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کیسے مل گیا۔" وہ حیران تھا۔
"یہ آپ کو ابو بتائیں گے، چلیں جلدی۔" راشدہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ "اور ہاں آپ کو
ایک حیرت انگیز بات بتاؤں۔"

"ہاں بتاؤ۔" اکبر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"میں جب کمرے میں آئی تو" راشدہ بتاتے بتاتے رک گئی وہ فیصلہ نہ کر پائی کہ یہ بات بھائی کو بتانا بھی چاہئے یا نہیں۔

لیکن خیر یہ تو گمان سے نکل چکا تھا لہٰذا اکبر نے اس سے اگلوا کر چھوڑا۔

راشدہ نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ "میں جب کمرے میں آئی تو آپ کے سرہانے نیلم پھپھی کو بیٹھے پایا۔"

اکبر کے لئے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ اسے یہ سن کر خوشی بھی ہوئی اور بے انتہا حیرت بھی۔

"وہ میرے سرہانے بیٹھی کیا کر رہی تھی۔" اکبر نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

"وہ ....." راشدہ بتاتے بتاتے پھر رک گئی۔ وہ اپنے بڑے بھائی سے یہ کیسے بتاتی کہ وہ آپ کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی اور آپ کو بڑی محبت سے دیکھ رہی تھی۔

"راشدہ جھجھکو مت۔ تم نے جو دیکھا ہے وہ صاف صاف بتا دو۔" اکبر نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"آپ بھائی سے خود پوچھ لیجئے گا نا۔" راشدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" اکبر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور پھر باتھ روم میں گھس گیا۔

جب وہ منہ ہاتھ دھو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تو سب لوگ جمع ہو چکے تھے۔ خلاف توقع نیلم بھی تھی۔ اس ناشتے کی تیاری میں اس نے راشدہ کا ہاتھ بٹایا تھا وہ اس وقت خاصی نارمل دکھائی دے رہی تھی۔

اکبر اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کچن سے میز تک آتے اور پھر واپس جاتے نیلم سے کئی مرتبہ نظریں ملی تھیں۔ ان آنکھوں میں اکبر کیلئے پھر سے پہچان جاگ اٹھی تھی۔ نیلم کی خوبصورت آنکھوں میں اکبر کیلئے محبت کی چمک تھی۔

ناشتہ مکمل طور چننے کے بعد وہ اکبر کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

بابر علی نے مکان ملنے کی روداد سنائی۔ اکبر کو مکان مل جانے پر وہ بھی آسانی سے، بڑی خوشگوار حیرت ہوئی۔ چلو ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اب صرف سامان کی منتقلی باقی تھی۔

دونوں باپ بیٹے نے مل کر طے کیا کہ یہ کام کس طرح ہو گا۔ درمیان میں صابرہ لقمہ دیتی رہی لیکن نیلم نے کوئی مداخلت نہ کی وہ خاموشی سے ناشتہ کرتی رہی۔

البتہ وہ اپنی پلکوں کی بھاری جھالر اٹھا اٹھا کر اکبر کو گاہے گاہے دیکھ لیتی تھی۔

ان نظروں میں بڑی گہرائی تھی، وہی گہرائی جو دو چاہنے والوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اکبر چاہ رہا تھا کہ اسے موقع ملے تو وہ نیلم سے اپنے کمرے میں آنے کی وجہ پوچھے۔ اپنی خوشی کا اظہار کرے۔ شادی کے بعد یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ نیلم، خود اکبر کے پاس پہنچ گئی تھی۔

ورنہ اب تک تو اکبر ہی نیلم کے پاس پہنچتا رہا تھا اور منہ کی کھاتا رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد بابر ناشتے کی میز سے اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی صابرہ بھی چلی گئی۔ سامان کی پیکنگ کا مسئلہ تھا پھر راشدہ اکیلی میز پر رہ گئی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کباب میں ہڈی بنی ہوئی ہے۔

نیلم اور اکبر دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ چائے پی رہے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا پیالے اٹھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

تب راشدہ نے میز سے برتن سمیٹے اور وہاں سے اٹھ گئی۔

راشدہ کے جانے کے بعد نیلم نے اکبر کو گہری نگاہوں سے دیکھا۔ ان نگاہوں میں جہاں محبت تھی وہاں کہیں دور حسرت بھی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی آئی۔ یہ مسکراہٹ بھی بڑی پھیکی پھیکی تھی۔ اس مسکراہٹ میں جہاں خوشی تھی، وہیں دکھ بھی تھا۔

"نیلم تم آج میرے کمرے میں آئی تھیں؟ میرے پاس بیٹھی تھیں؟"

"راشدہ نے تمہیں بتا دیا۔" نیلم نے پوچھا۔

"ہاں۔" اکبر نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یقین کرو۔ یہ سن کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی کاش اس وقت میں جاگ رہا ہوتا۔"

"اگر جاگ رہے ہوتے تو بھی کچھ نہ ہوتا۔ جب قسمت سو جائے تو پھر بندے کے جاگنے یا نہ جاگنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" نیلم نے بڑے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا.....

"نیلم کیا ہماری قسمت سو گئی ہے؟ کیا ہماری زندگی میں کوئی خوشی نہیں۔"

"مجھے تو یہی نظر آتا ہے۔" نیلم نے مایوسانہ لہجے میں کہا.....

"نیلم تم مایوس ہو گئی ہو۔" اکبر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اچھا وقت ضرور آئے گا۔"

"کاش ایسا ہو سکتا۔" نیلم کی آنکھوں میں بڑی حسرت تھی۔

"ایسا ضرور ہو گا۔ نیلم یقین رکھو۔" اکبر نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"میں جو جانتی ہوں۔ وہ تم نہیں جانتے۔ میں جو دیکھ رہی ہوں وہ تم نہیں دیکھ سکتے۔"

"نیلم تم کیا دیکھ رہی ہو۔" اکبر نے پوچھا۔

"اکبر میں اپنے سامنے مکمل تاریکی دیکھ رہی ہوں۔ اور اندھیرا بالکل قبر جیسا ہے۔"

"نیلم خدا کے واسطے ایسی باتیں مت کرو۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ ایسی مایوسی کی باتیں کر کے میرا دل نہ دہلاؤ۔ تم جانتی نہیں ہو کہ میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"لیکن لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔" نیلم نے کہیں دور نظریں جمائے کہا۔

"ہماری قسمت میں کیا لکھ دیا گیا ہے۔" اکبر نے پوچھا۔

"ہماری قسمت میں اندھیرا لکھ دیا گیا ہے۔ جب گہرا اندھیرا چھا جائے تو پاس بیٹھا ہوا بھی آدمی نظر نہیں آتا۔ بس اکبر اب گہرا اندھیرا چھایا ہی چاہتا ہے۔"

"ہم نے مکان کرائے پر حاصل کر لیا ہے۔ ہم شام تک نئے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے۔ کیا پتہ نیا گھر ہمارے لئے خوشیاں لے آئے۔ تم جس دلدل میں پھنس گئی ہو شاید اس سے نجات مل جائے۔"

"اکبر تم بہت بھولے ہو تمہیں دلدل کا اندازہ نہیں۔ دلدل میں جب ایک بار آدمی پھنس جائے تو پھر اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔" نیلم نے دلیل دی۔

"نیلم تم اس قدر مایوسی کی باتیں کیوں کر رہی ہو۔" اکبر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتا چاہا لیکن نیلم نے تیزی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"نہیں۔" خوف سے لرزنے لگی۔

"نیلم میں نے پکا عہد کر لیا ہے۔ میں تمہیں اس عذاب سے نجات دلا کر رہوں گا۔ چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔" اکبر نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر پکا عہد کیا۔

نیلم نے سن کر قہقہہ لگایا یہ بڑا بے ہنگم قہقہہ تھا۔

اکبر نے اسے غور سے دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ نیلم اب نیلم نہ رہی تھی اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئی تھیں اور یہ بے ہنگم قہقہہ اس کا نہ تھا۔ یہ قہقہہ مردانہ تھا۔

"اچھا تو یہاں حلف اٹھایا جا رہا ہے۔" نیلم نے کرخت مردانہ آواز میں کہا۔ "قسمیں کھائی جا رہی ہیں۔ نجات کی تدبیریں سوچی جا رہی ہیں۔ ارے بیوقوف تجھ پر اکیا بگاڑ لے گا۔ تیرے بڑے ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکے تو تو کوئی چیز ہی نہیں۔ چل اٹھ یہاں سے۔ گھر کا سامان باندھ اور جا یہاں سے۔"

اکبر نے نیلم کی حالت بدلتے دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی۔ وہ ایک لفظ نہ بولا۔

"تو ہم سے ٹکرانے کی سوچ رہا ہے۔ اپنی جان دینے کی بات کر رہا ہے۔ کیا تو اور کیا تیری جان۔ تیرا وجود ہمارے سامنے دیئے کی لو کی طرح ہے۔ ایک پھونک ماروں تو بجھ جائے دھواں دینے لگے۔"

اکبر نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔

"چپ چاپ کیوں بیٹھا ہے۔ بولتا کیوں نہیں۔ ابھی تو بہت بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ نیلم نے تجھے جو بتا دیا ہے اسے گرہ میں باندھ لے اب تیرے لئے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ تاریکی ہی تاریکی ہے۔"

"میں اس تاریکی کو اجالے میں تبدیل کر دوں گا۔" بالآخر اکبر سے چپ نہ رہا گیا۔ وہ بول اٹھا۔

"بولا، بولا۔" نیلم نے تالیاں بجائیں اور مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔ "ابھی تم کمسن ہو۔"

"تم آخر اس لڑکی کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔"

"اس نے تو ہمارا کچھ نہیں بگاڑا۔" نیلم نے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ "اس کے حسن نے ہمیں مارا ہے۔ اس کی خوبصورت زلفوں کے ہم اسیر ہوئے ہیں۔"

"تم یہ کیوں بھول گئے ہو کہ نیلم میری بیوی ہے۔" اکبر کے لہجے میں خفگی تھی۔

"میں نہیں جانتا، میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ نیلم میری ہے، میری رہے گی۔"

"تم مجھ پر ظلم کر رہے ہو، یاد رکھو ظلم کی ایک انتہا ہوتی ہے۔"

"ظلم تو تم مجھ پر کر رہے ہو، تین بول پڑھ کر اس پر اپنا قبضہ ظاہر کر رہے ہو۔ تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ اسے طلاق دے کر، اس سے دستبردار کیوں نہیں ہو جاتے۔"

"یہ تمہارا مطالبہ ہے۔" اکبر نے سوال کیا۔

"نہیں، میرا مشورہ ہے۔" نیلم ہنسی۔ "مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ تمہارے نکاح میں ہے۔ میرے سامنے اس کاغذی نکاح کی حیثیت ہی کیا۔ یہ مشورہ تو میں تمہاری بھلائی کیلئے دے رہا ہوں

کیونکہ نیلم کو تم اپنی بیوی سمجھ کر خواہ مخواہ ہلکان ہوئے جا رہے ہو۔"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ نیلم کو تمہارے پنجے سے آزاد کروا کر رہوں گا۔" اکبر نے حتمی لہجے میں کہا۔

یہ سن کر نیلم نے بلند آہنگ اور بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ اس قہقہہ کی آواز پورے کمرے میں گونج گئی۔ گھر کے سارے افراد ڈائننگ ٹیبل کی طرف بھاگے۔

"بے وقوف لڑکے۔ تم ہر وقت میری چنگل میں رہتے ہو۔ تمہیں جب چاہوں مسل دوں گا مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ تم آزاد ہو۔ میں بھی آزاد ہوں۔ اب یہ مقابلہ آزادانہ ہوگا۔" یہ کہہ کر نیلم نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر اپنا سر میز پر جھکا دیا۔

بابر، صابرہ اور راشدہ جب میز کے نزدیک پہنچے تو انہوں نے نیلم کو میز پر سر رکھے دیکھا۔

"کیا ہوا؟" بابر نے پوچھا۔

"نیلم، اے نیلم۔" صابرہ نے نیلم کے سر پر ہاتھ رکھ کر بلایا۔

"جی۔" نیلم نے سر اٹھایا تو وہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا بیٹی؟" صابرہ نے بڑی محبت سے پوچھا۔

نیلم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پہلے تو خالی خالی نظروں سے صابرہ کو دیکھتی رہی پھر ایک دم اٹھی اور کمرے کی طرف چلی گئی۔

"اکبر، کیا ہوا تھا؟" اب بابر، اکبر سے مخاطب ہوا۔

"وہ آگیا تھا، وہ مجھے چیلنج کر کے گیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ کسی مچھر کی طرح مجھے اپنی چنگل سے مسل سکتا ہے۔ لیکن آج میں نے بھی اسے بتا دیا ہے کہ میں بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں میں اس کا مقابلہ کروں گا۔ میں نیلم کو اس کے پنجے سے آزاد کروا کر رہوں گا۔ اب یہ مقابلہ آزادانہ ہوگا۔" اکبر نے بتایا۔

یہ سب سنا تو بابر اور صابرہ کے چہرے کی ہوائیاں اڑ گئیں۔ انہیں اپنے بیٹے کی نادانی پر غصہ آیا۔ اکبر کی اس سپر پور کے جن کے سامنے حیثیت ہی کیا تھی۔ وہ واقعی جب چاہے اسے چٹکی سے مسل سکتا تھا۔ دادا غفور اور ماموں فرقان جیسے طاقتور لوگ اس کا کچھ نہ بگاڑ پائے تھے پھر اکبر اس سے خواہ مخواہ کیوں الجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ یہ کیا نادانی کر رہا تھا۔

پھر کافی دیر تک بابر اور صابرہ اسے سمجھاتے رہے تھے اور جتنا وہ اسے سمجھاتے رہے تھے اتنا ہی وہ اندر سے پُرعزم، مستحکم اور پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ بظاہر اس نے والدین کی نصیحت کے سامنے سر جھکا لیا تھا لیکن اندر سے اس نے سر اٹھا لیا تھا۔

سپر پور کے جن کی ہدایت کے مطابق اس گھر کو سورج نکلنے سے پہلے خالی کر دیا گیا۔ گھر میں کافی سامان تھا۔ ٹرک کو دو تین پھیرے لگانے پڑے۔

سامان منتقل ہونے کے بعد گھر کے افراد نے خالی گھر کا آخری چکر لگایا۔

صابرہ نے اس گھر کو بڑی محنت اور محبت سے بنایا تھا بڑی دلچسپی اور لگن سے اس گھر کی تزئین اور آرائش کی تھی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ جس گھر کو وہ اپنا سمجھ کر اتنی محبت سے سجا سنوار رہی ہے ایک دن اس کا

رہے گا۔ اس سے خالی کروالیا جائے گا۔

صابرہ کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ خالی کمروں میں گھومتے ہوئے بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے جنہیں وہ دوپٹے کے کنارے سے صاف کرلیتی۔

بارہ بجے گھر میں تھا۔ یہاں اس گھر میں صابرہ، راشدہ، نیلم اور اکبر تھے۔ سب لوگ خاموش تھے۔ اداس تھے اور کیوں نہ اداس ہوتے انہیں ان کے گھر سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔

صابرہ آہ بھی تھی اس کے پیچھے راشدہ، نیلم اور اکبر چل رہے تھے گھر کا آخری پھیرا تھا اس کے بعد معلوم نہیں کہ کیا ہونے والا تھا۔ اس گھر کا دروازہ ان پر ہمیشہ کیلئے بند ہو جانا تھا یا یہ بے دخلی عارضی تھی۔

صابرہ ایک ایک کمرے میں جا کر ان کے در و دیوار کو اپنی آنکھوں میں بھر رہی تھی اس گھر کے آگے پیچھے صابرہ نے کتنی محنت سے طرح طرح کے پودے لگائے تھے، پھول اگائے تھے۔ اس گھر کے آنگن کو گلشن بنایا تھا۔

آج اسی گلشن کو خدا حافظ کہنا پڑ رہا تھا۔

صابرہ نے پورے گھر کا چکر لگانے کے بعد پھر سے اندر جانا چاہا تو اکبر نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بس امی..... چلئے ..... یہ گھر آپ کا ہے، آپ ہی کا رہے گا۔ اسے اس طرح نہ دیکھئے جیسے آخری بار دیکھ رہی ہوں۔" اکبر نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"اللہ، تیری زبان مبارک کرے۔" صابرہ نے آنسو بھری آنکھوں سے اکبر کو دیکھا اور پھر آنسو پونچھتے ہوئے پُرعزم لہجے میں بولی۔ "آؤ اب چلیں۔"

"اکبر بھائی، آپ گھر کے تمام کمروں کو بند کر کے دروازے لاک کر دیں، یہ لیجئے چابیاں، تب تک ہم چل کر گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔" راشدہ نے اکبر کی طرف چابیوں کا گچھا بڑھاتے ہوئے کہا.....

پھر صابرہ، راشدہ اور نیلم گھر سے باہر نکل گئے، اکبر کو جلد آنے کی تلقین کر کے۔

اکبر نے سب سے پہلے اپنے بیڈ روم کو بند کیا۔

وہ موم بتی ابھی تک جل رہی تھی۔ پہلے وہ سنگھار میز پر رکھی رہتی تھی لیکن سنگھار میز کے نکل جانے کے بعد اس موم بتی کو کمرے کے فرش پر رکھ دیا گیا تھا۔

کمرہ بالکل خالی تھا بس ایک موم بتی تنہا جل رہی تھی۔ کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا، یہ جلتی ہوئی شمع بڑی پُراسرار لگ رہی تھی۔

اکبر کی شمع سے نظر ہٹی تو اس نے دیکھا کہ موم بتی سے تھوڑے فاصلے پر وہ بیٹھا تھا۔ وہ اپنے اگلے دونوں پاؤں کو چاٹ رہا تھا اور اس کی گول گول لال انگارہ آنکھیں اکبر کو گھور رہی تھیں۔

اکبر نے جلدی سے گھبرا کر دروازہ بند کر دیا اور پھر اس نے جب تالا لگانا چاہا تو تالے میں چابی نہ گھومی۔ جیسے تالے کو زنگ لگ چکا ہو۔ اکبر نے چابی نکال کر ایک نظر اس کے نمبر کو دیکھا چابی کا نمبر ٹھیک تھا۔ تب اس نے زیادہ زور آزمائی مناسب نہ سمجھی۔ وہ تالا بند کئے بغیر دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

لیکن وہاں بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ چابی درست بیٹھنے کے باوجود تالے میں نہ گھومی پھر ایک

ایک کر کے اس نے سارے دروازے آزما ڈالے۔ کسی دروازے میں چابی نہ لگی، کوئی تالا بند نہ ہوا۔

مجبوراً وہ گھر کے تمام دروازوں کو کھلا چھوڑ آیا۔

باہر آکر اس نے گیٹ بند کیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تالا تھا اس تالے کو گیٹ میں لگا کر اکبر نے سوچا جس طرح گھر کے تمام دروازوں کے تالے ناکارہ ہو چکے ہیں اسی طرح یہ تالا بھی ناکارہ ہو گا اور اب اس گھر کو بالکل کھلا چھوڑنا پڑے گا۔

اکبر نے چلتے چلتے اس بڑے تالے میں یہ سوچ کر چابی گھمائی کہ وہ بھی نہیں گھومے گی لیکن وہ گھوم گئی۔ اکبر کو خوشی ہوئی کم از کم اس گھر کا مین گیٹ تو بند ہو سکے گا۔

پھر اکبر نے گھر سے باہر نکل کر آہنی گیٹ کو بند کیا اور اس میں بڑا سا تالا ڈال کر چابی گھمادی۔ تالے سے چابی نکال کر اکبر نے تالے کو دو تین جھٹکے دیئے تالا بند ہو چکا تھا۔

اکبر نے ایک گہرا سانس لیا۔ گھر پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور تیزی سے چلتا ہوا گاڑی میں آبیٹھا۔

خواتین پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں اور اس کی شدت سے منتظر تھیں۔

"اکبر گھر کے تمام دروازے بند کر دیئے؟" صابرہ نے پوچھا۔

"جی امی دروازے تو تمام بند کر دیئے ہیں لیکن تالا کسی کو نہیں لگا سکا۔" اکبر نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے! وہ کیوں؟" راشدہ نے پوچھا۔

"باوجود کوشش کے کسی تالے میں چابی نہیں گھومی۔" اکبر نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔" صابرہ نے پریشان ہو کر کہا..... "سارا گھر کھلا پڑا ہے کوئی گھر میں گھس سکتا ہے۔"

"ہاں، یہ خطرہ تو ہے لیکن شکر ادا کریں کہ گیٹ پر تالا لگ گیا اگر وہ بھی بند نہ ہوتا تو ہم کیا کر لیتے گھر کو اسی طرح کھلا چھوڑنا پڑتا۔"

"اکبر بھائی آپ چوکیدار سے کہہ دیجئے گا وہ خیال رکھے گا۔"

اکبر کو جہاں اپنا گھر چھوڑنے کا دکھ تھا وہاں ایک خوشی بھی تھی کہ نیلم اس کے ساتھ تھی جب جن نے نیلم کے ذریعے آج شام تک گھر خالی کرنے کا حکم دیا تھا تو اکبر کے ذہن میں تھا کہ جیسے ہی گھر خالی ہو گا کچھ ایسے حالات پیش آئیں گے کہ نیلم کو اس خالی گھر میں چھوڑنا ناگزیر ہو جائے گا۔

خدا کا شکر تھا کہ ابھی تک کوئی ایسی بات نہ ہوئی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ یہ گھر سید پور کے جن نے نیلم کیلئے خالی کرایا ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس جن نے خود بخود نیلم کا پیچھا چھوڑ دیا ہو۔ ایسا بھی ہوا تو نہیں ہے کہ کسی لڑکی پر جن کا سایہ ہوا ہو اور وہ خود بخود ہی غائب ہو گیا ہو۔ بغیر عمل کے جن کبھی جان نہیں چھوڑتا۔ بہرحال جو بھی صورت حال تھی اب تک اکبر کے حق میں تھی۔

گھر خالی کر دیا گیا لیکن نیلم اس کے ساتھ تھی اور وہ خوش ہوتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ

کہیں بات پلٹ نہ جائے اگر آج کی رات خیریت سے گزر گئی تو پھر اس بات کے امکانات روشن ہو جائیں گے کہ نیلم کا اس جن سے پیچھا چھوٹ گیا ہے۔

نیلم اگلی سیٹ پر اس کے برابر ہی بیٹھی تھی، صابرہ اور راشدہ پیچھے تھیں۔

بیداری کی وجہ سے نیلم کے خوبصورت بال بار بار اس کے چہرے پر آ رہے تھے۔ اکبر ترچھی نظروں سے اسے دیکھ لیتا تھا۔ خوبصورت چہرے کو چومتی ہوئی حسین زلفیں ایک مسحور کن نظارہ پیش کر رہی تھیں۔

کیا یہ خوبصورت چہرہ ہمیشہ کیلئے اس کا ہو گیا تھا۔

اکبر کا بار بار جی چاہ رہا تھا کہ وہ خوشی سے بھرپور قہقہہ لگائے لیکن اندر سے اسے کوئی قہقہہ لگانے سے روک رہا تھا۔

ابھی ٹھہرو، انتظار کرو، تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ابھی جلد بازی سے کام نہیں لے گا۔ نیلم سے دور رہے گا، وقت کا انتظار کرے گا۔

گھر پہنچے تو بابر ان کا منتظر تھا۔

وہ بیل بجتے ہی گیٹ کی طرف بھاگا۔

جب اس نے فرنٹ سیٹ پر نیلم کو اکبر کے ساتھ بیٹھا دیکھا تو اسے بڑی خوشی ہوئی۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ جانے کیوں اس کے دل میں یہ بات بار بار آ رہی تھی کہ نیلم ان لوگوں کے ساتھ نہیں آئے گی، اسے خالی گھر میں ہی روک لیا جائے گا۔

اس وقت گھر مال گودام بنا ہوا تھا۔ سامان اتار کر ایسے ہی رکھ دیا گیا تھا۔

پھر ان لوگوں نے ایک کمرہ بیٹھنے اٹھنے کیلئے تیار کر لیا۔ باقی سامان آہستہ آہستہ سیٹ ہوتا رہے گا۔

کچن کو اس قابل کیا گیا کہ چائے بنائی جا سکے۔

رات کو اکبر کھانا باہر ہوٹل سے لے آیا۔ سب لوگوں نے مل کر کھانا کھایا۔

کھانا کھا کر اکبر نے آئس کریم کھانے کی تجویز پیش کی۔

بابر نے کہا بھئی "تم لوگ چلے جاؤ میں گھر میں رہوں گا۔ سب لوگ جائیں تو گھر کو تالا لگانا پڑے گا، ویسے بھی میں تھک گیا ہوں۔"

بابر نے جانے سے معذرت کی تو صابرہ کیسے جاتی۔ اس نے بھی تھکن کا بہانہ کر دیا۔

اب رہ گئی راشدہ تو وہ جانے کے لئے تیار تھی لیکن صابرہ نے کچھ سوچ کر اسے بھی روک لیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر کے ساتھ جانے والی صرف نیلم رہ گئی۔

"تم کیا کہتی ہو۔"

"میں چلوں گی آپ کے ساتھ۔" نیلم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"پیدل چلیں گے، مارکیٹ نزدیک ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" نیلم نے کہا۔

"اچھا ای ہم ابھی آتے ہیں۔" اکبر نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"اکبر بھائی آئس کریم لاؤ نا نہ بھولئے گا۔" راشدہ نے زور سے کہا۔

"اچھا، اچھا نہیں بھولوں گا۔"

"یہ پہلا موقع تھا کہ وہ دونوں ایک ساتھ ٹہلنے نکلے تھے۔ تنہائی کا یہ موقع انہیں آج تک میسر نہیں آیا تھا۔ اکبر بہت خوش تھا لیکن اسی خوشی میں وہ کوئی بے اعتدالی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"نیلم آج تم بہت خوش نظر آتی ہو۔" اکبر نے اس کو تو چھی نظروں سے دیکھا۔

"اپنا گھر خالی کر کے بھی، نیلم جانتی ہوں کیوں؟"

"ہاں اپنا گھر چھوڑ کر بھی، نیلم جانتی ہوں کیوں؟"

"نہیں، میں نہیں جانتی۔ میں جاننا بھی نہیں چاہتی، مجھے خوشی سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"کیوں آخر؟" اکبر نے پوچھا۔

"اس خوشی کے لئے میں کیسے خوش ہوں، جو میرے نصیب میں ہی نہیں۔"

"کیا تم آج خود کو ہلکا پھلکا نہیں محسوس کرتی ہو۔ کیا کوئی بوجھ تمہارے سر سے نہیں ہٹا۔"

"نہیں، کچھ بھی نہیں ہوا۔ میرے لئے سب کچھ پرانا ہے۔"

"مجھے تو روشنی نظر آرہی ہے۔" اکبر نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ مانگے کا اجالا ہے۔" نیلم نے دھیرے سے کہا۔

"کیا مطلب؟" اکبر بولا۔

"مجھے دور تک روشنی نظر نہیں آرہی، تاریکی ہی تاریکی چھائی ہے۔"

"نیلم خدا کے واسطے اچھی باتیں کرو مجھے خواب دکھاؤ خود خواب دیکھو۔"

"ایسے خواب دیکھنے کا کیا فائدہ جن کے کرچی کرچی ہونے کا احتمال ہو۔"

"پھر وہی مایوسی کی بات۔ نیلم تمہیں کیا ہو گیا ہے۔"

"میں کیا جانوں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ بس یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں جل رہی ہوں۔"

"نیلم کیا تم ایسا محسوس نہیں کرتیں جیسے تم آزاد ہو گئی ہو۔"

"میں کہاں ہوئی ہوں آزاد۔ میرے ہونٹوں کو سی دیا گیا ہے۔ میرے جسم کو شعلوں سے باندھ دیا گیا ہے۔" نیلم نے بڑے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"تم فکر نہ کرو نیلم، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مجھے تو کچھ ٹھیک ہوتا نظر نہیں آتا اکبر، بس تم مجھے معاف کر دینا، مجھے مجبور جان لینا۔"

"نیلم ایک بات بتاؤ، دیکھو سچ کہنا۔"

"جی، سچ کہوں گی، فریب سے کام نہ لوں گی۔ تم پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔"

"جس طرح میں تم سے محبت کرتا ہوں کیا ویسے ہی تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے۔"

"اکبر اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہارے ساتھ نہ چل رہی ہوتی۔"

"یہ میری بات کا جواب نہ ہوا۔" اکبر نے شکوہ کیا۔

"آج کی رات گزر جانے دو، صبح تمہیں خود بخود اپنی بات کا جواب مل جائے گا۔"

"اس چھوٹی سی بات کے لئے مجھے پوری رات انتظار کرنا ہو گا۔ خیر کوئی بات نہیں، میں کروں گا

انتظار۔ مجھے تو انتظار کی جیسے عادت ہو گئی ہے۔"

"تم بہت اچھے انسان ہو، اکبر۔" نیلم نے بڑی محبت سے کہا۔ "تم نے میرے لئے بہت عذاب جھیلے ہیں۔ کاش میں تمہیں ان عذابوں سے بچانے کی سکت رکھتی۔"

نیلم نے سچ کہا تھا وہ واقعی اسے عذابوں سے بچانے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔

دونوں آئس کریم کھا کر واپس آئے۔ گھر کے افراد کیلئے بھی آئس کریم لیتے آئے۔

پھر رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ یہ طے ہوتا رہا کہ کون کونسا کمرہ لے گا۔ سامان کہاں رکھا جائے گا۔ سامان کو کس طرح سیٹ کیا جائے گا۔

پھر وہ لوگ ایک ہی کمرے میں جہاں جسے جگہ ملی پڑ کر سو گیا۔

صبح سب سے پہلے اکبر کی آنکھ کھلی۔ اس نے کروٹ موڑ کر اس جگہ کو دیکھا جہاں نیلم سوئی تھی۔

وہاں نیلم نہ تھی۔

تب اسے اپنے سینے پر رکھے کسی کاغذ کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے سینے سے اس کاغذ کو اٹھا لیا اور فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔

یہ نیلم کا خط تھا۔

اس کاغذ پر چند سطریں لکھی ہوئی تھیں۔ یہ بھورے رنگ کا کاغذ تھا۔ شاید کسی لفافے سے پھاڑا گیا تھا۔ بال پین سے آڑھے ترچھے جملے لکھے ہوئے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بہت عجلت میں یہ جملے تحریر کئے گئے ہوں۔ اکبر نے خط پڑھنے سے پہلے خط لکھنے والے کا نام دیکھا۔ خط کے آخر میں لکھا تھا۔

"تمہاری نیلم۔"

میری نیلم۔ اکبر کو اس کا تمہاری نیلم لکھنا بہت اچھا لگا۔ پھر اس نے جلدی جلدی خط پر نظر ڈالی لکھا تھا۔

اکبر..... جان نیلم.....

میں جا رہی ہوں۔ میرا تعاقب نہ کرنا۔ میں خالی گھر میں جا رہی ہوں، میں اب وہیں رہوں گی۔ یہ چند گھنٹے جو میں نے تمہارے ساتھ گزارے ہیں، ان کی مجھے بڑی مشکل سے اجازت ملی تھی۔ تین بجنے والے ہیں، وہ مجھے لینے آتے ہوں گے۔ مجھے معاف کر دینا، میں بہت مجبور ہوں۔ میں تمہیں خوشیاں نہ دے سکی لیکن ملا مجھے کچھ نہیں۔ بس آگ ہی آگ ملی ہے۔ میں اس آگ میں آہستہ آہستہ جل رہی ہوں، جھلس رہی ہوں، میں رو سکتی ہوں، نہ چیخ سکتی ہوں۔ بس سسک رہی ہوں۔ ایک دن آئے گا کہ میں اسی طرح سسکتے سسکتے مر جاؤں گی۔ میں مر جاؤں تو میری لاش میرے ماں باپ کو بھجوا دینا۔

اچھا اللہ حافظ۔

تمہاری، نیلم

اس خط کو پڑھ کر اکبر سناٹے میں آ گیا۔ وہ اسی لئے تو رات کو خوش نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے اندر سے کہیں آواز آ رہی تھی کہ نیلم کا تمہارے ساتھ چلے آنا ضروری نہیں کہ خوشی کا باعث ہو لہٰذا خوشی منانے میں عجلت پسندی سے کام نہ لو..... اور ہوا بھی وہی۔

یہ خوشی اسے چند گھنٹوں کے لئے ملی۔ یہ چند گھنٹے بطور بھیک اس کی جھولی میں ڈالے گئے۔ وہ بھی نیلم کے اصرار پر..... اب یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ نیلم کو بھی اس سے محبت ہے ورنہ اسے کیا ضرورت

تھی چند گھنٹوں کی بھیک لینے کی۔ جانے کتنی خوشامد کر کے اس نے یہ چند گھنٹے حاصل کئے ہوں گے۔ کون جانے کس قدر مجبور ہے، وہ کتنی مظلوم ہے۔ جانے وہ کیسی آگ میں جل رہی ہے۔ کون شعلوں سے کھیل رہی ہے۔ رونا چاہے تو رو بھی نہیں سکتی۔

کیا میری نیلم اسی طرح سسک سسک کر مرجائے گی۔ میں اس کے لئے کچھ نہ کر سکوں گا۔ میرا نیلم کے ماں باپ سے ان کے جگر کے ٹکڑے کو اس لئے اپنے ہمراہ لایا تھا کہ اس کی لاش انہیں بھجوا دوں گا۔ وہ سوچیں گے اس کے ماں باپ میرے بارے میں ..... ان کی گڑیا سی بیٹی کی جان نہاں کر لاش انہیں پارسل کر دی۔ کیا اسی لئے ان لوگوں نے مجھے اپنی بیٹی دی تھی۔

جیسے جیسے وہ سوچتا جارہا تھا اس کے دماغ کی رگیں کھنچتی جارہی تھیں۔

وہ اس وقت شدید اعصابی دباؤ میں تھا۔ جسم میں بے کلی بڑھ رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ بس اپنے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھال دے۔

آنکھوں میں اندھیرا اتر رہا تھا۔ دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ جسم میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔

اس نے نیلم کے خط کو تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

اچانک صابرہ کی آنکھ کھلی۔ اس نے اکبر کو دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا دیکھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اکبر کا چہرہ دیکھ کر صابرہ کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔

"اکبر میرے بیٹے، تجھے کیا ہوا؟" صابرہ تقریباً چیختی ہوئی اٹھی۔

اکبر نے ماں کو خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ اس وقت وہ بے کسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

صابرہ نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھ میں لے کر اپنے چہرے سے لگالیا۔

"کیا بات ہے بیٹا؟"

پھر اچانک اسے نیلم کا خیال آیا۔ اس نے گردن گھما کر اس جگہ کو دیکھا جہاں نیلم کا بستر لگا ہوا تھا وہ جگہ خالی تھی۔

"ارے نیلم کہاں گئی؟"

تب اکبر نے اپنی جیب سے وہ خط نکال کر صابرہ کے حوالے کر دیا۔ اکبر کا ہاتھ لرز رہا تھا اور پلکوں پر موتی جھلملا رہے تھے۔

صابرہ نے اکبر سے پرچہ لے کر جلدی جلدی پڑھا۔ جوں جوں وہ خط پڑھتی گئی۔ اس کا رنگ بدلتا گیا۔ جب آخری سطر پر پہنچی تو اس کا کلیجہ جیسے کھنچ گیا۔ اسے لگا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔

"اے اللہ، اس بچی پر رحم کر۔" صابرہ نے دل تھام کر دعا مانگی۔

ان دونوں کی باتوں کے شور سے بابر علی کی آنکھ بھی کھل گئی۔ راشدہ بھی اٹھ بیٹھی۔

صابرہ نے بغیر کچھ بتائے بابر علی کے سامنے نیلم کا پرچہ کر دیا۔ بابر نے حیرت سے پہلے صابرہ کو دیکھا..... پھر ہاتھ بڑھا کر پرچہ لے لیا۔ پرچہ پڑھ کر اسے بہت دکھ ہوا، وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ حیرت تو مجھے اس وقت ہوئی تھی جب میں نے نیلم کو تم لوگوں کے ساتھ واپس آتے دیکھا تھا....."

"اکبر تو پریشان نہ ہو۔" صابرہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہ اپنے گھٹنوں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔
اس کے جسم میں لرزش تھی۔
صابرہ نے اس کا چہرہ دیکھ کر تڑپ اٹھی۔ "ارے یہ تو تف رو تا کیوں ہے؟" صابرہ نے اسے لپٹاتے ہوئے کہا۔
"امی، میں کیا کروں؟" اکبر نے سسکتے ہوئے کہا۔
"بہت سے کام ہو۔ تمہارے رونے سے کیا ہوگا؟" صابرہ نے اسے تسلی دی۔
"اکبر بیٹے کسی کے رونے سے کچھ نہ ہوگا۔ ہم سب بے بس ہیں۔ کچھ نہیں کر سکتے..... اور جہاں کچھ نہ کیا جا سکتا ہو، وہاں آنسو بہانے کا فائدہ۔ خود کو ہلکان مت کرو بیٹے....." بابر علی نے اسے سمجھایا۔
لیکن آنسو اس کے بس میں کب تھے۔ وہ آتے جا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی طرح برس رہے تھے۔ وہ یہاں بھی مجبور تھا۔
وہ گھٹنوں میں سر دیئے جانے کتنی دیر تک اپنی قسمت کو روتا رہا۔
جب آنسو خوب بہہ گئے۔ من کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ تب وہ اٹھا۔ اس نے ہاتھ منہ دھو لیا۔ لباس تبدیل کیا اور گاڑی کی چابی لے کر باہر نکلنے لگا۔
گاڑی کی چابی لے جاتے دیکھ کر صابرہ نے اسے پکارا.....
"اکبر....."
"جی امی....." وہ جاتے جاتے رک گیا۔
"کہاں جا رہے ہو، بیٹے ناشتہ نہیں کرنا۔" صابرہ نے پوچھا۔
"ابھی آتا ہوں امی۔"
"آخر جا کہاں رہے ہو؟"
"میں نے کہا نا، ابھی آتا ہوں....." یہ کہہ کر وہ تیزی سے گھر سے نکل گیا۔ اس نے صابرہ کو مزید بولنے کا موقع نہ دیا۔
گاڑی میں بیٹھ کر اس نے خالی گھر کا رخ کیا۔
دن خاصا چڑھ آیا تھا لیکن آسمان پر گہرے بادل ہونے کی وجہ سے اس کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ سورج بادلوں میں منہ چھپائے ہوئے تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس لئے سردی بھی اچھی خاصی تھی۔
رات کو شاید بارش ہوئی تھی..... سڑکوں کے کنارے جگہ جگہ پانی بھرا ہوا تھا۔ بادل اب بھی گہرے تھے۔ لگتا تھا جیسے جلدی بارش شروع ہونے والی ہے۔
یہ بادل رات کے بارہ بجے کے بعد سے چھانا شروع ہو گئے تھے۔ یہ لوگ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک باتیں کرتے رہے پھر سب ہی تھکے ہوئے تھے اس لئے اپنے اپنے بستروں میں جا گھسے اور سو گئے۔
اگر اکبر کو یہ معلوم ہوتا کہ نیلم آج رات اس سے جدا ہو جائے گی تو کبھی نہ سوتا۔ جب سب سو گئے تو

نیلم اپنے بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اکبر اس کے سامنے ہی لیٹا تھا۔ سب بے خبر اور سب محو خواب تھے۔ نیلم، اکبر کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔

وہ اس وقت تک جب تک اس کے جانے کا وقت نہیں ہو گیا یونہی خاموشی سے اکبر کو دیکھتی رہے گی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ آج رات اس سے جدا ہو جائے گی۔ کون جانے پھر وہ اکبر کو دیکھ بھی سکے گی یا نہیں۔ وہ اس مسلت سے جو اسے ملی تھی، پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ یہ آخری دیدار تھا۔ خاموش ملاقات تھی۔

اگر اکبر کو یہ معلوم ہوتا کہ نیلم بجائے سونے کے اس کے چہرے کو چاند سمجھ کر دیکھ رہی ہے تو وہ شاید کوا بی آنکھیں بند کر لیتا۔ وہ اپنی پیاسی آنکھوں میں نیلم کی حسین صورت بھر لیتا۔ اسے اپنی آنکھوں میں بسا لیتا۔ سما لیتا۔

دھائی بجے کے قریب نیلم کو کالے بلے کی آواز سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا مگر کالا بلا کہیں نہ دکھائی دیا۔

تب جلدی جلدی نیلم نے اکبر کے نام پرچہ لکھا اور اس کے سینے پر رکھ دیا۔

وہ جانتی تھی کہ کسی بھی وقت بلاوا آنے والا تھا۔ بلاوا آنے تک وہ اکبر کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

پھر وہ آواز آئی۔ اس کے دماغ میں کہیں دور سے وہ آواز سنائی دے رہی تھی۔

وہ اسے بلا رہا تھا۔

"آؤ نیلم..... آؤ نیلم..... آؤ نیلم۔"

تب وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح کھڑی ہو گئی پھر وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔ گیٹ پر پہنچی تو گیٹ خود بخود کھل گیا۔

اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ ایک بگھی سجائی بگھی سامنے کھڑی ہے اور اس بگھی میں دو گھوڑے جتے ہوئے ہیں۔ دو سفید گھوڑے۔

نیلم کو گیٹ سے باہر آتا دیکھ کر وہ سید پور کا جن شہزادے کے روپ میں بگھی سے نیچے اترا۔ اس نے آگے بڑھ کر نیلم کا ہاتھ تھاما۔

نیلم کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ہاتھ کسی شعلے پر رکھا گیا ہو۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بصد احترام اسے لئے بگھی کی طرف بڑھا۔ اس کو بگھی میں بیٹھنے کی مدد کی۔

نیلم جب بگھی میں بیٹھ گئی تو وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"چلو۔" اس نے حکم دیا۔

سید پور کے جن کے حکم پر بگھی چل پڑی۔

نیلم کو بڑی حیرت ہوئی کیونکہ جب وہ بگھی میں بیٹھی تھی تو کوچوان کی جگہ پر کوئی نہ تھا۔ پھر یہ بگھی کیسے چل پڑی تھی۔ اس نے تھوڑا اچک کر دیکھنے کی بھی کوشش کی لیکن اسے کوچوان کی سیٹ پر کوئی بشر نظر نہیں آیا۔

بگھی نے اب رفتار پکڑ لی تھی لیکن گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز نہیں آ رہی تھی یہ کیسے گھوڑے تھے جو بغیر

سڑک پر سے آواز چل رہے تھے پھر اسے احساس ہوا کہ کبھی سڑک پر نہیں چل رہی تھی۔ کبھی سڑک پر اور رہی ہے۔

نیلم نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ابھی چند سیکنڈ ہی ہوئے ہوں گے آنکھیں بند کئے کہ اسے کبھی کے رہنے کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو پرانے گھر کے سامنے پایا۔

سید پور کے جن نے اشارہ کیا۔ اشارے کے ساتھ ہی گیٹ خود بخود کھلتا چلا گیا۔

جب پورا گیٹ کھل گیا تو کبھی گھر کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ پھر کبھی رکی تو وہ اترا۔ اس نے نیلم کو سارا دے کر کبھی سے اتارا۔ گھر میں داخل ہو گئے۔

نیلم نے دروازہ بند ہونے سے پہلے جب باہر دیکھا تو اسے وہاں کبھی نظر نہ آئی۔

گھر کا دروازہ بند ہوتے ہی آسمان پر بادل آپس میں ٹکرائے۔ بڑے زور کی گرج پیدا ہوئی بجلی اتنی زور سے چمکی کہ پورا آسمان روشن ہو گیا۔

اس زوردار گرج چمک کے بعد چھما چھم بارش شروع ہو گئی۔

نیلم جب شام کو اس گھر سے گئی تھی تو یہ گھر بالکل خالی ہو چکا تھا۔ بس اس کے بیڈ روم میں شمع جلتی رہ گئی تھی، لیکن اس وقت جب وہ گھر کے اندر داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ پورا گھر سامان سے بھر چکا ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ بڑے قرینے سے رکھی تھی اور جو چیز بھی تھی وہ اپنی جگہ بہترین تھی۔ ڈرائنگ روم، بیڈ روم، فرنیچر، ڈی لائونج، کچن غرض گھر کا کوئی کونا ایسا نہ تھا جو اشیاء سے خالی ہو۔

یوں لگتا تھا جیسے اس گھر سے کوئی گیا ہی نہ ہو جیسے یہ گھر خالی ہوا ہی نہ ہو۔

پورا گھر دیکھ کر نیلم اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ سید پور کا جن شہزادے کے روپ میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ نیلم گھر کا معائنہ کر رہی تھی اور وہ خاموشی سے اس کے ساتھ گھوم رہا تھا۔

بیڈ روم میں ایک خوبصورت سنگھار میز پر شمع روشن تھی۔

یہ شمع محبت تھی اور اسے سید پور کے جن نے روشن کیا تھا۔ یہ عجیب شمع تھی اتنا عرصہ مسلسل جلنے کے بعد بھی ذرا سی بھی نہ پگھلی تھی۔

اس کمرے میں وہ مسحور کن خوشبو بسی ہوئی تھی جو اس کے ہوش لوٹ لیا کرتی تھی۔

نیلم ایک گہرا سانس لے کر میز پر بیٹھ گئی۔ اس بیڈ پر انتہائی نرم، ملائم اور ریشم جیسا بستر بچھا ہوا تھا۔ ایسا بستر کہ آدمی بیڈ پر بیٹھے تو محو خواب ہونے کو جی چاہے۔

نیلم اس ریشمیں بستر پر نیم دراز ہو گئی۔

سید پور کے جن نے اسے مسکرا کر دیکھا اور بڑی محبت سے بولا۔ "نیلم آپ کو اپنا گھر پسند آیا۔"

"ہاں اچھا ہے۔ خوب سجایا ہے آپ نے۔" نیلم نے رسمی تعریف کی۔

"تمہاری اس سے ملاقات ہو گئی؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" نیلم نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیا کیا باتیں ہوئیں ہمیں نہیں بتائیں گی۔" اس نے اسے پُرشوق نگاہوں سے دیکھا۔

"کوئی خاص بات نہیں، بس رسمی سی۔" نیلم نے بتایا۔

"وہ اداس تو ہوا ہو گا؟" سید پور کے جن نے سوال کیا۔

"اس وقت تو نہیں تھا۔ صبح ہو تو ہو۔" نیلم نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"تم نے اسے کچھ تو نہیں بتایا۔"

"نہیں۔ میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ بس اشاروں اشاروں میں سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ نے اس سے نہیں کہا کہ پریشان ہو جاتا۔ چند گھنٹوں کی جو خوشی اسے ملی تھی وہ بھی اکارت جاتی۔ میں کے نام ایک پرچہ لکھ آئی ہوں صبح اٹھ کر پڑھے گا تو سب کچھ جان لے گا۔"

"تم نے چھوڑ کر اداس ہو۔" "سید پور کے جن نے پوچھا۔

نیلم کا جی چاہا کہ فوراً ہاں کہہ دے لیکن وہ جانتی تھی کہ "ہاں" کہہ کر اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر کہا۔ "میں کیوں ہوتی اداس۔ میں آپ کو اداس دکھائی دیتی ہوں۔"

"نیلم کے اس جواب نے سید پور کے جن کو خوش کیا۔

"آج کی رات کس قدر حسین ہے۔ باہر ابر کرم برس رہا ہے اور اندر تمہارے حسن کی کہکشاں ہو رہی ہے آج کی رات۔" قرل نے خوشی سے جھوم کر کہا۔ "آج کی رات کس قدر دلفریب ہے۔ جو مانگو گی آناً فاناً حاضر کر دیا جائے گا۔"

"میں جو مانگوں گی وہ آپ مجھے دے نہ سکیں گے۔ اگر ایسا ہونا ہوتا تو میں اس گھر میں خوشی جاتی۔" نیلم نے اداس ہو کر کہا۔

"نیلم ہم سے وہ نہ مانگو جو ہم دے نہیں سکتے۔ ہم سے وہ مانگو جو ہم دے سکتے ہیں۔ ہم سے اپنا آپ مانگو۔ اپنے وجود کی آزادی نہ مانگو ہم تو خود تمہارے قیدی ہیں۔ ایک قیدی کسی کو کیا آزاد کر سکتا ہے۔ تمہیں آزاد کرنا ہمارے بس سے باہر ہے اگر تم آزاد ہو گئیں تو ہم مر جائیں گے۔ نیلم اس برستی بارش کی قسم ہم سے ہمارا وجود نہ مانگو۔" اس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

"گرمند نہ ہوں۔ میں آپ سے کچھ نہیں مانگ رہی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ مجھے کیا دے سکتے ہیں کچھ نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میرے مقدر میں کیا لکھ دیا گیا ہے۔ میرے مقدر میں شعلے لکھ دیے گئے ہیں۔ سو مجھے ان شعلوں سے گزرنا ہوگا۔ اس آگ سے کھیلنا ہوگا۔" یہ کہہ کر نیلم نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔

"نیلم۔" اس نے بڑے جذباتی لہجے میں اسے پکارا۔ "رو مت۔ اس برستی بارش کی قسم میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے نیلم کا بازو چھوا۔

نیلم کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی شعلے نے اسے چھو لیا ہو۔

"پھر میں کیا کروں؟" نیلم نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر اسے بھیگی نظروں سے دیکھا۔

"کچھ مت کرو۔ تم نے کچھ نہیں کرنا۔ فی الحال اتنا کرو کہ اپنی خوبصورت آنکھوں سے آنسو پونچھ لو۔ تم جانتی ہو کہ اب یہ گھر تمہارا ہے۔ اس گھر میں اب ہم دونوں نے رہنا ہے۔ اس گھر پر تمہاری حکمرانی ہوگی جو تم چاہو گی وہ تمہیں مل جائے گا۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں تمہارے سامنے حاضر ہو جائے گا۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری خوشی کی خاطر میں ہر وہ کام کر گزروں گا جو تمہیں مسرت دے گا۔ نیلم تم نہیں جانتی میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں۔ تمہارا کس قدر دیوانہ ہوں۔"

یہ کہہ کر سید پور کے جن نے ہاتھ فضا میں پھیلایا تو اس کے ہاتھ پر ایک سفید رومال آگیا یہ رومال

اس نے نیلم کی طرف بڑھایا۔ "لو نیلم اپنی آنکھیں پونچھ لو۔ باہر کیا کام ہورہی ہے۔"
نیلم نے اس کے ہاتھ سے رومال لے لیا اور اپنی خوبصورت آنکھوں کو صاف کرنے لگی۔
"کہیں ایک بات بتاؤں۔" سیدپور کا جن ہچکچاتا ہوا بولا۔
نیلم نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ بولی کچھ نہیں۔
"وہ صبح آئے گا۔" اس نے کہا۔
"وہ آئے گا؟" نیلم نے پوچھا۔
"اون آئے گا۔" سیدپور کے جن نے بتایا۔
"پوچھ پڑھنے کے بعد وہ سیدھا ادھر کا رخ کرے گا۔"
"اچھا آپ اکبر کی بات کررہے ہیں۔" نیلم نے اشارہ سمجھتے ہوئے کہا۔
"میں اسی کی بات کررہا ہوں۔ وہ آئے گا۔ اس گھر کی گھنٹی بجائے گا۔ گیٹ کو زور زور سے پیٹے گا۔" اس نے کہا۔
"پھر مجھے کیا کرنا ہوگا۔" نیلم نے پوچھا۔
"تم بہری ہوجاؤ گی۔ تمہیں کچھ نہیں سنائی دے گا۔" سیدپور کے جن نے بتایا۔
نیلم کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی وہ واقعی بہری ہوجائے گی یا اسے بہرہ ہوجانا پڑے گا اس نے پوچھا۔
"میں واقعی بہری ہوجاؤں گی۔"
"نہیں تمہیں بہرہ بننا ہوگا۔ تمہیں سب کچھ سنائی دے گا لیکن کچھ نہیں سنائی دے گا۔"
"اچھا۔" نیلم نے ٹھنڈا اور گہرا سانس لیا۔ اس سانس میں دکھ تھا۔
اسی وقت زور سے بجلی کڑکی۔ آسمان پر دھماکے ہونے لگے۔ یوں محسوس ہوا جیسے کہیں آس پاس ہی بجلی گری ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس علاقے کی بجلی چلی گئی۔
کمرے میں اندھیرا ہوگیا۔ بس ایک شمع تھی جو جل رہی تھی۔
صبح ہوئی۔ یہ ایک ٹھنڈی اور ابر آلود صبح تھی۔
اکبر بڑی اسپیڈ سے خالی گھر کی طرف آرہا تھا اس کا ذہن خالی تھا اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ خالی گھر کی طرف کیوں جارہا ہے۔ کیا اسے یہ امید تھی کہ نیلم سے اس کی ملاقات ہوجائے گی۔ اور وہ کسی طرح اسے اپنے ساتھ لے آئے گا یا پھر وہ یہ سوچ کر گھر کی طرف بڑھ رہا تھا کہ وہ تصدیق کرنے آیا تھا کہ نیلم گھر میں موجود ہے یا نہیں۔
اکبر کے ذہن میں کوئی بات واضح نہیں تھی، نیلم کے خط نے اسے تڑپا دیا تھا اور وہ سوچے سمجھے بغیر کسی ارادے کے خالی گھر کی طرف چل پڑا تھا۔
گھر کے گیٹ پر پہنچ کر اس نے گاڑی روکی۔ گاڑی کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے اس نے خالی گھر پر نظر ڈالی۔ گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گیٹ بند تھا۔ اس میں تالا پڑا ہوا تھا۔
تب اسے خیال آیا کہ وہ چابی تو لایا ہی نہیں۔ چابی صابرہ کے پاس تھی، صابرہ کو معلوم تھا کہ وہ خالی گھر کی طرف جارہا ہے پھر اس نے یاد نہ دلایا، یہ نہ کہا کہ چابی لیتے جاؤ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے خیال ہی نہیں آیا ہو۔
اکبر نے سوچا کہ گیٹ جوں کا توں بند ہے پھر نیلم نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ وہ خالی گھر میں جارہی ہے

"کس طرح اندر گئی ہوگی۔ گیٹ کافی اونچا تھا اور اس کے اوپر نوکیلی سنگینیں لگی ہوئی تھیں کسی لڑکی کا آہنی جنگلہ کو عبور کر کے گھر میں جانا اتنا آسان نہ تھا۔

یہ کیا چکر ہے۔ پھر نیلم کہاں گئی؟

اب وہ گاڑی سے اتر آیا۔ اس نے دونوں گیٹ کے درمیان جو جھری تھی اس سے جھانک کر دیکھا اس جھری سے گھر کا دروازہ نظر آرہا تھا جو بند تھا گھر میں کسی قسم کی زندگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے

پھر اکبر نے پیچھے ہٹ کر کال بیل پر ہاتھ رکھا۔

گھنٹی کی آواز خالی گھر میں دور تک گونج گئی۔ نیلم سو رہی تھی۔ گھنٹی کی آواز سن کر اس کی خوابناک کیفیت ختم ہوگئی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

گھنٹی پھر بجی یہ اکبر کا مخصوص انداز تھا گھنٹی بجانے کا۔ نیلم سہم گئی کہ دروازے پر وہ آگیا ہے۔ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔

وہ اپنے بیڈ روم سے باہر نکلی پھر ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اس نے کھڑکی سے ذرا سا پردہ سرکا کر باہر کھڑکی سے گھر کا گیٹ صاف نظر آتا تھا۔ دروازہ بند تھا اسے اکبر نظر نہ آیا بس یہ احساس ہی تھا کہ اکبر گیٹ کے اس طرف موجود ہے۔

اکبر نے کئی مرتبہ اپنے مخصوص انداز میں گھنٹی بجائی۔ ہر مرتبہ اس کا دل زور زور سے دھڑکا۔ ہر مرتبہ اس کا جی چاہا کہ وہ دروازہ کھول کر باہر پہنچ جائے۔

لیکن اسے معلوم تھا کہ حدود توڑنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ وہ حکم کے مطابق بہری بن گئی۔

اسے سب کچھ سنائی دے رہا تھا۔

اب اکبر مین گیٹ زور زور سے پیٹ رہا تھا لیکن اسے کچھ نہیں سنائی دے رہا تھا۔

وہ باہر تھا نیم پردے کے پیچھے کھڑی تھی اور دل کا درد آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

دیوار کے اس طرف ریشمیں پردوں کے پیچھے نیلم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے تو دیوار کی دوسری طرف اکبر پر جنون کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔

وہ گھر کے گیٹ کو زور زور سے پیٹ رہا تھا اور چیخ چیخ کر سوال کر رہا تھا۔

"نیلم تم کہاں ہو..... ! نیلم تم کہاں ہو؟"

اکبر کی سوز میں ڈوبی ہوئی آواز نیلم کے دل میں ٹیسیں بن کر اتر رہی تھی۔ وہ بار بار اپنا دل مسوس رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری تھے۔

تب اچانک ہی نیلم نے اپنی پیٹھ پر تپش محسوس کی..... کسی نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا تھا اس نے مڑ کر دیکھا سید پور کا جن شہزادے کے روپ میں اس کی پشت پر کھڑا تھا۔

"آؤ نیلم! اپنے کمرے میں چلو۔"

"نیلم تم کہاں ہو.....؟ نیلم تم کہاں ہو؟" اکبر کی باہر سے دیوانہ وار آواز آرہی تھی۔

"تم جو آواز سن رہی ہو ابھی چند لمحوں میں ختم ہو جائے گی۔ اس دیوانے کے والدین اسے لینے کے لئے آرہے ہیں اب تم چلو یہاں سے..... اپنا وقت ضائع مت کرو۔"

"یہ کہہ کر سید پور کے جن نے اس کا ہاتھ تھام لیا..... یوں لگا جیسے کسی شعلہ نے کسی حسین

اب کو اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا ہو۔

گیٹ کے اس پار۔ ایک کیسی آکر رکی بابر علی جلدی سے اترا اس کے پیچھے صابرہ چلی۔

اکبر پر جنون کی سی کیفیت طاری تھی وہ زور زور سے گیٹ پیٹ رہا تھا اور چیخ چیخ کر سوال کر رہا تھا۔

نیلم تم کہاں ہو؟ ..... نیلم تم کہاں ہو۔"

نیلم جہاں تھی وہاں اسے گونگا بہرہ بنا دیا گیا تھا۔ وہ کیا جواب دیتی۔

بابر علی نے بڑی محبت سے اکبر کے کندھے پر ہاتھ رکھا ..... اکبر نے پلٹ کر دیکھا تو اپنی پشت پر اپنے باپ کو پایا۔ باپ کی شکل دیکھ کر اسے کچھ ہوش سا آیا۔

صابرہ اس سے آکر لپٹ گئی ..... "میرے بچے تجھے کیا ہو گیا ہے آ ہمارے ساتھ چل۔"

اکبر نے کچھ نہ کہا ..... وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا ..... بابر علی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور وہ تیزی سے واپس ہو گئے۔

گھر پہنچ کر صابرہ نے اعصاب کو سکون پہنچانے والی دوائیں جو ڈاکٹر نے اس کو لکھ کر دی تھیں وہ اکبر کو کھلائیں اور اسے آرام سے ایک بستر پر لٹا دیا۔ کچھ دیر کے بعد اکبر کو نیند آ گئی۔

سر پر کو اس کی آنکھ کھلی ..... صابرہ نے زبردستی اسے تھوڑا سا کھانا کھلا دیا ..... وہ کھانا کھانے سے انکار کر رہا تھا اس کی بھوک جیسے ختم ہو گئی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے پھر گھر سے نکلنے کی تیاری کی ..... تو صابرہ اس کے آڑے آ گئی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ذرا باہر جا رہا تھا ....." اکبر نے سفید جھوٹ بولا۔

"اکبر تمہیں میری قسم ہے اب تم اس خالی گھر کی طرف نہیں جاؤ گے۔"

"امی مجھے نیلم کی فکر ہے ..... وہ کہاں ہے؟"

"وہ اسی گھر میں ہے، وہ کہاں جائے گی۔"

"امی، وہ وہاں نہیں ہے، اگر وہ وہاں ہوتی تو ضرور باہر آ جاتی۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو، وہ اسی گھر میں ہے ..... جب وہ پرچہ لکھ گئی ہے کہ وہ خالی گھر میں جا رہی ہے تو اس میں شبہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ وہیں ہے اور کہاں جائے گی؟"

"مجھے یقین نہیں آتا۔ میں ایک بار اور اسے جا کر دیکھ آؤں۔"

"میں تمہیں اپنی قسم دے چکی ہوں ..... تم نے اب اس خالی گھر کا رخ کیا تو مجھے زندہ نہ پاؤ گے۔"

"امی، اللہ نہ کرے، آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟" اکبر نے اپنی ماں کو لپٹا لیا۔ "اچھا امی میں نہیں جا رہا، آپ فکرمند نہ ہوں۔"

صابرہ نے اسے تو جانے سے روک دیا لیکن مغرب کے بعد صابرہ اور بابر علی نے خالی گھر کا رخ کیا ..... اندھیرا گہرا ہو گیا تھا ..... ان کا خیال تھا کہ وہ گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہو گا۔ لیکن انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی ..... گھر کے ہر کمرے کی بتی روشن تھی بلکہ گیٹ پر لگی بتیاں بھی جل رہی

تھیں۔

یہ احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ گھر خالی ہے۔

اور صابرہ کی طرف دیکھا۔

بابر علی نے گیٹ کے سامنے گاڑی روک لی

بابر علی نے پوچھا۔

"کیا خیال ہے؟ گھنٹی بجاؤں"

"چھوڑیں، کہیں کوئی مصیبت نہ نازل ہو جائے۔"

صابرہ کے اس طرح کہنے پر بابر علی کی رہی سہی ہمت بھی ٹوٹ گئی ..... اس نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر کے سامنے سے تیر کی طرح نکل گیا۔

اب گاڑی کا رخ عزیز آباد کی طرف تھا۔

ماموں فرقان کو ان لوگوں کے گھر خالی کرنے کا پتہ نہ تھا ..... گھر انہوں نے اچانک ہی خالی کیا تھا ..... اس لئے ان دونوں نے سوچا کہ ماموں فرقان کو تازہ ترین صورت حال بتا دی جائے۔ ساتھ ہی نئے گھر کا ایڈریس بھی سمجھا دیا جائے تاکہ وہ گھر آئیں تو انہیں کوئی دقت نہ ہو۔

ماموں فرقان اور ان کے گھر والے دونوں میاں بیوی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

لیکن جب صابرہ نے گھر خالی کرنے کی روداد سنائی تو ماموں فرقان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"تو نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے۔" ماموں فرقان نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "خیر تم لوگ پریشان نہ ہو۔ اکبر کہاں ہے؟"

اسی وقت گھر کی گھنٹی بجی۔

گھنٹی کی آواز سن کر شمسہ اٹھ کر دروازے کی طرف جانے لگی تو ماموں فرقان نے اسے روک دیا۔

"ٹھہرو بیٹے میں دیکھتا ہوں دروازے پر کون ہے؟"

"ابو آپ بیٹھیں میں دیکھتی ہوں اس وقت دروازے پر ضرور کوئی میری سہیلی ہوگی۔" شمسہ نے کہا۔

"اچھا پھر تم جا کر دیکھو۔" وہ پھر صوفے پر بیٹھ گئے۔

شمسہ نے جا کر دروازہ کھولا تو اسے اپنے سامنے اکبر کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔

"اکبر صاحب آپ ہیں؟" شمسہ کے لہجے میں حیرت اور سوال تھا۔

"کیوں، پھوپھی جان آپ کیا سمجھیں؟" اکبر نے مسکرا کر کہا۔

"بھتیجے میں یہ سمجھی کہ میری کوئی سہیلی آئی ہے۔ ابو دروازہ کھولنے آ رہے تھے یہی سوچ کر میں نے انہیں آنے سے روک دیا تھا۔" شمسہ نے ہنس کر کہا.....

"اچھا ماموں ہیں گھر میں۔" اکبر نے خوش ہو کر کہا.....

"ماموں بھی ہیں اور آپ کے امی ابو بھی موجود ہیں۔" شمسہ نے اطلاع بہم پہنچائی۔

"ہیں یہ لوگ یہاں ہیں۔" اکبر یہ کہہ کر جلدی سے ڈرائنگ روم میں آیا۔

"ارے اکبر تم۔" صابرہ نے اسے دیکھ کر حیرت سے کہا۔

"اور امی آپ یہاں۔" اکبر نے سوال کیا۔ "آپ لوگ بتا کر نہیں آئے کہ ماموں کے گھر

جارہے ہیں۔" راشدہ کو اکیلا چھوڑ کر آئے ہو۔" صابرہ ایک دم پریشان ہوگئی۔

"تم گھبراؤ نہیں کہ خالی گھر جانے سے منع کر دیا تھا لیکن میرا جی گھبرا رہا تھا میں نے سوچا کہ ماموں ہی آپ نے کہا خیال تھا کہ آپ لوگ کہیں آس پاس ہی گئے ہیں، آپ جلد گھر پہنچ جائیں گے میں ہے ل آؤں میرا خیال تھا کہ آپ لوگ کہیں آس پاس ہی گئے ہیں، آپ جلد گھر پہنچ جائیں گے میں راشدہ کو بتا کر گھر سے نکل آیا مجھے اگر معلوم ہوتا کہ آپ لوگ ماموں کے گھر گئے ہیں تو میں ہرگز گھر ہے نہ نکلتا۔"

"اچھا خیر کوئی بات نہیں تم یہاں بیٹھو ہم لوگ چلتے ہیں۔" صابرہ نے بابر علی کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"چلیں بی راشدہ گھر پر اکیلی ہے وہ ڈرتی بھی بہت ہے اور گھر بھی نیا ہے۔"

"ارے بھئی کھانا وانا کھا کر چلے جانا۔" ماموں فرقان نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔

"نہیں ماموں اب چلیں گے اگر اکبر نہ آیا ہوتا تو ہم ضرور کھانا کھا کر جاتے ویسے بھی یہاں آنے کا مقصد آپ کو حالات سے آگاہ کرنا تھا اور نئے گھر کا پتہ بتانا تھا سو کر دیا ہے باقی باتیں آپ اکبر سے پوچھ لیجئے گا۔" بابر علی نے کہا.....

"اور آپ دونوں کے حصے کا کھانا بھی انہیں کھلا دیں۔" شمسہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل۔" صابرہ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اچھا ماموں خدا حافظ اور ممانی کسی دن شمسہ کو لے کر پورے دن کے لئے آجائیں نا ہماری طرف۔"

"ہاں صابرہ میں آؤں گی۔" ممانی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"ہو آپ جاتے ہوئے چوکیدار سے کہہ دیجئے گا کہ وہ ہمارے گھر کا خیال رکھے۔" اکبر نے بابر سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" بابر نے گھر سے نکلتے ہوئے کہا.....

صابرہ اور بابر کو دروازے تک رخصت کرنے کے بعد ماموں فرقان نے اکبر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے قریب کر لیا اور بولے۔ "ہاں بھئی اکبر سناؤ کیا حال چال ہیں؟"

"ماموں حال چال تو آپ کو امی ابو سے معلوم ہو گئے ہوں گے لیکن مجھے آپ سے ایک شکایت ہے۔" اکبر نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا جناب؟" ماموں فرقان نے بڑے ادب سے پوچھا۔

"آپ نے تو ہمارے گھر آنا ہی چھوڑ دیا۔"

"اکبر بس میں تمہیں کیا بتاؤں آج کل ذرا کاروبار میں الجھا ہوا ہوں فرصت ہی نہیں ملتی۔" ماموں فرقان نے مصالحت آمیز جواب دیا۔

اکبر کو بات اچھی طرح معلوم تھی کہ ماموں فرقان نے کیوں کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ سیدپور کے جن نے انہیں خاصا نقصان پہنچایا تھا اگر دادا غفور نہ ہوتے تو ماموں فرقان کی جانے کیا حالت ہوتی۔

اس گھر سے جہاں سیدپور کے جن کا بسیرا تھا، کترانا بالکل فطری بات تھی۔ اکبر بڑا حقیقت پسند انسان

تھا وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ماموں فرقان کی جگہ ہوتا تو وہ اتنا بھی ساتھ نہ دیتا جتنا ماموں نے نبھایا تھا۔ اکبر اس نے زیادہ اس موضوع پر بات نہ کی۔

سن کر اس نے زیادہ اس موضوع پر بات نہ کی۔

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "ماموں میں کیا کروں؟"

"کیا کرنا چاہتے ہو؟" ماموں فرقان نے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔

"ماموں میں کوئی عمل کرنا چاہتا ہوں میں نے عہد کر لیا ہے کہ نیلم کو اس کے چنگل سے چھڑا لوں گا بس آپ مجھے کوئی عمل بتادیں۔" اکبر نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا

"اکبر بیٹے میں نے عمل کیا تھا وہ ایک مشکل عمل تھا۔ قبرستان میں عمل کرنا کوئی آسان کام نہیں عمل میں نے تمہاری خاطر کیا تھا۔ اس معصوم لڑکی کیلئے کیا تھا لیکن قسمت کی خرابی کہ وہ کامیاب نہ ہو اس کے دھوکے میں آگیا ورنہ اس سے تمہیں کب کی نجات مل چکی ہوتی۔" ماموں فرقان نے سانس لے کہا۔

"ماموں جو ہوا سو ہوا اب آگے سوچنا ہے۔" اکبر نے سنجیدگی سے کہا

"میں تمہاری طرف نہیں جا سکتا یہ اور بات ہے لیکن میں تم سے غافل نہیں رہا۔ میں نے تمہارے کئی لوگوں سے بات کی ہے۔ میں کوئی عامل ڈھونڈ رہا ہوں کوئی ایسا عامل جو واقعی ان مسائل کو سمجھتا ہو اور پکا ہو۔"

"داوا غفور کیا کہتے ہیں؟"

"وہ بیچارے کیا کہیں گے ان کے پاس جو اسلحہ تھا وہ ہم آزما چکے۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"پھر کیا ماموں، نیلم اس کی قید میں گھٹ گھٹ کر مر جائے گی؟" اکبر افسردگی سے بولا۔

"اللہ نہ کرے۔" ماموں فرقان نے فوراً کہا۔ "مجھے ایک کتاب نہیں مل رہی ہے؟"

"کون سی کتاب ماموں؟"

"میرے پاس ایک کتاب تھی اس میں کچھ عملیات درج تھے خاص طور سے جنات کے بارے میں بڑی نادر کتاب تھی وہ۔ میں نے اسے تلاش تو کیا ہے لیکن وہ مجھے کہیں نظر آئی نہیں اب مجھے اس کتاب کو اچھی طرح تلاش کرنا ہوگا۔ اکبر وہ کتاب مل گئی تو تمہارا مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا۔"

"ماموں اس کتاب کو ضرور ڈھونڈیئے۔" اکبر نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "آپ کہیں تو میں کل دن صبح سے آجاؤں۔ میں آپ کے ساتھ مل کر تلاش کروں گا۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں میں گھر میں ہر اس جگہ ڈھونڈ چکا ہوں جہاں اسے ہونا چاہئے بس ایک الماری اور رہ گئی ہے اس الماری میں زیادہ تر کتابیں بھری ہوئی ہیں جو میں علیگڑھ سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس میں داوا کی عطا کردہ کتابیں خاصی ہیں۔ وہ عملیات کی کتاب بھی انہی کی تھی اس الماری میں تالا پڑا ہے اور اس کی چابی نہیں مل رہی ہے۔ اب اس تالے کو توڑنا پڑے گا۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"آپ تالا نہ توڑیں میں ایسا کرتا ہوں کہ کسی تالے والے کو بلا لاتا ہوں وہ گھر آکر چابی بنا دے گا۔" اکبر نے تجویز پیش کی۔

"ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔" ماموں فرقان نے کہا ..... "ویسے وہ تالا اتنی آسانی سے ٹوٹنے والا بھی نہیں۔ وہ لیور والا تالا ہے اور وہ بھی علیگڑھ کا۔"

دوسرے دن صبح ہی اکبر لیاقت آباد سے ایک تالے والے کو پکڑ لایا۔ ماموں فرقان دکان پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اکبر کو دیکھ کر انہوں نے دکان پر جانا ملتوی کر دیا۔

تالے والے نے الماری کے تالے کو ہاتھ میں لے کر معائنہ کیا پھر اسے الٹا پلٹا ایک نظر ماموں فرقان کو دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ "بڑا زبردست تالا ہے۔"

"اس کی چابی تو بن جائے گی نا۔" ماموں فرقان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اکبر بول اٹھا۔

"میاں آپ دکان پر تو کہہ رہے تھے کہ بیشک چابی نہ بنے بس تالا کھل جائے۔" تالے والے نے اکبر کو ترچھی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں کوئی حرج نہیں۔" ماموں فرقان بولے۔ "چابی بے شک نہ بنے مگر یہ کھل جائے۔"

"ارے صاحب آپ فکر ہی نہ کریں جن تالے والا آپ کے گھر آیا ہے۔ اب تالا بھی کھلے گا اور چابی بھی بنے گی۔" یہ کہہ کر جن تالے والے نے اپنی جیب سے ماسٹر کی نکالی۔

پھر اس چابی کو تالے میں ڈال کر حرکت دی تو فوراً کھل گیا۔

"ارے واہ جن صاحب آپ نے تو کمال کر دیا۔" اکبر نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

پھر پانچ منٹ میں جن تالے والے نے گھس گھسا کر اس کی نئی چابی بنا دی اور اپنا معاوضہ وصول کر کے رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد ماموں فرقان نے الماری کھولی۔ یہ الماری کیونکہ ایک عرصے سے بند پڑی تھی اس لئے اس کے اندر خاصے کیڑے مکوڑے موجود تھے۔

الماری دیوار میں بنی ہوئی تھی اس میں تین خانے تھے ان تینوں خانوں میں کتابیں ٹھساٹھس بھری ہوئی تھیں۔ یہ ساری کتابیں پرانی تھیں، دیمک زدہ اور کرم خوردہ۔

ماموں فرقان نے ایک ایک کر کے سارے خانے دیکھ ڈالے لیکن عملیات کی وہ کتاب جس کی انہیں سخت ضرورت تھی کہیں نظر نہ آئی۔ اکبر کو ماموں فرقان کی تلاش سے تسلی نہ ہوئی تو اس نے پوری الماری کی کتابیں خالی کر دیں اور پھر ایک ایک کر کے انہیں الماری میں رکھتا گیا۔

نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات..... وہ کتاب الماری میں موجود نہ تھی۔

ماموں فرقان کو قوی امید تھی کہ وہ کتاب الماری میں ضرور موجود تھی اسے الماری میں نہ پا کر انہیں سخت مایوسی ہوئی یہ آخری امید تھی جو ٹوٹ گئی تھی۔

ماموں فرقان سے زیادہ اکبر کا دل ٹوٹا اس کے چہرے پر اداسی پھیل گئی۔

"ماموں اب کیا ہوگا؟" اس نے مایوسی سے کہا.....

"پریشان کیوں ہوتے ہو؟ اللہ نے چاہا تو کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔"

"ماموں یہ لوگ جو شہر کے مختلف علاقوں میں بیٹھے ہیں اور خود کو پروفیسر اور ماہر عملیات کہلاتے ہیں کیا ان سے رجوع نہیں کیا جا سکتا۔"

"ارے نہیں ان کے چکروں میں نہ پڑ جانا۔ یہ سب دھوکے باز ہیں لوٹنے کھسوٹنے والے۔ یہ کیا عمل کریں گے۔" ماموں فرقان نے سختی سے کہا۔

"مگر ماموں۔" اکبر کو کوئی راستہ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

"میں دکان پر بیٹھا اکثر لوگوں سے معلومات حاصل کرتا رہتا ہوں ایک دو لوگوں سے نہیں بلکہ بہت سارے لوگوں سے پوری معلومات سامنے آئیں تو پھر ان میں سے کسی سے ملا جائے۔"

"ماموں اب یہ کارروائی ذرا تیز کر دیں۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو حالات اب زیادہ سنگین ہو گئے ہیں ایک دو دن میں تمہاری طرف سے انشاء اللہ اس وقت ضرور میرے پاس تمہارے لئے کچھ نہ کچھ ہو گا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ کسی کے پیچھے لگنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اچھے اور نیک لوگ پیچھے رہتے ہیں وہ خود کو ظاہر نہیں کرتے اگر وہ خود ظاہر کر دیں تو ضرورت مندوں کا ان کے گرد ہجوم ہو جائے۔ سایہ ور کرنے والے عملیات بہت مشکل ہوتے ہیں ان کی وجہ سے جان جوکھوں میں پڑ جاتی ہے۔ اگر عمل میں ذرا سا نقص رہ جائے تو معمول الجھ جاتا ہے۔ عمل کرنے والے کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے اس لئے اچھے لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ خود کو چھپا کر رکھیں۔" ماموں فرقان نے سمجھایا۔

"مکمل ہے ماموں۔ اچھے لوگ سامنے آتے نہیں اور جو سامنے ہیں وہ اچھے ہیں نہیں پھر میرے پیارے لوگ کیا کریں۔" اکبر نے بڑے آزردہ لہجے میں کہا۔

ماموں فرقان کے پاس اس سوال کیا کیا جواب ہو سکتا تھا بھلا۔ بس انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اتنا کہا۔ "صبر کرو بیٹا۔"

"ماموں اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا، میری نیلم قید میں ہے اور آپ کہتے ہیں بیٹا صبر کر۔ اب صبر میرے مجھ سے صبر۔" یہ کہہ کر اکبر ماموں فرقان کے گھر سے نکل آیا۔

ماموں فرقان، ممانی ریحانہ، شمسہ سبھی نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ رکا نہیں۔

مین روڈ پر پہنچ کر اس نے ایک ٹیکسی روکی وہ جلدی سے ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے گردن موڑ کر پوچھا۔ "کدھر جائیں گے صاحب۔"

اکبر سوچ میں پڑ گیا وہ ٹیکسی میں بیٹھ تو گیا تھا لیکن اس وقت اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اعصاب جیسے ایک دم بڑھ گیا تھا۔ پہلے خیال آیا کہ گلشن کے لیکن وہ گھر جا کر کیا کرتا۔ پھر اس نے سوچا کہیں گھومتے چلے۔ سمندر سے اسے عشق تھا فوراً اس کے ذہن میں کلفٹن کا خیال آیا پھر اس نے مزید سوچے بغیر ڈرائیور سے کہا..... "بھائی کلفٹن چلو۔"

"اچھا صاحب۔" یہ کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر میٹر ڈاؤن کیا۔

آج سردی زیادہ نہ تھی پھر بھی کلفٹن پر رش نہ تھا وہ دیوار پر بیٹھ گیا۔ سامنے وہ جہاز تھا جو ریت میں دھنسا ہوا تھا۔ اس نے سوچا اس کی زندگی کا جہاز بھی تو اسی طرح ریت میں دھنس گیا ہے کوئی نہیں جو اس جہاز کو ریت سے نکال کر زندگی کے سمندر میں رواں دواں کرے۔

جب وہ ٹیکسی میں بیٹھا کلفٹن کی طرف آ رہا تھا تو اس کے دل پر گھٹا سی چھائی تھی۔ اپنی بے بسی کا احساس کر کے بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آتے تھے وہ ان آنسوؤں کو بڑے ضبط سے پی رہا تھا۔

لیکن اس وقت دیوار پر بیٹھ کر اس ریت میں دھنسے ہوئے جہاز کا نظارہ کرتے ہوئے بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ جہاز دھندلا گیا۔

اکبر نے کوٹ کی جیب سے رومال نکال کر اپنی آنکھوں کو صاف کیا۔
تبھی پیچھے سے آواز آئی۔
"رو تا کیوں ہے۔"
اکبر نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا وہ کوئی ملنگ تھا اس نے ایک میلا اور پھٹا سا تہہ باندھ رکھا تھا اس کے جسم پر لیف نہ تھی۔ کالی داڑھی، چمکتی آنکھیں، کشادہ پیشانی، سانولی رنگت۔
"رو تا کیوں ہے بچہ۔" اس نے ایک انگلی اٹھا کر اکبر سے پوچھا۔
"کچھ نہیں بابا۔" یہ کہہ کر اکبر نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک پانچ کا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ لو۔"
"نہیں چاہئے۔ ہمیں تیرا یہ نوٹ۔" وہ جیسے غصے میں آگیا۔
"کم ہیں زیادہ دے دوں دس روپے۔"
"ہمیں کچھ نہیں چاہئے بچہ، ہماری بات غور سے سن جا مزار پر جا۔" یہ کہہ کر وہ ملنگ ایک سیکنڈ کے لئے بھی وہاں نہ رکا۔
"بابا سنو تو۔" اکبر کے ہاتھ میں پانچ روپے کا نوٹ دوبارہ گیا۔
کچھ دیر بعد سمندر کی لہروں کو ایک دوسرے کا تعاقب کرتے دیکھتا رہا اور اس ملنگ کے رویے پر غور کرتا رہا وہ عجیب فقیر تھا اس نے پیسے بھی نہ لئے اور مزار کی طرف جانے کا مشورہ دے گیا۔
اکبر کے دل میں ایک خیال آیا اور پھر وہ خیال گہرا ہوتا گیا۔
کیوں نہ وہ مزار کی طرف جائے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مزار کی طرف چل دیا۔
مزار کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے دل کی عجیب کیفیت تھی رقت طاری تھی آنسو بار بار آنکھوں کی قید سے آزاد ہونے کیلئے مچل مچل جاتے تھے۔
مزار پر اس وقت کوئی خاص رش نہ تھا اس نے ایک کونے میں کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی اور اللہ سے دعا مانگنے لگا۔
اس عالم کے رب اور دوسرے عالموں کے رب سورج کو مشرق سے نکال کر مغرب میں غروب کرنے والے، رات کو دن میں اور دن کو رات میں تبدیل کرنے والے اے اللہ تو ازل ہے تو ابد ہے میں نے ہمیشہ تجھ ہی سے مانگا ہے اور تجھی سے مانگوں گا اے انسانوں اور جنوں کے بنانے والے مجھے اس جن سے نجات دلا۔ اے اللہ مجھ پر رحم کر تو ہی کریم اور بخشنے والا ہے۔
اس کے ہاتھ دعا کو اٹھے ہوئے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ آنسو رخساروں پر بہہ رہے تھے اور وہ دھیرے دھیرے اپنے رب سے مخاطب تھا۔
اس رب سے جو انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی نزدیک ہے جو سب کی سنتا ہے سب کچھ دیکھتا ہے، جس کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہلتا جو بستے دریاؤں میں ہے۔ گرتے آبشاروں میں ہے، اونچے پہاڑوں میں وہ ہر جگہ ہے وہ کہاں نہیں ہے۔
دعا کر کے اس نے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر پھیرے اور خاموشی سے مزار کے باہر آگیا۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے سامنے اس کی نظر پڑی تو اسے وہ ملنگ ایک سیڑھی پر بیٹھا فکر آلود شکل کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

جب اکبر اس کے نزدیک پہنچا تو اس ملنگ نے اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آ بیٹھ جا۔"

اکبر کے اس کے برابر بیٹھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی۔ "تو مزار پر گیا؟"

"بابا آپ ہی نے تو کہا تھا۔ "اکبر نے کہا.....

"مزار میں جا کر تو نے کیا کیا۔ "ملنگ نے پوچھا۔

"میں نے فاتحہ پڑھی اور اپنے رب سے دعا مانگی۔" اکبر نے بتایا۔

"بس بات کی دعا۔"

"اس جن سے نجات کی دعا جس نے میری بیوی کو قید کر لیا ہے۔"

"تو بھی لیر گیا ہے۔" ملنگ نے اچانک پوچھا۔

"نہیں کبھی نہیں۔" اکبر نے فوراً جواب دیا۔

"پھر تو لیر جا وہاں الٹی والے بابا سے مل، راستہ دکھانے والا تو اللہ ہے، نجات دلانے والا تو اللہ ہے، عجب کہ تجھے اس کے ذریعے نجات مل جائے بس اب جا مجھے جو کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا۔" یہ کہہ کر ملنگ نے اکبر کے جانے کا بھی انتظار نہ کیا خود ہی اٹھ گیا اور مزار کی تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

وہ اسے کچھ دیر اوپر جاتے ہوئے دیکھتا رہا جب وہ مزار میں غائب ہو گیا تھا تو اکبر سیڑھیاں اترنے لگا۔

اکبر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ ماجرا کیا تھا۔ اکبر نئی روشنی کالڑکا تھا اسے ان قلندروں، ملنگوں اور فقیروں کی دنیا کا کچھ علم نہ تھا اسے معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ دنیا سے بے خبر ہوتے ہوئے کتنے باخبر ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے کوئی دیوار، دیوار نہیں ہوتی یہ جہاں تک چاہے دیکھ سکتے ہیں جہاں تک چاہیں جا سکتے ہیں۔

اکبر کو ان قلندر قسم کے فقیروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ انہیں ادھر اُدھر سڑکوں کے فٹ پاتھوں پر لیٹے بیٹھے دیکھتا اور ان کے قریب سے گزر جاتا۔

آج بھی اس کا ذہن اس واقعہ کو قبول نہیں کر رہا تھا وہ معمول کے مطابق یہاں سے سرسری طور پر گزر جانا چاہتا تھا۔ وہ اس سارے واقعہ کو کسی مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہ دینا چاہتا تھا۔

ہاں ایک بات ضرور اس کے دماغ میں ہتھوڑے برسا رہی تھی کہ اگر یہ سب محض اتفاق تھا تو اس ملنگ نے ساحل سمندر سے مزار تک تعاقب کیوں کیا تھا۔ بے شک وہ اس بات کو اہمیت دے یا نہ دے یہ اس کا اپنا مسئلہ تھا۔ یہ واقعہ اتفاقی ضرور تھا لیکن غیر اہم ہرگز نہ تھا۔

وہ مزار سے ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر پہنچ گیا شام اپنے پر سمیٹ رہی تھی۔ رات اپنے سائے پھیلا رہی تھی۔ مغرب کے وقت ویسے بھی ہر سُو سناٹا چھا جاتا ہے ہر طرف ایک اداسی سی پھیل جاتی ہے۔ شاید یہ سورج ڈوبنے کا ردعمل ہوتا ہے جبکہ صبح سورج نکلتا ہے تو ایک خوشی کا احساس جاگتا ہے۔

اس وقت گھر میں بھی سناٹا طاری تھا۔ دروازہ راشدہ نے کھولا تھا اور وہ خاموشی سے بغیر کچھ کہے اس کے ساتھ اندر آ گئی تھی۔

تمہ کا سامان بڑی حد تک سیٹ ہو چکا تھا۔ بس چھوٹی موٹی رد و بدل جاری تھی صابرہ اس کام میں بھی
چلی ہی گئی اور باہر اس کی مدد کر رہا تھا۔
آپ کی وی لانچ میں پڑے ایک صوفے پر بیٹھ گیا وہ بہت تھکا تھکا سا تھا۔
"اکبر بھائی چائے لاؤں آپ کیلئے۔" راشدہ نے پوچھا۔
"اکبر نے سر کو ہلکا سا جھکا کر صرف اثبات میں گردن ہلائی۔
"آپ سے کچھ نہ بولا صرف اثبات میں گردن ہلائی۔
آپ تھک سے گئے ہیں۔" صابرہ اس کے نزدیک آکر بیٹھتے ہوئے بولی۔
"ہاں ہوا بیٹھے۔" اکبر نے پوچھا۔
"بس چیز کا لائی۔
"تم ہاسوں کی طرف گئے تھے وہ کتاب ملی کہ نہیں پہلے تو یہ بتاؤ کہ الماری کا تالا بھی کھلا تھا
نہیں۔
"ہی الماری کا تالا تو کھلوا دیا تھا لیکن وہ کتاب نہیں ملی۔" اکبر نے بتایا۔
"اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔" صابرہ نے اپنے ہاتھ مسلے۔
"ہاں ہاسوں خود بہت پریشان تھے انہیں قوی توقع تھی کہ وہ کتاب الماری سے ضرور مل جائے گی۔"
اکبر نے کہا۔
"پھر اب وہ کیا کہہ رہے تھے۔" صابرہ نے پوچھا۔
"انہوں نے حسب معمول مجھے صبر کرنے کو کہا ہے۔" اکبر نے پھیکی مسکراہٹ سے ماں کو
دیکھا صبر تو کیے بیٹھے ہیں۔" صابرہ نے ذرا خفگی سے کہا۔
"وہ کہہ رہے تھے کہ اچھے عامل کو ڈھونڈ رہے ہیں۔" اکبر نے مزید بتایا۔
"اب کیا ملے گا وہ عامل؟" صابرہ نے سوال کیا۔
"اللہ بہتر جانتا ہے۔" اکبر نے ٹھنڈی سانس بھری۔
"باہر بھی کوشش کر رہے ہیں شاید کوئی نجات دہندہ مل ہی جائے۔" صابرہ نے بتایا۔
نجات دہندہ کا سن کر اکبر کو فوراً کلفٹن والے ملنگ کا خیال آیا۔
"امی آج میں کلفٹن گیا تھا وہاں مجھے ایک فقیر ملا۔ میں دیوار پر بیٹھا ریت میں دھنسے ہوئے جہاز کو دیکھ
رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے پکارا میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک فقیر کو پایا۔ میں نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکال
کر اس کی طرف بڑھایا تو اس نے سختی سے کہا، نہیں چاہئے ہمیں تیرا نوٹ میں سمجھا شاید یہ پیسے کم ہیں اس
لئے وہ لینے سے انکار کر رہا ہے۔ میں نے پھر دس روپے دینے کی پیشکش کی تو اس نے پھر اسی غصے سے
کہا ..... ہمیں کچھ نہیں چاہئے بچہ۔ جا مزار پر جا۔ یہ کہہ کر وہ فقیر چلا گیا میں نے اس فقیر کو کوئی اہمیت
نہ دی آرام سے بیٹھا رہا پھر جانے کیوں دل بار بار مزار کی طرف جانے کیلئے اکسانے لگا آخر میں اس قدر
بے چین ہوا کہ مزار کی طرف چل دیا۔
"اکبر بھائی چائے۔" راشدہ نے اکبر کی طرف چائے کی پیالی بڑھاتے ہوئے کہا۔
"راشدہ تیرے ابو کہاں ہیں؟" صابرہ نے پوچھا۔
"وہ ڈرائنگ روم میں ہیں، تصویر لگا رہے ہیں۔"
"ذرا انہیں بھیج۔" صابرہ نے کہا۔

اکبر سمجھ گیا کہ صابرہ، بابر کو کیوں بلا رہی ہے وہ بابر کو بھی یہ داستان سنوانا چاہتی تھی۔ اکبر مسکرا کر کھڑا ہو گیا اور بابر کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

"ہاں بھئی کیا ہوا؟" بابر نے آتے ہی پوچھا۔

"ادھر آئیں۔" صابرہ نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ "اکبر آج کلفٹن گیا تھا وہاں اسے ایک فقیر ملا، اکبر ذرا پھر سے سنا۔"

اکبر نے دوبارہ جہاں تک صابرہ کو سنایا تھا سنا دیا۔ یہ بات کہ وہ دیوار پر بیٹھا رو رہا تھا اور اس بھنگ سے ہٹ کر کھا تھا رو تا کیوں ہے بچہ۔ صابرہ سے چھپائی تھی۔ یہ بات اس نے بابر کو بھی نہ بتائی۔ یہ بات کیسے بتاتا۔ بتانے والی کہاں تھی بھلا۔

مزار تک جانے، وہاں دعا مانگنے، واپس ہونے، ملنگ کے ملنے اور اہلی والے بابا کے پتہ بتانے تک اکبر نے سارے واقعہ کو تفصیل سے بتا دیا۔

ساری بات سن کر بابر نے کہا۔ "بڑی حیرت میں ڈالنے والی بات ہے۔"

"ابو، حیرت میں ڈالنے والی بات تو اس وقت ہوتی جب وہ فقیر میرے کچھ بتائے بغیر جن کا ذکر کر رہا ہے اور اہلی والے بابا کا پتہ بتاتا۔" اکبر اس واقعہ کو اہمیت دینے کیلئے تیار نہ تھا۔

"بیٹا کیا حرج ہے اگر تم ملیر چلے جاؤ۔" صابرہ نے اسے ترغیب دی اور اپنے شوہر سے تائید چاہی۔

"کیوں جی؟"

"ہاں جانے میں تو کوئی حرج نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس علاقے کا مشہور آدمی ہوگا۔ پتہ ڈھونڈنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔" بابر نے کہا۔

"ٹھیک ہے ابو میں کسی دن جا کر اہلی والے بابا سے مل آؤں گا۔" اکبر نے کہا۔

"اپنے ساتھ کسی دوست کو لے جانا تم نے تو وہ علاقہ دیکھا بھی نہ ہوگا یا کہو تو میں چلوں۔"

"نہیں ابو آپ زحمت نہ کریں میں اپنے ساتھ کسی دوست کو لے لوں گا۔ یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے میں کر لوں گا آسانی سے۔" اکبر نے اپنے باپ کو یقین دلایا۔

پھر اکبر نے کچھ دیر گھر میں آرام کیا اس کے بعد وہ گھر سے نکل گیا۔ اس نے اپنے ایک دوست طارق کے گھر کا رخ کیا۔

اکبر کے گھر سے نکلنے کے بعد فرقان ماموں آ گئے۔ ایک تو انہوں نے نیا گھر دیکھا تھا دوسرے انہیں اکبر کی فکر تھی وہ جس موڈ میں ان کے گھر سے نکلا تھا وہ ان کے لئے باعث تشویش تھا۔

گھر میں داخل ہو کر پہلے انہوں نے گھر کا ایک چکر لگایا۔ نئے مکان کی تعریف کی اور پھر اکبر کے بارے میں پوچھا۔ "اکبر کہاں ہے؟"

"وہ ماموں، آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے نکلا ہے۔ اپنے کسی دوست کی طرف گیا ہے۔"

"بھئی اس وقت میں خاص طور سے اس کے لئے آیا تھا۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"کیوں ماموں خیریت تو ہے۔" اس مرتبہ بابر نے پوچھا۔

"بھئی، وہ میرے گھر سے ناراض ہو کر نکلا تھا میں نے سوچا جا کر اس سے معذرت کر لوں۔"

"ماموں آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں اس کے ایک ہاتھ لگایا ہوتا۔ وہ ٹھیک ہو جاتا۔"

"بھئی، اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہیں اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو شاید میرا بھی یہی ردعمل ہوتا۔ اب آدمی کب تک صبر کرے۔ آخر صبر کی بھی کوئی حد ہونا چاہئے۔ اکبر بیچارے نے تو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی صبر کر لیا ہے۔" ماموں فرقان نے دکھی لہجے میں کہا۔

"بابر، ماموں کو آج کا واقعہ بتاؤ۔"

"کیا ہوا بھئی، خیریت تو ہے؟"

"شاید صبر کا پھل ملنے والا ہے۔"

"اچھا، وہ کیسے؟" ماموں فرقان نے سوال کیا۔

"آپ کے گھر سے نکل کر وہ ادھر آنے کے بجائے سیدھا کلفٹن چلا گیا تھا۔ وہاں اسے ایک فقیر ملا۔ اس نے اسے مزار پر جانے کی ہدایت کی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مزار کی طرف چلا گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نادیدہ طاقت اسے مزار کی طرف دھکیل رہی ہے۔ مزار سے فاتحہ اور دعا مانگ کر جب وہ نیچے آیا تو اسے وہ فقیر دوبارہ مل گیا۔ اس نے اسے اپنے نزدیک بٹھایا اور ملیر میں کسی اللہ والے بابا کا پتا بتایا کہ وہ اس سے جا کر ملے۔ اس کے ذریعے ممکن ہے کہ اس جن سے نجات مل جائے۔" بابر نے اس ملاقات کی روداد بیان کی پھر ماموں فرقان سے پوچھا۔ "ماموں آپ نے کسی اللہ والے بابا کا سنا ہے؟"

"نہیں، میرے علم میں تو کوئی نہیں ہے لیکن میں معلوم کرلوں گا۔ ملیر کے کئی لوگوں سے واقف ہوں۔ میں ان سے پوچھ کر بتادوں گا۔"

"ماموں، آپ کا کیا خیال ہے کہ اکبر کو اس بابا سے جا کر ملنا چاہئے۔"

"ہاں، ضرور ملنا چاہئے کیا عجب نجات کا راستہ نظر آجائے۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گھر کی بیل بجی۔ راشدہ دروازے پر گئی۔ بابر کا خیال تھا کہ اکبر آیا ہوگا لیکن دروازے پر اکبر نہ تھا۔

راشدہ نے آکر بتایا "ابو، چوکیدار گل خان آیا ہے۔"

"اچھا وہ کیسے آگیا۔" بابر کو حیرت ہوئی۔

بابر کے ساتھ ماموں فرقان بھی گیٹ پر پہنچے۔ گل خان نے بڑے احترام سے سلام کیا اور پھر جھجکتے ہوئے بولا۔ "صاب جی آپ نے کہا تھا کہ خالی مکان کا خیال رکھوں۔ لیکن صاب جی وہ خالی نہ ہے۔ اے ہوئو تو رہتا ہے کوئی۔"

"گل خان یہ تم کیا کہہ رہے ہو، ادھر کوئی نہیں رہتا ادھر ہم رہتے تھے۔" بابر علی نے بتایا۔

"نہیں صاب جی اُدور ضرور کوئی رہتا۔ رات کو گھر کی ساری بتیاں جل جاتی ہیں۔ صبح صبح اندر سے فرش دھلنے کی آواز آتی ہے۔ پانی باہر بہہ کر آتا ہے۔ دروازے پر تالا پڑا ہوا ہے۔ ام نے کسی کو اندر جاتے یا باہر آتے نہیں دیکھا۔ صاب جی اُدور کون لوگ رہتا ہے۔"

"گل خان وہاں کوئی نہیں۔ یہ تمہارا وہم ہے۔"

"بجلی کا رات کو جلنا، صبح کو بجھنا یہ امارا وہم نہیں اے، حقیقت ہے۔ آپ امارے ساتھ چل کر دیکھو اس وقت بھی گھر کی ساری بتیاں جلتی اے۔"

گل خان نے جو دیکھا تھا وہ صحیح تھا وہ اپنی بات پر اڑا رہا بابر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ گل خان کو کیسے

سمجھائے۔ اس جن کا تذکرہ کرے یا نہ کرے۔

تب ماموں فرقان نے باہر کو اشارہ کیا وہ تھوڑا بہت اس مکان کے بارے میں بتا دے۔ ماموں فرقان کی ہدایت پر باہر نے گل خان کو بتایا کہ اس مکان پر سایہ وغیرہ ہے اسی لئے ہم لوگوں نے اس کو خالی کر دیا ہے تم اس گھر سے دور ہی رہنا اس کے اندر جھانکنے یا اندر جانے کی کوشش نہ کرنا۔

اس ہدایت کو سن کر گل خان خاموشی سے واپس چلا گیا۔ لیکن اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اسے باہر کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

اسے باہر کی بات پر واقعی یقین نہیں آیا تھا۔

بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ اس گھر میں کوئی سایہ ہے۔ جو گھر کی بتیاں جلاتا بجھاتا ہے۔ گھر کی صفائی اور دھلائی کرتا ہے ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

گل خان کوئی چالیس کے پیٹے میں تھا وہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں کراچی آیا تھا۔ پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اتنی عمر اس نے مختلف علاقوں اور بنگلوں کی چوکیداری کرتے ہوئے گزاری تھی۔ اس نے آج تک کراچی کے کسی بنگلے یا علاقے کے بارے میں یہ نہ سنا تھا کہ یہاں جن بھوت رہتے ہیں۔

آج اسے پہلی بار کسی نے بتایا تھا کہ۔ اس بنگلے میں جن کا سایہ ہے اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی تھی کہ وہ اس گھر سے دور رہے۔

یہ جن والی بات اس کے گلے سے ہر گز نہیں اتر رہی تھی وہ ایک مضبوط جسم اور مضبوط قوت ارادی کا مالک تھا۔ ضد کا پورا اور دھن کا پکا تھا۔

اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ وہ اس مکان سے ہر گز دور نہیں رہے گا بلکہ آس پاس رہ کر اس کا مشاہدہ کرے گا اور اگر ممکن ہوا تو وہ اس گھر کی دہلیز پھلانگ کر اندر چلا جائے گا۔ وہاں جا کر دیکھے گا کہ جن گھر کے کس کونے میں بیٹھا ہے۔

اسے یہ بات معلوم تھی کہ اندر سے پورا گھر کھلا ہوا ہے صرف مین گیٹ پر تالا پڑا ہے۔

گل خان کی سیدھی کھوپڑی میں جو الٹی بات سما گئی تھی، اب اسے نکالنے والا کوئی نہ تھا۔

اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط لاٹھی تھی جس سے وہ گلی کے کتوں کو دھمکایا کرتا تھا۔ یا پھر بجلی کے کھمبوں کو بجایا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح چور بھی ڈرے رہتے ہیں اور مکین بھی ہوشیار ہو جاتے ہیں لیکن یہ محض اس کا خیال تھا۔ اس کے کھمبوں کو بجانے کے باوجود چور اپنا کام کر جاتے اور مکین سوتے رہ جاتے۔

لاٹھی کے علاوہ اس کی واسکٹ کی جیب میں ایک لمبا سا چاقو بھی تھا۔ یہ چاقو اس کے پاس بہت عرصے سے تھا یہ چاقو بھی کسی چور پر استعمال نہیں ہوا تھا البتہ دن میں پھل اور سبزی کاٹنے کے کام ضرور آتا تھا۔

گل خان نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ وہ ایک غریب علاقے میں، ایک نیم پختہ مکان میں رہائش پذیر تھا۔ رات کی چوکیداری کے بعد وہ کوئی سات آٹھ بجے تک اپنے گھر پہنچتا پھر وہ آرام کے بعد شام کو اپنے علاقے سے نکل پڑتا مغرب کے وقت وہ اس علاقے میں آ جاتا جہاں کی چوکیداری اس کے ذمے تھی۔

اس علاقے میں ایک پان کا کھوکھا تھا۔ کلو پنواڑی سے اس کی اچھی خاصی دوستی تھی۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ کر کلو کے پاس آ بیٹھتا تھوڑی سی گپ شپ کے بعد وہ ایک ہوٹل سے رات کا کھانا کھاتا اور دوبارہ کلو کے پاس آ بیٹھتا پھر وہ اس وقت تک وہاں رہتا جب تک کلو اپنی دکان نہ بند کر جاتا۔ اس دکان کی

حافظ کی ذمہ داری بھی گل خان کی تھی۔ کلو کے دکان بند کر جانے کے بعد وہ موقع ہوتی ہوئی وہیں سے نماز نکل کر اپنے گھر میں وا اتا تھا اور لاٹھی پکڑ کر علاقے کا گشت شروع کر دیتا۔

بابو علی کا ناشتہ گھر، کلو پنواڑی کی دکان سے زیادہ دور نہ تھا اور کلو پنواڑی کی دکان خالی گھر کے نزدیک ہی تھی۔ نماز کو جاتے اور ہوٹل میں کھانا کھانے کیلئے اس خالی گھر کے سامنے سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس گھر کی روشنیاں گل خان کی نظر میں آگئی تھیں۔

بابو علی سے مل کر وہ سیدھا کلو کے پاس پہنچا۔ اس نے کلو سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ کلو یہ بات سن کر بولا۔ "گل خان، کیا فضول باتیں کرتے ہو آج کے زمانے میں جن بھوت کہاں اور وہ بھی بت بنا۔ یہاں کے بچے ہی اتنے شریر ہیں کہ شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ بھلا جن اس کے گھر میں کہاں رہے گا۔"

"لیکن کلو صاحب بولتا اوور جن اے تم اس گھر سے دور رہو۔" گل خان نے بحث کی۔

"اچھا، یہ بات ہے تو رات کو چلیں گے ادھر میں نے کبھی جن نہیں دیکھے ہیں میں بھی آج دیکھ لوں گا۔"

پھر گل خان اور کلو پنواڑی رات گئے تک اس موضوع پر بات کرتے رہے اور ہنستے رہے کبھی کوئی راہ گیر کھلی اوڑھے ادھر سے گزرتا تو کلو نعرہ لگاتا۔ "گل خان وہ دیکھ جن جارہا ہے۔"

آج خاصی سردی تھی۔ بادل اب بھی چھائے ہوئے تھے۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب کلو نے اپنی دکان بند کی اور پھر وہ دونوں خالی گھر کی طرف چل دیئے۔

کلو تقریباً اس کا ہم عمر تھا لیکن جسامت کے اعتبار سے اس کے ہم پلہ نہ تھا وہ دبلا پتلا تھا جبکہ گل خان اچھے قد کاٹھ کا آدمی تھا۔

وہ باتیں کرتے بالآخر خالی گھر کے سامنے پہنچ گئے۔

گھر کی ساری بتیاں روشن تھیں۔ گل خان نے پھاٹک کی جھری میں سے اندر جھانک کر دیکھا اس جھری میں سے جہاں تک نظر آرہا تھا، وہاں کوئی نہ تھا ہر سُو سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"اندر تو کوئی نظر نہیں آرہا۔"

"گل خان، گیٹ کو لاٹھی سے بجاؤ۔" کلو نے مشورہ دیا۔

گل خان نے فوراً اپنی لاٹھی سیدھی کی اور زور زور سے گیٹ پر مارنے لگا اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ سڑک پر دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گیٹ بجنے کی آواز دور تک گونج گئی۔

"بس، بس۔" کلو نے گل خان کو روکا۔ "ذرا ٹھہرو، اب اندر جھانک کر دیکھتے ہیں لیکن اس گیٹ سے کچھ نظر نہ آئے گا، دیوار کی طرف آجاؤ میں تمہیں سہارا دیتا ہوں، تم دیوار پر چڑھ جاؤ۔"

"ٹھیک اے۔" گل خان نے دیوار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

پھر وہ کلو کی مدد سے دیوار پر چڑھ گیا۔ اس نے دیوار پر بیٹھ کر دور تک دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے اندر کوئی نظر نہیں آیا اندر گھر کا دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں۔ لیکن پردوں کے پیچھے سے روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔

"کلو اوور تو کوئی بھی نہیں، دروازہ بند ہے۔"

"گل خان، شور مچاؤ، پوچھو اندر کوئی ہے۔"

گل خان نے کلو پنواڑی کی ہدایت پر نعرہ لگایا۔ "ارے، اندر کوئی اے۔ اے تو باہر آؤ۔"

"کوئی نکلا۔" کلو پنواڑی نے پوچھا۔

"نہیں۔ کلو، اور کوئی بدبخت نہیں نکلا۔" گل خان نے غصے کا اظہار کیا۔

"اچھا، پھر تم اندر کود جاؤ، اور اندر سے گیٹ کی کھڑکی کھول دو، پھر ہم دونوں اندر چلتے ہیں۔"

"اچا ٹھیک اے۔" یہ کہہ کر گل خان دیوار کے اس پار کود گیا پھر ادھر سے کوئی آواز نہ آئی۔

کلو پنواڑی فوراً گیٹ کی طرف بھاگا اور زور سے چیخا۔ "گل خان۔"

"آتا اے۔ آتا اے۔" گل خان کی اندر سے آواز آئی۔

"خیریت تو ہے۔" کلو پنواڑی نے پوچھا۔

"آں۔ وہ تو ہے، اور ہمارا قیاس کانٹوں میں پھنس گیا تھا۔" ادھر سے گل خان بولا۔

پھر کلو پنواڑی کو گیٹ کی کھڑکی کھولنے کی آواز آئی۔ کھڑکی کھول کر گل خان نے سر باہر نکالا اور کلو پنواڑی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آجاؤ اندر۔"

کلو پنواڑی نے خاصا جھک کر کھڑکی پار کی۔ گل خان نے کلو پنواڑی کے اندر آنے کے بعد کھڑکی بند کر کے چٹخنی لگا دی۔

اب دونوں نے گھر کے دروازے کی طرف رخ کیا۔ پختہ راستے پر جانے کے بجائے وہ دونوں لان میں داخل ہو گئے۔ لان کے درمیان اور اس کے اطراف میں پودے لگے ہوئے تھے۔ لان سے گزرنے کے بعد وہ گھر کے صدر دروازے پر پہنچے۔

دونوں نے خاموشی سے لان کراس کیا تھا اب بند دروازے کے سامنے پہنچ کر ان کے دل میں تھوڑی سی دھکڑ پکڑ شروع ہوئی۔ دروازہ بجانے کیلئے دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پہل کون کرے۔

پھر گل خان نے ہمت کی اس نے دروازے پر دستک دینے کیلئے ہاتھ رکھا تو دروازہ تھوڑا سا کھل گیا۔

اندر سے گلاب کے پھولوں جیسی خوشبو کا ایک تیز جھونکا آیا۔

"یہ خالی مکان میں گلابوں کی خوشبو؟" کلو پنواڑی نے سوال کیا۔

"اندر گلاب کے پودے رکھے ہوں گے۔" گل خان نے جواب دیا۔ "آؤ، اندر چلو۔"

دروازہ کھول کر وہ دونوں اندر داخل ہو گئے اندر روشنی تھی، راہداری میں قالین بچھا ہوا تھا، وہ دونوں قالین پر چلتے ہوئے اندر پہنچے۔ بائیں جانب ایک دروازہ تھا وہ بند تھا اس پر ہاتھ رکھا تو وہ کھل گیا گل خان نے اندر جھانکا۔

یہ ڈرائنگ روم تھا۔ خوبصورتی سے سجا ہوا، قالین اور قیمتی صوفوں سے آراستہ۔

پھر ایک ایک کر کے انہوں نے سارے کمرے جھانک لئے۔ سارے کمروں میں سامان تھا۔ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ گھر خالی ہوا ہے یہاں سے سارا سامان لے جایا جا چکا ہے۔

پورا گھر سجا ہوا تھا لیکن گھر میں کوئی نظر نہ آیا۔ اس گھر میں ایک دروازہ ایسا بھی تھا جو اندر سے بند تھا۔ ان لوگوں کے ہینڈل گھمانے کے باوجود وہ نہیں کھلا تھا۔ گل خان نے چابی کے سوراخ میں سے اندر جھانک کر دیکھا لیکن اندر کچھ نظر نہ آیا اندر شاید اندھیرا تھا۔

پھر ان لوگوں نے اس بند دروازے کو چھوڑ کر کچن کا رخ کیا وہاں چولہے پر ایک دیگچی رکھی ہوئی تھی اس میں سالن تھا۔ مرغی پکی ہوئی تھی۔ ایک رومال میں چند روٹیاں تھیں۔ کچھ جھوٹے برتن سنک میں پڑے تھے۔ ایک کپ رکھا تھا جس میں تھوڑی سی چائے تھی۔ غرض باورچی خانہ یہ بتا رہا تھا کہ اس گھر میں مکین موجود ہے لیکن گھر میں کوئی دکھائی نہ دیا تھا۔

گل خان اور کلو کے لئے یہ ساری چیزیں حیرت کا باعث تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے نظروں ہی نظروں میں سوال جواب کر رہے تھے۔

ٹاہلوں میں نہیں آ رہا تھا کہ جب یہ گھر خالی کر دیا گیا تھا تو اس میں سامان کہاں سے آیا اور سب سے حیران کرنے والی بات یہ تھی کہ باورچی خانے میں کھانے پینے کی اشیاء کیسے موجود تھیں۔ کچن میں کھانا ہوا فریج بھی کھانے پینے کے لوازمات سے بھرا ہوا تھا۔

فریج میں رکھے ہوئے لال لال سیب دیکھ کر کلو پنواڑی کا جی مچل اٹھا۔ اس نے ایک سیب نکال لیا اور اس میں منہ مار اسیب کاٹنے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے مٹی کھالی ہو۔ اس نے فوراً تھوک دیا اور اس کھائے ہوئے سیب کو واپس فریج میں رکھ دیا۔

"کیوں کیا ہوا؟" گل خان نے پوچھا۔

"سیب ہے یا مٹی کا ڈلا۔" کلو تھوکتا ہوا بولا۔

"ایسے کیسے ہو۔" گل کو یقین نہ آیا۔

"چکھ کر دیکھ لو، تمہیں یقین آجائے گا۔" کلو نے پیشکش کی۔

گل خان نے سیب چکھا تو اسے بھی یہی احساس ہوا جیسے مٹی کھا رہا ہو اس نے فوراً تھوک دیا اور بولا۔

"بدبخت یہ سیب کیسا ہے۔"

"گل خان، میرے خیال سے یہاں سے نکل لو۔" کلو پنواڑی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟" گل خان نے پوچھا۔

"نہیں، ڈر کیسا؟" کلو پنواڑی نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر وہ دونوں کچن سے نکل آئے۔ ٹی وی لاؤنج میں پہنچے۔ ٹرالی پر ایک نیا چمکتا ہوا ٹیلیویژن رکھا تھا اور ٹرالی کے ایک خانے میں وی سی آر بھی موجود تھا۔

کلو پنواڑی آگے بڑھ کر دونوں چیزوں کو دیکھنے لگا۔

اسی وقت "میاؤں" کی آواز آئی۔

دونوں نے چاروں طرف نظر دوڑائیں لیکن دکھائی کچھ نہ دیا۔

چند لمحوں بعد پھر "میاؤں" کی آواز آئی۔ یہ آواز نزدیک ہی سے آئی تھی۔

"یہ آواز تو بلی کی ہے لیکن بلی کہیں نظر نہیں آ رہی۔" کلو پنواڑی نے کہا۔

گل خان نے ٹرالی کے پیچھے جھانکا صوفے کے نیچے دیکھا لیکن انہیں کچھ نظر نہ آیا۔

"میاؤں، میاؤں" کی آواز بدستور آ رہی تھی۔

"اوے، بدبخت تو کدر اے، سامنے آ۔" گل خان نے زور سے کہا۔

گل خان کو اگر یہ معلوم ہوتا کہ وہ اس کو بدبخت کہہ کر اپنی بدبختی کو آواز دے رہا ہے تو وہ کبھی ایسا نہ

کرتا۔ خاموشی سے کلو پنواڑی کو اس گھر سے لے کر نکل جاتا اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرتا۔ تب وہ ٹرالی کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ اس نے اپنی لال انگارہ آنکھوں سے اسے گھور کر دیکھا اور بولا۔ "میاؤں" اس آواز میں بڑی دہشت تھی۔

"کالا بلا۔" کلو پنواڑی کی اس پر نظر ڈالی تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "یہ یہاں چھپا ہوا تھا۔" وہ کالا بلا۔ اب ٹرالی سے نکل کر سامنے آچکا تھا۔ اس نے قالین پر اپنی اگلی دونوں ٹانگوں پر جم کر انگڑائی لی اور پھر اس نے اپنی نظریں گل خان پر جما دیں۔

گل خان بڑے دل گردے کا مالک تھا۔ اس نے ڈرنا سیکھا ہی نہ تھا لیکن اس وقت کالے بلے کی آنکھیں دیکھ کر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈ اترنے لگی۔ یا الٰہی یہ کیسا بلا ہے۔

اب کالے بلے نے گل خان کو دیکھ کر غرانا شروع کیا اس کی غراہٹ خوف میں مبتلا کر دینے والی تھی پھر اچانک ہی اس نے گل خان پر چھلانگ لگائی اور اس کے کندھے پر سوار ہو گیا۔

گل خان کو توقع نہ تھی کہ اس میں اتنا وزن ہو گا اس کے اندر گدھے برابر وزن تھا۔ گل خان اس کا وزن برداشت نہ کر سکا وہ پیچھے کی طرف گرا۔ کالے بلے نے گل خان کے گرتے گرتے اس کے دائیں کان کی طرف اپنا منہ بڑھایا اور اس کا کان بھنبھوڑ کر رکھ دیا۔

گل خان تکلیف کی شدت سے چیخا اور پھر اٹھ کر بھاگا۔ گل خان کا یہ حشر دیکھ کر کلو پنواڑی کی حالت پتلی ہو گئی وہ بھی گل خان کے ساتھ دروازے کی طرف بھاگا۔

کلو کو بھاگتے دیکھ کر کالے بلے نے اس پر بھی چھلانگ لگائی اور اس کا بھی وہی حشر کیا جو گل خان کا کیا تھا۔ اس کا کان بھی بھنبھوڑ کر اس کے جسم سے الگ کر دیا۔

کلو پنواڑی، کالے بلے کے وزن کی وجہ سے منہ کے بل زمین پر گرا اور پھر اٹھ کر بھاگا۔

گل خان آگے تھا، وہ اپنے کٹے کان پر ہاتھ رکھے بہت تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ اب اسے یقین آگیا تھا کہ اس مکان کے مالک نے اس سے سچ کہا تھا کہ اس گھر میں آسیب ہے اس سے دور رہنا۔ اب دونوں کو پتہ چل گیا تھا کہ آسیب کیا ہوتا ہے۔ جن بھوت کا سایہ کیسے کاٹتے ہیں۔

وہ چاہ رہے تھے کہ کوئی سواری مل جائے تو کسی طرح اسپتال پہنچ جائیں۔

ایک گشتی پولیس وین ادھر سے گزر رہی تھی پولیس پارٹی نے دو بندوں کو بگٹٹ بھاگتے دیکھا تو گاڑی ان کے سروں پر جا کر روک دی اور ایک پولیس والے نے للکارا۔ "خبردار۔ جو بھاگنے کی کوشش کی۔" وہ دونوں فوراً رک گئے۔ وہ جانتے تھے اگر وہ دونوں نہ رکے تو یہ لوگ ان کا جن سے بھی برا حشر کریں گے۔

"اوئے، تم لوگ واردات کر کے بھاگے ہو۔" پولیس والے نے للکارا۔

"ناجی نا۔ تھانے دار جی، میں کلو پنواڑی ہوں، نزدیک ہی میرا پان کا کھوکھا ہے۔ یہ گل خان ہے اس علاقے کا چوکیدار۔ ہم شریف لوگ ہیں جی۔"

"اوئے۔ آج کل شریف لوگ ہی واردات کرتے ہیں اور یہ تم دونوں نے اپنے کانوں پر کیوں ہاتھ رکھے ہوئے ہیں ذرا اپنے ہاتھ تو ہٹاؤ۔" پولیس والے نے غصے سے کہا۔

اور جب دونوں نے اپنے کان سے ہاتھ ہٹائے تو وہاں کان ہی نہ تھے اور خون تیزی سے نکل رہا تھا۔

"اوئے۔ یہ کیا ہوا؟"

تب ان دونوں نے گھبرا گھبرا کر ہونے والے واقعہ کی تفصیل بیان کی۔

ان دونوں کے بیان کے مطابق ایک کالے بلّے نے ان پر حملہ کر کے ان کے کان کاٹے تھے اور وہ بلّے کی چھوٹی کھڑکی سے باہر آئے تھے۔

لیکن جب پولیس وین خالی گھر کے گیٹ پر پہنچی تو وہ چھوٹی کھڑکی اندر سے بند ہو چکی تھی اس کے علاوہ وہ مکان اب تاریکی میں ڈوب چکا تھا کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس مکان میں کوئی رہائش پذیر ہے۔ گیٹ پر پرانا تالا بدستور بند تھا۔

پولیس پارٹی نے ان دونوں "جھوٹوں" کو اپنی وین میں ڈالا، اسپتال سے ان کی مرہم پٹی کروائی اور تھانے کے لاک اپ میں بند کر دیا۔

وہ دونوں رات بھر حوالات ایک کونے میں پڑے کراہتے رہے۔ اپنی قسمت کو کوستے رہے اور سوچتے رہے کہ انہوں نے خواہ مخواہ خالی گھر پر شک کر کے خود کو عذاب میں مبتلا کر لیا۔ اگر اس گھر کی بجلیاں رات کو خود بخود جل جاتی تھیں یا صبح کو اندر سے فرش دھوئے جانے کی آوازیں آتی تھیں اور پانی بہہ کر گیٹ سے باہر آتا تھا تو آتا رہتا۔ بجلی جلتی بجھتی رہتی۔ اس کا کام چوکیداری تھا۔ وہ نمرانی کرتا رہتا۔ ایک ذرا سے تجسس نے گل خان کو ایک کان سے محروم کر دیا اور ساتھ ہی اس نے اپنے دوست کو بھی مروایا۔ کلو بیچارہ بھی مفت میں کن کٹا ہو گیا۔

بچارے ہوئی تو ان دونوں کو تھانے کے انچارج کے سامنے پیش کیا گیا۔

تھانے کا انچارج معصوم علی شاہ محض نام کا معصوم تھا لوگ اسے "ظالم شاہ" کے نام سے یاد کرتے تھے اس کے ظلم کی داستانیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اصل مجرموں پر ہاتھ نہ ڈالتا۔ اگر غلطی سے پکڑے جائیں تو ان کی پیٹھ پر تھپکی دے کر بھگا دیتا اور معصوم لوگوں کو پکڑ کر اپنی کارکردگی میں اضافہ کرتا۔ اس کا شعار تھا وہ ایک انتہائی اکھڑ مزاج اور سخت گیر شخص تھا۔ اس کے ماتحت اس کے سامنے تھر تھر کانپتے تھے اور پیٹھ پیچھے اس کو دل کھول کر گالیاں دیتے تھے۔

معصوم علی شاہ کا جبڑا ہمہ وقت سختی سے بند رہتا تھا اس نے مسکرانا کبھی سیکھا ہی نہ تھا یوں بھی پولیس کو بھلا مسکرانے کی کیا ضرورت ہے۔ پولیس اگر مسکرائے گی تو مجرموں کو تو پھر کھلی چھٹی مل جائے گی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہر پولیس والے کو بطور خاص ہدایت کی جاتی ہے، تھانے میں آنے والے ہر شخص کو شیر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ منہ سختی سے بند رکھا جائے اور جتنی بے عزتی ممکن ہو۔ وہ فوراً کر دی جائے۔

معصوم علی شاہ کا موڈ آج صبح ہی صبح خراب ہو گیا تھا۔

کرسی پر بیٹھتے ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلیفون کی گھنٹی معصوم علی شاہ کے لئے کسی صور اسرافیل سے کم حیثیت نہ رکھتی تھی۔ ادھر پہلی گھنٹی بجی اور ادھر اس نے ریسیور جھپٹ کر اٹھایا۔ وہ پہلی گھنٹی کو بھی پورا نہ ہونے دیتا تھا۔ حسب معمول اس وقت بھی اس نے ٹیلیفون پر جھپٹا مارا۔

"ہالو۔" وہ ہیلو اس انداز میں کھینچ کر اور اتنے زور سے کہتا کہ پورا تھانہ گونج اٹھتا۔

"جمعہ بازار۔" ادھر سے کسی نے تمسخر سے کہا۔

"اوئے۔ یہ تانوں جمعہ بازار لگدا اے۔ اے تھانڑاں، تھانڑاں اے۔" یہ کہہ کر معصوم علی شاہ نے

زور سے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور ٹیلیفون کرنے والے کو ایک زوردار گالی دی۔

پندرہ لمحوں بعد ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجی معصوم علی شاہ نے جھپٹ کر ریسیور اٹھایا اور چیخا۔ "ہلو"

"آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟" ادھر سے بڑی ملائمت سے پوچھا گیا۔

"ابے تو نے کہاں فون کیا ہے چومن چڑ آں۔ ناہوں اوئے۔" معصوم علی شاہ دھاڑا۔

"میں نے تو جناب پاکی خانے فون کیا ہے۔" ادھر سے پھر بڑی رسانیت سے جواب آیا۔

پاکی خانے کا نام سن کر معصوم علی شاہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی اس نے غصے میں فون رکھنے والے کو دو نہیں بھری بھری گالیاں دیں پھر فون بند کر دیا۔

لیکن ادھر سے جو فون کر رہا تھا شاید اس نے قسم کھالی تھی کہ آج معصوم علی شاہ کا بلڈ پریشر کسی قیمت پر نارمل نہیں ہونے دے گا۔ اس نے فون بند ہوتے ہی پھر دوبارہ رنگ کیا۔

معصوم علی شاہ کی میز پر رکھا ہوا ٹیلیفون پھر چیخا۔

"ہلو۔" معصوم علی شاہ نے حسب معمول پورا اخبار سر پر اٹھا لیا۔

"ہاں۔ بھئی گینڈے آپ کے کیا حال ہیں؟" ادھر سے بہت محبت سے پوچھ گیا۔

اگرچہ معصوم علی شاہ کا ڈبل ڈول کسی گینڈے جیسے ہی تھا لیکن وہ یہ سن کر بپھر اٹھا۔ اس نے ہونٹ نکال لیے اور ریوالور کی نال منہ تک پیس کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ "میں تجھے شوٹ کر دوں گا۔"

جواب میں ادھر سے قہقہہ سنائی دیا۔

قہقہہ سن کر معصوم علی شاہ بالکل ہی بے قابو ہو گیا اس کے منہ سے گالیاں، گولیوں کی طرح نکلنے لگیں پھر اس نے فون بند کر دیا۔

"اوئے بالے۔" معصوم علی شاہ نے آواز دی۔

بہر کھڑا سپاہی اقبال شیخ فوراً چست اٹھ کر اندر آیا اٹینشن ہو کر اس نے سیلوٹ مارا اور مؤدبانہ انداز میں بولا۔ "جی سر۔"

"بالے ابھی فون کی گھنٹی بجے گی، کوئی کتے کا بچہ کئی دن سے فون پر پریشان کر رہا ہے ذرا اس کو دو چار کراری کراری سنا دینا۔" معصوم علی شاہ نے اسے ہدایت کی اور میز پر سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر سگریٹ سلگانے لگا۔

سگریٹ سلگا کر اس نے ابھی ایک کش ہی کھینچا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

معصوم علی شاہ نے اسے آنکھ سے اشارہ کیا اقبال شیخ نے ریسیور اٹھاتے ہی ٹیلیفون کرنے والے کو ایسی ایسی گالیاں سنائیں کہ معصوم علی شاہ کا دل خوش ہو گیا۔ اس نے تعریفی نظروں سے اقبال شیخ کو دیکھا۔

لیکن پھر جانے کیا ہوا کہ اقبال شیخ کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہونے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ریسیور کانپنے لگا اور وہ۔ "جی سر، سوری سر۔" کی گردان کرنے لگا۔

بالے کو سیدھا ہوتے دیکھ کر معصوم علی شاہ کی حالت بھی پتلی ہو گئی اسے اندازہ ہو گیا کہ کس کا فون ہے اور اقبال شیخ نے جو نئی نئی گالیاں سنائی ہیں۔ ان کا سامع کون ہے اور اگلے چند لمحوں میں کیا ہونے والا ہے۔

پھر اس نے کانپتے ہاتھوں سے ریسیور معصوم علی شاہ کی طرف بڑھایا۔ "بڑے صاحب کا فون۔ بات کریں۔"

معصوم علی شاہ نے ریسیور ہاتھ میں پکڑ کر، کمزے ہو کر سلیوٹ مارا اور مودب ہو کر بولا۔ "یس سر"

اسے معلوم تھا کہ اس "یس سر" کے جواب میں اسے کیا سننا پڑے گا۔ "بڑے صاحب" نے دوسرے جو کچھ کہا، وہ اسے تلخ گھونٹ سمجھ کر پیتا رہا۔ بڑے صاحب بہت غصے میں تھے انہوں نے معصوم علی شاہ کو دل کھول کر سنائیں اور پھر غصے میں فون بند کر دیا۔ انہوں نے کیوں فون کیا تھا، یہ بھی نہ بتایا۔

یہی وجہ تھی کہ آج صبح ہی صبح معصوم علی شاہ کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

جب گل خان اور کلو پنواڑی کو معصوم علی شاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ اپنے ماتحت پر برس پڑا اور جانے اسے کیا کیا سنا ڈالیں۔ جب غصہ تھوڑا ٹھنڈا ہوا، بلڈ پریشر کا گراف نیچے آیا تو اس نے کلو اور گل خان کے چہروں پر نظر ڈالی۔

"ان بندروں کو کہاں سے لائے ہو؟" معصوم علی شاہ نے اپنے ماتحت پولیس افسر نادر حسین سے پوچھا۔

"سر جی۔ رات کے گشت پر یہ دونوں ہاتھ آئے ہیں۔ چور ہیں؟"

"نہیں جی، ہم لوگ چور نہیں ہیں۔" کلو نے فوراً کہا۔

"اوئے چپ۔" معصوم علی نے آنکھیں نکالیں۔ "تجھ سے کس نے کہا ہے بولنے کو۔ ہاں، نادر، ان بندروں نے کیا چرایا ہے، چوری کا مال کدھر ہے۔"

"ہم بندر نہیں ہیں، انسان ہیں۔" اس مرتبہ گل خان بولا۔ "ام نے کوئی سامان نہیں چرایا۔"

"اوئے، ایسے ہوتے ہیں انسان۔ تمہارے جیسے انسان ہونے لگیں تو پھر بندروں کا کیا بنے گا۔" معصوم علی شاہ نے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ اپنے خیال میں اس نے کوئی زبردست بات کہی تھی۔

"نادر، کیا کیس ہے؟" معصوم علی شاہ نے اپنا بے ہنگم قہقہہ روک کر پوچھا۔

نادر نے ان دونوں کو جس طرح پکڑا تھا، انہوں نے جو بیان دیا تھا اور خالی گھر میں اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ سب معصوم علی شاہ کو تفصیل سے بتایا اور آخر میں بولا۔ "ان دونوں کا بیان ہے، ان کے کان کالے بلّے نے کاٹے ہیں اور وہ کالا بلا ان کے خیال کے مطابق کوئی جن ہے، جس نے اس گھر پر قبضہ کر لیا ہے اور مالک مکان کو کرائے کے گھر میں رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"اوئے، یہ کیا بکواس ہے۔" معصوم علی شاہ اپنے ماتحت پر گرجا۔ "تمہیں تو فوراً لائن حاضر کر دینا چاہئے۔ پولیس میں ہو کر تم نے ان بندروں کے بیان پر یقین کر لیا۔"

"ام بندر نہیں ہیں۔" گل خان نے پھر تردید کی۔

"بیان تو تم لوگوں نے بندروں جیسا دیا ہے، انتہائی جانورانہ۔ اوئے تمہارے بیان پر محض ہنسا جا سکتا ہے یقین نہیں کیا جا سکتا۔" معصوم علی شاہ یہ کہہ کر ہنسا۔

"پہلے ہمارا بھی یہی خیال تھا۔ اس مکان میں کوئی آسیب، جن بھوت نہیں ہے۔ آج سے سات سال پہلے بھلا جن بھوت کہاں؟ اور اسی جنتس کے مارے ہم اس گھر میں داخل ہوئے تھے۔ وہاں ہمارا یہ حشر ہوا کہ ہم کان سے محروم ہو گئے۔" کلو نے بڑے افسوس سے کہا۔

"لیکن تم لوگوں کا بیان تھا کہ تم لوگ اس گھر کے گیٹ کی چھوٹی کھڑکی سے باہر آسیب اور اس گھر میں تمام لائٹیں جل رہی تھیں لیکن جب ہم نے چیک کیا تو گیٹ کی کھڑکی اندر سے بند تھی اور گھر کی کوئی لائٹ بھی روشن نہ تھی۔"

"ہم نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے۔ آپ کو یقین نہیں تو اس پنگلے کے مالک بابر علی صاحب سے پوچھ لیجئے۔ انہوں نے مجھ خان کو اس گھر سے دور رہنے کی ہدایت کی تھی لیکن وہ تو ہم دونوں کی مشترکہ ملکیت تھی کہ تصدیق کرنے کیلئے اس گھر میں کود گئے۔" کلو پنواڑی نے کہا۔

"اوئے نادر، ان بندروں کو پاگل خانے پہنچا، انہیں تھانے کیوں لے آیا۔" معصوم علی شاہ نے اپنے ماتحت افسر کو غصے سے دیکھا۔

"سر جی، آپ اجازت دیں تو میں اس گھر کے مالک بابر علی کو تھانے بلوالوں۔" نادر حسین نے معصوم علی شاہ کے غصے کی پروا نہ کی۔ اس کی ذہن میں تجسس جاگ گیا تھا، وہ اس کیس کی حقیقت کو جاننا چاہتا تھا۔

"کیا تو سمجھتا ہے، اس گھر میں واقعی کوئی سایہ وایہ ہے۔" معصوم علی شاہ نے نادر حسین کو بڑی حیرت سے دیکھا۔

"سر جی، اس کیس سے مجھے دلچسپی ہو گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ....."

"اوئے، بے وقوفا، ایسے خشک کیس سے دلچسپی لین دا کی فائدہ۔ کوئی ایسا کیس پکڑ جس میں چار پیسے بننے کا امکان ہو۔" معصوم علی شاہ یہ کہہ کر اپنی کرسی سے اٹھا اور باتھ روم کی طرف چلا گیا۔

نادر حسین ذرا مختلف پولیس والا تھا اسے کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے آسیب، جن بھوت اور چڑیلوں سے متعلق بہت کہانیاں پڑھی تھیں لیکن دیکھا کچھ نہیں تھا۔ ان کہانیوں کو اس نے محض کہانیاں سمجھ کر ہی پڑھا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ایک دن یہ کہانیاں حقیقت کا روپ دھار کر اس کے سامنے آجائیں گی۔

نادر حسین کو گل خان اور کلو کے بیان پر یقین نہ تھا لیکن انہوں نے بابر علی کے بارے میں جو بیان دیا تھا اس سے حقیقت کا کچھ اندازہ ہونے کا امکان تھا۔

اس نے گل خان اور کلو کو تھانے کے لاک اپ میں ڈالا اور ان سے بابر علی کا پتہ لے کر دو سپاہیوں کو بابر علی کے گھر کی طرف روانہ کر دیا۔

دونوں سپاہی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر بابر علی کے گھر پہنچے ایک سپاہی نے موٹر سائیکل سے اتر کر گھر کی گھنٹی بجائی جبکہ دوسرا سپاہی موٹر سائیکل پر بیٹھا رہا۔

کچھ دیر کے بعد گھر کا گیٹ کھلا، راشدہ نے باہر جھانکا تو گیٹ پر پولیس دیکھ کر وہ ڈر جھجکی وہ فوراً پیچھے ہو گئے۔ تب اس سپاہی نے کہا۔ "بی بی، بابر صاحب کا مکان یہی ہے۔"

"ہاں جی، یہی ہے۔" راشدہ نے جواب دیا۔

"یہاں وہ گھر ہیں۔" سپاہی نے پوچھا۔

"جی ہاں، ہیں۔" راشدہ نے کہا۔

"ذرا انہیں باہر بھیجیں۔" سپاہی بولا۔

راشدہ یہ سن کر گھبرائی ہوئی اندر پہنچی باہر اس وقت شور وم جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اکبر اپنے ایک بیگ کے گھر جا چکا تھا۔

"راشدہ کون ہے دروازے پر۔" بابر علی نے پوچھا۔

"ابو۔۔۔ پولیس والے ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں۔" راشدہ نے بتایا۔

"پولیس والے۔" بابر علی نے حیرت سے کہا۔ "مجھے بلا رہے ہیں۔ اچھا میں دیکھتا ہوں۔"

بابر علی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پولیس والے اس کے دروازے پر کیوں آئے ہیں، گیٹ پر پہنچ کر اس نے اپنا تعارف کروایا۔ "میرا نام بابر علی ہے۔ فرمایئے کیا کام ہے آپ کو مجھ سے۔"

"بابر صاحب آپ کو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔ صاحب نے بلایا ہے۔" اس سپاہی نے بڑے مودبانہ لہجے میں کہا۔

"تھانے۔" بابر علی حیرت زدہ رہ گیا۔ "آخر کیوں؟"

"یہ تو آپ کو تھانے چل کر ہی پتہ چلے گا؟" سپاہی نے جواب دیا۔

"کسی نے میرے خلاف کوئی رپورٹ درج کرائی ہے؟" بابر نے پوچھا۔

وہ سپاہی جو موٹر سائیکل پر ذرا دور کھڑا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے بابر علی کے قریب آیا اور بولا۔

"میں آپ کو بتاتا ہوں چکر کیا ہے؟"

"جی بتائیں۔" بابر علی نے کہا۔

"اصل میں آپ کا چوکیدار میرا مطلب ہے آپ کے علاقے کا چوکیدار پکڑا گیا ہے۔ میں گل خان کی بات کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ کلو پنواڑی بھی ہے۔ وہ کل رات آپ کے خالی گھر سے خون میں نہائے ہوئے بھاگ رہے تھے کہ پکڑے گئے انہوں نے جو بیان دیا ہے اس پر کسی کو یقین نہیں آرہا آپ کو تفتیش کے لئے بلایا گیا ہے بس اتنی سی بات ہے۔" اس سپاہی نے سمجھایا۔

یہ سن کر بابر علی کی جان میں جان آئی اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں اندر سے اپنی گاڑی کی چابی لے آؤں۔"

کچھ دیر کے بعد دونوں سپاہی موٹر سائیکل پر آگے اور بابر علی اپنی کار میں پیچھے چل رہا تھا۔ دس منٹ کے بعد وہ تھانے کی حدود میں داخل ہوگئے۔

ناور حسین، بابر علی کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا جب بابر علی اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اس سے بڑے تپاک سے ملا۔ اس نے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھنے کی پیشکش کی۔

بابر کے بیٹھ جانے کے بعد اس نے ساتھ آئے سپاہیوں سے کہا۔ "ذرا ان دونوں کو بھیجو۔"

چند لمحوں بعد گل خان اور کلو پنواڑی کمرے میں داخل ہوگئے۔ گل خان نے بابر علی کو دیکھا تو وہ اس کی طرف لپکا اور بولا۔ "صاب جی، آپ آگئے، صاب جی آپ انہیں بتاؤ کہ ام چور نہیں ہے۔"

"ہاں، گل خان میں جانتا ہوں کہ تم چور نہیں ہو۔" بابر علی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تم فکر نہ کرو، اب میں یہاں آ گیا ہوں، تمہارے بارے میں جو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ وہ میں دور کر دوں گا۔ مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے اور یہ تم دونوں کے کان پر پٹی کیوں بندھی ہے؟"

"صاحب جی، اس کالے بلے نے ہمارے کان کاٹ لئے۔" اس مرتبہ کلو پنواڑی بولا۔

"کالے بلے نے؟" بابر علی نے حیرت ظاہر کی۔ "کیا تم لوگ مکان میں داخل ہوئے تھے اگر لوگوں نے ایسا کیا ہے تو سخت غلطی کی۔ گل خان میں نے تو تمہیں اس مکان سے دور رہنے کو کہا تھا، تم نے کیا؟"

تب گل خان اور کلو پنواڑی نے ایک ایک بات تفصیل سے بتائی۔

نادر حسین بالکل خاموشی سے ان دونوں کا بیان سنتا رہا۔ یہ وہی بیان تھا جو وہ دونوں رات سے رہتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے چپ ہونے کے بعد نادر حسین نے ان دونوں کو پکڑنے کی تفصیل بتائی اس کے بعد بابر علی سے مخاطب ہوا۔ "یہ کیا معاملہ ہے؟"

بات کیونکہ کافی آگے بڑھ چکی تھی، اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ بابر علی ساری کہانی دہراتے۔ ایک ایک بات بتا دے اس نے کہا۔ "جناب، یہ ایک لمبی کہانی ہے؟"

"لیکن میں پھر بھی تمام واقعات جاننا چاہوں گا۔" نادر حسین نے کہا۔

"گل خان کو میں نے اس خالی گھر کے بارے میں سرسری سا بتایا۔ بس اتنا ہی کہ وہ گھر آسیب زدہ ہے وہ اس سے دور رہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ بات سن کر اسے جوش چڑھ جائے گا اور میری بات کی تصدیق کرنے کے لئے یہ میرے گھر میں داخل ہو جائے گا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ ایسا کرنے والا ہے تو میں اسے ذرا تفصیل سے بتا دیتا۔ اس کالے بلے کی خوفناک داستان سنا دیتا جس نے ہمارے گھر کو اجاڑ دیا ہے، ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔"

"بابر صاحب، تمہید اب کافی ہو گئی، آپ اب اصل معاملے پر آئیں۔" نادر حسین نے بابر علی کو ٹوکا۔

"یہ کہانی میں آپ کو صرف تنہائی میں سناؤں گا۔" بابر علی بولا۔

"ٹھیک ہے، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔" یہ کہہ کر نادر حسین نے ایک سپاہی کو آواز دی۔ گل خان اور کلو پنواڑی کو باہر لے جانے کو کہا اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ جب تک میں بلاؤں کوئی کمرے میں داخل نہ ہو۔

تنہائی میسر آنے کے بعد بابر علی نے اپنی کہانی شروع کی یہ کہانی ٹرین سے شروع ہوئی۔ ٹرین میں کالے بلے کی آمد، لاہور میں عجیب و غریب واقعات کا پیش آنا، نیلم اور اکبر کی شادی میں طرح طرح کی رکاوٹیں، پھر شادی کا جیسے تیسے ہونا، بارات کی کراچی واپسی، خوفناک واقعات کی ابتداء، نیلم کی کہانی، وہ کس کی بیٹی ہے، سید پور کس طرح پہنچی، کس طرح جن اس پر عاشق ہوا اور اس نے اکبر کو کس کس طرح پریشان کیا۔ یہاں تک گھر بھی خالی کروا لیا۔

نادر حسین بت بنا سارے واقعات کو بڑی دلچسپی اور غور سے سنتا رہا۔ وہ پولیس والا تھا، شک و شبہ اس

کی بھی ہاں پڑا تھا۔ تفتیش اس کے خون میں شامل تھی۔ واقعات سننے کے بعد اس نے بے شمار سوالات کیے اور جب اسے یقین ہو گیا کہ بابر علی نے جو کچھ کہا ہے وہ حقائق پر مبنی ہے، اس نے سچ بولا ہے تو وہ معصوم علی شاہ کے کمرے میں پہنچا۔

معصوم علی شاہ کو اس انداز سے رپورٹ پیش کی کہ وہ اکھڑ مزاج پولیس افسر جو اپنے خیالات اس پر مسلط کرنا چاہتا تھا، ان واقعات کو سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ معصوم علی شاہ جن بھوت پر ذرہ بھر بھی یقین نہ تھا۔ وہ خود اپنے آپ کو جن بھوت کہا کرتا تھا۔

"ہم پولیس والوں سے تو شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ جن بھوت کی تو حقیقت ہی کیا۔"

معصوم علی شاہ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "نادرے۔ تو کی جانا۔"

"شاہ جی، ایک مظلوم لڑکی اس خالی گھر میں قید ہے، ہمیں اس کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔ یہ تو سیدھا سیدھا اغوا کا کیس ہے۔"

"چل پھر تیار ہو جا۔" معصوم علی شاہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کس لئے شاہ جی۔" نادر حسین نے پوچھا۔

"تفتیش پر چلتے ہیں، میں نے کبھی جن نہیں دیکھا، آج چل کر دیکھ لیتا ہوں۔ نادرے تو بھی کیا یاد کرے گا کہ کیسے اعلیٰ افسر سے تیرا واسطہ پڑا تھا۔" یہ کہہ کر معصوم علی شاہ نے اپنا ریوالور چیک کیا اور کرسی سے اٹھ گیا۔

نادر حسین کو توقع نہیں تھی کہ معصوم علی شاہ اس کی رپورٹ سن کر اس قدر بے تاب ہو جائے گا خود ہی تفتیش پر چل دے گا وہ تو خود تفتیش پر جانے کے لئے معصوم علی شاہ سے اجازت لینے آیا تھا۔ معصوم علی شاہ کی دلچسپی دیکھ کر اسے خوشی ہوئی۔

دس منٹ کے اندر اندر وہ لوگ تھانے سے نکل گئے۔

اس مرتبہ بابر علی اپنی گاڑی میں آگے تھا۔ معصوم علی شاہ اور نادر حسین چار سپاہیوں سمیت اپنی پولیس وین میں پیچھے تھے۔ کوئی دس بارہ منٹ بعد بابر علی نے اپنی گاڑی، خالی گھر کے سامنے روک لی۔

بابر علی گاڑی سے اتر کر گھر کے گیٹ کی طرف آیا، اتنے میں پولیس پارٹی بھی اپنی گاڑی سے اتر کر گیٹ پر پہنچ چکی تھی۔

معصوم علی شاہ نے اس خالی گھر کو بغور دیکھا اور بولا۔ "اے وے جن باشا کی رہائش۔ اوئے مکان تو جن باشا نے اچھا پکڑا ہے۔"

بابر علی خاموش رہا اس نے کوئی رائے نہ دی۔

"شاہ جی مکان ہی نہیں، اس نے لڑکی بھی اچھی پکڑی ہے۔ نیلم بہت خوبصورت لڑکی ہے؟"

"اوئے نادرے، تانوں کی پتہ۔"

"مجھے بابر صاحب نے بتایا ہے۔"

"اچھا، پھر تالا کھولو۔" معصوم علی شاہ نے ڈنڈے سے تالے کو ہلایا۔ "چابی کدھر ہے؟"

بابر علی گھر سے چلا تھا تو اس نے احتیاطاً گھر کی چابی اپنی جیب میں ڈال لی تھی اس نے تالا خود کھولنے

کے بجائے چابی نادر حسین کی طرف بڑھائی۔ "یہ ہے جی۔ چابی۔"

نادر حسین نے مسکراتے ہوئے چابی بابر کے ہاتھ سے لے لی اور بولا۔ "لائیے میں کھولتا ہوں۔"

نادر حسین نے آگے بڑھ کر تالے میں چابی ڈالی اور دائیں جانب گھمائی چابی فوراً گھوم گئی۔ نادر نے تالا کنڈے سے نکال کر بابر علی کے حوالے کیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے گیٹ کو ایک طرف دھکا دیا۔ گیٹ کے دونوں پٹ تیزی سے کھلتے چلے گئے۔

سب سے پہلے مکان کے احاطے میں معصوم علی شاہ نے قدم رکھا پھر بابر اور نادر ساتھ ساتھ تھے۔ ان کے بعد چاروں سپاہی داخل ہوئے۔

نادر حسین نے پیچھے پلٹ کر ایک سپاہی کو حکم دیا۔ "گیٹ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دو۔"

"میرا خیال ہے کہ گیٹ بند ضرور کروا دیں لیکن کنڈا نہ لگائیں۔" بابر علی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ارے۔ بابر صاحب آپ تو خاصے ڈرے ہوئے ہیں آپ فکر نہ کریں ہم تو آپ کے ساتھ ہیں۔ ہمیں دیکھ کر تو شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ جن بھوت کیا چیز ہیں۔" پھر معصوم علی شاہ، سپاہی سے مخاطب ہوا۔ "اچھا ٹھیک ہے صرف گیٹ بند کر دو، کنڈی نہ لگانا۔"

"جی، سر۔" سپاہی نے کہا اور گیٹ بند کر دیا۔

"اوے کون کیندا اسی کہ اس گھر کا فرش صبح صبح دھلتا ہے۔ یہاں تو فرش پر اتنی ریت جمی ہوئی ہے۔ راہ میں پتے پڑے ہوئے ہیں۔" معصوم علی شاہ نے دور تک نظریں دوڑائیں۔

"یہ چوکیدار گل خان کا بیان تھا۔"

"اوئے۔ ان بندروں کو تھانے کیوں چھوڑ آئے انا نو وی نال لانا سی۔" معصوم علی شاہ نے کہا۔

"میں نے دونوں سے چلنے کو کہا تھا شاہ جی تو وہ کہنے لگے ہم نے اپنا دوسرا مکان نہیں کرایا۔" نادر حسین نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"اوئے بیوقوف دے پتر۔" معصوم علی شاہ نے غصے میں دونوں کو ایک ایک عدد موٹی گالیوں سے نوازا پھر بولا۔ "نادرے۔ مجھے تو اس گھر میں کوئی آبادی نہیں لگدی۔ کیوں جی۔ یہ گھر آپ نے کب خالی کیا ہے۔"

"دو تین دن ہوئے ہیں۔" بابر علی نے بتایا۔

"اچھا۔ آپ کوئی فرق محسوس کر رہے ہیں۔ جیسا چھوڑ کر گئے تھے۔ مکان کیا ویسا ہی ہے۔" اس مرتبہ نادر بولا۔

"مجھے تو ویسا ہی نظر آ رہا ہے۔" بابر علی نے چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے کہا۔

اب یہ لوگ مکان کے بڑے دروازے پر پہنچ گئے تھے۔

"گھر کھولو جی۔" معصوم علی شاہ نے بابر سے کہا۔

"گھر کھلا ہوا ہے شاہ جی۔ ان کا بیان ہے کہ گھر کے گیٹ کے سوا کہیں تالا نہیں لگا تھا۔" نادر حسین نے وضاحت کی۔

"چلیں پھر اندر۔" معصوم علی شاہ نے بابر کو اشارہ کیا۔ "آگے بڑھیں۔"

"میں چلوں آگے۔" بابر علی نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں چلتا ہوں آگے۔" نادر حسین نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔

نادر حسین نے آگے بڑھ کر بہت آہستہ سے دروازے پر ہاتھ رکھا۔

نادر حسین نے دھکا دیا تو دروازہ فوراً کھل گیا۔ معصوم علی شاہ نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ وقت تھوڑا سا دروازہ کھلنے پر بھی قدغہ لگایا۔

دیکھ کر اس نے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔

نادر حسین پریشان ہوا کہ یہ اچانک معصوم علی شاہ کو کیا ہوا۔ اس نے پوچھا "شاہ جی کی ہوئی۔"

"اوئے نادرے، ہوا کچھ نہیں، میں نے ٹائم دے دیا تھا۔ پورے بارہ بجے ہیں۔"

یہ سن کر نادر حسین اور بابر نے بھی گھڑیاں دیکھیں اور دونوں مسکرا پڑے۔

"بڑا خطرناک وقت ہے شاہ جی۔" نادر حسین نے ہنستے ہوئے معصوم علی شاہ سے کہا۔

"اوئے، فکر نہیں۔" یہ کہہ کر معصوم علی شاہ نے پورا دروازہ کھول دیا اور اندر قدم بڑھایا۔

دروازہ کھلتے ہی اندر سے حبس زدہ ہوا باہر آئی۔ یہ ایسی ہی بو تھی جیسے عموماً بند گھروں سے آتی ہے۔

"اوئے کتنے گلابوں کی خوشبو، سانوں تو بند ہوا کی بو آندی پئی اے۔" معصوم علی شاہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"یہ بیان بھی انہی کا تھا، گل خان اور کلو کا۔"

"اوئے، نادرے ان بندروں کو نال لانا سی۔"

"اوم بندر نہیں انسان اے۔" اچانک گل خان کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز کس طرف سے آئی اس کا اندازہ کوئی نہ لگا سکا۔

آواز سنتے ہی معصوم علی شاہ نے چاروں طرف دیکھا اور پھر نادر حسین سے مخاطب ہوا۔ "نادرے، جو میں نے سنا ہے، کیا تو نے بھی وہ سنا ہے۔"

"جی، شاہ جی میں نے بھی سنا ہے۔"

پھر اس نے بابر علی اور سپاہیوں سے بھی پوچھا۔ انہوں نے بھی گل خان کی آواز کی تصدیق کی۔

اندر کمروں کے دروازے سارے کے سارے بند تھے۔ ٹی وی لاؤنج خالی پڑا تھا، وہاں نہ ٹی وی تھا نہ وی سی آر، فرش ننگا تھا اور فرش پر اچھی خاصی ریت جمی ہوئی تھی کہ جوتوں کے نشان بن رہے تھے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب ڈرائنگ روم کا دروازہ تھا ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا گیا وہ اندر سے بالکل خالی تھا وہاں بھی فرش پر ریت جمی ہوئی تھی۔

پھر گل خان اور کلو کے بیان کی تصدیق کیلئے گھر کا کچن دیکھا گیا وہ بھی خالی پڑا تھا۔ نادر حسین نے گیس کے چولہے پر بطور خاص انگلی پھیر کر دیکھا، چولہے پر ریت جمی ہوئی تھی وہاں فریج تھا نہ چولہے پر پکی ہوئی ہنڈیا اور نہ جھوٹے برتن۔

"نادرے، تیرے ان بندروں کا ایک بیان بھی صحیح نہیں ہے، میں تانوں کینہ انہیں سی، اے سب فراڈ اے۔ ان دونوں کو جا کر پھینی لا۔ خواہ مخواہ ساڈا وکت برباد کیتا۔"

"لیکن شاہ جی بابر صاحب نے بھی تو بیان دیا ہے۔"

"اوئے، بیان دیا ہے تو تصدیق کروا، یہ تیرے سامنے کھڑے ہیں۔"

"میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ سچ کہا ہے۔" بابر نے مستحکم انداز میں کہا۔

"سچ کہا ہے تو پھر بتاؤ لڑکی کہاں ہے۔ لڑکی برآمد ہو تو ہم جن باشا کے خلاف ایف آئی آر کٹوائیں گے اور پولیس کا قیمتی وقت ضائع کرنے پر آپ کو حوالات کی سیر کرنا ہوگی۔" معصوم علی شاہ نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا اسے ڈرانے کے لئے دھمکی دی۔

"لڑکی یہیں ہے۔ میں آپ کو نیلم کا خط دکھا سکتا ہوں جس میں اس نے لکھا ہے کہ وہ خالی گھر جا رہی ہے۔" بابر نے جواب دیا۔

"اوئے بھولے باشا، تمہاری بہو تمہیں چکما دے گئی ہے، وہ جانے اس وقت کس کے ساتھ عیش کر رہی ہوگی۔" معصوم علی شاہ بالآخر پھکڑ پن پر اتر آیا۔

"ایسا نہ کہیں جی، نیلم بہت معصوم لڑکی ہے۔" بابر علی نے احتجاج کیا۔

"اوئے بالکل میری طرح۔" معصوم علی شاہ نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ "اوئے، میرے باپ نے میرا نام معصوم رکھ دیا، میں تمہیں کہیں سے معصوم نظر آتا ہوں۔"

نادر حسین نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ گھر چھان ماریں۔ گھر کی چھت اور پچھواڑہ بھی دیکھیں۔ اگر گھر میں لڑکی کہیں موجود ہو تو آکر اطلاع دیں۔

پانچ منٹ میں سپاہیوں نے پورا گھر چھان مارا لیکن انہیں انسان کی بچی تو دور کی بات ہے وہاں چڑیا کا بچہ بھی دکھائی نہ دیا۔

"اب بولو جی۔" معصوم علی شاہ نے بابر کو تیز نگاہوں سے گھورا۔

اس سے پہلے کہ بابر علی کچھ بولتا نادر حسین نے اس سے پوچھا۔ "وہ آپ نے ایک موم بتی کا ذکر کیا تھا جسے کوئی نہیں بجھا سکا تھا اور وہ پگھلی بھی نہ تھی۔ وہ موم بتی کہاں ہے۔"

"وہ میرے بیٹے اکبر کے بیڈروم میں تھی۔"

"ذرا دکھاؤ تو۔" معصوم علی شاہ نے اس طرح کہا جیسے کہہ رہا ہو۔ "اوئے کیوں جھوٹ بول رہا ہے۔"

بابر علی نے فوراً نیلم کے بیڈروم کا رخ کیا گھر کا ایک ایک دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن بند تھا تو بیڈروم۔ سپاہیوں نے بھی اس دروازے کو بند پایا تھا۔

بابر علی نے جب اس دروازے کے ہینڈل کو گھما کر کھولنا چاہا تو وہ نہیں کھلا۔ "کیسے بند ہو گیا۔" سپاہیوں نے کہا یہ دروازہ شروع سے بند ہے۔

نادر حسین کو خیال آیا کہ گل خان اور کلو نے بھی اپنے بیان میں ایک کمرے کے دروازے کو مقفل پایا تھا۔

"آپ کے خیال کے مطابق اسے کھلا ہونا چاہئے تھا۔"

"ہاں۔" بابر علی سوچتا ہوا بولا۔

"وہ کیوں۔" نادر حسین نے سوال کیا۔

"وہ اس لئے کہ جب اس گھر کے دروازوں کو تالا لگانے کی کوشش کی گئی تو کسی دروازہ پر تالا نہیں لگا تھا، وہ موم بتی اسی کمرے میں ہے۔" بابر نے جواب دیا۔

"اچھا۔ ذرا ادھر بٹیں۔" نادر حسین نے بابر علی سے کہا۔

بابر علی کے دروازے سے ہٹنے کے بعد وہ آگے آیا اس نے ہینڈل کو گھما کر اور پھر دروازے پر دباؤ ڈال کر دیکھا پھر اس نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔

"شاہ جی۔ تالا بند نہیں ہے۔ اندر سے کنڈی بند ہے۔" نادر حسین نے کہا۔

"اوئے اندر کون ہو سکدا اے۔" معصوم علی شاہ نے سوال کیا۔

"نیلم ہوگی۔" بابر نے کہا۔

"اچھا۔ پھر انوں آواج مارو۔"

"جی۔" بابر کی سمجھ میں بات نہ آئی۔

"شاہ جی کہہ رہے ہیں۔ اسے آواز دے کر باہر نکالیں۔" نادر حسین نے بات صاف کی۔

"اچھا۔" بابر علی نے پھر زور سے کہا۔ "نیلم کیا تم اندر ہو؟ نیلم باہر آجاؤ۔ میرے ساتھ پولیس ہے۔"

لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔

تب معصوم علی شاہ کی شامت آئی اس نے تالے کے سوراخ سے اندر جھانکنے کی کوشش کی جیسے ہی اس نے سوراخ سے آنکھ لگائی۔ ویسے ہی کسی نے اس کی آنکھ میں تیز دھار کی نوکیلی چیز گھسیڑ دی۔ معصوم علی شاہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا اس کا ایک ہاتھ آنکھ پر رکھا ہوا تھا اور چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔

"شاہ جی۔ کیا ہوا؟" نادر حسین نے اس کا ہاتھ آنکھ سے ہٹایا تو دیکھا کہ آنکھ سے خون بہہ رہا ہے۔

"شاہ جی۔ آپ فوراً اسپتال جائیں۔ آپ کی آنکھ سے خون بہہ رہا ہے۔ یہ شدید زخمی ہے۔" نادر حسین نے فکرمندی سے کہا پھر ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ "تم شاہ جی کو فوراً اسپتال لے جاؤ۔"

پولیس وین میں معصوم علی شاہ نے کا اسپتال کا رخ کیا۔ وہ جاتے جاتے نادر حسین کو ہدایت کر گیا کہ وہ دروازہ توڑ کر لڑکی کو برآمد کرے اور تھانے لے آئے۔

لیکن معصوم علی شاہ کو پھر تھانہ دیکھنا نصیب نہ ہوا وہ تو اسپتال بھی نہ پہنچ سکا۔

اس کی آنکھ میں شدید تکلیف تھی اتنی تکلیف کہ اس کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی اس نے گاڑی کو اور تیز چلانے کی ہدایت کی پھر گاڑی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

ایک موڑ پر اس کی ٹکر ایک سامان لدے ٹرک سے ہو گئی ٹکر اتنی شدید تھی کہ پولیس وین کئی قلابازیاں کھا کر دور جا گری اور اس میں فوراً ہی آگ لگ گئی۔ اس آگ کے بجھنے تک معصوم علی شاہ کی زندگی کا چراغ بجھ گیا وہ نیلم کو تھانے کی حدود میں دیکھنے کی حسرت لئے چل بسا۔ پولیس وین ڈرائیور بھی اس حادثے میں جاں بحق ہو گیا۔

معصوم علی شاہ کے اسپتال چلے جانے کے بعد نادر حسین گھوم کر باہر گیا اس نے کھڑکی کے شیشوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن شیشے اس طرح کے تھے کہ ان سے آر پار نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

تب نادر حسین نے ریوالور کے دستے سے شیشہ توڑنے کا ارادہ کیا۔

ابھی اس نے ریوالور کا دستہ شیشے پر مارنے کیلئے ہاتھ اوپر اٹھایا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ نادر حسین نے غصے سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

ریوالور پانچ چھ فٹ کے فاصلے سے زمین پر پڑا ہوا تھا اور دور تک کوئی نہ تھا۔ وہ باقی تینوں ساتھیوں کو دروازے پر چھوڑ آیا تھا کہ وہ پیچھے کا جائزہ لے کر ابھی آرہا ہے۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے ہاتھ سے ریوالور کس طرح نکل گیا۔ اس نے اپنا ریوالور جھکنے کیلئے اٹھایا لیکن وہ ابھی ریوالور اٹھا کر سیدھا ہی ہوا تھا کہ کسی نے اسے بڑے زور سے دھکا دیا جس سے زور سے کراہتے ہوئے منہ کے بل فرش پر گرا۔ اس کا منہ ریوالور پر پڑا اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا اور خون بھل بھل کر نکل آیا۔

وہ بھاگتا ہوا گھر کے اندر پہنچا اس کے منہ سے خون بہتا دیکھ کر سب پریشان ہوگئے۔

بابر علی نے باتھ روم کا راستہ دکھایا۔ نادر حسین نے پانی سے کلیاں کیں لیکن خون بند نہیں ہوا۔ بابر علی باتھ روم میں لگے شیشے میں اپنے ٹوٹنے والے دانت کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ باتھ روم کا دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہوگیا۔

دروازہ بند ہوتے ہی "میاؤں" کی خوفناک آواز سنائی دی۔

سید پور کا جن پانی کی ٹنکی پر بیٹھا تھا وہ اس وقت بہت غصے میں تھا اس نے نادر حسین پر چھلانگ لگائی۔ نادر حسین اس کا وار نہ سنبھال سکا وہ الٹ کر گرا اور اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ نادر حسین کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا۔

نادر حسین کے گرتے ہی کالے بلّے نے اپنا کام دکھا دیا۔ اس نے اس کے دونوں کان کاٹ لئے۔ نادر حسین پاگلوں کی طرح باتھ روم سے نکل کر بھاگا۔

سپاہیوں نے جو اسے خون میں نہایا دیکھا تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ انہوں نے نادر حسین کے ساتھ ہی دوڑ لگائی۔

پھر وہ منظر بھی دیکھنے والا تھا کہ چار پولیس والے چوروں کی طرح ڈرے سہمے سڑک پر بھاگے جارہے تھے۔

بابر علی بھی جلدی سے گھر سے نکل آیا اس نے گیٹ بند کر کے تالا لگایا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر کا راستہ لیا اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ جن کے عتاب سے بچ گیا تھا۔

نادر حسین اپنا ایک دانت اور دو، کان گنوا کر اتنا دہشت زدہ ہوا کہ اس نے بعد میں نہ صرف اس تھانے سے بلکہ اس شہر سے ہی اپنا تبادلہ کروالیا۔

بابر علی گھر پہنچا تو اس کی بری حالت تھی۔ صابرہ اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اسے شبہ ہوا کہیں پولیس نے اسے مارا پیٹا نہ ہو۔

اس نے بڑی فکر مندی سے بابر علی کا جائزہ لیا اور پوچھا۔ "خیریت تو ہے؟"

"صابرہ۔ بس مت پوچھو کہ آج کیا ہوا ہے؟"

پھر جب اس نے گل خان، کلو پنواڑی، معصوم علی شاہ اور نادر حسین پر گزرنے والی قیامت کا ذکر کیا تو صابرہ کانپ کر رہ گئی۔

بے اختیار صابرہ کا ہاتھ اپنے سر کے پیچھے چلا گیا۔ سید پور کے جن نے اس کی چوٹی جلا دی تھی۔ سر کے پیچھے ایک چاند سا بنا ہوا تھا کھال ایک دم چکنی ہو گئی تھی اور وہاں اب تک کوئی بال نہ اگا تھا۔ صابرہ کو وہ سب یاد آ گیا جو اس پر گزرا تھا۔ سید پور کے جن نے اسے ایک عذاب میں مبتلا کر دیا تھا اب پوتیات تو زندی تھی نتیجے میں صابرہ کو کہنا پڑا تھا کہ ہاں میں تمہارے ہونے کا اقرار کرتی ہوں۔ تم ہو۔ یہ صابرہ تھی جو جن بھوتوں کا مذاق اڑایا کرتی تھی، ان کے وجود سے منکر تھی، جو اپنے خاندان بھر میں نڈر مشہور تھی۔ اب اس "نڈر بیگم" کا یہ حال تھا کہ پتا بھی کھڑکھڑاتا تو وہ سہم جاتی تھی۔

اس وقت بھی اس نے بابر علی کی زبانی پولیس کی درگت کا حال سنا تو کپکپا اٹھی۔ ایک طرف اسے خوشی ہوئی کہ بابر علی وہاں سے صاف بچ کر آ گیا تھا۔

چائے وغیرہ پینے کے بعد بابر علی کی حالت ذرا سنبھلی تو اس نے اکبر کے بارے میں پوچھا۔ "اکبر ابھی تک نہیں آیا وہ کیا کہہ کر گیا تھا۔"

"اس کا ایک دوست ہے طارق وہ اس کے پاس گیا ہے، پھر وہ دونوں ملیر جائیں گے۔ وہاں طارق کا کوئی دوست رہتا ہے، پھر وہ الٰہی والے بابا کا پتہ کریں گے۔ وہ کہہ گیا تھا کہ دوپہر تک آ جائے گا ابھی تک تو آیا نہیں اس وقت ایک بج رہا ہے۔" صابرہ نے تفصیل سے بتایا۔

"اب وہ گیا ہے تو ضرور کچھ نہ کچھ کر کے آئے گا۔" بابر علی نے کہا۔

"بھئی، مجھے تو بڑا ڈر لگ رہا ہے جن کی آج کی کارروائی سن کر، کہیں وہ ہمارے بیٹے کو نہ کوئی نقصان پہنچا دے۔" صابرہ نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"پریشانی تو مجھے بھی ہے لیکن اس طرح ڈر کر بیٹھ جانے سے کیا ہو گا؟"

"میں نے اسے کتنی بار کہا ہے کہ اس مسئلے سے اپنی جان چھڑا لے مگر وہ سنتا ہی نہیں۔"

"وہ کس طرح، صابرہ۔"

"ارے، نیلم کو طلاق دے کر، وہ کونسی میری بہن کی سگی بیٹی ہے اور اگر ہوتی بھی تو میرے بیٹے کی جان سے زیادہ تھوڑے ہی عزیز ہوتی لیکن وہ تو اس پر ایسا عاشق ہوا کہ کسی طرح مانتا ہی نہیں، کہیں خدانخواستہ کوئی نقصان نہ اٹھا بیٹھے۔" صابرہ نے فکرمند ہو کر کہا۔

"اب نیلم کو اس خالی گھر میں بھی تو نہیں چھوڑا جا سکتا، نہ جانے بیچاری پر کیا گزر رہی ہو گی۔"

"ہاں، یہ تو ہے، اس کی حالت واقعی قابل رحم ہو گی۔" صابرہ نے تاسف سے کہا۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گھر کی گھنٹی بجی بابر علی خود اٹھ کر گیٹ تک گیا۔ دروازے پر اکبر تھا دونوں باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا دونوں کے ہی پاس ایک دوسرے کو سنانے کیلئے بہت کچھ تھا لیکن دونوں خاموش رہے۔

گھر کے اندر آ کر جب اکبر بیڈ پر لیٹ گیا تو صابرہ نے پوچھا۔

"کیا ہوا اکبر، خیر تو ہے؟"

"تھک گیا امی؟" اکبر نے آسودگی سے ہاتھ پاؤں پھیلا لئے۔

"آج تجھے معلوم ہے، تیرے جانے کے بعد کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟" اکبر گھبرا کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ویسے سب خیریت ہے؟"

"آخر ہوا کیا؟ کچھ بتائیں تو۔" اکبر نے الجھتے ہوئے کہا۔

"گھر پر پولیس والے آئے تھے۔ تیرے ابو کو تھانے بلا کر لے گئے۔"

"تھانے!" اکبر پریشان ہو گیا۔ "وہ کیوں؟"

"تھانے میں چوکیدار گل خان اور اس کا ایک دوست کلو پنواڑی موجود تھا۔ دونوں کو رات کو پولیس نے ہمارے گھر سے بھاگتے ہوا پکڑا تھا۔ انہوں نے جو بیان دیا تھا اس کی تصدیق کے لئے تمہارے ابو کو بلایا گیا تھا، لو وہ تمہارے ابو آ گئے۔ ان سے سن لو۔ اب ساری روداد مجھے تو ان پولیس والوں کا خیال آتا ہے تو جسم میں جھرجھری سی آ جاتی ہے۔"

بابر علی مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اکبر کے نزدیک ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے تھانے سے لے کر گھر واپسی تک جو کچھ دیکھا تھا، وہ بیان کر دیا۔

اکبر نے ساری داستان سن کر ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ "یہ تو بہت برا ہوا ابو۔"

"ہاں ہوا تو برا لیکن انہیں میری بات پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ انہیں تو گل خان اور کلو پنواڑی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس پر بھی یقین نہ تھا حالانکہ دونوں کے کان کٹے ہوئے تھے میں نے انہیں جو کچھ سنایا، اس پر ان لوگوں نے یقین نہ کیا شاید وہ سمجھ رہے تھے۔ میں انہیں بے وقوف بنا رہا ہوں یا میں کوئی پاگل شخص ہوں یا پھر میں جھوٹ بول رہا ہوں، یوں بھی جو واقعات ہمارے ساتھ پیش آئے ہیں وہ قابل یقین کہاں ہیں۔ سب سے بڑی مثال تو یہ صابرہ بیٹھی ہیں سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی یہ جن کے وجود سے منکر تھیں بالآخر ان کو ماننا پڑ گیا، یقین آ گیا۔ پولیس والوں کو تو میں نے صرف زبانی ہی بتایا تھا وہ بھلا ایسے ناقابل یقین واقعات پر آنکھ بند کر کے کس طرح یقین کر لیتے، سو انہوں نے تفتیش کی تھانی اور اس گھر میں ان پولیس والوں کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ عمر بھر یاد رکھیں گے۔ اب انہیں جنات کے وجود کے بارے میں بھی یقین آ گیا ہو گا۔ اچھا، اکبر میں نے تو ساری روداد سنا دی، اب تم بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا بیتی؟ املی والے بابا کا سراغ لگا کہ نہیں یا اس قلندر نے ایسے ہی ہانک دی تھی۔" بابر نے پوچھا۔

"ارے، آپ کیا بات کر رہے ہیں، بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" صابرہ نے ذرا خفگی سے کہا۔

"ہاں، ابو کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، میں نے پورا ملیر چھان مارا ہے لیکن کہیں املی والے بابا کا سراغ نہیں ملا۔" اکبر نے بڑی مایوسی سے کہا۔

اس کی یہ بات سن کر دونوں میاں بیوی حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

صابرہ اور بابر کی حیرت بجا تھی آخر ایسا کیوں ہوا؟ اکبر کو املی والے بابا کا پتہ ٹھکانہ کیوں معلوم نہ ہو سکا؟ کیا اس ملنگ نے ویسے ہی ہانک دی تھی لیکن اکبر کو وہ ملنگ جس طرح ملا تھا اس میں فریب کی کوئی گنجائش نہ تھی آخر اسے کیا پڑی تھی کہ سمندر کے کنارے بیٹھے ہوئے لڑکے کو مزار جانے کا مشورہ دے اور پھر ملیر میں املی والے بابا سے ملنے کی ہدایت کرے ضرور کہیں گڑ بڑ ہوئی ہے۔

"بیٹا لوگوں سے پوچھتے۔" صابرہ نے اس سے کہا۔

"امی کافی لوگوں سے پوچھا لیکن سب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔" اکبر نے بتایا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ وہاں کی کوئی مشہور شخصیت نہیں ہے۔" بابر نے اظہار خیال کیا۔

ملیر کوئی چھوٹی جگہ تو نہیں ہے اس کراچی میں پڑوسی، پڑوسی کا پتہ نہیں بتا سکتا۔"

ملیر نے کہا۔ "بیٹا تم ایک مرتبہ اور جا کر پتہ کرو۔"

سابرہ نے کہا۔ "اگر پتہ معلوم ہو تو پتہ بھی کروں اس طرح اب کہاں مارا پھروں؟"

"اچھی بھلی چلے جاؤ اس فقیر کو ڈھونڈ کر اس سے صحیح پتہ معلوم کرو۔" سابرہ نے مشورہ دیا۔

"پھر کلفٹن چلے جاؤ۔" ملیر نے تائید کی۔

"ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔" باہر نے تائید کی۔

"اچھا اب کل چانس لوں گا اب تو میں خاصا تھک گیا ہوں۔"

"نہیں بیٹا کل نہیں آج۔ اس کام میں دیر نہ کرو ابھی تم کچھ دیر سو جاؤ پھر شام کو اٹھ کر چلے جانا۔"

باہر نے ہدایت کی۔

"اچھا ابو۔" اکبر نے کہا۔

لیکن اکبر کو کلفٹن جانے کی ضرورت نہ پڑی وہ تھکا ہوا تو تھا ہی جلد ہی گہری نیند سو گیا۔

اس نے خود کو کلفٹن والے مزار کی سیڑھیوں پر پایا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور اور ادھر بیٹھے ہوئے فقیروں کو غور سے دیکھتا جا رہا تھا۔

تب کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا یہ ایک مضبوط اور کھردرا ہاتھ تھا۔

اکبر نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو اس نے اپنے مقابل ایک ملنگ کو پایا۔

"ہمیں ڈھونڈ رہا ہے بچہ؟"

"جی بابا میں نے سارا ملیر چھان مارا مجھے املی والے بابا کا پتہ نہیں چلا۔"

"گلیوں اور محلوں میں ڈھونڈتا پھرا تو املی والے بابا کو۔ ارے جنگل میں جا، کسی گوٹھ میں پتہ کر جا اب جو۔"

یہ کہہ کر اس ملنگ نے اکبر کو دھکا دے دیا فوراً اکبر کی آنکھ کھل گئی اس نے خود کو اپنے کمرے میں پایا لیکن وہ خواب اتنا صاف اور واضح تھا اسے لگا جیسے وہ خود مزار پر گیا تھا اس ملنگ نے خواب میں نہیں حقیقت میں اس کا پتہ بتایا تھا۔

دوسرے دن صبح ہی اس نے ملیر کا رخ کیا اس مرتبہ اس نے گلی محلوں کے بجائے جنگل کا رخ کیا تب اسے باغ نما جنگل میں املی والے بابا کا سراغ مل گیا۔ اس گھنے جنگل کے شروع میں ایک چائے کا ہوٹل تھا جہاں لوگوں کی آواز میں ریکارڈنگ ہو رہی تھی اور جو لوگ وہاں بیٹھے تھے وہ سب چرسی محسوس ہوتے تھے ایک آدمی بھی شریف دکھائی نہ دیتا تھا۔

اکبر نے کسی چرسی سے پوچھنے کے بجائے براہ راست ہوٹل کے مالک سے بات کی اس سے املی والے بابا کا پتہ پوچھا اس نے کہا "اندر چلے جائیں جنگل میں کافی آگے جا کر ایک نہر آئے گی اس نہر کے درمیان ایک بھاری سا املی کا درخت ہے اسی درخت کے نیچے وہ بابا بیٹھا مل جائے گا لیکن تم لوگ اس کا پتہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"ہمیں ملنا ہے لیکن وہ تو کسی سے نہیں ملتا اگر کوئی اس کے پاس جانے کی کوشش کرتا ہے تو پتھر مار کر بھگا دیتا ہے۔" ہوٹل والے نے انکشاف کیا۔

"کوئی تو ہوگا جو بابا کے پاس آتا جاتا ہوگا آخر بابا کھاتا پیتا کہاں سے ہوگا؟" اکبر کا دوست طارق بولا۔

"لیکن جناب وہاں کوئی نہیں جاتا یہ بات بالکل درست ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ کھاتا پیتا کہاں سے ہوگا تو اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں رات کے بارہ بجے محفل سجتی ہے۔"

"محفل سجتی ہے۔ کس قسم کی محفل؟" اکبر نے پوچھا۔

"یہ کوئی نہیں بتا سکتا اس لئے کہ رات کو وہاں کوئی نہیں جا سکتا ایک دو لوگوں نے جانے کی کوشش بھی کی ہے تو وہاں سے اندھے اور گونگے ہو کر لوٹے ہیں۔" ہوٹل کے مالک نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"آپ لوگ نوجوان ہیں طالبعلم معلوم ہوتے ہیں۔ آپ لوگ کہاں باباؤں کے چکر میں پڑے ہیں۔"

"آپ یہ بتائیں دن میں جانے میں تو کوئی خطرہ نہیں؟" اکبر نے پوچھا۔

"نہیں۔" ہوٹل والے نے جواب دیا۔

"کیا اندر موٹر سائیکل جا سکتی ہے؟" طارق نے پوچھا۔

"ہاں جا سکتی ہے۔" ہوٹل والے نے بتایا۔

"اچھا جناب آپ کا بہت بہت شکریہ۔" یہ کہہ کر اکبر طارق کے ساتھ موٹر سائیکل پر آ بیٹھا۔

طارق کے دوست شاکر نے بھی اپنی موٹر سائیکل سنبھالی اور وہ جنگل میں داخل ہوئے۔

یہ ایک گھنا جنگل تھا یہاں مختلف قسم کے درخت لگے ہوئے تھے انہی درختوں کے درمیان ایک پگڈنڈی نما راستہ تھا وہ اس راستے پر ہو لئے۔

آگے طارق اور اکبر تھے پیچھے شاکر تھا۔ شاکر کبھی ایسے گھنے جنگل میں داخل نہیں ہوا تھا پھر ابھی والے بابا کے بارے میں ہوٹل والے نے جو نقشہ کھینچا تھا اس سے اس کے دل میں ہول بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل کی رفتار دھیمی کی پھر طارق اور اکبر جب درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے تو شاکر نے فوراً اپنی موٹر سائیکل کو بریک لگائے۔ پیچھے گھمائی اور گاڑی کو ریس دے کر بڑی رفتار سے جنگل سے نکل گیا۔

طارق اور اکبر باتیں کرتے جا رہے تھے آگے جا کے انہیں احساس ہوا کہ وہ اکیلے جا رہے ہیں پیچھے شاکر نہیں ہے تو اکبر نے کہا۔ "یہ شاکر کدھر رہ گیا؟"

"پیچھے نہیں ہے؟" طارق نے مڑ میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اکبر نے گردن گھما کر دیکھا۔ "یار پیچھے تو دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا۔ گاڑی روکو ذرا۔"

طارق نے موٹر سائیکل روک لی۔ دونوں نے کچھ دیر انتظار کیا ان کا خیال تھا کہ اگر کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا ہوگا تو آ جائے گا لیکن ان کا انتظار بے سود ثابت ہوا۔

"پیچھے چل کر دیکھیں؟" اکبر نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ واپس چلا گیا وہ تھوڑا ڈرپوک بندہ ہے پھر اس ہوٹل والے نے اندھا اور گونگا

بڑی کہانی سنادی۔ جنگل بھی سنسان ہے وہ ڈر کر بھاگ گیا۔ آؤ تم گاڑی پر بیٹھو ہم آگے چلتے ہیں۔"

طارق نے کہا۔

پھر اکبر طارق کے پیچھے بیٹھ گیا۔ طارق نے کک لگائی اور موٹر سائیکل نے رفتار پکڑلی۔

خود اندیشہ جاکر ہموار راستہ اونچا نیچا ہونے کے علاوہ چھوٹے بڑے پتھروں سے پُر تھا جب گاڑی کا چلانا ممکن نہ رہا تو طارق نے گاڑی کھڑی کر دی اور وہ دونوں پتھروں پر چلتے آگے بڑھنے لگے۔ کوئی ایک فرلانگ چلنے کے بعد انہیں جنگل ختم ہونے کا احساس ہوا ایک تو اندھیرا کم ہو چکا تھا دوسرے درختوں کے تنوں کے درمیان سے آسمان جھلکنے لگا تھا۔

پھر وہ نہر نظر آ گئی۔

نہر جنگل کے اختتام پر تھی۔ نہر کے اس پار کھلا میدان تھا۔ کھیتوں کا سلسلہ تھا اور بہت آگے کچھ کچے مکان دکھائی دے رہے تھے۔ شاید وہ کوئی گوٹھ تھا۔

نہر کے کنارے پہنچ کر دونوں نے سوچا کہ اب کدھر جایا جائے اس لئے کہ وہ جہاں نکلے تھے وہاں انہیں نہر میں کوئی املی کا درخت نظر نہ آیا تھا۔ نہر کیونکہ سیدھی نہ تھی آگے جاکر مڑ گئی تھی اس لئے دور تک دیکھنا بھی ممکن تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ نہر کے دائیں طرف جایا جائے یا بائیں جانب۔

"اب کیا کریں؟" اکبر نے سوال کیا۔

"میرے خیال میں پہلے بائیں جانب چلتے ہیں۔ ادھر اگر املی کا درخت نہ ہوا تو واپس آکر دائیں جانب چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے ایسا کر لیتے ہیں۔"

"ایک کام اور کرنا ہوگا۔" طارق بولا۔

"وہ کیا؟"

"جب ہم واپس آئیں گے تو ہمیں یہ یاد نہ رہے گا ہم کہاں سے نہر پر نکلے تھے۔ یہ اگر یاد نہ رہا تو واپسی میں موٹر سائیکل کو تلاش کرنا آسان نہ ہوگا۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہاں دو چار پتھر ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر نشانی لگا دیتے ہیں۔" طارق نے تجویز پیش کی۔

"یار تُو نے بہت عقلمندی کی بات کی ورنہ واپسی میں ہم ضرور راستہ بھول جاتے۔"

پھر اکبر اور طارق نے مل کر پانچ چھ پتھر ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر ایک سنگ میل بنا دیا اور اب وہ نہر کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگے۔

آگے جاکر نہر دھیرے دھیرے گھومتی گئی پھر وہ جیسے ہی سیدھی ہوئی تو وہ دونوں خوشی سے اچھل پڑے سامنے ایک بہت موٹے تنے کا لمبا چوڑا املی کا درخت موجود تھا۔ یہ درخت نہر کے درمیان تھا۔ نہر میں زیادہ پانی محسوس نہ ہوتا تھا۔ درخت کے چاروں طرف ایک چبوترہ سا بنا ہوا تھا اسی چبوترے میں ایک جگہ سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں یہ چھوٹی بڑی سیڑھیاں تھیں جو قدرتی طور پر بن گئی تھیں۔

درخت کے تنے میں ایک بڑا سا محراب نما شگاف تھا اس محراب کے نیچے ایک بڑا سا پتھر اور اس پتھر پر وہ آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ املی والا بابا۔ آلتی پالتی مارے گوتم بدھ کی طرح آسن جمائے۔

اسے دیکھ کر دونوں کے دل میں ایک خوف سا پیدا ہوا۔

دور تک کوئی آدم نہ آدم زاد۔ جنگل تھا، پتھر تھے، نہر میں بہتا پانی تھا اور کبھی کبھی پرندوں کے بولنے کی آوازیں بھی آجاتی تھیں۔

وہ دونوں خاموشی سے چلتے اس درخت کے سامنے پہنچ گئے۔

املی کے درخت اور ان کے درمیان مشکل سے پندرہ بیس گز کا فاصلہ ہوگا۔ املی والے بابا کے جسم پر ایک لنگوٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ سر کے سفید بال کاندھوں پر پڑے تھے اور سفید داڑھی سینے پر لہرا رہی تھی۔ سرخ سفید اور توانا جسم قد کاٹھ بھی اچھا۔

چبوترے پر چھوٹے بڑے بہت سے پتھر پڑے تھے۔ دنگل والے نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ بے بال نہ والوں کو پتھر مار کر بھگا دیتا ہوگا۔ یہ دونوں بھی سہمے ہوئے کھڑے تھے کہ کب بابا آنکھ کھولے، کب انہیں دیکھے اور کب اٹھ کر سنگ برسائے۔

پھر اچانک اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں لال انگارہ آنکھیں۔ اکبر کو کالے بابے کی آنکھیں یاد آگئیں۔

وہ اندر ہی اندر لرز کر رہ گیا۔

املی والے بابا نے آنکھیں کھول کر ان دونوں کو دیکھا پھر وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا جیسے اسے دونوں کی آمد پر غصہ آگیا ہو۔ اٹھ کر وہ دونوں کی طرف تیزی سے بڑھا۔

اکبر اور طارق نے دوڑنے کی تیاری کرلی کہ جیسے ہی وہ مارنے کے لئے پتھر اٹھائے گا فوراً فرار اختیار کرلیں گے لیکن بابا نے کوئی پتھر نہ اٹھایا وہ چبوترے کے آخری سرے پر آیا اور چیخ کر بولا۔

"تم میں زخمی کون ہے؟"

دونوں نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ بابا کی زخمی سے کیا مراد ہے۔

املی والے بابا نے دونوں کو گومگوں کی حالت میں دیکھا تو پھر چیخا۔

"بولتے کیوں نہیں اگر تم میں کوئی زخمی نہیں ہے تو اپنا راستہ لو ہمیں کیوں پریشان کرنے آئے ہو۔"

"بابا یہ ہے زخمی۔" طارق نے بابا کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

"کون ہے تو تم؟"

"میں اس کا دوست ہوں جی۔" طارق نے جواب دیا۔

"اچھا، تیار دار ہو۔" املی والے بابا نے کہا۔

"آپ ایسا سمجھ لیں" طارق بولا۔

املی والے بابا نے پھر اکبر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "تم آؤ اکیلے۔"

یہ کہہ کر املی والا بابا پلٹ گیا اور محراب دار کھوکھے میں پتھر پر بیٹھ گیا۔

طارق نے اکبر کو ٹھوکا دیا۔ "جاؤ فوراً۔"

"پانی میں کیسے جاؤں؟" اکبر ہچکچایا۔

"ارے جوتے موزے اتار دو ... پتلون کے پائینچے اوپر کرلو اور پانی میں گھس جاؤ ... پانی زیادہ گہرا نہیں ہے ... تمہارے گھٹنوں سے نیچے ہی ہوگا۔" طارق نے راہ دکھائی۔

"نہیں یہ کیسے پتہ کہ پانی زیادہ گہرا نہیں ہے۔"

"میرا اندازہ ہے۔"

"اگر پانی زیادہ گہرا ہوا تو کیا ہوگا؟"

"اگر پانی میں ایک دو قدم بڑھا کر دیکھ لو اندازہ ہو جائے گا میں تمہارا ہاتھ پکڑ لوں گا

"پانی میں اترنے سے پہلے کوٹ بھی اتار لو... اگر پانی گہرا بھی ہوا تو کوٹ نہ بھیگے۔"

پانی میں اترنے سے پہلے کوٹ بھی اتار لو... اگر پانی گہرا بھی ہوا تو کوٹ نہ بھیگے۔"

یہ تو ف اس کنارے کھڑا کیا سوچتا ہے ... آتا کیوں نہیں۔" اٹلی والے بابا نے اسے

تیز نظروں سے دیکھ کر ڈانٹ لگائی۔

اکبر کوٹ اتارنے جا رہا تھا اٹلی والے بابا کا ڈانٹ سن کر اس نے کوٹ اتارنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور

جلدی سے پانی میں قدم رکھا اس نے گھبراہٹ میں جوتے موزے بھی نہ اتارے تھے۔

خوش قسمتی پانی واقعی زیادہ نہ تھا دو فٹ تک بلند ہوگا وہ جلدی سے پانی پار کر کے چبوترے پر چڑھ

گیا۔

عارق اسے بڑے حیرت سے دیکھ رہا تھا اسے نہیں معلوم تھا کہ اکبر کے ساتھ کیا ہونے والا ہے وہ

حیرت اور تشویش کے ملے جلے جذبات میں گھرا ہوا تھا۔

چبوترے کی آڑھی ترچھی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اکبر کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ گنتا تھا

دیوار تو ڑ کر باہر آجائے گا۔ حلق خشک ہو رہا تھا اور دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

اکبر اوپر پہنچا تو اس نے بابا کو آنکھیں بند کئے بیٹھے پایا وہ خاموشی سے اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا

ہو گیا۔

"بیٹھ جا۔" اٹلی والے بابا نے آنکھیں بند کئے ہدایت کی۔

اکبر فوراً ہی اکڑوں بیٹھ گیا۔

تب اٹلی والے بابا نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ بڑی بڑی اور لال انگارہ آنکھیں..... ان آنکھوں کو

دیکھ کر اکبر کے بدن میں جھرجھری سی آگئی۔ یہ آنکھیں تو کالے بلے کے مقابلے میں زیادہ خوف میں

مبتلا کرنے والی تھیں۔

"کیوں آیا ہے یہاں؟" اٹلی والے بابا نے پُر جلال لہجہ اختیار کیا۔

"میں جی۔ دو تین دن پہلے سمندر پر گیا تھا۔ وہاں میری ملاقات....."

"وہاں تیری ملاقات نیاز محمد سے ہوئی..... اس نے تجھے مزار کا راستہ دکھایا..... پھر اس نے

تجھے پتا بتایا۔ تو کل سارا طیر چھان گیا مگر تجھے ہم نہ ملے..... نیاز محمد نے پھر تیری مدد کی اور اس کے

بتائے ہوئے اشاروں پر بالآخر تو یہاں پہنچ گیا..... یہی بتانا چاہتا ہے نا تو ہمیں۔" اٹلی والے بابا نے اس

کی بات کاٹ کر کہا۔ "ارے بے وقوف ہم یہ نہیں پوچھ رہے کہ تو یہاں کس کے ذریعے آیا.....

تجھے اپنی آمد کی وجہ بتا۔"

اکبر نے جب اٹلی والے بابا کی زبانی یہ سنا تو اس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یہ سب بابا کو کس طرح

معلوم ہو گیا اسے یہ یقین ہو گیا کہ بابا کوئی اونچی چیز ہے۔

"اب میں اپنی زبان سے کیا بتاؤں۔ آپ تو اندھیروں میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔" اکبر نے ہمت

کر کے کہا۔

اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔ املی والے بابا نے کوئی جواب نہ دیا

کچھ دیر کے بعد آنکھیں کھولیں تو ان میں ایک عجیب سی چمک تھی۔

"سید پور کے جن کا ستایا ہوا ہے۔" املی والے بابا نے انکشاف کیا۔

"جی بابا! اس نے میری زندگی برباد کر دی ہے وہ میری بیوی کو لے اڑا ہے

اس نے اسے قید کر لیا ہے وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا بابا جی! آپ مجھ پر رحم کریں

کسی طرح اس جن سے نجات دلا دیں۔"

"ہم رحم کرنے والے کون ہیں؟ رحم کرنے والا اللہ ہے ہم تو اس بساط دنیا کے ایک مہرے ہیں

تو فکر نہ کر، کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" املی والے بابا کی آنکھوں میں اب محبت کی جھلک تھی۔

"بابا جی! میں زندگی بھر آپ کا ممنون رہوں گا۔" اکبر نے بڑے خلوص سے کہا۔

"تو اچھا لڑکا ہے تجھ میں صبر شکر بہت ہے ..... تو سچا بھی ہے تو ہمیں پسند آیا

ہے۔ تو نیاز محمد کو بھی پسند آیا تھا..... وہ تجھے روتا ہوا نہ دیکھ سکا خیر فکر نہ کر ہم تیرے

لئے ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے ہم ایک دو دن میں اپنا ایک سپاہی بھیجیں گے ..... ہو سکتا ہے

نیاز محمد کو ہی بھیج دیں..... نہیں تجھے اپنے گھر کا پتہ بتانے کی ضرورت نہیں..... تیرا گھر اب بھی

ہماری آنکھوں میں ہے۔ جا اب تو جا..... تیری زندگی کے دکھ اب ختم ہوئے ..... تو جشن منانے

کی تیاری کر ..... اور یہ لے۔" املی والے بابا نے قریب ہی زمین پر پڑی ہوئی کوئی چیز اٹھائی اور مٹھی بند

کر کے اس کی طرف بڑھائی۔

اکبر نے جلدی سے اپنی ہتھیلی پھیلا دی..... ایک پانچ پیسے کا سکہ اس کے ہاتھ پر گرا اکبر

نے اس سکے کو حیرت سے دیکھا۔

"اس سکے کو ایک کپڑے میں سی کر اپنے بازو پر باندھ لینا تو سید پور کے جن کے شر سے محفوظ رہے گا

انشاء اللہ اب جا، وہ تیرا انتظار کر رہا ہے ..... اور ہاں ایک بات

سن..... بہت غور سے ..... ہمارے بارے میں کسی کو کچھ پتہ نہ چلے..... ہم اپنے اردگرد ان خواہشوں بھرے انسانوں کو دیکھنا نہیں چاہتے. ہمارے پاس کام بہت ہیں ..... اسی لئے ہم دنیا سے دور اس جنگل میں بیٹھے ہیں۔ ہماری دنیا بالکل مختلف ہے ..... خواہشوں بھرے انسان اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے ..... جا اب جا۔"

یہ کہہ کر الٰہی والے بابا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اکبر خوشی خوشی اٹھا..... اس نے پانچ کے سکے کو اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالا..... اور تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا..... ٹیڑھی میڑھی سیڑھیاں اس نے احتیاط سے پار کیں ..... پانی میں قدم رکھا اور پھر جلدی جلدی چلتا کنارے پر آپہنچا۔

کنارے پر پہنچا طارق نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا..... وہ اس کے ہاتھ کے سہارے سے اوپر کنارے آ گیا۔

"کیا ہوا؟" طارق نے پوچھا۔

"میں نکل چلو یہاں سے۔ آگے چل کر بات ہوگی۔" اکبر نے کہا۔

"میں نکل چلو یہاں سے۔ آگے چل کر بات ہوگی۔" اکبر نے کہا۔

طارق نے پھر کوئی سوال نہ کیا ..... دونوں تیزی سے آگے بڑھنے لگے

پھر جب موڑ آیا تو

اکبر نے پیچھے مڑ کر دیکھا ..... اس کو محراب دار کھوکھے میں کوئی نظر نہ آیا ..... اکبر نے

اطمینان کا سانس لیا۔ اللی والا بابا اٹھ کر تنے کے پیچھے چلا گیا ہوگا۔

اللی والا بابا "سیف میل" پر پہنچے تو انہوں نے وہاں ایک بندر بیٹھا دیکھا۔ یہ بندر انہیں دیکھتے ہی اپنے بنائے "سیف میل" پر پہنچے تو انہوں نے وہاں ایک بندر بیٹھا دیکھا۔ یہ بندر انہیں دیکھتے ہی

نزدیک ہی ایک درخت پر چڑھ گیا۔

یہ لوگ پھر جنگل میں داخل ہوگئے۔

یہ لوگ پھر جنگل میں داخل ہوگئے۔

موٹر سائیکل کے نزدیک پہنچے تو انہوں نے گدی پر ایک بندر بیٹھا دیکھا۔

موٹر سائیکل کے نزدیک پہنچے تو انہوں نے گدی پر ایک بندر بیٹھا دیکھا۔

"یار! یہ بندر کہاں سے آگئے۔" طارق نے حیرت سے کہا۔

"یہ ہماری موٹر سائیکل کی حفاظت کر رہا ہے۔" اکبر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ ہماری موٹر سائیکل کی حفاظت کر رہا ہے۔" اکبر نے ہنستے ہوئے کہا۔

بندر ان دونوں کو دیکھ کر سیٹ پر بیٹھا بیٹھا اچھلا اور درخت کی ایک موٹی شاخ پکڑ کر اس سے جھولتے

ہوئے پھر وہ شور مچاتا درخت کے اوپر چلا گیا۔

موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے وہ دونوں تیزی سے اس جنگل سے نکل کر باہر آگئے۔

موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے وہ دونوں تیزی سے اس جنگل سے نکل کر باہر آگئے۔

ہوٹل والے نے ان دونوں کو جنگل سے نکلتے دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے ان کو روکا۔

"صاحب لوگ! کچھ چائے وائے پئیں۔"

"نہیں شکریہ ہم اب جا رہے ہیں۔ کچھ جلدی ہے۔"

"نہیں شکریہ ہم اب جا رہے ہیں۔ کچھ جلدی ہے۔"

"کیا ہوا، آپ لوگوں کی ملاقات ہوگئی۔" ہوٹل والے نے پوچھا۔

"کیا ہوا، آپ لوگوں کی ملاقات ہوگئی۔" ہوٹل والے نے پوچھا۔

"نہیں کہاں ہوئی۔ آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہم نزدیک پہنچے تو انہوں نے ہم پر پتھر پھینکنے شروع کر دیئے۔ ہم فوراً ہی وہاں سے بھاگ لئے۔" اکبر نے دانستہ غلط بیانی سے کام لیا اور پھر اس نے طارق کو اشارہ کیا۔

طارق نے بڑی برق رفتاری سے گاڑی وہاں سے نکال لی۔ ہوٹل والا حیرت سے ان کی بھیگی پینٹ کو دیکھتا رہ گیا۔

راستے میں اکبر نے طارق کو گفتگو کا لب لباب بتا دیا اور ساتھ ہی اسے ہدایت کر دی کہ وہ آئندہ کسی کو اللی والے بابا کا پتہ نہ بتائے، کسی کو وہاں سے کچھ نہیں ملے گا۔ بس پتھر ہی پتھر ملیں گے۔

طارق، اکبر کو اس کے گھر کے گیٹ پر چھوڑ کر چلا گیا۔

اکبر نے گیٹ پر کھڑے ہو کر اپنی ٹانگیں سیدھی کیں جو موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے اکڑ گئی تھیں۔ وہ اس وقت بہت خوش تھا۔ اللی والے بابا سے اس کی ملاقات بڑی کامیاب رہی تھی۔ وہ بابا واقعی بزرگ اور روشن ضمیر تھا۔ اکبر کو اسے کچھ بتانا ہی نہ پڑا۔

اکبر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ پیسے کے سکے کو نکالا۔ سکہ اس کی جیب میں موجود تھا۔ یہ ایک چمکتا ہوا سکہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی ابھی ڈھل کر نکلا ہو۔

اس نے اس سکے کو مٹھی میں بند کر لیا اور ٹھنڈی کے بٹن پر ہاتھ رکھا۔

تھوڑی دیر کے بعد راشدہ نے گیٹ کھولا۔ وہ اکبر کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔

"اکبر بھائی! آپ آ گئے؟"

"جی راشدہ بہن۔ میں آ گیا۔" اکبر نے خوش دلی سے کہا۔

"اوہو۔ بڑے چمک رہے ہیں آج تو۔ خیر تو ہے۔" راشدہ نے گیٹ بند کرتے ہوئے کہا۔

"بس۔ اب خیر ہی خیر ہے۔" اکبر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابو شوروم سے واپس آ گئے۔"

"نہیں۔ ابھی نہیں آئے۔ یہ وقت ان کی واپسی کا تو نہیں۔"

"امی ہیں گھر میں۔"

"ہاں امی گھر میں ہیں۔ امی کہاں جائیں گی بھلا۔ کیا بات ہے بھائی اکبر۔ سب کو پوچھا جا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی لمبی خوشی مل گئی ہے آپ کو۔ مجھے نہیں بتائیں گے۔" راشدہ نے ہنس کر پوچھا۔

اب وہ دونوں گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ صابرہ نے گھنٹی کی آواز سن لی تھی۔ وہ باہر کی طرف آ رہی تھی کہ دیکھے دروازے پر کون آیا ہے۔ اکبر نے صابرہ کو آتے دیکھا تو خوشی میں چلایا۔

"امی۔"

پھر وہ بھاگ کر ماں سے لپٹ گیا۔

کافی عرصے کے بعد صابرہ نے اپنے بیٹے کے چہرے پر خوشی دیکھی تھی۔ اس کا کھلتا ہوا چہرہ دیکھ کر صابرہ کے دل میں انار سے جھڑنے لگے۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو لرا گئے اس نے اپنے بیٹے کو لپٹا لیا۔

"میرا بیٹا۔"

"امی۔ آپ کو معلوم ہے۔ میں کس سے مل کر آ رہا ہوں۔" اکبر نے پوچھا۔

"کس سے بیٹا۔" صابرہ بولی۔

"امی۔ امی والے بابا سے۔" اکبر نے خوش ہو کر بتایا۔

کوئی اور وقت ہوتا، یہ جن کا چکر نہ ہوتا اور اس نے اکبر کے منہ سے کسی بابا کا نام سنا ہوتا تو وہ فوراً اس کے کان پکڑ لیتی اور آئندہ کسی بابا سے ملنے سے توبہ کروا لیتی لیکن اس وقت اس نے اپنے بیٹے کی زبان سے امی والے بابا کا نام سنا تو پھول کی طرح کھل اٹھی۔

"اکبر، سچ۔" اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"جی امی۔ بالکل سچ۔" اکبر نے یقین دلایا۔

"کیا بات ہوئی، کچھ تو بتاؤ۔" صابرہ بیڈ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"امی، وہ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ مجھے انہیں کچھ نہیں بتانا پڑا۔ انہوں نے سب کچھ اپنی زبان سے بتا دیا۔" اکبر نے بتایا۔

"انہیں پتہ لگ گیا کہ تم کس سلسلے میں آئے ہو۔" صابرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ امی میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہاں کیا ہوا؟" یہ کہہ کر اکبر نے ایک ایک بات اپنی ماں کو پوری تفصیل سے بتا دی۔

صابرہ نے اکبر کی بات بڑی دلچسپی سے سنی۔ اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات ہرگز

نہیں آئی کہ امی والے بابا نے کچھ بتائے بغیر ہی سب کچھ کیسے بتا دیا۔
اکبر نے پانچ پیسے کے اس سکے کو گھر میں آتے ہوئے جیب میں ڈال لیا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے اس سکے کو نکالا اور صابرہ کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔
صابرہ نے اس چمکتے ہوئے سکے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ بابا کا دیا ہوا سکہ کوئی مختلف چیز ہوگا۔ لیکن وہ تو عام سا سکہ تھا۔ بس فرق اتنا تھا کہ وہ بالکل نیا تھا جیسے ابھی ٹکسال سے باہر آیا ہو۔
"راشدہ۔" صابرہ نے اس سکے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"جی امی۔" راشدہ نے جواب دیا۔
"ذرا کوئی کپڑا تو لاؤ۔" صابرہ نے کہا۔
"کیا کپڑا امی۔" راشدہ بولی۔
"جیسی، اس سکے کو کپڑے میں لپیٹنا ہے۔ کوئی بھی پاک کپڑا لے آؤ۔ اچھا ٹھہرو۔ میں خود دیکھتی ہوں باہر مشین میں دھلا کپڑا تو ہوگا۔" صابرہ نے پوچھا۔
"جی ہاں، امی ہے۔" راشدہ نے کہا۔
صابرہ اس سکے کو مٹھی میں دبا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ دس منٹ کے بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک سبز رنگ کی پٹی تھی۔ درمیان سے وہ پٹی چوڑی تھی۔ وہاں سکہ سلا ہوا تھا۔
"کس ہاتھ پر باندھنا چاہئے۔" صابرہ نے پوچھا۔
"بیٹے ہاتھ پر ہی باندھنا چاہئے۔" اکبر بولا۔
"ٹھیک ہے۔ لاؤ بازو کھولو۔" صابرہ نے کہا۔
"اچھا امی۔" یہ کہہ کر اکبر نے کوٹ اتار دیا۔ پھر قمیض کے بٹن کھول کر آستین اوپر چڑھالی۔
تب صابرہ نے اس کے داہنے بازو پر اس سکے کو کس دیا۔ سکہ بندھوانے کے بعد اکبر نے قمیض کی آستین نیچے کرلی۔ پھر اس نے قمیض کے اوپر سے بندھی ہوئی پٹی پر ہاتھ پھیرا۔
صابرہ اس کے بازو پر سکہ باندھ کر پیچھے ہٹی تو اسے اچانک خوف سا محسوس ہوا۔
بازو پر پٹی باندھتے ہی صابرہ کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس کے کانوں میں جو آواز سنائی دی وہ کسی طرح خوش آئند نہ تھی۔
صابرہ جلدی سے اکبر کے نزدیک ہوگئی اور اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔
"کیا ہوا امی؟" اکبر اپنی ماں کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر پریشان ہوگیا۔
"مجھے لگتا ہے وہ آگیا ہے۔"
صابرہ نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔
"کون امی، آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟" اس مرتبہ راشدہ نے گھبرا کر پوچھا۔
صابرہ نے بولنے کے لئے منہ کھولا لیکن اس کی زبان جیسے گنگ ہوگئی۔
اکبر اور راشدہ حیرت اور فکر مندی سے صابرہ کو دیکھ رہے تھے۔
وہ دونوں پریشان تھے ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ صابرہ کو اچانک کیا ہوگیا تھا وہ کس کی آمد کا ذکر

کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں، زبان گنگ کیوں ہو گئی تھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن کہہ نہ پا رہی ہو، خوفزدہ ہو۔

تب اکبر نے اپنی ماں کا ہاتھ تھام لیا اور اعتماد سے بولا۔ "امی آپ چپ کیوں ہو گئیں، ثمائیہ باہر کون آگیا ہے؟"

"اکبر میں نے ابھی اس کی آواز سنی تھی وہی خوفناک آواز، اے اللہ اپنا رحم کر۔" صابرہ پر ایک کپکپی طاری ہو گئی تھی۔

"امی ہم نے تو کوئی آواز نہیں سنی۔" راشدہ نے کہا.....

"آواز تو مجھے بھی کوئی نہیں سنائی دی آپ نے پتہ نہیں کیا سن لیا۔" اکبر بولا۔

"اکبر میں جیسے ہی تمہارے بازو پر پٹی باندھ کر ہٹی تو مجھے قریب ہی میاؤں کی آواز سنائی دی تھی اور آواز کو سن کر میرے جسم کا رواں رواں کانپ جاتا ہے۔" صابرہ نے چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ "میں اس آواز کو اچھی طرح پہچانتی ہوں۔"

اکبر نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا..... "امی آپ کو وہم ہو گیا اس کمرے میں وہ نہیں ہے۔"

"ہاں شاید وہم ہی ہو گیا ہو۔" صابرہ نے کہا لیکن اس کا دل یہ بات ماننے کو تیار نہ تھا کیونکہ اس نے صاف اور واضح طور پر "میاؤں" کی آواز سنی تھی اور یہ آواز سیدپور کے جن کے سوا کسی کی نہ تھی۔

رات کو بابر علی شوروم سے گھر پہنچا تو راشدہ نے گیٹ کھولتے ہی نئی والے بابا سے ملاقات کی خوشخبری سنادی۔

پھر کھانا کھاتے ہوئے اکبر نے وہ ساری روداد جو وہ صابرہ کو سنا چکا تھا من و عن بابر علی کے سامنے دہرادی۔

بابر علی یہ سب سن کر بہت خوش ہوا اسے یوں محسوس ہوا جیسے عذاب کی گھڑیاں ختم ہو گئی ہوں، بہار آگئی ہو اور ہر طرف خوشی کا سا سماں ہو۔

رات کو اکبر بیڈ پر لیٹا تو اسے بہت دیر تک نیند نہ آئی۔

وہ بیڈ پر کروٹیں بدلتا رہا اور تصور میں وہ کچھ دیکھتا رہا جس کے لئے وقت پڑا تھا۔

اٹلی والے بابا سے ملاقات کا ایک ایک لمحہ اس کی آنکھوں میں جیسے مجسم ہو گیا تھا۔ بابا کے وہ جملے جن میں نوید مسرت دی گئی تھی اس کے کانوں میں رس گھول رہے تھے۔ گونج رہے تھے۔

"ہم تیرے لئے ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے۔ ہم ایک دو دن میں اپنا ایک سپاہی بھیجیں گے۔ ہو سکتا ہے نیاز محمد کو ہی بھیج دیں۔ نہیں تجھے اپنے گھر کا پتہ بتانے کی ضرورت نہیں تیرا گھر اب بھی ہماری آنکھوں میں ہے۔ جا اب تو جا تیری زندگی کے دکھ اب ختم ہوئے، تو جشن منانے کی تیاری کر۔"

ان جملوں کو یاد کر کے اس پر نشے کی سی کیفیت طاری ہوئی جارہی تھی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح وہ ان مسرت بھرے پیغام کو نیلم تک پہنچادے۔

نیلم کا خیال آتے ہی اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ جانے وہ کیسی ہو گی۔ اس پر کیا گزرتی ہو گی۔ وہ شعلوں کی قیدی تھی جانے کس کرب میں اس کی زندگی بیت رہی ہو گی۔

سوچتے سوچتے اس کا دماغ شل ہو گیا اس پر تھکن طاری ہو گئی وہ نیند کی آغوش میں جا گیا تب اسے
کچھ محسوس ہوا جیسے اس کے سرہانے کوئی آ بیٹھا ہے۔
کسی کی موجودگی کا احساس کر کے وہ فوراً اٹھ بیٹھا اٹھ کر اس نے کمرے کی لائٹ جلائی تب اس نے
روشنی میں دیکھا کہ نیلم اس کے سرہانے افسردہ بیٹھی ہے۔
وہ جلدی سے اس کے قریب آیا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بہت محبت سے بولا۔
"نیلم تم کیسی ہو؟"
"اکبر تم کیسے ہو؟" وہ بڑی بے قراری سے بولی۔
"میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن تم یہاں کیسے آ گئیں اس جن نے تمہیں کیا آزاد کر دیا۔"
"میں کہاں ہوئی ہوں آزاد، اکبر میں جل رہی ہوں۔ اس گیلی لکڑی کی طرح جو جلتی کم ہے دھواں
زیادہ دیتی ہے۔ میرے جسم سے بھی دھواں اٹھ رہا ہے اور تم یہاں آرام سے سو رہے ہو۔ تمہیں میری
بالکل فکر نہیں۔ تم نے مجھے بھلا دیا ہے۔ اس جن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے کس قدر ظالم ہو تم
اکبر۔"
"نہیں نیلم ایسا نہ کہو میں تمہیں کیسے بھلا سکتا ہوں تم میری بیوی ہو تم ہر لمحہ میری آنکھوں میں رہتی ہو
اس تم میری آنکھوں سے اسی وقت نکل سکتی ہو جب یہ آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو جائیں۔" اکبر نے بڑے
جذباتی انداز میں کہا.....
"اللہ نہ کرے اکبر، کیسی بات کرتے ہو۔" نیلم نے یہ کہہ کر اپنا نرم ملائم ہاتھ اس کے ہونٹوں پر
رکھ دیا۔
تب ہی وہ کالا بلا کہیں سے بیڈ پر کودا اور میاؤں کی آواز نکالنے کے بجائے انسانی آواز میں بولا۔
"نیلم تم یہاں بیٹھی ہو، میں وہاں تمہیں تلاش کر رہا تھا۔"
"تم یہاں کیوں آئے ہو، میں اب تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی، میں تمہارے ساتھ نہیں جانا
چاہتی۔ میں اب اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔" نیلم نے سخت لہجے میں
کہا.....
لیکن کالے بلّے پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا وہ خاموشی سے بیڈ پر کھڑا ہوا اسے اپنی لال لال آنکھوں سے
گھورتا رہا پھر بولا۔ "خیریت اسی میں ہے کہ تم واپس میرے ساتھ چلی چلو۔"
"میں نے تم سے ایک بار کہہ دیا نا، میں اب کہیں نہیں جاؤں گی۔"
"یہ کیا بکواس ہے۔" اچانک کالے بلے کو غصہ آ گیا۔ "کیا تم جانتی نہیں ہو کہ کس سے بات
کر رہی ہو۔"
"ہاں میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں کس سے بات کر رہی ہوں۔ میں سید پور کے جن سے بات
کر رہی ہوں۔"
"تم اگر سید پور کے جن سے واقف ہو تو پھر یہ بات بھی جانتی ہو گی کہ میں اپنی ضد کا کس قدر پکا ہوں۔
بہتر ہو گا کہ تم خاموشی سے میرے ساتھ چلی چلو۔"
"میں نہیں جاؤں گی۔" نیلم نے بڑے غصے میں کہا۔

تب کالے بلّے نے اپنی لال لال آنکھوں سے نیلم کو گھور کر دیکھا نیلم نے ایک زوردار چیخ ماری۔

نیلم کی چیخ کے ساتھ ہی کمرے کا منظر بدل گیا۔

اب وہاں نیلم تھی اور نہ کالا بلّا لیکن پردوں کی پھڑپھڑاہٹ کی آواز آرہی تھی کہیں سے۔

اکبر نے چاروں طرف دیکھا تب اسے ایک سلاخوں والی کھڑکی نظر آئی اس نے اندر جھانک کر دیکھا وہاں ایک کبوتری کے پاؤں میں ایک زنجیر بندھی ہوئی اور اس زنجیر کے سرے پر لوہے کا ایک بھاری گولا تھا اور کبوتری آزاد ہونے کے لئے اپنے پر پھڑپھڑا رہی تھی۔

اس کبوتری کو دیکھ کر اکبر کو فوراً نیلم کا خیال آیا وہ چیخ کر بولا۔ "نیلم، یہ تم ہو؟"

اس کبوتری نے اپنی خوبصورت گردن موڑ کر اکبر کی طرف دیکھا وہ سہمی ہوئی تھی اس کی حالت قابل رحم تھی۔ اکبر کی چھٹی حس نے بتایا کہ یہی نیلم ہے۔

اکبر نے اس کھڑکی کی سلاخوں کو توڑنے کی کوشش کی پھر اس نے خود کو ہاتھی کی سونڈ پر محسوس کیا وہ کوئی بہت بڑا ہاتھی تھا جو اسے سونڈ پر اٹھائے جنگل میں بھاگ رہا تھا۔

ہاتھی سے بچنے کے لئے اس نے ایک درخت کی شاخ پکڑلی اور اس سے جھول گیا۔ ہاتھی "ہے" نکل گیا لیکن درخت کی شاخ کمزور تھی وہ ان کا وزن نہ سہار سکی ٹوٹ گئی اکبر زمین پر گرا۔

تب خوف سے اس کی آنکھ کھل گئی اس نے خود کو بیڈ کے نیچے قالین پر پایا۔

کمرے میں اندھیرا تھا اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا اس نے جلدی سے اٹھ کر کمرے کی لائٹ جلائی سرہانے رکھا ہوا ایک گلاس پانی پیا۔

اب بھی اس کے جسم میں لرزش تھی وہ خوفزدہ نظروں سے کمرے کی دیواروں کو گھور رہا تھا۔

زنجیر میں جکڑی ہوئی کبوتری کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی یہ کیسا بھیانک خواب تھا۔

پھر اسے نیند نہ آئی وہ صبح تک پڑا کروٹیں بدلتا رہا کبھی یہ بھیانک خواب اس کے لئے کانوں کی چیخ بن جاتا اور کبھی املی والے بابا سے حوصلہ افزاء ملاقات پھول بھری زندگی کی نوید دیتی۔ رات بھر دو متضاد کیفیتیں اس پر طاری رہیں وہ سونے کی کوشش کے باوجود نہ سو سکا۔

صبح کو راشدہ جب اسے اٹھانے آئی تو وہ بے خبر سونے کے بجائے دیدے پھاڑے چھت کو گھور رہا تھا۔ راشدہ نے کمرے میں داخل ہو کر اسے غور سے دیکھا پھر مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔

"اکبر بھائی آپ جاگ رہے ہیں، میں تو آپ کو اٹھانے آئی تھی۔" راشدہ نے کہا.....

"ٹھیک ہے میں آنکھیں بند کرلیتا ہوں تم اٹھاؤ۔" یہ کہہ کر اکبر نے آنکھیں بند کرلیں۔

"اکبر بھائی یہ آپ کی آنکھوں کو کیا ہوا ایک دم لال انگارہ ہو رہی ہیں۔"

"راشدہ میں رات کو سو نہیں سکا۔" اکبر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اور تھوڑی بہت دیر جو نیند آئی اس میں ایک بھیانک خواب دیکھ لیا۔"

"کیسا خواب، اکبر بھائی۔" راشدہ نے فکر مندی سے کہا۔

"میں نے نیلم کو قید میں دیکھا ہے۔ نیلم کو کالے بلّے نے کبوتری بنا دیا ہے وہ ایک کوٹھری میں بند ہے

ہی ہے پاؤں میں زنجیر ہے اور اس زنجیر کے سرے پر ایک بھاری گولا ہے وہ اڑنے کیلئے پر پھڑپھڑاتی ہے۔ ہیں پھڑپھڑا کر بے حد بیری آنکھوں میں جیسے منجمد ہو گیا ہے۔ کبوتری کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اب بھی رہا ہے خواب کا پیچھا کر رہی ہے جانے اس خالی گھر میں نیلم کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔" اکبر نے افسردگی پھیر کاؤں میں کہا۔

"اکبر بھائی آپ پریشان نہ ہوں، بس دو چار دن کی اور بات ہے۔ اللہ نے چاہا تو نیلم بھابھی کو اس جن سے نجات مل جائے گی۔" راشدہ نے پرامید لہجے میں کہا۔

"کیسے۔" اکبر نے پوچھا۔

"ارے بھول گئے، امی والے بابا نے آپ سے نہیں کہا کہ تیری زندگی کے دکھ اب ختم ہوئے تو جشن منانے کی تیاری کر۔" راشدہ نے بتایا۔

"ہاں کہا تو تھا لیکن راشدہ کیا واقعی ایسا ہو جائے گا۔" اکبر پر بے یقینی کی کیفیت طاری تھی۔

"ہاں اکبر بھائی کیوں نہیں ہو گا، اللہ والے لوگوں کے پاس بڑی طاقت ہوتی ہے۔"

"اچھا یہ تجھے کس نے بتایا۔" اکبر نے مسکرا کر پوچھا۔

"اکبر بھائی میرا مذاق نہ اڑائیں۔" راشدہ نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "پتہ ہے اکبر بھائی جب نیلم بھابھی خالی گھر سے آجائیں گی تو میں انہیں دوبارہ دلہن بناؤں گی۔ ہم ساری رسمیں پھر سے کریں گے گیت گا کر گھر پر روشنی کروائیں گے، خوب جشن منائیں گے خوب بلا گلا کریں گے۔"

"جب اتنا کچھ ہو گا تو باراتی بیچاروں نے کیا قصور کیا ہے، انہیں بھی اکٹھا کر لینا۔"

"ہیں ٹھیک ہے بلکہ ایسا کریں گے جتنے لوگ اس وقت بارات میں شامل تھے۔ ان سے اسٹیشن جانے کو کہہ دیں گے پھر ہم لوگ بس میں بارات لے کر گھر واپس آئیں گے۔"

"تو پھر ایک کام اور کرو۔"

"کیا کام بھی دوبارہ پڑھوا دینا۔"

"اکبر بھائی اب اتنا نہ پھیلیں۔" راشدہ نے مسکرا کر کہا۔

"کچھ زیادہ پھیل گیا۔"

"اور کیا۔"

"اچھا چلو سکر جاتا ہوں....." اکبر نے اپنا جسم سمیٹتے ہوئے کہا..... "بھئی ایسا تو ہو سکتا ہے کہ جشن میں خالہ خالو کو بھی شامل کر لیا جائے۔"

"نہیں نہیں، ایسا ہو سکتا ہے۔ ہم لاہور فون کر دیں گے، وہ لوگ آجائیں گے۔"

"کتنا مزہ آئے گا۔" اکبر نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔

"بہت مزہ آئے گا، اتنا مزہ آئے گا کہ میں سوچ سوچ کر دیوانی ہوئی جا رہی ہوں۔"

"راشدہ ابھی سے اتنی دیوانی نہ ہو، مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ جانے کیا ہو جائے۔ کہیں ہمارے خواب بکھر نہ جائیں۔"

"اکبر بھائی خدا کے واسطے....." راشدہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ

دیا۔ "کوئی بدفال نہ نکالیں۔ اچھی سوچ رکھیں۔"

"راشدہ۔ میری سوچ تو اچھی ہے لیکن میری سوچ سے کیا ہوتا ہے۔ میں نے تو اب تک نیک دیکھنا نہ کی خوشیاں میرے نزدیک آ کر واپس لوٹ گئیں..... اور میں حسرت سے اپنا دامن پھیلائے رہ گیا....." اکبر نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"انشاء اللہ۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ اکبر بھائی جانے کیوں میرا دل اندر سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اب ایسا نہیں ہوگا....." راشدہ نے بڑے یقین سے کہا۔

"تو بس ہے میری۔ تیرا دل پکار پکار کر نوید نہیں دے گا تو اور کس کا دے گا....."

"اچھا۔ اب اٹھ جائیں۔ امی ناشتہ تیار کر چکی ہوں گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ مجھے اتنی دیر غائب دیکھ کر یہاں آنے ہی والی ہوں۔"

"پھر تو مجھے فوراً ہاتھ روم کا رخ کر لینا چاہئے۔" اکبر نے تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اکبر باتھ روم میں گھساتو راشدہ مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

اکبر نے منہ ہاتھ دھوتے ہوئے آئینے پر نظر ڈالی تو اسے اپنی شکل بدلی بدلی سی دکھائی دی۔ اس کی آنکھیں واقعی خاصی سرخ ہو رہی تھیں۔ رات کی جگار نے اس کی آنکھوں میں جیسے شعلے بھر دیئے تھے۔ اس کا رنگ بھی کچھ پژمردہ سا ہو رہا تھا۔ چہرے پر ایک عجیب سی ادا سی پھیلی تھی۔ جانے کیوں اسے اپنی ہی شکل اجنبی سی لگی۔

اکبر نے جلدی جلدی برش کر کے گرم پانی کے چھینٹے منہ پر مارے لیکن چہرے کی بشاشت واپس نہ آئی۔ اس نے سوچا کچھ دیر گرم پانی کا شاور لے لے۔

ابھی وہ گرم پانی کے مزے لے ہی رہا تھا کہ کسی نے دروازہ بجایا۔

"کون ہے؟" اکبر نے اپنا سر شاور کے نیچے سے ہٹا کر پوچھا۔

"میں ہوں۔" راشدہ کی باہر سے آواز آئی۔

"راشدہ میں آرہا ہوں بس نما چکا۔"

"اکبر بھائی فوراً باہر آجائیں۔ کوئی آیا ہے۔" راشدہ نے اطلاع دی۔

"کون آیا ہے؟ ماموں آئے ہیں کیا؟" اکبر نے پوچھا۔

"نہیں، دروازے پر کوئی اور ہے۔ وہ آپ کو پوچھ رہا ہے۔"

"راشدہ۔ ابو کہاں ہیں۔ ان سے کہو۔ اس کو اندر بلا کر بٹھائیں۔"

"ابو گئے تھے دروازے پر۔ لیکن وہ اندر نہیں آیا۔ وہ بس آپ کو بلائے جا رہا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے میں آرہا ہوں۔" اکبر نے کہا۔ پھر وہ پورا نلکا کھول کر نلکے کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کے سر اور جسم پر صابن لگا ہوا تھا۔ اس نے جلدی جلدی جسم دھویا اور چند منٹ میں باتھ روم سے باہر آگیا۔

اس کی سمجھ میں ابھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ اتنی صبح اس سے ملنے کون آ پہنچا۔ اگر اس کا کوئی دوست ہوتا تو وہ اندر آجاتا۔ ابو اس کے سارے دوستوں سے واقف تھے۔ پھر راشدہ بھی بتا دیتی کہ آپ کا فلاں دوست آیا ہے۔ دروازے پر آنے والا کوئی اجنبی تھا۔ ایسا اجنبی جسے صرف اکبر جانتا تھا۔ تب اکبر کا

جیلن فوراً ہی والے بابا کی طرف گیا۔
انہوں نے اپنا کوئی ساتھی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا کیا ان کا سپاہی آ پہنچا۔
سوچ کر اس کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک جوش سا بھر گیا۔
کمرے کے دروازے پر بابر علی اس کا منتظر تھا۔ اکبر نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "ابو۔ باہر کون ہے؟"
"کوئی ملنگ ہے۔" بابر نے کہا۔ "نہ اپنا نام بتاتا ہے اور نہ کام۔ وہ ایک ہی بات کہتا ہے اکبر کو بلاؤ۔"
"پھر وہ کہاں ہے؟"
"کوئی ملنگ قسم کا آدمی ہے۔"
"سفید شلوار اور ایک روئی کی بنڈی پہنی ہوئے ہے۔ وہ ملنگ تو نہیں دکھائی دیتا۔" بابر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔
"اچھا میں دیکھتا ہوں۔" اکبر نے تیزی سے گھر سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔
اسے یاد آیا کہ کلفٹن پر اسے جو ملنگ ملا تھا جس کا نام الٰہی والے بابا نے نیاز محمد بتایا تھا۔ اس نے تو اس دن محض ایک تہبند باندھا ہوا تھا اور اس کے چہرے سے کہیں سے ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اسے سردی محسوس ہو رہی ہے۔ اس وقت جو دروازے پر تھا وہ نیاز نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ابو کے بقول وہ سفید شلوار اور ایک روئی کی صدری پہنے ہوئے تھا۔ ہو سکتا ہے الٰہی والے بابا نے کسی اور شخص کو بھیج دیا ہو کیونکہ انہوں نے یہ بات یقین سے نہیں کہی تھی کہ وہ کس کو بھیجیں گے۔ البتہ سپاہی بھیجنے کی بات ضرور کہی تھی۔
اکبر انہی خیالات میں الجھا جب گیٹ پر پہنچا اور اس نے اچک کر گیٹ کے اوپر سے دیکھا تو اسے اپنے سامنے ایک سر نظر آیا۔ وہ جو بھی تھا اس کا چہرہ سڑک کی طرف تھا۔ اکبر دیکھ نہیں پایا کہ وہ کون شخص ہے۔
پھر اکبر چھوٹے گیٹ سے باہر نکلا اور پھر بولا۔ "ہاں جناب۔"
اکبر کی آواز سن کر وہ شخص پلٹا۔ کالی داڑھی اور گردن پر پڑے بال، نکلتا ہوا قد، چمکتا ہوا چہرہ وہ اکبر کو دیکھ کر مسکرایا۔
"آگیا تو۔"
"ارے۔ آپ۔" اکبر نے اسے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ نیاز محمد ہی تھا۔ سمندر کے کنارے ملنے والا ملنگ۔
اس لباس میں وہ آج بالکل ملنگ نہیں لگ رہا تھا۔ "ہمارے ساتھ چل۔" نیاز محمد نے کہا۔
"کہاں بابا؟" اکبر بولا۔
"سوال نہ کر۔ دیر نہ کر۔" نیاز محمد نے اس کی پیشانی پر انگشت رکھی۔
"کہیں دور چلنا ہے تو گاڑی نکال لوں۔" اکبر نے پوچھا۔
"خالی گھر تک جانا ہے۔ آج وہاں تماشا ہو گا۔ گاڑی کو چھوڑ پیدل چل پیدل۔"
"اگر آپ اجازت دیں تو میں کوٹ لے آؤں اپنا۔"
گیٹ کے پیچھے بابر علی موجود تھا۔ اس نے کوٹ کا ذکر سنا تو فوراً بولا "بیٹے میں لاتا ہوں تمہارا کوٹ۔ تم

بیس ٹھہرو۔"

"مجھے بہت سردی لگتی ہے؟" ملنگ نے پوچھا۔

"نہا کر نکلا ہوں۔ اس لئے کچھ محسوس ہو رہی ہے۔ ویسے نہیں لگتی۔" اکبر نے جواب دیا۔

"ہمارے بابا کا دیا ہوا سکہ تو نے باندھ لیا۔" نیاز محمد نے پھر سوال کیا۔

"جی ہاں۔ میں نے باندھ لیا۔" اکبر نے کہا۔

"دکھا۔ بازو۔" نیاز محمد نے حکم دیا۔

اکبر نے قمیض کی آستین اوپر کر کے بازو پر بندھا ہوا سکہ دکھایا نیاز محمد نے اس سکے پر اپنی انگلی رکھی اور بولا۔ "معلوم ہے یہ کیا ہے؟"

"سکہ ہے پانچ پیسے کا۔"

"یہ سکہ نہیں ہے۔ یہ ایم بم ہے۔ ایٹم بم۔"

"لو بیٹے یہ کوٹ۔" بابر علی نے چھوٹے گیٹ سے اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ میرے والد ہیں۔" اکبر نے اپنے باپ کا تعارف کرایا۔

"جانتا ہوں میں۔" نیاز محمد نے بے نیازی سے کہا۔ "اور ابو یہ نیاز محمد صاحب ہیں۔ وہی جو سمندر کے کنارے ملے تھے۔"

"اچھا اچھا۔" بابر علی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

"چل بھئی اکبر جلدی کر دیر نہ کر۔"

"اکبر کیا میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟" بابر علی نے پوچھا۔

"ہم اکبر کے ساتھ ہیں اب کسی کو اس کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔" نیاز محمد نے تڑک کر کہا۔

"جی بہتر ہے۔" بابر علی نے بڑی فرمانبرداری سے کہا اور پھر اکبر سے مخاطب ہوئے۔ "جاؤ بیٹے خدا حافظ۔"

بابر علی نے یہ کہہ کر گیٹ بند کر لیا اور نیاز محمد نے آگے قدم بڑھائے۔ اکبر بھی اس کے پیچھے چلا۔ نیاز محمد نے پہلے بہت تیزی سے آگے قدم بڑھائے اتنی تیزی سے کہ اکبر کو یہ گماں ہوا جیسے وہ دوڑنے لگا ہو۔

جتنی تیزی سے وہ آگے گیا تھا اتنی ہی تیزی سے پیچھے آیا اب وہ گھوم رہا تھا۔ رقص کر رہا تھا اس کے پاؤں سے چھن چھن کی آواز آ رہی تھی۔

اکبر کو اس چھن چھن کی آواز پر بڑی حیرت ہوئی اس نے بغور ملنگ کے پاؤں دیکھے وہ ننگے پاؤں ضرور تھا لیکن اس کے پاؤں میں گھنگھرو نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

وہ ملنگ تیزی سے رقص کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اس پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی اگرچہ اس کرائے کے گھر سے خالی گھر کا فاصلہ زیادہ نہ تھا لیکن اتنا کم بھی نہ تھا کہ چند منٹوں میں طے کر لیا جاتا۔

اس ملنگ نے یہ راستہ رقص کرتے ہوئے طے کیا۔

فقیر کرتے اس ملنگ کے ساتھ چلتے ہوئے اکبر کو شرم آ رہی تھی اس لئے رقص کرتے ہوئے اس
کو دیکھنے کے لئے راہ گیر رک جاتے تھے ایک دو گاڑی والوں نے بھی اس تماشے کو رک کر

دیکھا۔ اکبر ذرا پیچھے رہ جاتا تو وہ ملنگ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ کر لیتا۔

تھوڑی دیر میں اکبر کو بڑی شرم آتی ایک پڑھا لکھا لڑکا ایک فقیر کے ساتھ کیوں لگا ہوا تھا۔
رقص میں اکبر اس کے ساتھ چلتا ایک نوجوان لڑکا راہ گیروں کے لئے تماشا بن جاتا وہ اسے پلٹ
پلٹ کر ناچتے اور اس کو دیکھتے جاتے۔

اب وہ گھر بہت نزدیک آ رہا تھا نیاز محمد کے رقص میں تیزی آتی جاری تھی اس پر ایک عجیب جذب
کی کیفیت طاری تھی۔ اس کے پیروں سے آتی ہوئی گھنگروؤں کی آواز اکبر کو مسلسل حیران کر رہی
تھی۔

پھر خالی گھر آ پہنچا۔ خالی گھر کے سامنے پہنچتے ہی نیاز محمد نے ایک نعرہ مستانہ مارا اور تیز تیز دھمال
کرنے لگا۔ دو انگلی اٹھائے "حق حق" کر رہا تھا اس کے پیروں میں گھنگھرو بج رہے تھے۔

جب اچانک ہی اکبر کو خیال آیا کہ وہ خالی گھر کے گیٹ پر پڑے تالے کی چابی لانا تو بھول ہی
گیا۔

وہ سوچنے لگا کیا کرے نیاز محمد کو بتا کر گھر سے جا کر چابی لے آئے یا نیاز محمد خود اس سے مخاطب ہو تو
پھر وہ اسے چابی کے متعلق بتائے۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک نیاز محمد نے رقص بند کر دیا اور پھر وہ تیزی سے گیٹ کی طرف
بڑھا۔ اس نے تالا ہاتھ میں پکڑا تو وہ اس طرح کھل گیا جیسے بند ہی نہ تھا۔

تالا کھول کر نیاز محمد نے گیٹ کے دونوں پٹوں کو زور سے دھکیلا۔

گیٹ کھلتا چلا گیا۔

نیاز محمد نے گیٹ کے درمیان کھڑے ہو کر خالی گھر پر نظر ڈالی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ خالی
گھر میں بچھی والی کھلیلی کی سن گن لینا چاہتا ہو۔

کچھ توقف کے بعد اس نے نعرہ مستانہ لگایا۔ "حق حق۔"

اور پھر خالی گھر کے دروازے پر آنکھیں گاڑ دیں اور کانوں سے کچھ سننے کی کوشش کی لیکن نیاز محمد کو
کچھ دکھائی دیا نہ سنائی دیا۔

"بھاگ گیا کیا۔" نیاز محمد نے جیسے خود سے سوال کیا۔

پھر گیٹ کے اندر داخل ہوا اور چند قدم آگے جا کر رک گیا۔ کھڑے کھڑے گردن گھمائی اور اکبر کو
اندر آنے کا اشارہ کیا۔

جب وہ اس کے نزدیک آ گیا تو نیاز محمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "ڈر تو نہیں لگ
رہا۔"

"نہیں۔ آپ کے ہوتے ہوئے ڈر کیسا؟" اکبر نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"بس، پھر گیٹ بند کر دے اور آجا میرے ساتھ۔" نیاز محمد نے اکبر کو حکم دیا۔
"اکبر نے جلدی سے گیٹ کے دونوں پٹ ملا کر اندر سے کنڈا چڑھا دیا۔
نیاز محمد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اکبر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ہاتھ شعلے پر رکھا گیا ہو۔ اتنی تپش تھی اس بلنگ کے ہاتھ میں۔
نیاز محمد نے گھر کے دروازے کی طرف رخ کرنے کے بجائے وہ لان میں داخل ہو گیا۔ لان کے درمیان پہنچ کر اس نے ایک جگہ منتخب کی اور ہری ہری گھاس پر بیٹھ گیا۔ اس نے اکبر سے اشارے سے کہا کہ وہ اس کی پیٹھ کے پیچھے بیٹھ جائے۔
اکبر اس کی پیٹھ کے پیچھے بیٹھ گیا بلکہ چھپ گیا۔
نیاز محمد نے آستی پاشی مار کر آسن بدلا چند تسبیح پڑھا اور ایک انگلی اٹھا کر اپنے چاروں طرف گھمائی شاید اس نے اپنے اور اکبر کے گرد حصار باندھا تھا۔
جب حصار باندھ کر اس نے خالی گھر کے دروازے پر نظریں جما دیں..... دروازہ بند تھا۔
جب یہ لوگ گیٹ میں داخل ہوئے تھے تو فرش دھلا ہوا محسوس ہوا تھا..... لان کے اطراف میں جو پھول لگے ہوئے تھے۔ وہ بھی تر و تازہ تھے..... لگتا تھا جیسے انہیں باقاعدگی سے پانی ملتا رہا ہو۔
دروازہ ابھی تک بند تھا..... اکبر نیاز محمد کے کندھے سے جھانک کر مکان کے دروازے پر نظر رکھے ہوئے تھا..... اچانک اکبر کو ایسا محسوس ہوا جیسے دروازہ تھوڑا سا کھلا ہو۔
"بابا، کیا آپ نے دیکھا؟" اکبر نے سرگوشی میں کہا..... "دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔"
"ہاں، وہ جھانک کر گیا ہے۔" نیاز محمد نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔
نیاز محمد نے ٹھیک کہا تھا..... وہ واقعی دروازے پر آیا تھا..... اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر دیکھا تھا..... وہ دونوں سامنے ہی بیٹھے تھے۔
اس نے ایک نظر دونوں کو دیکھا اور پھر وہ بے پاؤں واپس ہو گیا..... اس نے بیڈ روم کا رخ کیا۔
نیلم بیڈ پر لیٹی محو خواب تھی..... اس کے چہرے پر ویرانی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔
سیدپور کے جن نے جو اس وقت کالے بلّے کے روپ میں تھا..... بیڈ پر چھلانگ لگائی اور اس کے منہ کے نزدیک اپنا منہ لے جا کر زور سے "میاؤں" کی آواز نکالی۔
اس خوفناک آواز کو سن کر نیلم کی فوراً آنکھ کھل گئی..... وہ پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی..... وہ کالا بلّا نہ رہا تھا..... شہزادے کے روپ میں آچکا تھا..... اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔
"کیا ہوا قرل؟" نیلم، سیدپور کے جن سے مخاطب ہوئی۔
"نیلم وہ لوگ باہر بیٹھے ہیں۔" سیدپور کے جن کے لہجے میں ہلکی سی لرزش تھی۔
"کون لوگ؟" نیلم نے حیرت سے پوچھا۔
"ایک تمہارا شوہر ہے اور دوسرا اٹلی والے بابا کا ایک چیلا ہے۔ نیلم تم فکر نہ کرو۔ میں اس نیاز محمد کا وہ حشر کروں گا کہ یہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔"

اکبر کا ذکر سن کر نیلم کے چہرے پر ایک دم رونق سی آگئی۔ "وہ آئے ہیں؟"

"ہاں وہ آئے ہیں۔" سید پور کے جن نے غصے سے کہا ..... "ان کے ابھی تک ہوش ٹھکانے نہیں آئے۔ آج انہیں بھی تھوڑا سا سبق سکھائے دیتا ہوں۔"

"میرے اکبر کو کچھ نہ کہنا۔ ورنہ یاد رکھو، میں خودکشی کرلوں گی۔" نیلم نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا ..... اور بیڈ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

یہ سن کر سید پور کے جن نے قہقہہ لگایا۔

سید پور کے جن کا قہقہہ بڑا بھیانک تھا۔

"تم کروگی خودکشی۔ ہا ہا ہا۔" سید پور کا جن بے تحاشہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ذرا کر کے دکھاؤ۔"

"ہاں میں جانتی ہوں کہ میں اپنی مرضی سے مر بھی نہیں سکتی۔ تم مجھے مرنے نہیں دوگے۔ لیکن قرل کیا تم سمجھتے ہو کہ میں زندہ ہوں۔ اگر یہی زندگی ہے تو پھر موت کیا ہوگی۔ اب یہ سب کچھ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں اس تنہا مکان میں کسی آسیب کی طرح منڈلاتی رہتی ہوں۔ قرل میں انسان ہوں۔ مجھ پر رحم کرو۔ یہ آگ، یہ بھڑکتے ہوئے شعلے، یہ دہکتا تندور۔ میری تو روح تک جھلس گئی ہے اس میں مجھے اب معاف کردو۔ مجھے جانے دو۔ دیکھو میرا اکبر مجھے لینے آپہنچا ہے۔" بولتے بولتے نیلم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

سید پور کے جن نے نیلم کے آنسوؤں کی پروانہ کی۔ وہ تھوڑا اس کے نزدیک ہوا اور اپنا منہ اس کے کان کے پاس لاکر بولا۔ "تمہارا اکبر تمہیں لینے نہیں آیا، یہاں مرنے آیا ہے۔"

"نہیں قرل، خدا کے واسطے ایسا نہ کرنا۔" نیلم کانپ اٹھی۔

"مجھے سبق نہ پڑھاؤ، میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ تم بیڈ پر آرام سے لیٹ جاؤ، اور اس وقت تک باہر نہ نکلنا جب تک میں تم سے باہر آنے کو نہ کہوں۔" یہ کہہ کر قرل نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

"تم کہاں جارہے ہو، قرل۔"

"میں ان لوگوں کے سامنے جارہا ہوں، اب گھمسان کا رن پڑے گا۔ میں جانتا ہوں کہ نیاز محمد کوئی معمولی انسان نہیں ہے لیکن میں بھی کوئی معمولی جن نہیں ہوں۔ بہت زبردست ہوں اب زبردست کا زبردست سے مقابلہ ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ میرا بال بھی بیکا نہ کرسکے گا۔ یہاں تم کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔ تم کمرے میں آرام کرو۔" یہ کہہ کر سید پور کا جن کمرے سے روتا ہوا بھاگے گا۔ اب میں جارہا ہوں۔

جاتے جاتے وہ دروازہ بھی بند کر گیا۔ نیلم تڑپ کر دروازے تک آئی۔ اس نے ہینڈل تھما کر دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ نہ کھلا۔ سید پور کا جن باہر نکلتے نکلتے دروازہ مقفل کر گیا تھا۔

نیلم اب کمرے میں تنہا رہ گئی۔

اس وقت اس کی بہت بری حالت تھی۔ دل میں طوفان اٹھ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے دل پھٹ جائے گا۔ آنکھوں میں آنسو امڈ امڈ کر آرہے تھے۔ اس کے جسم پر لرزش طاری تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

اکبر اسی گھر کے احاطے میں تھا اور وہ اس سے مل نہیں سکتی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ نہیں سکتی تھی۔ یہ کیسی بے بسی تھی۔ یہ کیسی قید تھی۔

"اے اللہ مجھ پر رحم کر۔" اس کے ہاتھ بے اختیار دعا کے لئے اٹھ گئے۔ آنسو بھری آنکھیں اور دکھے ہوئے دل سے اس نے اللہ کو پکارا۔ اس نے تڑپ تڑپ کر سسک سسک کر اپنی رہائی کی دعا مانگی۔ "اے اللہ مجھے اس جن سے نجات دلا دے۔ مجھے میرے شوہر سے ملا دے۔ اے اللہ مجھ پر رحم کر۔"

دعا مانگتے مانگتے اس کی آنکھوں میں غنودگی اترنے لگی۔ اس نے اپنا سر نیچے پر رکھ دیا۔ وہ بھی اسی حالت میں تھی۔ بس اسی طرح روتے روتے دعا مانگتے سو گئی۔

سید پور کا جن نیلم کے کمرے سے نکلتے ہی کالا بلا بن گیا۔ پھر وہ غصے میں بھرا ہوا گھر کے بند دروازے کی طرف چلا۔ اس نے اپنے ایک پیر سے دروازہ کھولا اور پھر باہر نکل گیا۔

"آ گیا۔" نیاز محمد نے کالے بلے کو دروازے سے نکلتے دیکھ کر نعرہ لگایا۔

اکبر نے جلدی سے اس کے کندھے سے جھانک کر دیکھا۔ کالا بلا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"ہاں۔ یہی ہے وہ۔" اکبر نے کالے بلے کو دیکھ کر تصدیق کی۔

"اب دیکھ تماشا۔" نیاز محمد نے جھوم کر کہا۔ پتہ نہیں اس نے یہ بات اکبر سے کہی تھی یا کالے بلے کو تنبیہہ کی تھی۔

نیاز محمد نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور پھر اس طرح ہاتھ کو جھٹکا دیا جیسے کالے بلے پر پتھر کھینچ مارا ہو۔ نیاز محمد کے ہاتھ میں کوئی چیز دکھائی نہیں دی تھی۔

وہ نادیدہ پتھر کالے بلے کو ٹھاہ کر کے لگا۔ وہ بلبلا گیا۔ اس نے غرا کر نیاز محمد کو دیکھا۔

تب ہی نیاز محمد کی سماعت سے ایک آواز ٹکرائی۔

"نیاز محمد جا چلا جا۔ تیری خیریت اسی میں ہے۔"

"میں چلا جاؤں۔" نیاز محمد نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "اب تجھے جانا ہوگا۔ تجھے یہ گھر چھوڑنا ہوگا۔ تجھے اس معصوم لڑکی کی جان چھوڑنا ہوگی۔"

"بہت مشکل ہے۔" نیاز محمد کے کانوں سے آواز ٹکرائی۔

اس مرتبہ نیاز محمد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے پھر ہاتھ اوپر اٹھایا اور ایک نادیدہ پتھر کالے بلے پر کھینچ مارا۔ پتھر لگتے ہی کالا بلا کئی قلابازیاں کھا گیا۔

"دیکھ نیاز محمد اب بھی مان جا۔" نیاز محمد کے کانوں سے آواز ٹکرائی۔

"اب تجھے ماننا ہوگا۔" نیاز محمد نے زور سے کہا۔ "ڈرتا کیوں ہے۔ آگے کیوں نہیں آتا میں بھی دیکھوں تو کتنا زبردست ہے۔"

"تو میرے سامنے مچھر جیسا ہے۔ تجھے اہلی والے بابا نے کیوں بھیج دیا۔ وہ میرے مقابلے پر خود کیوں نہیں آیا۔" ادھر سے آواز آئی۔

"پہلے تو مجھ سے مقابلہ کر لے۔ پھر میرے پیر کی بات کرنا۔ تیرے لئے اہلی والے بابا کا ایک سپاہی

ہے۔" نیاز محمد نے زور سے کہا۔ "لے سنبھل۔"

نیاز محمد نے پھر ایک نادیدہ پتھر اس کی طرف پھینکا۔ پتھر کھاتے ہی کالا بلا لڑھک کر کئی قدم پیچھے جا گرا۔ لیکن پھر وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی لال لال انگارہ آنکھوں سے نیاز محمد کو گھور کر دیکھا۔

پھر نیاز محمد اور اکبر پر پتھر برسنے لگے۔

یہ بڑے بڑے پتھر تھے۔ خلاء میں اچانک نمودار ہو کر ان پر برس رہے تھے۔ لیکن کوئی پتھر ان کو نہیں لگا۔ پتھر ان کے آس پاس گر رہے تھے، سروں سے گزر رہے تھے بس یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی پتھر اب لگا کب لگا۔

اکبر ان پتھروں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو رہا تھا۔ وہ پتھر اتنے بڑے تھے کہ اگر ایک بھی سر پر لگ جاتا تو یقینی طور پر بھیجہ باہر آ جاتا۔

چند منٹ تک پتھروں کی یہ بارش جاری رہی۔ ان کے آس پاس پتھروں کا ڈھیر لگ گیا۔ پھر خود بخود پتھروں کی یہ برسات تھم گئی۔

اب اپنی طاقت دکھانے کا نیاز محمد کا نمبر تھا۔

نیاز محمد نے جلدی جلدی اپنی انگلیوں پر کچھ پڑھا اور انگشت شہادت کو منہ کے قریب لا کر زور سے پھونک ماری۔

تب ہی اچانک کالے بلّے کے ارد گرد آٹھ دس موٹے موٹے چوہے نمودار ہو گئے۔ وہ نمودار ہوتے ہی کالے بلّے پر حملہ آور ہوئے۔ کسی نے اس کی ٹانگ پکڑی کسی نے دم میں کاٹا۔ کسی نے اس کا کان کترا۔ کالا بلا ناچ گیا۔ وہ ایک چوہے کو پکڑ کر اس کے تھپڑ لگاتا تو اتنی دیر میں دوسرا چوہا اس کی اچھی خاصی مزاج پرسی کر دیتا۔

نیاز محمد اور اکبر دور بیٹھے اطمینان سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ اکبر نے اب تک بلّی کو تو چوہے کے پیچھے بھاگتے دیکھا تھا لیکن وہ آج چوہوں کو بلّے کے پیچھے بھاگتے دیکھ رہا تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ یہ چوہے بلّے سے خوفزدہ نہ تھے بلکہ کالا بلّا ان سے خوفزدہ تھا۔ چوہے اس پر بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ کالا بلا کہیں کہیں سے زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے جسم سے خون بہتا دکھائی دے رہا تھا۔

کالے بلّے کے پنجے میں جو بھی چوہا آ جاتا وہ اسے پکڑ کر بھنبھوڑ دیتا۔ اس کی گردن دبوچ لیتا۔ اب تک اس طرح وہ کئی چوہے ختم کر چکا تھا۔

جب آخر میں دو تین چوہے رہ گئے تو وہ اپنی جان بچا کر ادھر اُدھر بلوؤں میں گھس گئے۔

کالا بلا چوہوں کے بھاگ جانے کے بعد اپنے پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا اور اپنے رستے زخموں کو اپنی لمبی اور سرخ سرخ زبان سے چاٹنے لگا۔ جیسے جیسے وہ چاٹتا جاتا، ویسے ویسے اس کے زخم بھرتے جاتے۔ چند منٹ کے اندر اندر اس کے زخم بالکل صاف ہو گئے۔ وہ بھلا چنگا ہو گیا۔

تب وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ اب اس نے گھور کر نیاز محمد کو دیکھا اور فضا میں ایک قلابازی کھائی۔

اب کالا بلا حملہ کرنے کے لئے بالکل تیار تھا۔ اب اس کا شعبدہ شروع ہوا۔

نیاز محمد نے دیکھا کہ ایک موٹا تازہ اڑدھا چلا آتا ہے وہ زور سے پھنکار رہا تھا اور جہاں جہاں اس کی

پھنکار پڑتی گھاس جل کر راکھ ہو جاتی۔

اکبر نے نیاز محمد کے کندھے سے اچک کر اژدھے کو دیکھا تو اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ نیاز محمد کے کان میں آہستہ سے بولا۔ "بابا وہ اژدھا۔"

"ہاں میں دیکھ رہا ہوں تم پریشان مت ہو۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" نیاز محمد کی نظریں بدستور اس اژدھے پر جمی ہوئی تھیں۔

اژدھا نزدیک سے نزدیک تر ہوتا جا رہا تھا۔

"بابا، اس پھنکار سے تو گھاس بھی جل رہی ہے۔"

"کوئی بات نہیں، تم ڈرو مت۔ میں آگے ہوں پہلے یہ مجھے نقصان پہنچائے گا پھر تم تک پہنچے گا۔" نیاز محمد نے بڑے اطمینان سے کہا۔

اب اژدھا ان سے صرف سات فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ پھر جانے کیا ہوا کہ وہ ایک دم رک گیا ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے آگے کوئی دیوار آ گئی ہو۔ وہ دائیں جانب مڑ گیا۔ اب وہ ان کے چاروں طرف گھوم رہا تھا لیکن سات فٹ دور تھا۔

وہ اژدھا جیسے جیسے گھومتا جاتا ویسے ویسے نیاز محمد بھی گھومتا جاتا۔ نیاز محمد کے پیچھے اکبر بھی گھوم رہا تھا۔

"ہاں، بھئی اکبر اب تو ڈر نہیں لگ رہا۔" نیاز محمد نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں بالکل نہیں۔" اکبر بڑے اطمینان سے بولا۔

"اس کا کیا حشر کروں۔" نیاز محمد نے پوچھا۔

"اس کا منہ رگڑ دیں۔" اکبر نے غصے میں کہا۔

"منہ رگڑ دوں یا جلا کر راکھ کر دوں۔" نیاز محمد نے پوچھا۔

"یہ تو اور بھی اچھا ہو گا۔" اکبر خوش ہو کر بولا۔

"تو پھر دیکھ تماشا۔"

نیاز محمد نے یہ کہہ کر اپنا ایک ہاتھ اوپر اٹھایا اور غصے سے بولا۔ "جل جا۔"

نیاز محمد کی زبان سے ابھی یہ لفظ ادا ہی ہوئے تھے کہ اس اژدھے میں آگ لگ گئی۔

یوں محسوس ہوا جیسے اژدھے کے جسم پر پیٹرول ڈال کر آگ لگا دی ہو۔ آناً فاناً اس کا جسم جل کر راکھ ہو گیا۔

نیاز محمد نے مڑ کر اکبر کو دیکھا اکبر نے خوش ہو کر کہا۔ "بہت اچھا۔"

کالا بلا اپنا شعبدہ دکھا چکا تھا۔ اب نمبر تھا نیاز محمد کا۔ نیاز محمد نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے سے پہلے اکبر سے پوچھا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

"اس خبیث کالے بلے کی پٹائی۔" اکبر نے فوراً کہا۔

لیکن پھر اکبر کو خیال آیا کہ اس بلے پر لاٹھی تو اثر کرتی نہیں۔ سید پور میں جب اس پر لاٹھی برسائی گئی تھی تو لاٹھی کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اس کا کچھ نہ بگڑا تھا۔

"لیکن بابا، اس پر لاٹھی تو اثر کرتی نہیں۔" اکبر نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"یہیں نہیں کرے گی۔" نیاز محمد نے بڑے یقین سے کہا پھر ہاتھ اوپر کیا تو اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط لاٹھی نمودار ہوگئی۔ نیاز محمد لاٹھی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "یہ اللہ کی لاٹھی ہے۔ یہ اس خبیث کی گردن کے ٹکڑے کردے گی۔"

"اچھا۔" اکبر نے کہا۔ "پھر بسم اللہ کیجئے۔"

"یہ لو۔" یہ کہہ کر نیاز محمد نے اس لاٹھی کو فضا میں اچھال دیا۔ "جا اس خبیث کی خبر لے۔"

اب وہ لاٹھی اس کالے بچھو پر برس رہی تھی اور وہ کالا بلا لاٹھی کی زد سے بچنے کیلئے ادھر اُدھر چھلانگیں لگا رہا تھا۔ جیسے یہ لاٹھی اس کی کمر یا سر پر لگتی وہ بلبلا جاتا اور غرا کر لاٹھی کو پکڑنے کی کوشش کرتا۔ وہ لاٹھی برابر اس پر برس رہی تھی۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ لاٹھی کسی کے ہاتھ میں ہو اور وہ نشانہ لے لے کر کالے کو مار رہا ہو۔

کالے بچھو کی پٹائی ہوتے دیکھ کر اکبر کی آنکھوں میں خوشی رقصاں تھی۔ اس کالے بچھو نے اسے بڑا تنگ کیا نچایا تھا۔ اب وہ کالا بلا خود تنگی کا ناچ ناچ رہا تھا۔

وہ کالا بلا اِدھر اُدھر کونے بچالوں میں اپنا سر چھپانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ لاٹھی مسلسل اس کے سر پر برس رہی تھی، اس کا بھیجا ہلا رہی تھی۔ اس کی کمر ٹوٹ رہی تھی اور کالے بچھو کی اچھل کود، اس کی غراہٹ، اس کی بے بسی دیکھنے کے لائق تھی۔

"بس اکبر۔" نیاز محمد نے پوچھا۔

"نہیں بابا ابھی اور۔" اکبر نے غصے سے کہا۔ "اس خبیث نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ میری بیوی کو قید کیا۔ میری ماں کی چوٹی کاٹی، میرے ماموں کو کوڑھ میں مبتلا کیا۔ ان کا کاروبار تباہ کیا۔ بابا اس کے جرائم کی فہرست بڑی طویل ہے۔ اسے اتنی آسانی سے نہ چھوڑیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ پھر کچھ دیر اور تماشا دیکھ لو۔" یہ کہہ کر نیاز محمد نے لاٹھی کو حکم دیا۔ "برسے جا۔"

"اور زور زور سے برس، جلدی جلدی برس۔" اکبر نے ٹکڑا لگایا۔

"چل بھئی لاٹھی زور زور سے برس، جلدی جلدی برس۔" نیاز محمد نے اکبر کی خواہش کو حکم میں بدل دیا۔

حکم ملتے ہی لاٹھی میں تیزی آگئی۔ وہ بہت تیزی سے اس پر برسنے لگی۔

کالے بچھو کی پٹائی ہوتے دیکھ کر اکبر کی آنکھوں میں سکون بھر رہا تھا۔ اس کے اعصاب پر آسودگی چھاتی جارہی تھی۔

جب اس کی پٹائی ہوتے کافی دیر ہوگئی تو اکبر نے نیاز محمد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بس بابا۔"

"بس۔" نیاز محمد نے پوچھا۔ "ہوگیا تیرا جی خوش۔"

"ہاں، بابا۔" اکبر نے خوش ہو کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر نیاز محمد نے لاٹھی کو حکم دیا۔ "اے لاٹھی غائب ہوجا۔"

اس حکم کے گونجتے ہی لاٹھی غائب ہوگی۔ کالا بابا نڈھال ہو کر ایک طرف گر گیا۔ جیسے اس کی کمر ٹوٹ گئی ہو۔

"کیا مر گیا۔" اکبر نے کالے بلے کو فرش پر پڑے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"یہ بڑی ڈھیٹ چیز ہے۔ یہ اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں۔" نیاز محمد نے ہنس کر کہا۔ "ابھی دیکھنا یہ چند منٹ بعد اٹھے گا اور ہم پر حملہ کرے گا۔"

نیاز محمد کی کہی ہوئی بات سچ ثابت ہوئی۔

پانچ منٹ کے بعد کالا بابا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے چاروں پاؤں جانچے اور پھر اس طرح کھڑا ہوا جیسے کوئی جرنیل اپنی فوجوں کو کوئی حکم دینے سے پہلے کھڑا ہوتا ہے۔ پھر اس نے کھڑے کھڑے فضا میں ایک قلابازی کھائی اور پیر پھیلا کر بیٹھ گیا۔

اب اس نے نیاز محمد کو گھورنا شروع کیا۔

اکبر اسے بغور دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب دیکھیں یہ کالا بابا کیا کرتا ہے۔ کون سا شعبدہ دکھاتا ہے۔ اب تک جتنے شعبدے اس نے دکھائے تھے وہ نیاز محمد نے ناکام کر دیئے تھے۔

تب ایک کالا پرندہ اس کے جسم سے برآمد ہوا۔ اکبر نے دیکھا وہ کوّے جیسا تھا لیکن اس کے سر و چونچ اور اس کے پنجوں میں کوئی چیز دبی ہوئی تھی۔

وہ ایک تیز دھار کا چمکتا ہوا خنجر تھا۔

آناً فاناً وہ کوّے جیسا پرندہ ان کے سروں پر پہنچا اور اس خنجر کو چھوڑ دیا۔

نیاز محمد نے جلدی سے کچھ پڑھا اور شعلے سے بولا۔ "رک جا۔"

وہ خنجر ان کے سروں پر سات فٹ اوپر خلاء میں معلق ہوگیا۔ وہ خنجر اتنا بڑا اور تیز دھار کا تھا کہ جسم کے کسی حصے پر گرتا فوراً پیوست ہوجاتا۔

وہ کوا ان کے سروں پر کائیں، کائیں کرتا منڈلا رہا تھا۔

نیاز محمد نے پھر کچھ تیزی سے پڑھا اور بولا۔ "اے خنجر پلٹ۔"

نیاز محمد کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہی معلق خنجر میں حرکت ہوئی وہ واپس اٹھا اور سر پر منڈلاتے کوے کے پیچھے اس طرح چلا جیسے گائیڈڈ میزائل۔

پھر وہ اڑتے کوے کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ خنجر کے آر پار ہوتے ہی کوا پٹ سے زمین پر گرا اور کسی بم کی طرح پھٹ گیا لیکن آواز کوئی نہ ہوئی۔ بس اس کے چیتھڑے اُڑ گئے۔

سید پور کا جن جو کالے بلے کے روپ میں بڑے اطمینان سے بیٹھا خنجر بردار کوے کو دیکھ رہا تھا اسے پوری امید تھی کہ چند لمحوں میں نیاز محمد کا کام تمام ہوا لیکن جب اس نے اپنے کوے کے چیتھڑے اڑتے دیکھے تو وہ خود اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

اسے معلوم تھا کہ اب نیاز محمد کی باری ہے۔ ادھر سے کوئی ایسی مصیبت نازل ہوگئی کہ وہ پریشان ہوجائے گا۔ وہ اپنے کان کھڑے کر کے نیاز محمد کو دیکھنے لگا۔

نیاز محمد نے تیزی سے کچھ پڑھا اور اپنی انگشت شہادت پر زور سے پھونک ماری۔

اس پھونک کے ساتھ ہی انگشت شہادت سے دھویں کا ایک مرغولہ نکلا۔ اس دھویں کے بادل سے

ایک کالا کتا برآمد ہوا۔ یہ کالا کتا گدھے جتنا تھا۔ اس کی زبان ایک فٹ باہر نکلی ہوئی تھی جو تیزی سے اندر باہر ہو رہی تھی۔ اس کے بڑے بڑے نوکیلے دانت جبڑوں سے بھانک رہے تھے۔

اس کالے کتے نے زور سے چھلانگ لگائی اور کالے بلے کی طرف چلا۔

کالا بلا اسے دیکھ کر ایک دم سہم گیا۔ یہ کیا مصیبت اس پر نازل ہو گئی۔ لیکن وہ ہمت ہارنے والا نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کالا کتا کسی خرگوش کی طرح اس کی گردن دبا تا کالے بلے نے ایک چھلانگ لگائی اور اس قلعے پر چڑھ گیا جو ایک رسی سے لٹکا ہوا تھا اب وہ گملا جھول رہا تھا۔

کالا بلا قلعے پر چڑھ تو گیا لیکن اسے یہ اندازہ نہ ہوا کہ اس میں وزن کتنا ہے۔ اس میں گدھے جتنا وزن تھا۔ قلعے کی رسی فوراً ٹوٹ گئی۔ وہ قلعے کے ساتھ دھماکے سے زمین پر گرا۔

اسے زمین پر گرتے دیکھ کر کالے کتے نے اس پر فوراً حملہ کر دیا۔ کالا بلا بھی چوکنا تھا۔ وہ زمین پر گرتے ہی اٹھا اور کالے کتے کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی جھکائی دے کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اب کالا بلا آگے آگے اور کالا کتا پیچھے پیچھے۔

یہ لوگ لان کے درمیان بیٹھے تھے۔ کتے اور بلے کے درمیان ریس لگی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ کالا بلا پودوں کے درمیان چھپ رہا تھا لیکن کتا اسے ڈھونڈ کر نکالتا۔

یہ کھیل کافی دیر جاری رہا پھر ایک لمحہ ایسا آیا کہ کالے کتے نے اس پر جھپٹا مار دیا۔

اکبر نے دیکھا کہ کالے بلے کے ایک کان سے خون نکلنے لگا ہے۔ اس کا آدھا کان کتے نے اڑا دیا تھا۔

"بابا اس کالے بلے کا دوسرا کان بھی کٹنا چاہئے، اس نے کئی انسانوں کے کان کاٹے ہیں۔" اکبر جوش میں بولا۔

نیاز محمد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا البتہ کتے کو حکم دیا۔ "دوسرا کان بھی کاٹو۔"

کالے کتے نے بھاگتے بلے کو پھر دبوچ لیا اور اس مرتبہ اس کا دوسرا کان بھی کاٹ لیا۔

کالے بلے کے دونوں کانوں سے خون جاری ہو گیا۔ وہ تیزی سے مکان کے عقب کی طرف بھاگا۔ کتے نے اس کا پیچھا کیا پھر وہ دونوں آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

نیاز محمد نے اپنی آنکھیں بند کر لیں جیسے وہ آنکھیں بند کر کے کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اکبر کا خیال تھا کہ کالا کتا اس سپید پور کے جن کو دیکھ کر مکان کے عقب سے پھر میدان جنگ میں لے آئے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔

کئی منٹ گزر گئے۔

تب اس نے بے چینی سے نیاز محمد سے پوچھا۔ "کیا ہوا بابا؟ کدھر گیا وہ خبیث؟"

"وہ پیچھے آم کے درخت پر چڑھ گیا ہے اور اپنے پیروں سے اپنے کان سے بہنے والے خون کو صاف کر رہا ہے۔" نیاز محمد نے آنکھیں بند کئے بتایا۔

"اور وہ کالا کتا۔" اکبر نے پوچھا۔ "وہ کدھر گیا؟"

"وہ درخت کے نیچے بیٹھا ہے اس کے آنے کا منتظر ہے۔" نیاز محمد نے بتایا۔

"بابا کیا آپ کو نیلم بھی دکھائی دے رہی ہے؟"

"ہاں میں اسے دیکھ رہا ہوں وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی ہے۔"

"بابا اسے کمرے سے باہر بلائیں۔"

"نیلم کو کمرے سے باہر بلانا کوئی مشکل کام نہیں لیکن ابھی میں چاہتا نہیں ہوں۔"

"کیوں بابا۔" اکبر نے بے قراری سے پوچھا۔

"ابھی اسے باہر بلایا تو نقصان کا احتمال ہے۔ میں جلد بازی میں کام خراب کرنا نہیں چاہتا۔ تم ذرا آرام سے بیٹھو اور دیکھتے جاؤ کہ کیا ہوتا ہے؟" نیاز محمد نے اسے سمجھایا۔

"بابا کیا میں کوئی اچھی امید رکھوں۔"

"ہاں، کیوں نہیں، اچھی امید نہ رکھنے کی کیا وجہ ہے؟"

"یہ جن ابھی تک کسی کے قابو میں آیا نہیں ہے۔"

"اب آجائے گا۔" نیاز محمد نے بڑے یقین سے کہا۔ "اول تو میں اس کے لئے بہت ہوں۔ اگر مجھ سے کہیں چوک ہوگئی تو پھر پیر صاحب سے مدد لی جائے گی۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اللہ والے بابا۔"

"ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔" نیاز محمد نے کہا۔ "اچھا اب خاموش ہوجاؤ اس خبیث نے درخت سے مکان کی چھت پر چھلانگ لگائی ہے۔ وہ چند لمحوں میں سامنے ظاہر ہونے والا ہے۔"

"اور وہ کتا۔"

"اسے میں نے غائب کردیا ہے، اس کا کام ختم ہوا؟"

"اب کیا ہوگا؟"

"اب جو کچھ ہوگا وہ تمہارے سامنے آجائے گا لیکن ایک بات میں تمہیں ضرور بتانا چاہتا ہوں۔"

"جی فرمائیں۔"

"ہمیں اب بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوگی۔ یوں سمجھو کہ اب ہم پل صراط پر کھڑے ہیں ہماری ذرا سی بھی بھول ہمیں کوئی بڑا نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

"کیا وہ خبیث اب مجھ پر حملہ کرے گا۔" اکبر نے گھبرا کر پوچھا۔

"اس میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ تم پر حملہ کرے۔ میں جب تک تمہارے ساتھ ہوں اور بابا کی نشانی تمہارے بازو پر بندھی ہے۔ یہ سید پور کا جن تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

ابھی وہ دونوں باتیں ہی کررہے تھے کہ اچانک کسی نے باہر کے گیٹ پر کھٹکا کیا۔

"یہ اس وقت گیٹ پر کون آگیا؟"

نیاز محمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ کچھ پڑھنے میں مصروف تھا۔

پھر وہ گیٹ جو اندر سے بند تھا خود بخود کھلا اور گیٹ کے اندر کوئی داخل ہوا۔ اکبر نے انہیں دیکھ کر بے قرار ہوگیا۔ اس نے خوشی سے اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ "ارے ماموں آپ۔"

نیاز محمد نے فوراً اکبر کا ہاتھ پکڑ لیا اور غصے سے بولا۔ "کیا کرتا ہے؟"

"وہ ماموں فرقان آئے ہیں۔"

"ہے وقت ابھی مجھے سمجھا یا تھا کہ بہت ہوشیار رہنا ہوگا لیکن تو فوراً ہی بھول گیا۔ یہ ماموں وا ماموں نہیں ہیں۔ یہ وہی خبیث ہے۔ سید پور کا جن۔ یہ لوگ شکل بدلنے کے ماہر ہوتے ہیں۔ ایک لمحے میں بہروپ بدلتے ہیں۔ یہ اختیار کرلیں۔"

"وہ یہ وہ ہے۔ معاف کرنا بابا غلطی ہوگئی۔"

"وہ ماموں فرقان جس طرح آئے تھے۔ واپس چلے گئے۔ گیٹ پھر سے بند ہوگیا اور اس کالے جن نے گیٹ کے اوپر ظاہر ہوکر زمین پر چھلانگ لگائی۔

پھر وہ دوڑتا ہوا لان میں داخل ہوا، اور تو فٹ کے فاصلے پر نیاز محمد کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ پھر وہ اپنی بھیانک آنکھوں کے بل گھاس پر بیٹھ گیا۔

"نیاز محمد تو کیا چاہتا ہے؟" سید پور کے جن کی آواز نیاز محمد کی سماعت سے ٹکرائی۔

"میں جو چاہتا ہوں، اسے میں پورا کر کے رہوں گا تو بول تو کیا چاہتا ہے۔"

"میں یہ چاہتا ہوں نیاز محمد تو یہاں سے چلا جائے۔"

"ہاں، میں چلا جاؤں گا۔ میں یہاں رہنے نہیں آیا لیکن میں تجھ سے اس گھر کو پاک کر کے جاؤں گا۔ تیرے سر سے عشق کا بھوت اتار کر جاؤں گا۔ اس معصوم بچی کی جان چھڑا کر جاؤں گا۔"

"تو بہت بھولا ہے۔" سید پور کا جن طنزیہ ہنسی ہنسا۔

"میں بہت بھولا سہی لیکن تو تو سیانا ہے تو تھک ہار کر کیوں بیٹھ گیا۔ مجھ پر حملہ کیوں نہیں کرتا۔"

نیاز محمد نے کالے جن کی طرف دیکھ کر کہا۔

اکبر کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اسے نیاز محمد کی آواز تو سنائی دے رہی تھی لیکن وہ کس سے بات کر رہا تھا، کس کی بات کا جواب دے رہا تھا۔ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ سید پور کا جن نیاز محمد کے دماغ میں بول رہا تھا جبکہ نیاز محمد اپنی زبان سے اس کی بات کا جواب دے رہا تھا۔ اکبر نے درمیان میں مداخلت کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ خاموشی سے نیاز محمد کی بات سنتا رہا۔

"میں حملہ ضرور کروں گا، تجھے چھوڑوں گا تھوڑے ہی۔" جن کی آواز نیاز محمد کی سماعت سے ٹکرائی۔

"ہاں، میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تیری کوئی حسرت دل میں نہ رہے۔ اسی لئے میں یہاں آکر بیٹھا ہوں۔ تو اپنی طاقت آزما لے پھر میری طاقت دیکھ۔ تجھے معلوم نہیں کہ میں انسان ہوں، اللہ نے ہمیں سب سے اشرف بنایا ہے۔ ہمارے آگے کسی کا چراغ نہیں جلتا۔" نیاز محمد نے بڑے فخر سے کہا۔

"نیاز محمد تو چراغ کی بات کرتا ہے، میں نے اس گھر میں ایک شمع روشن کردی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" نیاز محمد نے جواب دیا۔

"تو جانتا ہے تو اسے بجھا کر دکھا۔" سید پور کے جن نے چیلنج کیا۔

"میں اسے بجھاؤں گا نہیں ویسے میں اسے بجھانے کی طاقت رکھتا ہوں لیکن میں بجھاؤں گا نہیں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" نیاز محمد نے کہا۔

"کہاں؟" اس نے پوچھا۔
"اپنے بابا کے پاس، اپنے پیر کے پاس۔" نیاز محمد نے جواب دیا۔
"کیوں۔" اس نے پوچھا۔
"ان کا یہی حکم ہے۔" نیاز محمد نے کہا۔
"اچھا نیاز محمد اگر مجھے بچانے کے لئے تجھے اپنی طاقت کا مظاہرہ نہ کرنا پڑے۔ میں خود ہی یہاں سے چلا جاؤں تو؟"
"پھر میں تجھے معاف کر دوں گا۔ تجھے سزا سے بچالوں گا۔" نیاز محمد نے فوراً کہا۔
"ٹھیک ہے پھر میں نیلم کو آزاد کر دیتا ہوں۔ تم اسے لے جاؤ۔"
پھر اچانک یہ کالا بلا اٹھا اور تیزی سے گھر کے اندر چلا گیا۔
کچھ دیر کے بعد نیلم دروازے سے برآمد ہوئی اور اس نے بے قراری سے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔
"اکبر۔"
"بابا نیلم آگئی ..... بابا نیلم آگئی۔" اکبر خوشی سے جھوم اٹھا۔ "میری نیلم آگئی۔"
نیلم کو دیکھ کر بے قرار ہو کر اٹھنا، فطری بات تھی۔
وہ اس کی بیوی تھی جسے سید پور کے جن نے اسے شجر ممنوع بنا دیا تھا۔ اب وہی شجر ممنوع لنگڑا سکتا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ نیلم کو کالے بلے نے اپنے پنجے سے آزاد کر دیا تھا۔ وہ سامنے اپنی دونوں بانہیں پھیلائے کھڑی تھی اور اکبر، اکبر پکار رہی تھی۔
"اکبر آؤ، اکبر آؤ۔"
تب اکبر سے نہیں رہا گیا تھا، وہ بے قابو ہو کر نیاز محمد کی پیٹھ کے پیچھے سے بھاگ اٹھا۔
"میں آرہا ہوں، نیلم۔"
اور یہ سب اتنی جلدی، اتنی آناً فاناً ہوا کہ نیاز محمد دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے اکبر کو پکڑنے کے لئے اپنا ہاتھ بھی بڑھایا لیکن وہ اس کی پہنچ سے دور ہو چکا تھا پھر نیاز محمد بھی اس کے پیچھے بھاگا کیونکہ اسے سید پور کے جن کا کھیل سمجھ میں آگیا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اکبر اس کے فریب میں آجائے۔
نیلم، اکبر کو اپنے قریب آتا دیکھ کر فوراً پلٹ گئی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔
نیلم کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر اکبر چیخا۔ "نیلم ٹھہرو، میں آرہا ہوں۔"
"اکبر ٹھہرو۔" پیچھے سے نیاز محمد نے آواز دی اور چند قدم آگے جا کر اس نے اکبر کی قمیض پیچھے سے پکڑ لی۔

"چھوڑ دیں بابا مجھے، وہ نیلم واپس چلی جائے گی۔" اکبر نے بڑی بے قراری سے کہا۔
"بے وقوف۔" نیاز محمد نے غصے سے کہا۔ "وہ نیلم نہیں ہے۔"
لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، سید پور کے جن کی چال کامیاب ہو چکی تھی۔
اس نے نیاز محمد کو حصار سے نکال لیا تھا، اس کا حصار توڑ دیا تھا۔ اس کی توجہ تقسیم کر دی تھی۔ خیر

جو چاہو ہو سو ہوا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ اکبر کی جان بچ گئی۔

اگر وہ جوش محبت میں نیلم کے پیچھے خالی گھر میں داخل ہو جاتا تو وہ سید پور کے جن کے زیر اثر آ جاتا۔ وہ اس طرح کی چالیں چلتا کہ اکبر خود بخود اپنے بازو سے اس سکے کو اتار کر پھینک دیتا۔ سکہ پھینکتے ہی اس کے ساتھ جو کچھ ہوتا، وہ اسے زندگی بھر یاد رہتا۔

نیاز محمد نے اسے اپنی جان پر کھیل کر بچا لیا۔ حصار ٹوٹ چکا تھا۔ ارتکاز باقی نہ رہا تھا۔ اب نیاز محمد اس چابی کی طرح ہو گیا تھا جس کا اسلحہ ناکارہ ہو گیا ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ دشمن اسے کچھ نقصان پہنچاتا اس نے دوسرے سے فوراً بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔

نیلم دروازے میں داخل ہو کر، دروازہ بند کر چکی تھی۔

"اکبر، اب یہاں سے نکل چلو۔ اسی میں ہماری عافیت ہے۔" نیاز محمد نے اکبر کی کوئی قدم کر اپنی طرف کھینچی۔

"بابا اب کچھ بھی ہو، میں نیلم کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔" اکبر نے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔

"بے وقوف۔ نہ بن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ خیریت اسی میں ہے کہ ہم یہاں سے بھاگ چلیں۔"

"لیکن بابا آپ نے کہا تھا ..."

"بے وقوف جب دو دشمن ایک دوسرے کے مقابل آتے ہیں تو کسی ایک کو ہارنا ہوتا ہے۔ ویسے ابھی ہم ہارے نہیں ہیں۔ بس تمہاری حماقت نے مجھے بے بس کر دیا ہے۔ میں دفاعی حالت میں آ گیا ہوں۔ میں اپنا دفاع تو کر سکتا ہوں لیکن حملہ نہیں کر سکتا۔ یہ سید پور کا جن بہت چالاک ہے۔ اس سے کسی دن میں اکیلا نمٹوں گا۔ آؤ، یہاں سے نکل چلیں۔"

یہ کہہ کر نیاز محمد نے اکبر کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا گیٹ کی طرف لے چلا۔

تب ہی پیچھے سے آواز آئی۔ "بس نیاز محمد بھاگ لئے۔"

"ان آوازوں پر کان مت دھرو، بس یہاں سے جلدی نکلو۔" نیاز محمد نے اکبر سے کہا۔

"ارے نیاز محمد تم تو ہمیں اس گھر سے نکالنے آئے تھے۔" یہ کہہ کر سید پور کے جن نے قہقہہ لگایا۔ "اب خود ہی یہاں سے بھاگے جا رہے ہو۔ میں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ تم سٹھیا بھولے ہو۔"

وہ سید پور کا جن خوشی سے سرشار اور جانے کیا کیا کہتا رہا لیکن ان دونوں نے پیچھے آتی اس آواز پر کان نہیں دھرے۔ وہ بسرے ہو گئے۔

پھر ان دونوں نے جلدی سے گیٹ بند کیا۔ کنڈے میں لٹکے تالے کو نیاز محمد نے اپنے ہاتھ میں لے کر دیا تو وہ فوراً بند ہو گیا۔

"آؤ۔" نیاز محمد نے اکبر کا پھر ہاتھ پکڑ لیا اور وہ سڑک پر تیز تیز چلنے لگے۔

اکبر کی عجیب حالت تھی۔ وہ کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ وہ جیتے جیتے ہار گیا تھا۔ اتنی دیر میں جانے اس نے کتنے خواب دیکھ لئے تھے۔

نیلم کی ایک جھلک نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ نیاز محمد سے اپنا ہاتھ چھڑا کے ہوا میں خالی گھر میں داخل ہو جائے۔ پھر جو ہو سو ہو۔

"تو جو کچھ سوچ رہا ہے، غلط سوچ رہا ہے۔" جس کی جھلک دیکھ کر تو ایک دم دیوانہ ہو گیا تھا وہ نیلم نہیں تھی۔ وہ سید پور کا جن تھا۔ اس نے تیری سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا لیا، خیر دیکھا جائے گا میں پھر آؤں گا تو ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر چلا جا۔"

سامنے سے آتی ہوئی خالی ٹیکسی کو نیاز محمد نے ہاتھ دے کر روکا۔ اکبر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو نیاز محمد نے اس سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "سیدھے گھر جانا۔ اور کسی اغفاء خیال کو دل میں مت لانا۔ اگر تم خالی گھر میں داخل ہوئے تو وہ تمہیں شدید نقصان پہنچا دے گا۔ وہ بہت کینہ ہے۔"

"ٹھیک ہے بابا، میں ادھر نہیں جاؤں گا لیکن آپ کہاں جا رہے ہیں، آپ ٹیکسی میں آ جائیں نا، گھر چلیں، کھانا وانا کھا کر چلے جائیے گا۔" اکبر نے بڑے خلوص سے کہا۔

"نہیں، تو کھانے کی فکر نہ کر، ہم دوپہر کا کھانا نہیں کھاتے۔" نیاز محمد نے بے نیازی سے کہا۔

"پھر میں آپ کو، آپ کی مطلوبہ جگہ پر چھوڑ دوں گا، آپ ٹیکسی میں آ جائیں۔" اکبر بولا۔

"نہیں، ہم خود چلے جائیں گے، تم ہماری فکر نہ کرو۔"

"اچھا، بابا جیسی آپ کی مرضی۔"

اب نیاز محمد سے بحث فضول تھی۔ اکبر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ نیاز محمد اس کے ساتھ گھر جانا چاہتا ہے اور نہ ہی چاہتا ہے کہ وہ اسے ٹیکسی میں اس کی مطلوبہ جگہ چھوڑ دے۔ نیاز محمد بس یہیں سے اس سے جدا ہو جانا چاہتا تھا۔

اکبر کی وجہ سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا تھا۔ اسے اپنی حماقت پر افسوس تھا لیکن اس سے جو کچھ سرزد ہوا، اس پر اسے اختیار نہ تھا۔ وہ بے اختیار ہو گیا تھا۔ اکبر کو احساس تھا کہ اس کے جذباتی پن نے جیتی جنائی بازی الٹ دی تھی۔ یوں بظاہر نیاز محمد نے کسی شدید غصے کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ نیاز محمد اس کی حرکت کی وجہ سے ناراض ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں، اب وہ دوبارہ لوٹ کر بھی آئے گا یا نہیں۔

یہ سوچ کر اکبر فوراً ٹیکسی سے اتر آیا اور نیاز محمد کا ہاتھ بڑی عقیدت سے پکڑتے ہوئے بولا۔ "بابا، آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہو گئے۔"

"ارے، نہیں بچہ ایسا تو نے کیوں سوچا۔"

"پھر آپ لوٹ کر آئیں گے نا، مجھے اس عذاب سے نجات دلانے۔"

"تو فکر نہ کر بچہ جو کچھ ہو گا، تیرے حق میں بہتر ہی ہو گا۔" نیاز محمد نے یہ کہہ کر انگشت شہادت اس کی پیشانی پر رکھی اور پھر تیزی سے قدم بڑھاتا ایک طرف چلا گیا۔

اکبر چند لمحے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ مزید کھڑے رہنا فضول تھا۔ ادھر ٹیکسی والا بھی اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے ٹیکسی میں آ بیٹھا اور ٹیکسی والے سے بولا۔ "چلو۔"

گھر پہنچ کر جب وہ ٹیکسی سے اترا تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ نشے میں ہو۔

تھی کہ اس کے سارے نشے ہرن ہو گئے تھے۔ اس کے سارے خواب بکھر گئے تھے۔ کرچی کرچی ہو گئے تھے وہ اندر سے جیسے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اور یہ سب اس کی ذرا سی غفلت سے ہوا تھا۔ اب وہ راشدہ کو کیا جواب دے گا جو نیلم کی رہائی کی خبر سننے کی منتظر تھی۔ اس نے بھی جانے کیا کیا خواب اپنی آنکھوں میں سجا رکھے تھے۔ وہ ارمان جو دل ہی دل میں گھٹ کر رہ گئے تھے اور جن کے پورے ہونے کی کچھ آس بندھی تھی، وہ ایک مرتبہ پھر خزاں ہو گئے تھے۔

یہ سوچ سوچ کر وہ پاگل ہوا جاتا تھا۔ اس کے دل میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ بس اچانک ہی اس پر شدید ڈیپریشن کا دورہ پڑا تھا۔

اس نے لیکسی سے اتر کر دروازے پر لگی اطلاعی گھنٹی پر ہاتھ رکھا۔

گھر کے اندر "ڈنگ ڈونگ" کی آواز گونجی تو گھر کے ہر فرد کے چہرے پر خوشی بکھر گئی۔ اکبر ایک مخصوص انداز میں گھنٹی بجاتا تھا۔ سب کو معلوم ہو گیا کہ اکبر دروازے پر ہے۔

سب سے پہلے راشدہ بھاگی، "امی، اکبر بھائی آ گئے۔"

"ہاں، جا دروازہ کھول۔" صابرہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

بابر علی بھی گھر پر ہی تھے۔ وہ آج شوروم نہیں گیا تھا وہ اکبر کا انتظار کر رہا تھا اس کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ بھی چوکنا ہو گیا۔ وہ فوراً گیٹ کھولنے کے لئے اٹھا، لیکن گیٹ کی طرف بھاگتی ہوئی راشدہ نے روک دیا۔

"ابو، میں جا رہی ہوں، گیٹ کھولنے۔"

"اچھا بھئی جاؤ، تم ہی گیٹ کھولو۔" بابر علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیکھو، اکبر کیا خبر لایا ہے۔" صابرہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، کیسی خبر لایا ہو گا۔"

"میں ماں ہوں، میں تو اچھی ہی خبر کی توقع رکھوں گی۔"

"میں باپ ہوں، میں کیا بری خبر کی توقع رکھوں گا؟" بابر علی نے ہنس کر کہا۔

"نہیں، یہ بات نہیں، میں کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی۔"

راشدہ گھنٹی کی آواز سن کر فوراً ہی کمرے سے نکل گئی تھی۔ لیکن گیٹ تک پہنچتے پہنچتے کچھ وقت لگتا تھا۔ اکبر کی حالت اس وقت کچھ ایسی تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ فوراً گیٹ کھل جائے، بے قرار ہو کر اس نے دوبارہ گھنٹی بجا دی۔

راشدہ گیٹ تک پہنچ چکی تھی اس نے دوبارہ گھنٹی کی آواز سنی تو گیٹ کے اس طرف سے بولی۔

"اکبر بھائی، کھول رہی ہوں دروازہ۔ اس قدر بے قرار نہ ہوں۔"

اکبر نے ادھر سے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

راشدہ نے جلدی سے گیٹ کھولا وہ اکبر کا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اکبر کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آنکھوں میں چمک نہ تھی، وہ بجھی بجھی سی تھیں۔ وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا۔

"کیا ہوا اکبر بھائی؟" راشدہ گیٹ بند کر کے پلٹی۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

اکبر نے بڑی مایوسی اور اداسی سے جواب دیا۔ "کچھ نہیں راشدہ۔"

اکبر کے حلق میں جیسے کوئی چیز پھنسنے لگی۔ اس کا گلا رندھنے لگا۔ بمشکل اس نے اپنے چھلکتے آنسوؤں پر کنٹرول حاصل کیا۔

لیکن جب وہ اپنی ماں کے سامنے پہنچا اور ماں نے اپنے بیٹے کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر بے قراری سے کہا۔ "ہائے۔ میری بیٹے کو کیا ہوا؟"

تو بیٹے کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ اپنی ماں سے بے اختیار لپٹ گیا اور سسک سسک کر رونے لگا۔ صابرہ نے اس کا سر اپنے کاندھے سے اٹھایا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامتے ہوئے بولی۔ "رونا کیوں ہے۔ اکبر حوصلے سے کام لے۔ جو قسمت میں لکھا ہے۔ اسے ہر قیمت پر بھگتنا پڑے گا۔"

"آخر ہوا کیا، کچھ پتہ تو چلے۔" بابر علی نے پوچھا۔

"جو ہوا ہے۔ وہ اس کے آنسوؤں سے ظاہر ہے۔" صابرہ نے بابر علی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "پوچھ لینا۔ فی الحال اسے آرام کرنے دو۔ اری راشدہ جا بھائی کیلئے چائے بنا کر لا۔ اس میں تھوڑا گلوکوز ڈال دینا۔" صابرہ نے راشدہ کو ہدایت کی۔

"جی، اچھا امی، میں ابھی لائی۔" راشدہ فوراً کچن کی طرف لپکی۔

صابرہ، اکبر کو بیڈ روم میں لے گئی۔ اس نے اسے آرام سے بیڈ پر لٹا دیا۔ اکبر بیڈ پر لیٹ کر خاموشی سے چھت کو گھورنے لگا۔

☆ ..... ☆ ..... ☆

خالی گھر سے ناکام ہو کر جب املی والے بابا کا سپاہی نیاز محمد، املی والے بابا کے سامنے پہنچا، تو املی والا بابا، اسے اپنی بڑی بڑی اور سرخ آنکھوں سے چند لمحے گھورتا رہا۔ پھر ایک دم غصے میں بولا۔ "تجھے ہم نے اس لئے بھیجا تھا کہ تو وہاں سے ناکام ہو کر لوٹے۔"

"بس جی غلطی ہو گئی۔" نیاز محمد گردن جھکا کر بولا۔ "ویسے میں نے بازی جیت لی تھی....."

"بازی جیت کر آیا ہوتا تو اس وقت تیری گردن جھکی نہ ہوتی۔" املی والے بابا نے اس کی بات کاٹی۔

"بس جی، وہ لڑکا اس کے فریب میں آگیا اور حصار سے نکل بھاگا۔"

"اس میں لڑکے کا کوئی قصور نہیں، تم اس لڑکے کی جگہ ہوتے تو تم بھی یہی کرتے۔ میں پوچھتا ہوں، اس لڑکے کو اپنے ساتھ اندر لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟" املی والے بابا نے دریافت کیا۔

"بس جی، یہی مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے اکیلا اندر جانا چاہئے تھا۔" نیاز محمد نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "ویسے میرا خیال تھا کہ لڑکا سمجھدار ہے۔ خاموشی سے میرے پیچھے بیٹھا تماشا دیکھتا رہے گا۔"

"دیکھ لیا نا تماشا۔" املی والے بابا نے غصے سے کہا۔ "وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا

پڑا۔"

"اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔" نیاز محمد نے آہستہ سے کہا۔

"وہ کیسا مذاق اڑاتا ہوگا۔ ہم انسانوں کا۔ نیاز محمد تو نے تو ہماری لٹیا ہی ڈبو دی۔ آخر تو نے اس پر اعتبار کیوں کر لیا۔" الٰہی والے بابا نے غصے اور تاسف سے کہا۔

"میں سمجھاوہ واقعی تائب ہو گیا ہے۔ اس نے سزا سے بچنے کیلئے جتنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ میں نے سوچا اگر بغیر خون خرابے کے معاملہ نمٹ رہا ہے تو میں کیوں خواہ مخواہ اسے سزا دوں۔ ہمارا مقصد تو لڑکی کو اس کے چنگل سے آزاد کرانا تھا۔" نیاز محمد نے دلیل دی۔

"تو پھر کر والی لڑکی آزاد۔" الٰہی والے بابا نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

"بس جی چوک ہو گئی۔ مجھے معاف کر دیں۔" نیاز محمد نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"میں تجھے معاف نہیں کروں گا۔ تو نے انسانوں کی توہین کی ہے۔ ہم نے تجھے اپنا سچا بنا کر بھیجا تھا لیکن تو نے حماقت کا ثبوت دیا۔ تجھے اس حماقت کی سزا ملے گی۔ ہم تجھ سے تیری پنچی چھین لیں گے۔ تجھے لائن حاضر کر دیا جائے گا۔ تجھ سے تیری بصارت چھین لی جائے گی۔ اب تو دیواروں کے آر پار نہیں دیکھ سکے گا۔" الٰہی والے بابا نے آگ برساتے لہجے میں کہا۔

"نہیں بابا مجھے اتنی بڑی سزا نہ دیں۔ مجھ سے میری طاقت نہ چھینیں۔" نیاز محمد لرز اٹھا۔

"جو طاقت دے سکتا ہے، وہ طاقت چھیننے کا بھی حق رکھتا ہے۔" یہ کہہ کر الٰہی والے بابا نے وہ پتھر چھوڑ دیا جس پر وہ بیٹھا تھا۔

یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب اس موضوع پر کوئی بات نہ ہوگی۔ جو فیصلہ کر دیا گیا ہے اسے ہر صورت میں ماننا ہوگا، قبول کرنا ہوگا۔

نیاز محمد نے بالآخر الٰہی والے بابا کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔ پیر کے سامنے کس نے سر اٹھایا ہے۔

☆.....☆.....☆

اکبر کی عجیب کیفیت تھی۔ اسے کسی صورت قرار نہ تھا۔ اس کا دل کسی فیصلے کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ بار بار اس کا جی چاہتا کہ وہ سیدھا اٹھ کر خالی گھر جائے اور سیدپور کے جن کی دھجیاں بکھیر دے۔

لیکن وہ ایسا کر نہیں سکتا تھا۔ ایک تو نیاز محمد جاتے جاتے تنبیہہ کر گیا تھا۔ دوسرے وہ یہ بات اچھی جانتا تھا کہ جن کے آگے اس کی حیثیت ایک تنکے سے زیادہ نہیں۔

اس نے اپنے گھر والوں کو خالی گھر میں جو کچھ ہوا تھا، بتا دیا تھا۔ جیتی جتائی بازی ہارنے کا سب کو دکھ تھا۔ راشدہ کچھ زیادہ جذباتی ہو رہی تھی۔

"بھائی اکبر، آپ تھوڑا صبر نہیں کر سکتے تھے اگر تھوڑا صبر کر لیتے تو اس وقت نیلم بھابھی ہمارے درمیان بیٹھی ہوتیں۔" راشدہ نے کہا۔

"بس، راشدہ کیا بتاؤں، اس وقت میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔" اکبر بڑے افسوس سے

بولا۔

"ویسے، بیٹا ہوا برا ..... ایک بہت اچھا موقع ہاتھ آیا تھا، اس سے نجات کا۔"

"امی، اب میں کیا کروں، کیا امی والے بابا کے پاس پھر جاؤں۔"

"وہاں جانے سے پہلے ماموں فرقان سے مل آؤ۔ انہیں سارے حالات بتاؤ۔ ان سے معذرت طلب کرو۔"

شام کو اکبر جب ماموں فرقان کے گھر پہنچا تو وہ اسے گھر پر نہیں ملے۔ وہ ابھی دکان سے نہیں آئے تھے۔ اس نے سوچا کہ گھر پر انتظار کرنے کے بجائے دکان کا رخ کرے، لیکن گھر سے خالی ہاتھ نکل جانا مناسب نہ تھا۔ وہ کچھ دیر شمسہ اور ممانی ریحانہ سے گپ شپ کرتا رہا۔ شمسہ اٹھ کر کچن میں جانے لگی تو اکبر نے اسے روک دیا۔

"نہیں پھوپھی جان شکریہ، میں چائے نہیں پیوں گا۔"

"کیوں بھتیجے، ایسی کیا ناراضگی ہے۔" شمسہ نے بڑے پن سے کہا۔ "چائے نہیں پینی تو کولڈ ڈرنک منگوادوں۔"

"ایسی سردی میں شمسہ کولڈ ڈرنک پلوائے گی تو اکبر کو۔" ممانی ریحانہ نے مداخلت کی۔

"چلئے، پھر کافی بنادیتی ہوں۔" شمسہ نے ہنس کر کہا۔

"نہیں بھئی شکریہ، میں اب چل رہا ہوں۔" اکبر نے جانے کے لئے پر تولے۔

"دیکھا امی، ابو گھر پر نہیں ہیں تو ان سے بیٹھا نہیں جارہا۔ یہ یہاں ابو سے ملنے آتے ہیں ہم سے نہیں۔" شمسہ نے طنز کیا۔

"ارے نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اکبر سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"تو پھر بیٹھ جائیں اور آج کھانا کھائے بغیر نہ جائیں۔" شمسہ نے ہنس کر کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔"

"دیکھا امی، انہوں نے ٹھیک بھی کیسے مرے ہوئے لہجے میں کہا ہے۔" شمسہ بولی۔

"ارے لڑکی تو تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتی ہے۔" ممانی ریحانہ نے اسے ڈانٹا۔

"شکر کریں امی، ہاتھ دھو کر ہی پیچھے پڑتی ہوں، گندے ہاتھوں سے نہیں۔"

"توبہ ہے۔" ممانی ریحانہ نے کہا۔

"ممانی جان، اس کی بڑی زبان چلنے لگی ہے۔" اکبر نے شمسہ کو ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اے، اے ذرا تمیز سے، میں پھوپھی ہوں آپ کی اس نہیں ہوں۔" شمسہ بگڑ کر بولی۔

"اچھا، محترمہ پھوپھی جان صاحبہ اچھا۔"

"اور یہ آپ کی ممانی نہیں، دادی ہیں۔" شمسہ نے اپنی ماں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"جانتا ہوں۔" اکبر بولا۔

"تو پھر مانتے کیوں نہیں ہو۔" شمسہ نے کہا۔

"ہاں ہوں۔" اکبر بولا۔
"تو پھر کہتے کیوں نہیں ہو۔" شمسہ نے کہا۔
"ممانی جان، اسے کیا ہو گیا ہے، معلوم ہوتا ہے دماغ کو سردی لگ گئی ہے۔" اکبر ہنسا۔
"شمسہ زیادہ بکواس نہ کر، جا کر کافی بنا۔" ممانی ریحانہ نے اسے ڈانٹا۔
"نہیں ممانی جان، کافی نہیں چاہئے۔" اکبر نے کہا۔
"نہیں ممانی جان، اکبر کو انگوٹھا دکھاتی باورچی خانے میں چلی گئی۔
تب شمسہ ہنسی اور اکبر کو انگوٹھا دکھاتی باورچی خانے میں چلی گئی۔
اس تھوڑی سی نوک جھونک سے اکبر کو بڑا فائدہ ہوا۔ دوپہر سے اس پر جو ڈیپریشن کی کیفیت طاری تھی اس میں افاقہ ہوا، اس کا ذہن کھلا، کچھ اداسی کم ہو گئی۔
تب اکبر نے دکان پر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ممانی ریحانہ سے پوچھا۔ "ماموں کب تک آئیں گے؟"
"بس آنے ہی والے ہوں گے۔" ممانی ریحانہ نے کہا۔ "کیوں خیر تو ہے کوئی خاص بات ہے۔"
"ہاں، ممانی جان خاص بات ہے۔ ان سے ذرا مشورہ کرنا تھا۔"
"مشورہ۔" ممانی ریحانہ نے کہا۔ "وہ کس سلسلے میں۔"
"ممانی جان، وہ جو جن ہے ناسید پور کا، اس نے ایک مرتبہ ماموں کو چوٹ دی تھی۔ ان کے سارے کئے کرائے پر چند سیکنڈوں میں پانی پھیر دیا تھا، ان کا وظیفہ مکمل نہ ہو سکا تھا۔ وہ محلے کے ایک لڑکے رضوان کی شکل میں آ کر انہیں غلیظ پانی سے وضو کروا گیا تھا۔ آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا، آج بھی اس نے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک دی۔" اکبر نے کہا۔
اسی وقت گھر کی گھنٹی بجی اکبر خود اٹھ کر دروازے پر گیا۔ دروازے پر اس کے خیال کے مطابق ماموں فرقان ہی تھے۔
"او ہو، اکبر صاحب آئے ہیں۔" ماموں فرقان اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔
"جی ماموں۔" اکبر نے اداس لہجے میں کہا۔ ماموں فرقان کو دیکھ کر اس پر جانے کیوں اداسی چھا گئی۔
ماموں فرقان نے ایک گہری نظر اکبر پر ڈالی اور اندازہ کر لیا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے کچھ نہ کچھ ہوا ہے۔ اس کمینے نے پھر کوئی نقصان پہنچایا ہو گا۔
ماموں فرقان اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اندر لے آئے۔ اسے محبت سے بٹھایا اور بولے۔
"اکبر کب آئے؟"
"بس ماموں تھوڑی دیر ہوئی ہے۔"
"ابو، یہ تو جا رہے تھے، انہیں بڑی مشکل سے روکا ہے۔" شمسہ چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔
"اب تم لوگ اسے سوکھی چائے پر ٹرخاتے ہو، تو وہ جائے نہیں تو اور کیا کرے۔" ماموں فرقان

نے کھانے پینے کی اشیاء سے بھری ٹرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابو۔ یہ سوکھی چائے ہے۔" شمسہ چہک کر بولی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ کر مختلف کھانے کی چیزیں اکبر کے سامنے پھیلائیں۔

"اب دیکھیں نا، ماموں میرا ارادہ تھا کہ میں کھانا کھا کر جاؤں لیکن یہ چائے کے ساتھ اتنی چیزیں لے آئی ہے کہ میں انہیں کھا کر کھانے سے دستبردار ہو جاؤں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کھانا نہ کھانے کا شرمناک طریقہ ہے۔" اکبر نے ہنس کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر میں یہ ساری چیزیں واپس لے جاتی ہوں۔ آپ صرف سوکھی چائے پئیں۔" یہ کہہ کر شمسہ بڑی بے تکلفی سے ساری پلیٹیں ٹرے میں دوبارہ رکھنے لگی۔

"اے شمسہ، کیا کر رہی ہو؟" ماموں فرقان نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

تب وہ ہنستی ہوئی، ساری پلیٹیں میز پر پھیلا کر چلی گئی۔

"لو بھئی اکبر کچھ کھاؤ پیو۔" ماموں فرقان نے بسکٹ کی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"جی، ماموں۔" اکبر نے ایک بسکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ماموں اس کتاب کا کیا بنا۔ وہ نہیں ملی؟ پھر؟"

"وہ مل گئی تھی؟" ماموں فرقان نے بتایا۔

"مل گئی تھی سے کیا مراد ہے، کیا پھر گم ہو گئی۔" اکبر نے پوچھا۔

"گم تو نہیں ہوئی لیکن ملنا نہ ملنا اس کا برابر ہی ہے۔" ماموں فرقان نے جواب دیا۔

"کیوں؟" اکبر کی سمجھ میں بات نہ آئی۔

"تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ اس کتاب کو ہم نے کتنا ڈھونڈا تھا لیکن وہ کہیں نہیں ملی تھی اس کی تلاش میں پورا گھر چھان مارا تھا۔ آخر میں الماری بھی دیکھ لی تھی۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"پھر کہاں ملی؟" اکبر نے بے تابی سے پوچھا۔

"اسی الماری سے۔" ماموں فرقان نے بتایا۔

"لیکن وہ الماری تو ہم لوگوں نے بہت اچھی طرح دیکھ لی تھی، ایک ایک کتاب نکال کر تلاش کیا تھا۔" اکبر نے حیرت سے کہا۔

"اس وقت نظر نہیں آئی، پھر دوسرے یا تیسرے دن میں نے الماری کھولی تو وہ اوپر ہی رکھی تھی جیسے کسی نے بعد میں رکھ دی ہو۔" ماموں فرقان نے بتایا۔

"حیرت ہے۔" اکبر واقعی حیرت زدہ تھا۔

"اس سے زیادہ حیرت کی بات ایک اور ہے۔" ماموں فرقان بولے۔

"وہ کیا؟" اکبر نے پوچھا۔

"اس کتاب میں سے کچھ صفحات غائب ہیں۔" ماموں فرقان نے بتایا۔

"ارے نہیں۔" اکبر نے حیرت سے کہا۔

"اور یہ صفحات وہی ہیں جن میں جنات سے متعلق کچھ عملیات درج تھے۔"

"ماموں = کیسے ہوا؟"

"پتہ نہیں میں نہیں آتا۔" ماموں فرقان نے کہا۔ "یا تو یہ ہوا ہے کہ میں نے خود وہ صفحات نکال کر کہیں اور حفاظت سے رکھ دیئے ہیں یا پھر ان صفحات کو کسی نے نکال لیا ہے۔"

"دوسری بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اور یہ سید پور کے جن کے علاوہ کسی کی حرکت نہیں۔"

"ہو سکتا ہے۔" ماموں فرقان نے لاپروائی سے کہا۔

"ماموں، آج میری ذرا سی غلطی سے وہ بچ گیا، ورنہ از گیا تھا۔" اکبر نے بتایا۔

"وہ کیسے؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"میں آپ کو بتاتا ہوں۔ ساری بات تفصیل سے۔ سنیں گے تو آپ کو بھی دکھ ہوگا۔"

"آخر ہوا کیا؟" ماموں فرقان بولے۔

تب اکبر نے املی والے بابا سے ملاقات سے لے کر نیاز محمد کے خالی گھر میں داخل ہونے، جن سے مقابلہ اور پھر نیلم کے ظاہر ہونے تک سارے واقعات پوری تفصیل سے سنا دیئے۔

جب اکبر ساری داستان سنا چکا، تو کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ ماموں فرقان نے نظریں اٹھائیں اور اکبر کی آنکھوں میں دیکھا تو ان کے دل پر چوٹ سی لگی۔

اکبر کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"ارے، پروانہ کر۔" ماموں فرقان نے بے نیازی سے کہا۔ "ایک بار وہ مجھے دھوکا دے گیا۔ ایک بار وہ نیاز محمد کو جل دے گیا۔ آخر وہ کب تک ہم لوگوں کو جل دیتا رہے گا۔ ایک نہ ایک دن تو پکڑا جائے گا۔"

"ماموں مجھے تو وہ دن کہیں دور تک نہیں دکھائی دے رہا؟" اکبر نے اپنی آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں مایوس نہیں ہوا ہوں۔" ماموں فرقان بولے۔ "میں خود املی والے بابا سے جا کر بات کروں گا۔"

"ہاں، ماموں چلیں، املی والے بابا سے ملاقات کر لیں، ہو سکتا ہے، وہ آپ کو کوئی عمل بتا دیں۔"

"وہ آدمی تو کام کے معلوم ہوتے ہیں، ہم وہاں سے کچھ نہ کچھ ضرور لے کر آئیں گے۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"ماموں، پھر کب چلیں گے۔" اکبر نے پوچھا۔

"تم ایسا کرو، کل صبح گاڑی لے کر آجاؤ، ہم صبح ہی صبح یہاں سے نکل چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے ماموں۔" اکبر نے خوش ہو کر کہا۔

دوسرے دن، وہ گاڑی لے کر صبح ہی ان کے گھر پہنچ گیا۔ ماموں فرقان اور اکبر نے ناشتہ کیا پھر وہ دونوں گھر سے نکل گئے۔

ملیر پہنچے۔ اس جنگل کے شروع میں جو ہوٹل تھا، وہ کھلا ہوا تھا، ریکارڈنگ جاری تھی، ہوٹل کے مالک

نے اکبر کو دیکھتے ہی فوراً پہچان لیا وہ بولا۔ "اب کیسے آنا ہوا ادھر۔"

"ہم اندر جارہے ہیں۔ یہ میرے دادا ہیں۔ انہیں لے کر جارہا ہوں۔ میری گاڑی کھڑی ہے۔ ذرا خیال رکھنا۔" اکبر نے گاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"آپ بے فکر ہو کر اندر جائیں اور پتھر کھا کر واپس آجائیں۔ گاڑی آپ کو یہیں کھڑی ملے گی۔" ہوٹل والے نے ہنس کر کہا۔

جنگل میں کار کے داخل ہونے کی گنجائش نہ تھی۔ اسی لئے گاڑی جنگل کے باہر چھوڑنا پڑی۔ جنگل میں ایک چھوٹی پگڈنڈی تھی جس پر موٹر سائیکل چل سکتی تھی۔ اکبر کے پاس موٹر سائیکل نہ تھی ورنہ وہ لے آتا۔

موٹر سائیکل وہ طارق سے بھی مانگ سکتا تھا لیکن اس نے سوچا کہ موٹر سائیکل مانگ کر کیا فائدہ ہوگا کیونکہ موٹر سائیکل امی کے درخت تک نہیں جاسکتی تھی۔ آگے جا کر پتھروں سے بھرا راستہ آجاتا تھا جسے پیدل چل کر عبور کرنا پڑتا تھا۔ جب پیدل ہی چلنا تھا تو کچھ دور کے لئے موٹر سائیکل پر سفر بیکار تھا۔ بس یہی سوچ کر اکبر نے اپنی گاڑی لے لی تھی۔

"یہ ہوٹل اچھے لوگوں کا نہیں معلوم ہوتا۔" ماموں فرقان نے جنگل میں داخل ہو کر کہا۔

"جی ماموں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہاں پر بڑی عجیب عجیب شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔"

"ہماری گاڑی تو محفوظ رہے گی۔" ماموں فرقان نے خدشہ ظاہر کیا۔

"جی ہاں۔" اکبر نے کہا۔ "میں نے اسی لئے ہوٹل کے مالک سے گاڑی کا خیال رکھنے کو کہہ دیا ہے۔ کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔"

"وہ ہوٹل والا کہہ رہا تھا کہ بے فکر ہو کر جائیں اور پتھر کھا کر آجائیں۔"

"اصل میں بات یہ ہے کہ امی والے بابا نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا میں کسی سے اس ملاقات کا ذکر نہ کروں۔ ان کا خیال تھا کہ لوگ خواہ مخواہ انہیں پریشان کریں گے۔ جب میں امی والے بابا سے ملاقات کر کے آیا تو ہوٹل والے نے مجھ سے پوچھا کہ ہوگئی ملاقات۔ میں نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے بتایا کہ ملاقات نہیں ہوئی۔ امی والے بابا نے پتھر مار کر بھگا دیا۔ جب ہم امی والے بابا سے ملنے جارہے تھے تو ہوٹل والے نے منع کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ امی والا بابا کسی سے نہیں ملتا۔ وہ پتھر مار کر بھگا دیتا ہے۔ جب ہم امی والے بابا سے مل کر واپس آئے تو ہم نے بھی یہی بیان دیا۔ اب اس نے دوبارہ جنگل میں جاتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ میں کہاں جارہا ہوں۔ اسی لئے اس نے ہنس کر کہا کہ بے فکر ہو کر جائیں اور پتھر کھا کر واپس آجائیں۔ اس بے وقوف کو یہ نہیں معلوم کہ میری ملاقات امی والے بابا سے ہو چکی ہے۔"

"اگر اسے یہ بات معلوم ہو جائے تو....." ماموں فرقان نے بات ادھوری چھوڑی۔

"تو میرے خیال میں یہاں بیٹھنے والا ہر شخص ان کی قدم بوسی کے لئے پہنچ جائے۔ طرح طرح کی خواہشیں کر کے انہیں پریشان کرے۔"

"اسی لئے بابا جی کسی دنیا والے کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے۔" اکبر نے کہا۔

"لیکن تم اس معاملے میں خاصے خوش قسمت ہو۔"

"ہاں، ماموں واقعی، مجھ پر انہوں نے خاصی مہربانی کی۔"

چلتے چلتے وہ خاصے اندر نکل آئے ابھی تک وہ پگڈنڈی چل رہی تھی۔ جب چلتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی اور ماموں فرقان کو کوئی نشانہ دکھائی دی تو وہ کچھ پریشان سے ہو کر بولے۔

"اکبر کیا ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں؟"

"جی، ماموں راستہ تو یہ ٹھیک ہے، ابھی ہمیں مزید چلنا پڑے گا۔"

"چلنے کی تو خیر کوئی بات نہیں۔" ماموں فرقان نے اعتماد سے کہا۔ "مجھے پیدل چلنے میں مزہ آتا ہے۔ میں میلوں چل سکتا ہوں۔ ڈر یہ ہے کہ کہیں ہم غلط سمت میں نہ جا رہے ہوں۔"

"اس کی آپ پروانہ کریں، میں ایک مرتبہ یہاں پہلے آ چکا ہوں اور جس راستے کو میں ایک بار دیکھ لوں، اسے بھولتا نہیں۔"

"بشرطیکہ راستہ سچائی کا ہو۔" ماموں فرقان نے ہنس کر بات کا رخ موڑا۔

"راستہ صرف راستہ ہوتا ہے، یہ چلنے والے پر ہے کہ وہ اس پر چل کر سچ کو اختیار کرے یا جھوٹ کے فریب میں مبتلا ہو جائے۔" اکبر نے فلسفہ جھاڑا۔

"ہم دنیا والے جب تک جیتے ہیں فریب میں مبتلا رہتے ہیں۔ مر کر پتہ چلتا ہے کہ ہم کہاں تھے۔ ہم نے کیا کھویا کیا پایا۔"

"ماموں یہ دنیا کیا ہے؟" اکبر نے سوال چھیڑا۔

"یہ دنیا۔ بیٹے یہ دنیا ایک خواب ہے، ایک پُر فریب لمحہ۔"

"صرف ایک لمحہ ہے۔ اور وہ بھی پُر فریب ایک خواب جیسا۔" اکبر بولا۔

"جو زندگی ہم نے گزارنا ہے، اس زندگی کا، یہ دنیا ایک لمحہ ہے۔"

"اس ایک لمحے کے لئے ہم کیا کچھ نہیں کرتے۔"

"وہی بات ہے کہ سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں۔ ہزاروں خواہشیں اور ہر خواہش ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔ زندگی صرف ایک لمحے کی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہماری دنیا صرف ایک لمحے کی اور خواہشیں سمندر جیسی۔ پھر آدمی کیا کرے۔ وہ ہر طرف ہاتھ مارتا جا رہا ہے۔ یہ بھی مل جائے وہ بھی مل جائے۔ اکبر اگر ہم غور کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اس دنیا میں ہمیں باندھ کر پھینکا گیا ہے۔ نظر محدود، ایک حد سے ہم آگے نہیں دیکھ سکتے۔ دماغ محدود، ایک حد سے آگے ہم نہیں سوچ سکتے۔ سماعت محدود، ایک حد سے آگے ہم سن نہیں سکتے۔ اسی طرح ہمارا چھونا، چکھنا محدود، دیکھنا محدود، ہماری طاقت محدود۔ ہمارے چاروں طرف حد بندی ہے۔ ایک حصار کھنچا ہوا ہے، لیکن اکبر یہ ہماری اصل نہیں ہے۔"

"ہماری اصل کیا ہے۔" اکبر نے پوچھا۔

"ہماری اصل ہمارے جسم سے وابستہ نہیں ہے۔ ہماری روح سے وابستہ ہے۔" ماموں نے کہا۔ ان کے چہرے پر نظر ڈالی۔ "جب ہم زندگی کے اس پُر فریب لمحے سے آگاہ ہوتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم کس جال میں پھنسے ہوئے تھے۔ کس فریب میں مبتلا تھے۔ جسے ہم زندگی سمجھ کر اپنا جان جوکھم کرنے کے لئے تیار تھے۔ اصل میں وہ زندگی تھی ہی نہیں۔ زندگی تو اب شروع ہوئی ہے۔ صدیوں کا حصار ختم ہو گیا ہے۔ اب کوئی چیز محدود نہیں رہی۔ ہم پھیل کر کائنات بن گئے ہیں۔ ہم پھیل کر ابد بن گیا ہے۔" ماموں فرقان اپنے جذب میں بولے جا رہے تھے اور اکبر انہیں محو مسکرائے جا رہا تھا۔

"ماموں۔ آپ بڑی بھاری باتیں کر رہے ہیں۔" بالآخر وہ بولا۔

"ہاں۔ اس عمر میں یہ باتیں سب ہی کو بھاری لگتی ہیں۔ ابھی تم تو عمر ہو۔ جب تم میری عمر کو پہنچو گے تو یہ باتیں تمہاری خود بخود سمجھ میں آجائیں گی۔ بھاری نہیں لگیں گی۔"

"اچھا ماموں یہ بتائیں موت کیا ہے؟" اکبر نے سوال کیا اسے معلوم تھا کہ ماموں فرقان اس وقت بولنے کے موڈ میں ہیں۔ منزل ابھی دور تھی۔ جنگل کا راستہ تھا اس نے سوچا ماموں سے گفتگو جاری رکھے۔ بہرحال وہ جو کچھ کہہ رہے تھے وہ اگرچہ اس کی سمجھ میں پوری طرح نہیں آرہا تھا لیکن ان کی باتیں اسے اچھی لگ رہی تھیں۔

"موت بہت خوبصورت چیز ہے۔" ماموں نے مسکرا کر کہا۔

"بہت خوبصورت چیز ہے، ماموں یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" اکبر نے حیران ہو کر کہا۔

"آدمی مرکر، مرتا نہیں بلکہ زندہ ہوتا ہے۔ محدود سے لامحدود ہوتا ہے۔" وہ بولے۔

"ماموں مجھے تو موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔" اکبر نے کہا۔

"ابھی تم دنیا کے فریب میں مبتلا ہو جب اس سے نکلو گے تو ڈرنا چھوڑ دو گے۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں خاصے اندر نکل آئے تھے۔ اب ہموار راستہ ختم ہو گیا تھا اور پتھروں سے بھرا راستہ شروع ہو گیا تھا۔

وہ دونوں پتھروں پر چلتے ہوئے بالآخر نہر پر نکل آئے۔ اتفاق کی بات وہ ایسی جگہ نکلے جہاں انہوں نے کچھ پتھروں کو رکھ کر ایک نشانی بنا دی تھی۔ یہ نشانی اب بھی جوں کی توں تھی۔

اکبر کے قدموں میں اب تیزی آگئی وہ ماموں فرقان سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ماموں۔ بس اب ہم نزدیک آگئے ہیں، املی کا درخت قریب ہی ہے۔"

کچھ دور چلے تو درمیان میں اگا ہوا املی کا بھاری سا درخت نظر آنے لگا۔ درخت کے سامنے پہنچے تو انہیں املی والا بابا کہیں نظر نہ آیا۔ پتھر بھی خالی تھا اور درخت کے تنے میں بنا ہوا وہ محرابی کھوکھا بھی خالی تھا۔

"یہاں تو باباجی کہیں نظر نہیں آرہے۔" اکبر نے پریشان ہو کر کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ درخت کے پیچھے ہوں۔" ماموں فرقان نے رائے ظاہر کی۔

"میں جا کر دیکھوں۔" اکبر نے کہا۔

"ہاں جاؤ۔ اگر وہ درخت کے اس طرف ہیں تو مجھے اشارہ کر دینا میں آ جاؤں گا۔"

اکبر نے جوتے موزے اتار کر ایک طرف رکھے۔ پینٹ کے پائنچے جہاں تک لپٹ سکتے تھے لپیٹ لئے اور پانی میں پہلا قدم رکھا۔

ابھی اس نے دوسرا قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ آواز آئی۔

"ٹھہر جا۔"

اکبر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ املی والا بابا اچانک درخت کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گیا تھا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف آنے سے روک رہا تھا۔

اکبر کا اٹھا ہوا قدم فوراً جم گیا۔ وہ جیسے پتھر کا ہو گیا۔

"تو واپس جا۔ اسے ہمارے پاس بھیج جو تیرے ساتھ آیا ہے۔" املی والے بابا نے حکم دیا۔

یہ حکم سن کر اکبر فوراً پانی سے نکل آیا اور ماموں فرقان سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جائیں، ماموں، بابا جی آپ کو بلا رہے ہیں؟"

"اچھا ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر ماموں فرقان نے جوتے موزے اتارے، شلوار اونچی کی اور پانی میں اتر گئے۔ ٹھنڈے پانی میں سے گزر کر اونچی نیچی میڑھیوں پر پہنچے پھر چبوترے پر چڑھ گئے۔

اکبر نے دیکھا کہ املی والا بابا پلٹ کر جا چکا تھا۔ اب اس نے پتھر پر بیٹھ کر آسن جما لیا تھا آنکھیں بند تھیں۔ ماموں فرقان اس کے سامنے دو زانوں ہو کر مودبانہ انداز میں بیٹھ گئے۔

املی والے بابا نے چند سیکنڈ بعد اچانک آنکھیں کھولیں۔ اپنی ان لال انگارہ آنکھوں سے ماموں فرقان کو گھورا۔ یہ انگارہ آنکھیں دیکھ کر ماموں فرقان کو کالے بلے کی آنکھیں یاد آ گئیں۔ جانے کیا بات تھی کہ بابا کی آنکھیں دیکھ کر کالا بلا کیوں یاد آ جاتا تھا۔ اکبر کو بھی املی والے بابا کی لال انگارہ آنکھیں دیکھ کر کالے بلے کی خوفناک آنکھیں یاد آ گئی تھیں۔

"کیوں آیا ہے۔ ہم نے اس لڑکے سے منع کر دیا تھا کہ کسی اور کو ہمارا پتہ نہ بتائے مگر یہ نہیں مانا۔ یہ تجھے یہاں لے آیا ہے۔ کل کو تو کسی اور کو بھیج دے گا اور پھر یہاں سری سرد کھائی دیں گے۔ یہاں قوالیاں شروع ہو جائیں گی۔" املی والے بابا نے ناراضگی سے کہا۔

"نہیں بابا، ایسا نہیں ہو گا۔ آپ ناراض نہ ہوں۔ میں یہاں اپنی کسی غرض سے نہیں آیا بلکہ اکبر کے سلسلے میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔ اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔" ماموں فرقان نے التجا کی۔

"ہاں بول۔ زیادہ تکلف نہ تول۔" املی والے بابا کی ناراضگی برقرار تھی۔

"آپ کے سپاہی نیاز محمد اور سید پور کے جن کا جو مقابلہ ہوا، اس کے بارے میں تو آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا۔" ماموں فرقان نے بات شروع کی۔

"ہاں۔ آگے چل۔" املی والے بابا نے کہا۔

"سید پور کا جن، نیلم کی شکل میں باہر آیا۔ اکبر اسے دیکھ کر جذبات پر قابو نہ پا سکا اور کھیل بگڑ گیا۔

دراصل سید پور کا جن بہت چالاک ہے۔ وہ اپنے شعبدوں سے ہی انسان کو فیس مار تا بلکہ نفسیاتی حربے بھی آزماتا ہے۔ میں نے اسے قابو میں کرنے کے لئے قبرستان میں ایک عمل کیا تھا لیکن اس نے آخری لمحے میں چالاکی سے اس عمل کو ناکارہ کر دیا اور پھر مجھے نقصان پہنچایا۔ میں ..

"مختصر بول۔" اٹلی والے بابا نے بات کاٹی۔

"اس مرتبہ بھی اس نے نیاز محمد کی توجہ تقسیم کر دی اور اسے حصار چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔"

"نیاز محمد کی بات نہ کر اپنی بات کر۔"

"بابا جی، میرے پاس عملیات کی ایک نادر کتاب تھی پہلے تو وہ گم ہو گئی۔ جب ملی تو اس میں صفحے اڑے ہوئے تھے۔"

"کتاب کی بات نہ کر، اپنی بات کر۔"

"میں اکبر کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں، مجھ سے اس کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔"

"اب کیا ہو سکتا ہے جو بے وقوفی ہونا تھی وہ ہو گئی۔" اٹلی والے بابا کا اشارہ نیاز محمد کی طرف تھا۔

"خود نمائی جسم کا کوڑھ ہوتی ہے، ہم نے بھیجا تھا نجات دلانے وہ وہاں اپنے شعبدوں کی نمائش کرانے بیٹھ گیا۔ ہم یہاں دنیا سے چھپ کر بیٹھے ہیں۔ ہم چاہیں تو روز قوالیاں کروا سکتے ہیں۔ دیگیں پکوا سکتے ہیں لیکن ہم نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں۔ ہم خاموشی سے بیٹھ کر اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ خیر نیاز محمد کو اپنے کئے کی سزا مل گئی ہے۔ آئندہ ایسی حماقت نہ کرے گا۔"

ماموں فرقان میں ہمت نہ ہوئی کہ وہ اٹلی والے بابا سے پوچھتے کہ نیاز محمد کو کیا سزا ملی اور کیوں ملی۔ ان کی نظر میں غلطی اکبر کی تھی۔ اگر وہ نیلم کو دیکھ کر بے اختیار نہ بھاگتا تو نیاز محمد کی توجہ بٹتی نہ وہ حصار سے نکلتا۔ بہرحال یہ معاملہ بابا اور نیاز محمد کا تھا۔ وہ درمیان میں بولنے والے کون تھے۔ وہ یہاں بابا سے بات کرنے آئے تھے۔ جن سے نجات کا کوئی عمل معلوم کرنے آئے تھے۔

اٹلی والے بابا اپنی بات کہہ کر چپ ہو گیا پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر کے بعد اس نے اپنی لال انگارہ آنکھیں کھولیں اور بولا۔ "اب کچھ نہیں ہو سکتا وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ اب لکیریں رہ گئی ہیں، انہیں پیٹتے رہو سانپ تو نکل گیا۔"

ماموں فرقان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا انہوں نے سوالیہ مگر التجا آمیز نظروں سے بابا کو دیکھا۔

"میں کہہ رہا ہوں سانپ تو نکل گیا اب لکیر پیٹنے کا کیا فائدہ۔"

"بابا جی، میں سمجھا نہیں۔"

"میں نے یہاں کوئی مکتب نہیں کھول رکھا۔ جو میں لوگوں کو سمجھاتا رہوں جا اب تو جا یہاں سے تو نے میرا خاصا وقت برباد کر دیا۔"

"بابا جی، مجھے کوئی عمل بتا دیں، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

"کس چیز کے لئے عمل بتا دوں، پہلے حاضرات کروا کر دیکھ لے۔ تو تو جانتا ہے حاضرات کرنے والے بندے کو۔" اٹلی والے بابا نے ماموں فرقان کو غور سے دیکھا۔

ماموں فرقان کو فوراً واداغنور کا خیال آیا۔ ایک وہی ایسے آدمی تھے جنہیں حاضرات کا عمل آتا تھا اور ان سے واقف بھی تھے۔

"میرے دماغ میں جو نام آیا ہے ٹھیک آیا ہے تو وہاں جا۔" الٰہی والا بابا بولا۔ "جا وقت برباد نہ کر۔"

اب الٰہی والے بابا سے بحث بیکار تھی۔ ماموں فرقان فوراً اٹھ کھڑے ہوگئے۔

"ٹھیک ہے بابا جی، میں جاتا ہوں، اگر ضرورت پڑی تو میں آپ کی خدمت میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔" ماموں فرقان نے التجا آمیز انداز میں کہا۔

الٰہی والے بابا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے جواب میں آنکھیں بند کرلیں۔ ماموں فرقان چند لمحے وہاں رکے۔ شاید جواب میں الٰہی والا بابا کچھ کہے۔ لیکن اس نے کچھ نہ کہا آنکھیں بند کئے کئے اس نے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔

"خدا حافظ۔" ماموں فرقان نے کہا اور سیڑھیوں کی طرف چل دیئے۔

اکبر نہر کے اس پار بڑی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ ماموں فرقان کو واپس آتے دیکھ کر وہ ان کی طرف بڑھا۔ اس نے ماموں فرقان کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اندازہ لگانا چاہا کہ ماموں فرقان کچھ لے کر لوٹ رہے ہیں یا تہی دامن واپس آرہے ہیں۔

ماموں فرقان کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

جب وہ پانی سے گزر کر کنارے پر آئے تو اکبر نے اپنا ہاتھ بڑھا کر انہیں اوپر کھینچ لیا۔ ماموں فرقان نے اپنے پیر جھاڑ کر موزے اور جوتے پہنے۔ انہوں نے مڑ کر الٰہی والے بابا کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے اور آسن جمائے بیٹھا تھا۔

ماموں فرقان نے اکبر کا ہاتھ تھاما اور بولے۔ "آؤ اکبر واپس چلیں۔"

"کیا ہوا ماموں کیا بات ہوئی۔" اکبر نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"آگے چل کر بتاتا ہوں، یہاں سے نکل چلو۔" ماموں فرقان نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

پتھروں کی نشانی کو دیکھ کر وہ دونوں جنگل میں داخل ہوگئے۔ پھر پتھریلا راستہ ختم ہوا یہاں سے وہ پگڈنڈی شروع ہوگئی جو سیدھی ہوٹل پر نکلتی تھی۔

ماموں فرقان نے الٰہی والے بابا سے ہونے والی گفتگو من و عن دہرا دی۔

ساری بات سن کر اکبر نے بڑے تاسف سے کہا۔ "نیاز بابا، بیچارہ خواہ مخواہ مارا گیا۔"

"ہاں، کچھ سمجھ میں نہیں آئی بات۔" ماموں فرقان نے الجھتے ہوئے کہا۔ "کھیل تو تمہاری وجہ سے بگڑا تھا۔ خیر ہوگی کوئی بات، بابا نے نیاز محمد کو بلاوجہ سزا نہ دی ہوگی۔ ہو سکتا ہے اس نے ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی ہو۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔"

"الٰہی والے بابا نے ساری باتیں الجھا دیں۔ جب میں آیا تھا تو انہوں نے بڑی صاف صاف باتیں کی تھیں۔ مجھے تسلی دی تھی۔ دکھ بھرے دن ختم ہونے کی نوید سنائی تھی۔ جشن منانے کی باتیں کی تھیں۔"

اکبر نے کہا۔

"ایسے لوگ ہمیشہ ایک جیسی باتیں نہیں کرتے۔ بس ان کی ذہنی رو ہوتی ہے جس طرف چل نکلے۔ آج تو انہوں نے معاملے کی کوئی بات ہی نہیں کی حالانکہ میں نے کئی مرتبہ عمل کی طرف توجہ دلائی۔ زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے دادا غفور کا ذکر کر دیا۔ حاضرات کراؤ۔" ماموں فرقان نے کہا۔ "اب دادا غفور سے بات کرنا ہوگی، ممکن ہے وہاں کوئی بھید کھلے۔"

اب وہ دونوں باتیں کرتے کرتے اس مقام پر آپہنچے تھے جہاں ان کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ گھر پہنچے تو بابر علی شوروم جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ رک گیا۔

"ماموں کیا ہوا؟" بابر علی نے پوچھا۔

"ماموں ذرا آپ ساری بات تفصیل سے بتادیں میں منہ ہاتھ دھولوں اور راشدہ تم ذرا اچھی سی چائے بناؤ۔"

اکبر یہ کہہ کر اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی راشدہ اٹھ گئی پھر وہ چولہے پر کیتلی رکھ کر فوراً ہی واپس آگئی۔ ماموں فرقان کی باتیں سننے کے لئے۔

ماموں فرقان نے ابھی کہانی شروع ہی کی تھی سب لوگ توجہ سے ان کی بات سننے لگے۔

تھوڑی دیر بعد اکبر بھی منہ ہاتھ دھو کر آگیا۔ وہ بھی اس حیران کرنے والے قصے میں شامل ہوگیا۔ جہاں ماموں فرقان بھولتے وہاں اکبر ٹکڑا لگاتا۔

ماموں فرقان نے جب ساری داستان دہرادی تو محفل پر کچھ دیر کے لئے سناٹا چھایا رہا۔

"راشدہ چائے کا کیا ہوا؟" اکبر نے اس خاموشی کو توڑا۔

تب راشدہ کو جیسے ہوش آگیا۔ "اوہ میں تو چولہے پر کیتلی رکھ کر ہی بھول گئی۔ پانی تو پک پک کر پاگل ہوگیا ہوگا۔"

"اب اسی پانی میں پتی نہ ڈال دینا۔"

"معلوم ہے مجھے، میں دیہات سے نہیں آئی ہوں۔" راشدہ جواب دیتی ہوئی کچن کی طرف بھاگی۔

راشدہ چند منٹوں میں چائے دوبارہ دم دے کر لے آئی۔

چائے پیتے ہوئے بھی خاموشی طاری رہی۔ سب اپنی اپنی جگہ سوچوں میں گم تھے۔

"ماموں اب کیا ہوگا؟" بابر علی نے بالآخر خاموشی توڑی، وہ فرقان ماموں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ہم لوگ جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے۔ اعلیٰ والے بابا کی طرف امید کی کرن باقی تھی۔ اب وہ بھی نہیں رہی۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے ٹال دیا۔"

"ہوسکتا ہے بابر علی تمہارا خیال درست ہو۔ ایسے لوگ زیادہ جھنجھٹوں میں نہیں پڑتے لیکن انہوں نے حاضرات کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے کچھ امید بندھتی ہے اور حاضرات کے ماہر تو ہمارے

دادا غفور ہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دادا غفور کے پاس بھیجنے کے پیچھے کوئی راز ضرور ہے۔ بہرحال یہ بات تو وہاں جا کر ہی سلجھے گی۔" ماموں فرقان نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

کافی دیر اس مسئلے پر بحث ہوتی رہی لیکن اس بحث کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ نتیجہ نکل بھی نہیں سکتا تھا کسی کو عمل حقائق کا علم نہ تھا۔ جس کو جتنا معلوم تھا۔ وہ اسی حوالے سے بات کر رہا تھا۔ دلائل دے رہا تھا بہرحال اس بات کا سب کو افسوس تھا کہ اکبر کی ایک جذباتی سے غلطی سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا تھا۔ نیاز محمد کا بھی یہی خیال تھا کہ اکبر کی جلد بازی سے بساط الٹ گئی لیکن الٰہی والے بابا کا کچھ اور خیال تھا۔ الٰہی والے بابا نے اپنے سپاہی کی پیٹھ تھپتھپا دی۔ اسے لائن حاضر کر دیا تھا کیونکہ بابا کے نزدیک قصور وار نیاز محمد تھا۔ جس نے اکبر کو اپنے ساتھ اندر لے جانے کی بے وقوفی کی تھی۔

باتیں کرتے ہوئے کافی وقت گزر گیا تو اکبر نے کہا۔ "ماموں کیا خیال ہے چلیں۔"

"اب کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ اب کہاں جائیں گے کھانا کھا کر جائیں۔" بابر علی نے کہا۔

پھر ماموں فرقان نے ظہر کی نماز پڑھی اس کے بعد کھانا کھایا۔ کچھ دیر آرام کیا پھر وہ دونوں برنس روڈ کے لئے نکل گئے۔

برنس روڈ پہنچے تو عصر کا وقت نزدیک تھا وہ دونوں بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

"ہم بڑے اچھے وقت پر پہنچ گئے ہیں؟"

"اچھا۔" اکبر نے کہا۔

"ہاں حاضرات کے عمل کے لئے یہ وقت بہترین ہوتا ہے۔ دادا غفور عصر کی نماز پڑھ کر فوراً اس عمل کے لئے بیٹھ جائیں گے۔" ماموں فرقان بولے۔

"ماموں پہلے تو انہیں ساری روداد سنانی ہوگی۔" اکبر نے آخری سیڑھی پر پاؤں رکھا۔

دادا غفور کے فلیٹ کا دروازہ سامنے تھا۔ اکبر نے گھنٹی بجائی۔ دادا غفور خود دروازے پر آئے ان کی آستین چڑھی ہوئی تھی شاید وہ وضو کرنے جا رہے تھے۔

دونوں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ بولے۔ "اخاہ بڑے بڑے لوگ آئے ہیں آج تو۔"

ماموں فرقان اور اکبر نے باری باری انہیں سلام کیا۔ دادا غفور نے خوش دلی سے جواب دیا اور کہا۔

"آؤ بھئی اندر آؤ۔"

پھر وہ اپنے کمرے میں جا کر چوکی پر بیٹھ گئے ماموں فرقان نے ایک کرسی سنبھالی اور اکبر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"ہاں بھئی۔ اکبر تم کیسے ہو؟"

"بس ٹھیک ہیں دادا۔" اکبر نے دھیرے سے کہا۔

"اور تم فرقان۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اللہ کا فضل ہے۔"

"کیسے آنا ہوا؟"

"آپ شاید وضو کرنے جا رہے تھے۔"

"ہاں ارادہ تو یہی تھا۔"

"آپ وضو کر آئیں، مجھے آپ سے جو بات کرنا ہے، اس کا پس منظر سمجھانے میں دس پندرہ منٹ لگیں گے۔"

"تم اپنی بات کرو میں وضو کر لوں گا، ابھی تو اذان بھی نہیں ہوئی۔"

"ٹھیک ہے میں آپ کو ساری بات بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر ماموں فرقان نے ساری روداد بیان کر دی۔

دادا غفور پوری توجہ اور خاموشی سے سارا قصہ سنتے رہے۔ انہیں نیاز محمد کی ناکامی کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ وہ بولے۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔"

"اس سے زیادہ برا یہ ہوا کہ اعلیٰ والے بابا نے ہمیں ٹال دیا، میرا خیال تھا کہ میں ان سے کوئی عمل وغیرہ معلوم کر لوں گا لیکن انہوں نے معاملے کی کوئی بات ہی نہیں کی۔ جب میں نے عمل کا ذکر کیا تو وہ بولے کس چیز کے لئے عمل بتا دوں، پہلے حاضرات کروا کر دیکھ تو، تو جانتا ہے حاضرات والے بندے کو حاضرات کا ذکر سن کر میرا خیال فوراً آپ کی طرف گیا تو وہ بولے تیرے دماغ میں جو نام آیا ہے وہ ٹھیک ہے بس یہ آخری بات کی اس کے بعد ہمیں اپنے پاس سے بھگا دیا۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"بندہ تو پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔" دادا غفور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اشارہ اعلیٰ والے بابا کی طرف تھا۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔" ماموں فرقان نے فوراً تصدیق کی۔

"پھر دیکھتے ہیں حاضرات کر کے۔" دادا غفور نے کہا اور پھر وضو کرنے باتھ روم چلے گئے۔

نماز کے بعد دادا غفور نے شیشے کے گلاس میں اندر سے پانی منگوایا اسے اپنے سامنے رکھا اور تسبیح ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھنے لگے۔

دس پندرہ منٹ تک کچھ پڑھنے کے بعد انہوں نے گلاس اپنے نزدیک سرکایا اور ایک سفید چادر سے خود کو ڈھک لیا۔

پھر چند منٹ تک "دلہن" بنے بیٹھے رہے اس کے بعد انہوں نے وہ چادر سر سے اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ ان کا پورا چہرہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا وہ چادر سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولے۔ "فرقان معاملہ گڑبڑ ہے۔"

"کیا مطلع ابر آلود ہے؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"نہیں، دھواں نہیں ہے۔" دادا غفور نے بتایا۔

"تو پھر کیا معاملہ ہے۔" ماموں فرقان بولے۔

"دھواں نہ ہونے کے باوجود کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔" دادا غفور نے وضاحت کی۔

"دادا آپ دیکھ کیا رہے ہیں؟" اس مرتبہ اکبر نے مداخلت کی۔

"اکبر تم ۔" ماموں فرقان نے اکبر سے کچھ کہنا چاہا۔

لیکن دادا غفور نے ہاتھ کے اشارے سے ماموں فرقان کو روک دیا۔ پھر انہوں نے گہری نظروں سے اکبر کو دیکھا اور مسکرا کر بولے۔ "میں سید پور کے جن کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"مطلع صاف ہونے کے باوجود کچھ نہیں دکھائی دے رہا۔ پھر تو معاملہ گمبھیر ہے۔" ماموں فرقان نے اظہار خیال کیا۔ "ایک مرتبہ اور کوشش کر دیکھیں۔"

"چلو ٹھیک ہے ایک مرتبہ اور کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

دادا غفور نے یہ کہہ کر ایک تسبیح گھمائی اور پھر گلاس کو اپنے سامنے سرکا کر چادر اپنے سر پر ڈال لی۔

چند منٹ کے بعد جب انہوں نے چادر ہٹائی تو ان کا چہرہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ انہوں نے چادر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "وہی ڈھاک کے تین پات۔"

"کیا دادا؟ میں سمجھا نہیں۔" اکبر کی سمجھ میں ان کی بات نہ آئی۔

"اکبر تم....." ماموں فرقان نے اکبر کو پھر کوئی تنبیہہ کرنا چاہی لیکن اس مرتبہ پھر دادا غفور نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ انہوں نے مسکرا کر گہری نظروں سے دیکھا اور بولے۔ "یعنی نتیجہ وہی صفر۔"

"پھر دادا۔" اکبر نے پوچھا۔

"پھر یہ کہ مجھے یہ بتاؤ تم دونوں کیسے آئے ہو میرا مطلب ہے ٹیکسی، رکشہ سے یا اپنی گاڑی سے۔"

"گاڑی سے۔" اس مرتبہ ماموں نے جواب دیا۔

"پھر میں تم لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں۔" دادا غفور نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"دادا کہاں جائیں گے۔" اکبر نے پوچھا۔

"بھئی گلشن چلتے ہیں چل کر ذرا تمہارا گھر دیکھ لیں۔" دادا غفور نے ہنستے ہوئے کہا۔

یہ سن کر ماموں فرقان کا ماتھا ٹھنکا۔ دادا غفور اس قدر آسانی سے گھر سے نکلنے والے نہ تھے۔ اب وہ فوراً ہی گلشن جانے کے لئے تیار ہو گئے تھے تو معاملہ ضرور سنگین تھا۔

ماموں فرقان نے ان سے کوئی سوال نہ کیا وہ دادا غفور کے ساتھ خود بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آیئے چلیں۔"

تینوں بلڈنگ کی سیڑھیاں اتر کر فٹ پاتھ پر آئے تو سامنے ہی گاڑی موجود تھی۔ اکبر نے آگے بڑھ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور پھر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔

دادا غفور اور ماموں فرقان دونوں ایک ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

گاڑی نے گلشن کا راستہ اختیار کیا۔
جب گاڑی خالی گھر تک پہنچی تو اکبر کو خیال آیا کہ گھر کے گیٹ پر تو تالا پڑا ہے اور اس کی چابی اس وقت اس کے پاس نہیں تھی۔
اس نے دادا غفور سے مخاطب ہو کر کہا۔ "دادا گیٹ پر تالا ہے اور چابی گھر ہے۔"
"کوئی بات نہیں بیٹے ایسا کرو ہمیں یہاں خالی گھر پر اتار دو اور خود جا کر چابی لے آؤ۔"
"بہتر۔" یہ کہہ کر اکبر نے گاڑی خالی گھر کے سامنے روک دی۔
دادا غفور اور ماموں فرقان گاڑی سے اتر گئے۔
"میں چابی ابھی لے کر آیا۔" یہ کہہ کر اکبر نے گاڑی بھگائی۔
گھر پہنچ کر اس نے جلدی جلدی گاڑی کا ہارن دیا اور پھر اتر کر گھنٹی بجائی۔
چند سیکنڈوں کے بعد گیٹ صابرہ نے کھولا۔ صابرہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اکبر بولا۔
"امی خالی گھر کی چابی لا دیں۔ جلدی کریں۔"

"میں تمہیں وہاں نہیں جانے دوں گی۔" صابرہ نے پریشان ہو کر کہا۔
"ارے امی اس وقت ضائع نہ کریں۔ دادا غفور اور ماموں وہاں میرا انتظار کر رہے ہیں۔"
"ماموں اور دادا وہاں موجود ہیں تو میں لائے دیتی ہوں چابی۔ لیکن یہ دادا غفور کس طرح آ گئے گلشن۔ وہ تو گھر سے نکلتے نہیں۔"
"امی یہ باتیں بعد میں۔ پہلے اندر جا کر چابی لا دیں۔"
"اچھا لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر صابرہ تیزی سے گھر میں گئی۔
کچھ ہی سیکنڈ میں چابی اکبر کے ہاتھ میں تھی۔ اکبر نے چابی جیب میں ڈال کر گاڑی گھمائی اور تیزی سے خالی گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔
دادا غفور اور ماموں فرقان اس کے انتظار میں گیٹ پر کھڑے تھے۔ اس نے جلدی سے گیٹ پر لگا تالا کھولا اور پیچھے ہٹ گیا۔
ماموں فرقان نے گیٹ کا کنڈا کھول کر اسے زور سے دھکا دیا۔ گیٹ کے دونوں پٹ تیزی سے کھلتے چلے گئے۔
دادا غفور نے کچھ پڑھ کر قدم آگے بڑھایا۔ ماموں فرقان ان کے ساتھ چلے۔
ان دونوں کے پیچھے اکبر نے قدم بڑھایا تو ماموں فرقان نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور بولے۔ "اکبر تم گیٹ پر ہی ہم لوگوں کا انتظار کرو۔"
اکبر نے ماموں فرقان کو کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے التجا بھری نظروں سے دادا غفور کو دیکھا۔
"فرقان ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تمہارا ہمارے ساتھ جانا مناسب نہیں۔" یہ کہہ کر دادا غفور نے ماموں فرقان کا ہاتھ پکڑا اور خالی گھر کے احاطے میں داخل ہو گئے۔
اکبر گیٹ پر کھڑا انہیں خاموشی سے اندر جاتے دیکھتا رہا۔ اور سوچنے لگا اللہ جانے ان دونوں کا کیا حشر

ہونے والا ہے۔

ابرو نہیں معلوم تھا کہ دادا غفور یہاں کیوں آئے ہیں لیکن اسے اتنا تو اندازہ تھا کہ وہ سید پور کے جن کے سلسلے میں ہی یہاں آئے ہیں۔ اس کے دل سے فوراً دعا نکلی۔ "اے اللہ دادا غفور کو اپنے مقصد میں کامیاب کر۔"

دادا غفور اور ماموں فرقان جب گھر کے دروازے پر پہنچے تو ماموں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے دیکھ کر دادا نے انداز میں ہاتھ ہلایا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا کہ وہ کھلے گیٹ کو بند کر دے اور باہر کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرے۔

اکبر نے اشارہ پاتے ہی گیٹ کے دونوں پٹ بند کر دیئے۔ پٹ بند کرنے سے پہلے اس نے گھر کے دروازے پر ایک نظر ڈالی۔ دادا غفور اندر جا چکے تھے۔ ماموں فرقان دروازے میں داخل ہو رہے تھے پھر اس نے گھر کا دروازہ بند ہوتے دیکھا۔ تب اکبر نے بھی گیٹ بند کر دیا اور گیٹ کے ستون سے کمر ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

اکبر کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ جانے کیا ہونے والا تھا۔

دادا غفور اور ماموں فرقان گھر میں داخل ہوئے تو وہاں سناٹا طاری تھا۔ فرش پر ریت پڑی تھی جیسے کافی عرصے سے اس گھر کی صفائی نہ ہوئی ہو فی الاؤنج بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ یہاں کوئی چیز نہ تھی۔ فرش پر قالین نہ تھا۔ نہ ٹیلیو ژن۔ نہ ٹرالی اور نہ ٹرالی میں رکھا ہوا وی سی آر۔ فی الاؤنج بالکل خالی تھا۔ پھر ماموں فرقان نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا۔ ڈرائنگ روم بھی بالکل خالی تھا۔ بس فرش پر ریت جمی ہوئی تھی۔

ڈرائنگ روم سے نکل کر ماموں فرقان نے کچن کا رخ کیا وہاں بھی کچھ نہ تھا۔

اب ان دونوں نے ایک ایک کمرہ دیکھنا شروع کیا۔ سارے کمرے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ ویران پڑے تھے۔ خالی تھے۔

بس اب ایک کمرہ دیکھنا باقی رہ گیا تھا اور یہ تھا اکبر کا بیڈ روم۔ ماموں فرقان اس گھر کے چپے چپے سے واقف تھے اور اب تک جو واقعات پیش آئے تھے ان سے بھی آگاہ تھے۔ انہیں معلوم تھا اسی کمرے میں وہ شمع موجود ہے جسے سید پور کے جن نے روشن کیا تھا اور جسے کسی طرح بھی بجھایا نہ جا سکتا تھا۔ انہیں معلوم تھا اسی کمرے میں ایک شمع اور موجود ہے جو پگھل پگھل کر ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوتی جا رہی تھی۔

وہ تھی نیلم۔

نیلم کا کمرہ کھولنے سے پہلے ماموں فرقان نے دادا غفور کو دیکھا اور آہستہ سے بولے۔ "یہ نیلم کا کمرہ ہے۔"

"اچھا۔ تم پیچھے ہٹو میں دیکھتا ہوں اندر جا کر۔" دادا غفور نے آگے آتے ہوئے کہا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔" ماموں فرقان پیچھے ہٹتے ہوئے بولے۔

دادا غفور نے گردن کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا۔ انہوں نے کچھ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

ان کے ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے اور تسبیح کے دانے انگلیوں میں رقصاں تھے۔

کچھ پڑھنے کے بعد انہوں نے بند دروازے پر پھونک ماری اور پھر ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔

ماموں فرقان کو معلوم تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہوگا۔ نہیں کھلے گا کیونکہ اب تک کی روایت سے یہی بات ثابت تھی کہ سب کمرے کھل جاتے تھے لیکن یہ کمرہ کسی سے نہ کھلتا تھا۔ اگر کوئی اسے کھولنے یا اندر جھانکنے کی کوشش کرتا تو اس کا انجام بڑا بھیانک ہوتا۔

ماموں فرقان کی اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب دروازہ ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہی کھلتا چلا گیا۔ دادا غفور نے کمرے میں داخل ہونے کے بجائے دروازے کو زور سے دھکا دیا وہ دیوار سے جا لگا۔

کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ یہ کمرہ بھی خالی تھا۔ ماموں فرقان نے دروازے پر کھڑے کھڑے کمرے میں چاروں طرف نظریں گھمائیں لیکن انہیں سیدپور کے جن کی شمع کہیں نہ دکھائی دی۔ کمرے میں نیلم بھی موجود نہ تھی۔ کمرے میں ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔

"یہ کیا ہوا؟" ماموں فرقان حیران تھے۔ یہ جو کچھ ہوا تھا ان کی توقع کے خلاف ہوا تھا۔ "نیلم کہاں گئی؟"

دادا غفور نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ان کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔

"آؤ۔ اندر چلیں۔" دادا غفور نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

ماموں فرقان بھی ان کے ساتھ چلے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر کمرے کی ساری بتیاں روشن کر دیں۔ کمرے میں اجالا پھیل گیا۔ باتھ روم کا دروازہ بند تھا۔ ماموں فرقان نے آگے بڑھ کر وہ بھی کھول دیا۔ باتھ روم میں کوئی نہ تھا۔

دادا غفور نے کمرے کے درمیان میں کھڑے ہو کر کچھ پڑھنا شروع کیا۔ ان کی نظریں دروازے پر تھیں۔ ماموں فرقان بھی خاموشی سے کھلے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دل میں ایک دھڑکا سا تھا، وہ سوچ رہے تھے کہ اب کالے بلّے کی آواز سنائی دی کہ تب سنائی دی لیکن کچھ نہ ہوا۔ ہر سُو سناٹا چھایا رہا۔

دادا غفور نے پڑھنے کے بعد انگشت شہادت اپنے سر پر دائرے کی شکل میں گھمائی اور غصے سے بولے۔ "کہاں ہے تو۔ چھپ کیوں گیا۔ سامنے کیوں نہیں آتا۔"

اس للکار کے جواب میں کوئی للکار سنائی نہ دی۔ ماموں فرقان نے ٹھنڈا اور گہرا سانس لیا اور دادا غفور کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولے۔ "کیا وہ چلا گیا، اس گھر کو چھوڑ گیا۔"

"ہاں۔" دادا غفور نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"اور نیلم کہاں ہے؟" ماموں فرقان نے سوال کیا۔ "کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"کہیں وہ اسے اپنے ساتھ تو نہیں لے گیا۔" ماموں فرقان نے خدشہ ظاہر کیا۔

"ممکن ہے۔" دادا غفور نے سوچتے ہوئے فکرمندی سے کہا۔

"اگر ایسا ہوا تو بُرا ہوگا۔"

"میرا خیال ہے کہ ایسا ہونا ہی ہے۔ نیلم کی غیر موجودگی بتاتی ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔"

"اب والے بابا کی بات اب سمجھ میں آئی۔"

"وہ کیا۔"

"انہوں نے مجھے عمل بتانے سے آنا کانی کی تو اس کی وجہ کیا تھی۔" ماموں فرقان نے کہا۔ "اب اس جملے کا مفہوم بھی واضح ہو گیا ہے جو انہوں نے اس وقت کہا تھا۔"

"وہ کیا۔" دادا غفور نے پوچھا۔

"انہوں نے کہا تھا، سانپ تو نکل گیا، اب لکیر پیٹنے کا کیا فائدہ۔ انہیں سب معلوم تھا۔ اسی لئے انہوں نے عمل بتانے سے گریز کیا۔" ماموں فرقان کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ وہ بڑے تاسف سے بولے۔ "اب معاملہ اور پیچیدہ ہو گیا ہے پہلے تو یہ تھا کہ وہ ہمارے سامنے تھا، ہم اس کے لئے کوئی نہ کوئی توڑ کر سکتے تھے، لیکن اب کیا کریں گے۔"

"وہ یہاں سے بھاگا ہی اسی لئے ہے کہ ہم لوگوں نے اس کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اسے سکون سے نہیں رہنے دیا تھا۔" دادا غفور نے کہا اور پھر کمرے سے باہر نکل آئے۔

ماموں فرقان نے کمرے کی بتیاں بجھاویں اور خاموشی سے سر جھکائے وہ بھی دادا غفور کے ساتھ باہر آ گئے پھر وہ ان کے پیچھے چلتے ہوئے آہستہ سے بولے۔

"کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ سید پور کا جن گھر چھوڑ چکا ہے۔"

"ہاں، اب اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو اب تک ظاہر ہو چکا ہوتا اور اس بات کا کسی حد تک یقین مجھے حاضرات کے عمل کر کے ہی آ گیا تھا۔ دھواں نہ ہونے کے باوجود کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو گھر کے پیچھے چکر لگا آؤں۔" ماموں فرقان ابھی تک تذبذب میں تھے۔

"وہ کس لئے۔"

"ہو سکتا ہے، نیلم وہاں ہو۔"

"اچھا، دیکھ آؤ، اپنی تسلی کر لو، میں گیٹ کی طرف چلتا ہوں۔"

"آپ ایک منٹ یہیں ٹھہریں، میں ذرا گارڈن میں دیکھ آؤں، پھر آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ وہ اکبر کے سامنے نہیں ہو سکے گی۔"

"چلو ٹھیک ہے، تم گارڈن کا چکر مار آؤ۔"

ماموں فرقان تیز تیز قدموں سے گھر کے پچھلے حصے میں پہنچے۔ وہاں انہوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔ نہ نیلم تھی، نہ نیلم کا کوئی نشان تھا۔

وہ شرمندہ شرمندہ سے واپس آئے اور بولے۔ "ادھر کوئی نہیں۔"

"ادھر کیا، اب ادھر بھی کوئی نہیں۔"

"میں اکبر کو نیلم کے بارے میں صاف صاف بتادیں، یہی بات میں آپ سے کرنا چاہ رہا تھا۔"

"میرے خیال میں تو بتا دینا چاہئے۔" دادا غفور نے گھر کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اسے بہت صدمہ ہوگا۔" ماموں فرقان نے کہا۔ "ابھی تک تو اسے یہ تسلی تھی کہ نیلم خالی گھر میں موجود ہے، کسی بھی وقت آزاد ہو سکتی ہے۔ اب جب اس کو یہ معلوم ہوگا کہ نیلم اس گھر سے جا چکی ہے اور وہ بھی کسی نامعلوم سمت تو وہ بے حد پریشان ہوگا۔"

"پھر تم اسے کیا کہو گے؟"

"ہم اسے اتنا بتادیں کہ سیدپور کا جن یہ گھر چھوڑ کر جا چکا ہے۔"

"یہ سن کر سب سے پہلا سوال وہ یہ کرے گا کہ نیلم کہاں ہے۔"

"ہاں، یہ بات بھی آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ اس سے حقیقت مت چھپاؤ۔ وہ بڑے حوصلے اور بڑے صبر کا لڑکا ہے۔ برداشت کر جائے گا پھر ہم دونوں مل کر اسے تسلی دے دیں گے۔" دادا غفور نے کہا۔

"جھوٹی تسلی۔" ماموں فرقان نے مسکرا کر کہا۔

"جھوٹی تسلی دینے میں کوئی حرج نہیں۔" دادا غفور بولے۔ "ہم کوشش کریں گے کہ کسی طرح اس جن کا پتہ و نشان مل جائے اگر مل گیا تو وہ تسلی جھوٹی نہ رہے گی۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے گیٹ تک آگئے۔ گیٹ بند تھا۔

"بیچارہ، باہر کھڑا ہمارا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوگا۔" دادا غفور بولے۔

"کسی خوشخبری کا منتظر ہوگا۔"

"اس لڑکے کی قسمت ہی خراب ہے۔ کام بنتے بنتے بگڑ جاتا ہے۔"

ماموں فرقان نے آگے بڑھ کر گیٹ کو ہلایا۔ گیٹ باہر سے بند تھا۔

گیٹ کو ہلتے دیکھ کر اکبر جو نکلا اس نے فوراً گیٹ کا کنڈا کھول دیا۔ پھر اس نے دونوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ دونوں صحیح سلامت تھے۔ اکبر کو انہیں ٹھیک ٹھاک دیکھ کر خوشی ہوئی۔

"اکبر گیٹ میں تالا لگا دو۔" ماموں فرقان نے کہا۔

اکبر نے گیٹ بند کر کے اس میں تالا لگا دیا۔ اس اثناء میں دادا غفور اور ماموں فرقان گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ مجبوراً اسے بھی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنا پڑی۔

وہ چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد اسے معلوم ہو جائے کہ اندر کیا ہوا؟ لیکن دونوں بزرگ کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں معلوم ہوتے تھے..... اور وہ چاہتا نہیں تھا کہ خود سے پوچھے۔ اگر یہاں صرف ماموں فرقان ہوتے تو وہ کب کا ان سے کئی تابڑ توڑ سوالات کر چکا ہوتا۔

جب اکبر نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا تو ماموں فرقان نے کہا..... "مجھے اپنے گھر چھوڑ دو اور پھر دادا

غفور کو چھوڑ آتا۔"

"دادا غفور کو تو میں چھوڑ آؤں گا، لیکن اتنی جلدی جانے کی کیا ضرورت ہے۔ دادا غفور کو اپنے ساتھ گھر لے چلتے۔ کچھ دیر گھر بیٹھ کر پھر چلے جائیں گے۔ اس طرح امی، ابو سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ امی کو جب معلوم ہوا کہ آپ آئے ہوئے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئیں..... انہوں نے فوراً گھر کی چابی دیدی ورنہ وہ چابی دینے کے لئے تیار نہ تھیں۔" اکبر نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"نہیں بر خوردار اب میں سیدھا گھر جاؤں گا۔ اپنے امی ابو کو میرا سلام کہہ دینا۔" دادا غفور نے فیصلہ سنایا۔

جب گھر آگیا تو ماموں فرقان گاڑی سے نیچے اتر گئے، انہوں نے دروازہ بند کر کے کھڑکی سے دادا غفور سے ہاتھ ملایا۔ "اچھا خدا حافظ، میں ایک آدھ دن میں آپ کے پاس آؤں گا۔ آپ راستے میں اکبر کو ذرا سمجھا دیجئے گا۔"

"اچھا، ٹھیک ہے۔" دادا غفور نے بڑے اطمینان سے کہا..... پھر اکبر سے مخاطب ہو کر بولے۔ "چلو میاں۔"

جب گاڑی آگے بڑھی اس وقت تک ماموں فرقان مٹھی کے بٹن پر ہاتھ رکھ چکے تھے..... وہ جس بات سے پریشان تھے..... وہ مسئلہ آسانی سے حل ہو گیا تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ ان میں ہمت نہ تھی، اکبر سے بات کرنے کی۔ اسے یہ بتانے کی کہ نیلم اب خالی گھر میں نہیں ہے۔ دادا غفور اسے بتا بھی دیں گے اور سمجھا بھی دیں گے۔

گاڑی تھوڑا آگے بڑھی تو دادا غفور نے کہا۔ "اکبر میاں، ذرا گاڑی روکو۔"

اکبر نے فوراً گاڑی روک کر سڑک کے ایک طرف کر لی اور حیرت سے دادا غفور کو دیکھا۔

"خیریت۔"

"ہاں، خیریت ہے، میں ذرا تمہارے پاس آجاؤں۔" یہ کہہ کر وہ گاڑی سے باہر آئے..... اور اگلا دروازہ کھول کر اکبر کے برابر بیٹھ گئے۔ "اب چلو..... تم سے بات کرنا تھی، پیچھے بیٹھ کر نہ ہوتی۔"

"جی فرمائیں۔" اکبر ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"اکبر میں تمہیں ایک اچھی اور ایک بری خبر سنانا چاہتا ہوں..... سن لو گے؟"

"جی بالکل۔" اکبر نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جو اچھی خبر ہے، وہ بھی بری خبر کے اندر دب گئی ہے، اس لئے خاصے حوصلے کی ضرورت ہے، میں تمہیں ایک سمجھدار اور بڑے حوصلے کا لڑکا پاتا ہوں..... تم نے اب تک جس بردباری کا مظاہرہ کیا ہے..... وہ تمہارا ہی حصہ ہے..... سمجھدار بھی ہو، عقلمند بھی اور صابر اور شاکر بھی۔"

"جی دادا شکریہ، آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اطمینان سے کہیں۔" اکبر نے بظاہر اطمینان سے کہا لیکن اندر سے اس کا اطمینان اڑ گیا تھا۔

"تم کو کچھ اندازہ ہے کہ میں خالی گھر میں کیوں گیا تھا۔" دادا غفور نے سوال کیا۔

"جی نہیں۔" اکبر نے فوراً جواب دیا۔

"میں اس خالی گھر میں ایک بات کی تصدیق کرنے گیا تھا۔" دادا غفور نے بتایا۔

"کس بات کی۔" اکبر نے پوچھا۔

"حاضرات کرنے پر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا تھا کہ جیسے جن نے اس گھر کو چھوڑ دیا ہو۔"

"پھر دادا۔" اکبر نے بڑے جوش سے کہا۔

"جب میں اور فرقان خالی گھر میں داخل ہوئے تو ہمیں یقین ہو گیا کہ سیدپور کا جن اس گھر کو خالی کر گیا ہے۔" دادا غفور نے بتایا۔

"واقعی دادا۔" اکبر نے خوشی کا اظہار کیا۔

"وہ گھر بالکل خالی ہو گیا ہے..... سارے کمرے کھلے ہوئے تھے حتیٰ کہ وہاں جن کی جلائی ہوئی شمع بھی نہیں تھی۔" دادا غفور نے مزید بتایا۔

"دادا، یہ خبر آپ نے مجھ سے اب تک چھپا کر کیوں رکھی، مجھے وہیں کیوں نہ بتائی..... اللہ تیرا شکر ہے کہ نیلم اس ظالم کے پنجے سے آزاد ہو گئی۔" پھر اچانک اکبر کے دماغ میں دھماکا سا ہوا..... ایک بجلی سی گری..... اگر سیدپور کا جن گھر چھوڑ گیا ہے..... وہاں اس کی جلائی ہوئی شمع بھی نہیں ہے تو پھر نیلم کہاں ہے..... جب وہ آزاد ہو گئی ہے تو یہ لوگ اسے اپنے ساتھ باہر کیوں نہیں لائے..... اسے وہاں کیوں چھوڑ آئے..... اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔

"دادا۔" اکبر کی آنکھوں میں جن کے چلے جانے سے جو چمک پیدا ہو گئی تھی وہ فوراً ہی ختم ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے چراغ بجھ گئے..... وہ بڑی اداسی سے بولا۔ "اب وہ بری خبر بھی سنا دیجئے۔"

"نیلم اس گھر میں نہیں ہے....." دادا غفور نے صاف اور دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"نیلم بھلا وہاں سے کہاں جا سکتی ہے۔" اکبر نے دادا غفور پر شبہے بھری نظر ڈالی۔ "دادا، خدا کے واسطے جو سچ ہے وہ فوراً بتا دیجئے..... مجھ میں بڑا حوصلہ ہے میں سب کچھ برداشت کر لوں گا۔"

"بس، یہی سچ ہے۔" دادا غفور نے کہا۔

"جب جن اس گھر کو چھوڑ کر چلا گیا ہے، تو نیلم وہاں سے کہاں غائب ہو گئی..... یہ ناممکن ہے، دادا، کیا نیلم مر گئی ہے..... آپ لوگوں نے وہاں اس کی لاش دیکھی ہے؟"

"نہیں اکبر بیٹے، ایسی کوئی بات نہیں ہے..... آؤ تم واپس چلو، اس گھر کے اندر جا کر دیکھ لو۔"

"پھر وہ آخر کہاں گئی؟"

"میرا خیال ہے کہ جن اسے اپنے ساتھ لے گیا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا دادا، اب ہم اسے کہاں ڈھونڈیں گے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا، میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کروں گا..... تم مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ نیلم کے جانے کا دل پر اثر نہیں لو گے..... ویسے ہی صبر کا مظاہرہ کرو گے جیسا اب تک کرتے آئے ہو..... ٹھیک ہے۔"

"جی ٹھیک ہے....." اکبر نے اداسی سے کہا۔

"فرقان کو ساتھ لے جا کر الٰہی والے بابا سے ملو، انہیں سارے حالات بتاؤ، دیکھو وہ کیا کہتے ہیں پھر آ کر مجھے بتانا، میں اپنے طور پر بھی کچھ کرتا ہوں۔" دادا غفور نے کہا۔

پھر اس کے بعد ان دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ دونوں کے ہونٹ جیسے سختی سے سل گئے۔ دادا غفور نے اسے خبر سنانے کو تو سنا دی اور اپنی طرف سے سمجھا بھی دیا لیکن خود ان کا دل اندر ہی اندر کٹا جا رہا تھا۔ جن کا فرار اور نیلم کی گمشدگی ایک سانحہ تھی۔

اس خبر کو سننے کے بعد اکبر پر افسردگی کا حملہ ہوا اسے نہیں معلوم کہ وہ کس طرح برنس روڈ پہنچا۔ دادا غفور کو ان کے گھر کے دروازے تک چھوڑا اور کس طرح وہ واپس اپنے گھر گلشن پہنچا۔

گھر پہنچا تو سب نے اسے فکرمندی سے دیکھا۔ اکبر نے کوشش کر کے مسکرانے کی کوشش کی۔ اس مسکرانے کی کوشش میں اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ خاموشی سے ایک صوفے میں دھنس گیا۔

صابرہ اٹھ کر اس کے قریب آ گئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی..... "چھوڑ آئے دادا غفور کو۔"

"جی امی....." اکبر نے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"دادا غفور نے کیا کہا....." ماموں فرقان اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

"وہی جو آپ نہ کہہ سکے۔" اکبر نے صاف لہجے میں کہا۔

"ناراض ہو مجھ سے۔" ماموں فرقان اٹھ کر اس کے دائیں جانب بیٹھ گئے۔

"نہیں، میں کسی سے ناراض نہیں، ہاں البتہ تقدیر مجھ سے ضرور ناراض ہے۔"

"پریشان مت ہو بیٹا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" صابرہ نے اس کا ہاتھ دبایا۔

"امی، اب مجھے لگتا ہے کچھ ٹھیک نہیں ہو گا۔" اکبر نے مایوسی سے کہا۔

"اکبر بھائی حوصلہ رکھیں۔" راشدہ بولی۔

"بیٹا، اس طرح ہمت ہارو گے تو کس طرح کام چلے گا۔" بابر علی نے کہا۔

"دادا غفور نے کوئی مشورہ دیا۔" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"وہ کہہ رہے تھے کہ میں آپ کو لے کر الٰہی والے بابا سے ملوں۔" اکبر نے بتایا۔

"ٹھیک ہے، پھر ہم دونوں صبح ادھر چلیں گے۔"

"اچھا۔" اکبر نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اصل میں اب تک اس نے جن کے فرار اور نیلم کی گمشدگی کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ سوچتے سوچتے ایک خیال اس کے دل میں آیا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اپنی ماں سے مخاطب ہوا۔

"امی، گھر کی چابیاں کہاں ہیں۔"
"چابی تو تمہارے ہی پاس تھی، بیٹا۔"
"چابی تو صرف گیٹ کے تالے کی چابی ہے، میں کمروں کی چابیاں مانگ رہا ہوں۔"
"امی، وہ تو صرف گیٹ کے تالے میں پڑی ہیں، لاؤں۔"
"الماری کی دراز میں پڑی ہیں، لاؤں۔"
"ہاں، امی۔"
"کیا کرو گے۔" ماموں فرقان نے پوچھا۔
"ماموں میں خالی گھر تک جاؤں گا۔" "تمام کمروں کے تالے بند کر کے دیکھوں گا، اگر وہ سارے تالے بند ہو گئے تو سمجھوں گا کہ وہاں اب کوئی نہیں ہے کیونکہ جب ہم نے گھر خالی کیا تھا تو دروازے کا ایک بھی تالا باوجود کوشش کے بند نہیں ہو سکا تھا۔"
"ٹھیک ہے۔ تم جا کر تالے بند کر آؤ، پورا گھر کھلا ہوا ہے۔" ماموں فرقان نے کہا۔
راشدہ نے لا کر چابیوں کا گچھا اس کے ہاتھ پر رکھا اور بولی..... "اکبر بھائی، آپ وہاں اکیلے جائیں گے۔"
"اکیلے جانے میں کیا ہے، جب وہاں کوئی ہے ہی نہیں۔" اکبر افسردگی سے بولا۔
"ماموں کو ساتھ لے جاؤ یا کہو تو میں چلوں۔" بابر علی نے کہا۔
"ارے نہیں ابو، آپ آرام سے بیٹھیں، میں ابھی آیا۔"
یہ کہہ کر وہ گھر سے نکل گیا، گاڑی ابھی گیٹ کے باہر ہی کھڑی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے اس نے خالی گھر کی طرف رخ موڑا۔
رات ہو چکی تھی۔ وہ خالی گھر پہنچا تو گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔
اس گھر کو دیکھ کر ایک خوف کی لہر اس کے جسم میں داخل ہوئی۔ اس نے ہمت کر کے گیٹ پر پڑے تالے کو کھولا اور گیٹ کے دونوں پٹوں کو زور سے دھکا دیا۔ گیٹ کھلتا چلا گیا۔
وہ اللہ کا نام لے کر آگے بڑھا۔
سب سے پہلے اس نے گیٹ اور گھر کے دروازے کی بتیاں روشن کیں پھر وہ گھر کے اندر داخل ہوا۔ اب وہ ہر کمرے میں داخل ہو کر لائٹ جلاتا چلا جا رہا تھا۔ پھر سب سے آخر میں وہ اپنے بیڈ روم کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس کے دل کی دھڑکن اچانک تیز ہو گئی۔
اس کمرے سے بہت بھیانک اور وحشت ناک یادیں وابستہ تھیں۔
پھر اس نے ہمت کر کے دروازہ کھول دیا اور کمرے میں داخل ہو کر بتیاں روشن کیں۔ سارے کمروں کی طرح یہ کمرہ بھی خالی پڑا تھا۔ بالکل ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ بس ایک فرق تھا۔ اب اس کمرے کے فرش پر شمع نہیں رکھی تھی۔
اس نے کمرے کے درمیان کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اس کی نظریں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ نوشتہ دیوار پڑھنا چاہتا تھا لیکن دیوار پر کچھ لکھا ہوا تو اس کی نظر میں آتا۔

پھر وہ باتھ روم میں داخل ہوا۔ لائٹ روشن کی۔ باتھ روم میں بھی کچھ نہ تھا۔ اس نے ایسے ہی دروازے کے پیچھے جھانکا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید دروازے کے پیچھے لگی کھونٹیوں پر نیلم کا کوئی کپڑا وغیرہ رہ گیا ہو۔

کھونٹیوں پر کچھ نہ تھا، وہ خالی پڑی تھیں۔

لیکن پھر وہ جیسے چونک اٹھا۔ دروازے کے پیچھے کچھ لکھا ہوا تھا۔

یہ نیلم کی تحریر تھی۔ شاید اس نے اپنی لپ اسٹک سے قلم کا کام لیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"اکبر میں تمہاری ہوں، مجھے بھول نہ جانا۔"

اس تحریر کو دیکھ کر اکبر کے دل پر ایک برچھی سی لگی۔ اس کے سینے کے سارے زخم کھل گئے وہ جو بڑی مشکل سے اپنے آپ کو ضبط کئے ہوئے تھا ضبط کے سارے بندٹوٹ گئے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔ اس نے دروازے کو پکڑ لیا اور اپنی پیشانی اس تحریر پر رکھ دی۔

اب وہ سسک سسک کر رو رہا تھا۔ اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا اور دکھ آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

"نیلم، میری نیلم..... تم کہاں چلی گئیں..... تم مجھے اکیلا کیوں چھوڑ گئیں..... اب میں کیا کروں..... نیلم میں کیا کروں..... نیلم، میری نیلم۔"

اس کے آنسو اس کی آہ و بکا، اس کی پکار اگر کوئی سن لیتا تو اس کا دل دہل جاتا۔

وہ دروازے سے چپکا جانے کتنی دیر روتا رہا۔ تب اچانک اسے احساس ہوا کہ جیسے کسی نے اپنا نرم ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا ہو۔

اکبر نے فوراً پلٹ کر دیکھا لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔

اب وہ اپنے آنسو پونچھتا ہوا باتھ روم سے نکل آیا۔ چند سیکنڈ وہ کمرے میں کھڑا ہوا پھر اس نے کمرے کی بھی بتی بند کی اور باہر آگیا اس کے بعد اس نے تالے میں چابی لگائی گھمائی تالا بند ہو گیا۔

پھر اس نے ایک ایک کر کے سارے گھر کی بتیاں بجھا دیں اور سب کمروں کو مقفل کر دیا پھر اس نے کمرے کے بڑے دروازے میں چابی گھمائی وہ بھی بند ہو گیا۔

تھکے قدموں سے چلتا اور بھیگی آنکھوں سے دیکھتا اور ٹوٹے ہوئے دل سے سوچتا وہ گیٹ تک آیا، گیٹ بند کر کے گاڑی میں بیٹھا اور گھر کی طرف چل دیا۔

اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس خالی گھر میں جن ہے نہ نیلم۔

گاڑی چلاتے ہوئے بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے نیلم کی تحریر آرہی تھی۔

"اکبر میں تمہاری ہوں، مجھے بھول نہ جانا۔"

کریم کلر کے دروازے پر لکھی ہوئی یہ سرخ تحریر اس کے دل پر چھریاں چلا رہی تھی اس کا دل ڈوب ڈوب جاتا تھا۔

وہ بمشکل اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا، گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اس نے گاڑی اندر جا کر پارک کی اور گھر

میں داخل ہوا۔ گھر میں اس نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔
چابیوں کا گچھا صابرہ کے ہاتھ پر رکھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔
صابرہ نے اکبر کے پیچھے جانا چاہا تو بابر اور ماموں فرقان دونوں نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔
"اسے مت چھیڑو۔"
"اس کا چہرہ تو دیکھو کیسا ستا ہوا ہے لگتا ہے جیسے بہت رو کر آیا ہو۔" صابرہ نے بڑے دکھ سے کہا۔
"اسے اب تنہا چھوڑ دو، تم اس کے پاس جاؤ گی تو وہ اور روئے گا اور دکھی ہو گا۔" ماموں فرقان نے صابرہ کو سمجھایا۔
"اچھا میں کچھ بولوں گی نہیں دیکھ تو آؤں کہ وہ اندر کیا کر رہا ہے۔" صابرہ نے کہا۔
"جاؤ، دیکھ آؤ۔" ماموں فرقان نے اجازت دی۔ وہ جانتے تھے کہ صابرہ اپنی ممتا سے مجبور ہے۔
صابرہ نے فوراً اکبر کے کمرے کا رخ کیا۔ یہ اچھا تھا کہ اس نے اپنا دروازہ اندر سے بند نہیں کیا تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔
اکبر نے اپنے جوتے بھی نہیں اتارے تھے وہ بیڈ پر چت لیٹا، چھت کو گھور رہا تھا بہت گہری سوچ میں تھا۔
دروازہ کھلنے کی آواز سے اس نے دروازے کی طرف دیکھا دروازے پر ماں کو پایا تو آہستہ سے بولا۔
"آجائیں امی۔"
تب صابرہ نے پورا دروازہ کھول دیا۔ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور بولی۔ "آرام کر رہے ہو۔"
"ہاں امی اب زندگی میں آرام ہی آرام رہ گیا۔ جس سے زندگی کی ہلچل مچی تھی وہ تو چلی گئی۔"
"بیٹا فکر کیوں کرتے ہو۔" صابرہ نے اسے تسلی دی۔ "کیا ہوا، گھر کے سارے تالے بند ہو گئے؟"
"ہاں امی، کمرے سے شمع بھی غائب تھی۔" اکبر نے کہا۔ "امی مجھے اس گھر میں نیلم کا ایک پیغام ملا ہے۔"
"کیسا پیغام؟" صابرہ یہ کہہ کر اس کے نزدیک بیٹھ گئی۔
"باتھ روم کے دروازے کے پیچھے لپ اسٹک سے لکھی ہوئی نیلم کی تحریر موجود ہے۔"
"ہائے۔" صابرہ کو بڑی حیرت ہوئی۔ "کیا لکھا ہے وہاں۔"
"امی.....امی۔" پھر اکبر سے کچھ بتایا نہ گیا اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے وہ اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر رو دیا۔

پھر صابرہ نے اس سے کچھ نہیں پوچھا بس خاموشی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی اور اس کی آنکھوں کے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے سے صاف کرتی رہی۔

تھوڑی دیر کے بعد راشدہ کمرے میں داخل ہوئی اس نے صابرہ کے نزدیک آکر آہستہ سے کہا۔

"امی آپ کو ابو بلا رہے ہیں۔"

"تم چلو، میں آتی ہوں۔" صابرہ نے اسے جواب دیا۔

تب اکبر نے اپنا سر صابرہ کی گود سے اٹھا کر تکیے پر رکھ لیا اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔

صابرہ جب ٹی وی لاؤنج میں آئی تو بابر نے قدرے ناراضگی سے کہا۔ "اسی لئے میں تمہیں وہاں جانے سے روک رہا تھا تم وہاں جم کر ہی بیٹھ گئیں۔"

صابرہ نے بابر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ماموں فرقان سے مخاطب ہوئی۔ "ماموں آپ کو کچھ معلوم ہے کہ نیلم نے اکبر کے نام کیا پیغام چھوڑا ہے؟"

"نہیں، مجھے تو نہیں معلوم۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"باتھ روم کے دروازے کے پیچھے وہ کچھ لکھ کر گئی ہے۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گھر کی گھنٹی بجی۔ ماموں فرقان کا لڑکا عرفان جو حیدر آباد کے ایک بینک میں منیجر تھا وہ گھر میں داخل ہوا۔

عرفان یہاں اپنے باپ کی تلاش میں آیا تھا۔

ماموں فرقان صبح کے گھر سے نکلے ہوئے تھے۔ وہ ابھی تک گھر واپس نہ پہنچے تھے۔ عرفان گھر پہنچا تو اسے سارے حالات کا علم ہوا۔ ماموں فرقان ایک مرتبہ جن کے ہاتھوں زک اٹھا چکے تھے اس لئے گھر کا کوئی فرد چاہتا نہ تھا کہ ماموں فرقان اس معاملے میں خود کو ملوث کریں لیکن یہ بات کسی میں کہنے کی ہمت نہ تھی کیونکہ معاملہ رشتے داری اور انسانی ہمدردی کا تھا۔ ممانی ریحانہ خاموش ہی رہتی تھیں ویسے وہ جانتی تھیں کہ ماموں فرقان ضد کے کس قدر پکے ہیں۔ ایک مرتبہ جو دل میں سما جائے اسے کر کے ہی چھوڑتے تھے۔

عرفان کچھ ماموں فرقان کے سامنے بول دیا کرتا تھا۔ وہ جب بھی حیدر آباد سے آتا، فون کرتا یا وہاں سے خط لکھتا، اپنے باپ کو اس معاملے میں تنبیہہ کا ایک آدھ جملہ ضرور لکھ دیتا، بول دیتا تھا۔

آج بھی جب اسے معلوم ہوا کہ ماموں فرقان مہم پر نکلے ہوئے ہیں تو دل ہی دل میں وہ بہت کڑھا لیکن اس نے ممانی ریحانہ کے سامنے اس کا اظہار نہ کیا۔

گلشن کے اس گھر میں فون نہ تھا، اس لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ گھر جا کر خیریت معلوم کی جائے۔ ممانی ریحانہ خاصی پریشان ہو رہی تھیں اور ان کا پریشان ہونا بھی بجا تھا۔ ملیر کوئی اتنی دور نہ تھا۔ ان لوگوں کو دوپہر تک گھر واپس آجانا چاہئے تھا مگر اب شام گہری ہو چکی تھی اور ماموں فرقان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ تب عرفان نئے گھر کا پتہ لے کر نکل پڑا۔

عرفان کو دیکھ کر ماموں فرقان مسکرائے اور بولے۔ "تمہاری امی سے صبر نہ ہو سکا۔"

"ابا، آپ کو دیر بھی تو بہت ہو گئی۔" عرفان نے بڑے مودبانہ لہجے میں کہا۔

اکبر کو جب معلوم ہوا کہ عرفان آیا ہے تو وہ اپنے کمرے سے اٹھ کر چلا آیا۔ اکبر کو دیکھ کر عرفان حیرت زدہ رہ گیا۔ "اکبر تم یہاں ہو۔"

عرفان کی حیرت کا اکبر نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔ وہ اپنے غم میں مبتلا تھا۔ دھیرے سے بولا۔ "امی مجھے کہاں ہونا چاہئے تھا۔"

"شبہ تو مجھے امی کی بات سے ہی ہو گیا تھا لیکن اب تمہیں یہاں دیکھ کر شبہ یقین میں تبدیل ہو گیا ہے۔" عرفان نے بڑے پُریقین لہجے میں کہا۔

"بھائی عرفان کیا ہوا؟ آپ کو کس بات کا یقین ہو گیا؟" راشدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے آج اکبر کو حیدر آباد اسٹیشن پر دیکھا تھا نیلم کے ساتھ۔" عرفان نے بالآخر حیران کرنے والی خبر سنائی۔

یہ خبر واقعی بڑی دھماکہ خیز تھی۔ سب کے سب چونک گئے اور حیرت سے عرفان کو دیکھنے لگے۔

"تم نے اکبر کو نیلم کے ساتھ دیکھا تھا۔" ماموں فرقان نے دوبارہ تصدیق چاہی۔

"جی ابا۔" عرفان نے بڑے یقین سے کہا۔

"پوری بات تفصیل سے بتاؤ۔" بابر علی نے بے چین ہو کر کہا۔

"میں حیدر آباد سے کراچی ہمیشہ اپنی گاڑی پر آتا ہوں، آج گاڑی خراب تھی تو میں نے سوچا کہ بہت دن سے ٹرین سے سفر نہیں کیا ہے آج ٹرین سے سفر کیا جائے۔ اسٹیشن پہنچا میری گاڑی آنے میں دیر تھی۔ میں پلیٹ فارم پر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اتنے میں کراچی سے آنے والی ایک گاڑی پلیٹ فارم پر رکی۔ میں جہاں کھڑا تھا وہاں فرسٹ کلاس کا ڈبہ تھا۔ گاڑی رکتے ہی میری نظر نیلم پر پڑی۔ وہ برتھ پر بیٹھی تھی اور اس کی نظریں اوپر تھیں شاید وہ کھڑکی کھولنے والے کو دیکھ رہی تھی۔ پھر مجھے کھڑکی میں اکبر کا چہرہ نظر آیا۔ نیلم کی شکل دیکھتے ہی میں کھڑکی کی طرف بڑھ چکا تھا جب میں نے اکبر کو کھڑکی سے جھانکتے دیکھا تو میں نے اسے آواز دی۔ اپنا نام سن کر اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں دیکھ کر میں ایک لمحے کو ٹھٹھک گیا وہ انسانی آنکھیں نہیں تھیں اور اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی بلّے کی آنکھیں تھیں۔ اس وقت کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میں اکبر کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں اس لئے میں نے اس کی آنکھوں پر اتنا غور نہیں کیا لیکن اب جبکہ مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ وہ اکبر نہیں تھا تو وہ آنکھیں اپنے تمام اسرار کے ساتھ میرے سامنے ہیں۔ بہرحال اکبر نے اپنا نام سنتے ہی فوراً کھڑکی گرا لی مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کچھ غصہ بھی آیا کہ یہ اکبر نے کیا کیا۔ میری طرف دیکھ کر بھی کھڑکی بند کر لی۔ کیا اس نے مجھے پہچانا نہیں یا اگر پہچان لیا تھا تو پہچان کر انجان بن جانا چاہتا ہے۔ پھر مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں نے طے کیا کہ یہ اکبر مجھے نہیں پہچاننا چاہتا تو نہ پہچانے۔ یہ اجنبی بن گیا ہے تو میں بھی کیوں نہ اجنبی بن جاؤں بس پھر یہ سوچ کر میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ آیا۔ کچھ دیر کے بعد گاڑی پلیٹ فارم سے چلی گئی گھر آیا تو سب

سے پہلے امی سے میں نے اکبر کی شکایت کی کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ لاہور جا رہا تھا لیکن اس نے مجھ سے اسٹیشن پر بات تک نہ کی ہلکہ مجھے پہچان کر خوامخواہ کمرکی بند کر لی میری شکایت سن کر امی حیرت زدہ رہ گئیں۔ انہوں نے بڑے یقین سے کہا کہ وہ اکبر نہیں ہو سکتا کیونکہ اکبر تو آج صبح تمہارے ابا کے ساتھ ملیر اپنی والے بابا سے ملنے گیا ہے پھر شام تک ابا گھر نہیں پہنچے تو اور فکر لاحق ہو گئی۔ عجیب عجیب وسوسے دل میں پیدا ہونے لگے، تب امی نے گھبرا کر مجھے یہاں بھیج دیا کہ صحیح صورت حال معلوم کروں۔" یہ کہہ کر عرفان خاموش ہو گیا۔

عرفان کیا خاموش ہوا گویا سب کی زبانیں سلب ہو گئیں۔ کسی میں ہمت نہ رہی کہ سوال کرے۔ اب سوال کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی سب کچھ سامنے آ گیا تھا۔ املی والے بابا کے جملے سے عرفان کے بیان تک۔ ایک ہی داستان تھی۔ کڑی سے کڑی ملتی جا رہی تھی، اسرار کھلتے جا رہے تھے، اب یہ بات سب پر اچھی طرح عیاں ہو گئی تھی کہ سید پور کا جن خالی گھر کو "خالی" کر گیا تھا اور وہ اکیلا نہ گیا تھا اپنے ساتھ نیلم کو بھی لے گیا تھا اور کس طرح لے گیا تھا یہ بات بھی اب سامنے آ گئی تھی۔

دادا غفور نے کہا تھا کہ املی والے بابا سے رجوع کیا جائے۔ دادا غفور کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے ماموں فرقان اور اکبر نے ایک مرتبہ پھر ملیر کے جنگل کا رخ کیا تھا۔

جنگل میں داخل ہو کر جلدی ہی وہ اس پگڈنڈی پر پہنچ گئے جو ان کی جانی پہچانی تھی اور جس کے ذریعے آسانی سے نہر تک پہنچا جا سکتا تھا۔

جنگل بالکل سنسان پڑا تھا۔ اکبر بڑا چوکنا ہو کر چل رہا تھا اس کی نظریں دائیں بائیں گھوم رہی تھیں۔ گاہے گاہے وہ پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیتا تھا۔

"اکبر، کیا پریشانی ہے؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"جی، کوئی نہیں۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

پگڈنڈی والا راستہ ختم ہوا تو پتھریلا راستہ شروع ہو گیا پھر وہ ختم ہوا تو اکبر کو اپنی بنائی ہوئی پتھروں کی نشانی دکھائی دینے لگی نہر آ گئی تھی۔

پھر وہ بائیں گھوم گئے کچھ دور چلے تو املی کا تناور درخت نظر آنے لگا۔ تھوڑا اور آگے بڑھے تو املی کے درخت میں بنا ہوا وہ محرابی کھوکھا خالی نظر آیا۔ اس کے کھوکھے کے سامنے پڑا ہوا وہ بھاری پتھر جس پر املی والا بابا آسن جما کر بیٹھتا تھا وہ بھی خالی پڑا تھا۔

املی والے بابا کا دور تک پتہ نہ تھا۔

پچھلی مرتبہ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا کہ بابا کہیں نظر نہ آیا تھا لیکن جب اکبر نے پانی میں جانے کی تیاری کی تو بابا املی کے پیچھے سے نکل آیا۔

اب بھی یہی قیاس کیا گیا کہ وہ تنے کے اس طرف ہو گا۔

"ماموں کیا کرنا چاہئے۔" اکبر نے پوچھا۔

"مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آ رہی ہے۔ خیر تم ذرا چبوترے پر جا کر دیکھو۔"

"بس تم کی گز یہ، ماموں۔"
"مجھے یوں لگتا ہے جیسے الی کے درخت کے پیچھے اب کوئی نہیں۔"
"میں ابھی دیکھتا ہوں جاکر۔" اکبر نے اپنے جوتے موزے اتارے، پینٹ کے پائنچے اوپر چڑھائے اور نہر میں اتر گیا۔ ابھی اس نے پہلا قدم ہی آگے بڑھایا تھا کہ ایک بندر درخت کے پیچھے سے برآمد ہوا اور اچک کر بھاری پتھر پر بیٹھ گیا۔
اکبر نے دوسرا قدم آگے بڑھایا تو ایک اور بندر درخت کی اوٹ سے نکلا اور پتھر پر بیٹھے ہوئے بندر کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔
اکبر نے تیسرا قدم بڑھایا تو ایک اور بندر درخت کے پیچھے سے نکلا۔
اب اکبر جیسے قدم بڑھاتا باہر قدم پر ایک بندر درخت کی اوٹ سے نکلتا اور باہر آکر زمین پر بیٹھ جاتا۔ پہلا بندر پتھر کے اوپر بیٹھا ہوا تھا اور باقی آنے والے بندر دائرے کی شکل میں اس کے سامنے نیچے بیٹھتے جارہے تھے۔
اکبر کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اوپر چبوترے پر کیا ہورہا ہے۔ چبوترہ اکبر کے قد سے خاصا اونچا تھا اسے وہاں کی صورت حال سیڑھیاں چڑھ کر ہی معلوم ہو سکتی تھی۔
ماموں فرقان نہر کے کنارے کھڑے تھے۔
انہوں نے بندروں کی پراسرار آمد دیکھ لی تھی بندروں کا درخت کی اوٹ سے نکلنا اب بھی جاری تھا۔
ماموں فرقان کو اندازہ ہوگیا تھا کہ ان بندروں کے عزائم کیا ہیں۔
تب انہوں نے اکبر کو آواز دی۔ "اکبر۔"
"جی ماموں۔" اکبر نے بڑھتا ہوا قدم روک کر ماموں فرقان کی طرف دیکھا۔
"واپس آجاؤ بیٹا۔"
"کیوں ماموں۔"
"جو مجھے نظر آرہا ہے وہ تمہیں نظر نہیں آرہا بحث مت کرو، فوراً پلٹ آؤ۔" اس مرتبہ ماموں فرقان کی آواز میں کوئی ایسی بات تھی کہ اکبر کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے وہ جلدی سے نہر سے نکل آیا۔
اور جب اس نے کنارے پر چڑھ کر درخت کے نیچے دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں
"ارے ماموں یہ اتنے سارے بندر کہاں سے آگئے۔"
"بس، اب واپس چلو۔" ماموں فرقان نے تنبیہہ کی۔
"لیکن ماموں....." اکبر نے کچھ کہنا چاہا۔
"یہ لیکن ویکن کا وقت نہیں ہے اگر بندروں نے ہم پر حملہ کر دیا تو جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔"

ماموں فرقان نے اکبر کا ہاتھ پکڑا اور اسے جنگل کی طرف کھینچنے لگے۔
پھر جب وہ بندروں کی زد سے نکل آئے تو ماموں فرقان نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔
"یہ سب کیا تھا ماموں؟" اکبر نے پوچھا۔
"یہ جنگلی کا اسرار ہے۔" ماموں فرقان نے گول مول بات کی۔
"اور اہلی والے بابا۔"
"وہ اس وقت درخت کے نیچے نہیں تھے اگر تھے تو ہم سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔"
"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔" اکبر نے پوچھا۔
"یہ میرا اندازہ ہے، تم جانتے ہو کہ میرے اندازے کس قدر صحیح ہوتے ہیں۔" ماموں فرقان نے ہنس کر کہا۔
ماموں فرقان کا اندازہ صحیح تھا یا غلط اس کی تصدیق ممکن نہ تھی۔
وہ دونوں ملبیر کے جنگل سے مایوس لوٹ آئے ان کی ملاقات اہلی والے بابا سے نہ ہو سکی۔
اکبر کے دل پر گھٹا سی چھا گئی ہر سُو اندھیرا پھیل گیا۔
نیلم خالی گھر میں موجود تھی تو کم از کم اس بات کی امید تھی کہ وہ ایک نہ ایک دن آزاد ہو جائے گی اب وہ امید کی کرن بھی ختم ہو گئی تھی۔ سید پور کا جن نیلم کو لے اڑا تھا، اسے نہیں معلوم تھا کہ، اسے کیا کسی کو نہیں معلوم تھا کہ سید پور کا جن نیلم کو کہاں لے گیا ہے اب وہ اسے کہاں تلاش کرے گا، کیسے حاصل کرے گا۔
جس سے مدد کی امید تھی وہ بھی غائب ہو چکا تھا۔ اہلی والے بابا کی جگہ بندروں سے ملاقات ہوئی تھی۔
ماموں فرقان اور دادا غفور جیسے بے بس ہو گئے تھے۔
ان کے پاس جھوٹی تسلیاں رہ گئی تھیں۔
جن کے خالی گھر سے چلے جانے اور اس بات کی شہادت مل جانے کے بعد کہ نیلم جن کے ساتھ گئی ہے اس بات کی ضرورت تھی کہ نیلم کے والدین کو اس حادثے کی اطلاع دے دی جائے۔
بابر نے اپنے فرنیچر کے شوروم سے لاہور فون کیا۔ فیاض حسین اپنے دفتر جا چکا تھا۔ واجدہ گھر پر موجود تھی۔ اس نے چیختے فون کا ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو۔"
"ہاں، واجدہ میں بابر بول رہا ہوں۔"
"بابر بھائی کیا حال ہیں۔" واجدہ نے پوچھا۔
"واجدہ ادھر ایک حادثہ ہو گیا ہے۔" بابر علی نے افسردہ لہجے میں کہا۔
"یا اللہ خیر۔" واجدہ نے فوراً اپنا دل تھام لیا۔ "کیا ہوا بابر بھائی، نیلم تو خیریت سے ہے۔"
"واجدہ، نیلم کو جن لے اڑا ہے۔"
"ہائے اللہ۔" یہ خبر سن کر واجدہ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ "وہ اسے کہاں لے گیا ہے۔ ہائے میری بچی۔"

"کچھ نہیں معلوم۔" بابر علی نے مایوسی سے کہا۔ "ماموں فرقان کے لڑکے عرفان نے فیلم کر حیدر آباد اسٹیشن پر کراچی سے جانے والی ایک گاڑی پر دیکھا تھا۔ جن نے اکبر کا روپ دھارا ہوا تھا۔"

"اوہ میرے خدا۔ اب کیا ہوگا۔" واجدہ پر لرزہ طاری تھا۔

"فیاض کہاں ہیں۔"

"وہ ابھی اپنے آفس کے لئے نکلے ہیں۔ میں ابھی انہیں اطلاع دیتی ہوں۔" واجدہ نے کہا۔

"واجدہ۔ تم لوگ کراچی کیوں نہیں آجاتے۔" بابر علی بولا۔

"بابر بھائی۔ اگر سیٹ مل گئی تو ہم آج شام ہی کراچی پہنچ جائیں گے۔"

"ہاں تم لوگ آجاؤ تو پھر مل بیٹھ کر سوچیں کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔"

"واجدہ اور فیاض حسب پروگرام چھ بجے کی فلائٹ سے کراچی پہنچ گئے۔ سہ پہر کو فیاض نے اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی، اس لئے اکبر نے انہیں ایئرپورٹ پر ریسیو کرلیا۔

وہ آئے بھی اور چلے بھی گئے لیکن یہ بات نہ طے ہو سکی کہ نیلم کے سلسلے میں کیا کیا جائے۔ ماموں فرقان بھی اس مجلس مشاورت میں شامل تھے لیکن کسی کے پاس کوئی حل نہ تھا۔ مختلف تجاویز پیش ہوئیں کسی نے کہا کہ نیلم کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس میں درج کروادی جائے لیکن سوال یہ تھا کہ پولیس اس سلسلے میں کیا کر سکتی تھی۔ دو پولیس افسر پہلے ہی خالی گھر سے سزا پا چکے تھے۔ پھر سوچا کہ اخباروں میں نیلم کی تصویر کے ساتھ ایک اشتہار دیا جائے جس میں نیلم سے مخاطب ہو کر کہا جائے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے فوراً اپنے پتے سے آگاہ کرے پھر یہ تجویز بھی مسترد ہو گئی کیونکہ یہ کیا ضروری تھا کہ نیلم اس اشتہار کو دیکھ لے گی، جانے جن نے اسے کہاں لے جا کر رکھا ہوگا۔ نیلم میں اتنی عقل تو ہے وہ اگر اس پوزیشن میں ہوتی تو خود ہی اپنے پتے سے آگاہ کر دے گی۔ اس نے اگر اپنے پتے سے آگاہ کر بھی دیا تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا۔ وہ اتنے دن خالی گھر میں رہی تو کسی نے سید پور کے جن کا کیا بگاڑ لیا۔

واجدہ اور فیاض دو دن کراچی رہ کر واپس لاہور چلے گئے۔ واجدہ کی حالت بہت خراب تھی وہ اس تصور سے ہی کانپ جاتی تھی کہ جن اس کی بیٹی کو اپنے ساتھ لے گیا ہے، جانے اس نے اس کا کیا حشر کیا ہوگا۔

کراچی سے لاہور تک اس کی آنکھوں سے اشک رواں رہے۔

واجدہ اور فیاض حسین کے لاہور جانے کے بعد ان لوگوں نے کرائے کا گھر چھوڑ دیا اور خالی گھر میں واپس آگئے۔

خالی گھر میں شفٹ ہونے سے پہلے دادا غفور کو لیا گیا انہوں نے اس گھر میں جھاڑ پھونک کی، اس گھر کا چپہ چپہ دھلوایا گیا ہر کمرے میں اگربتی جلائی گئی۔ قرآن خوانی کروائی گئی تب جا کر یہ لوگ اپنے مکان میں واپس آئے۔

پہلی رات اس مکان میں بڑی بے چین گزری یہ لوگ اس مکان میں شفٹ تو ہو گئے تھے جھاڑ پھونک

اور دوسری احتیاطی تدابیر بھی اختیار کرلی گئی تھیں پھر بھی ساری رات دھڑکا لگا رہا کہ جانے کدھر سے سہاس کی آواز آجائے اور سارا معاملہ ٹیکٹ ہو جائے۔

اکبر نے اپنے بیڈروم میں سونا چاہا تھا لیکن کسی نے اسے سونے نہیں دیا تھا سب نے ایک زبان ہو کر کہا تھا۔ "نہیں، اکبر ابھی تم وہاں نہ سونا۔"

تب اکبر مجبوراً گیسٹ روم میں جاکر سو گیا تھا۔

وہ رات خیریت سے گزر گئی تھی۔

پھر تمام راتیں خیریت سے گزرنے لگی تھیں۔

کہیں سے کوئی آواز نہ آئی تھی، کالا بلا دکھائی دیا تھا نہ کوئی اور ڈراؤنی شکل نظر آئی تھی گھر میں سکون جیل گیا تھا۔

گھر میں تو سکون پھیل گیا تھا لیکن اکبر کا سکون لٹ گیا۔

اب وہ اپنے بیڈ روم میں سونے لگا تھا۔ اس بیڈروم سے بڑی دہشت ناک یادیں وابستہ تھی۔ ان اذیتناک یادوں کے باوجود اسے اسی کمرے میں سکون ملتا تھا۔ نیلم کا زیادہ تر وقت اسی کمرے میں گزرا تھا۔ وہ اسی بیڈ پر سوئی تھی۔ اس کمرے کی ہر چیز کو اس نے چھوا تھا۔ جب وہ اس کمرے میں داخل ہوتا تو جانے کیوں اسے یہ احساس ہوتا کہ نیلم اس کے آس پاس ہی ہے۔

باتھ روم کے کواڑ پر لکھی ہوئی اس کی تحریر "اکبر، میں تمہاری ہوں، مجھے بھول نہ جانا۔" بڑا تڑپاتی۔ وہ جب بھی باتھ روم میں جاتا تو دروازہ بند کر کے لپ اسٹک سے لکھے ہوئے ان سرخ لفظوں کو دھڑکتے دل سے دیکھے جاتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ تحریر ہلکی ہوتی جارہی تھی۔

اس تحریر کے علاوہ اس کے پاس نیلم کا ایک خط بھی تھا جو اس نے اس گھر میں آتے ہوئے لکھا تھا۔ اپنی مجبوریاں ظاہر کی تھیں اور پچھتانہ کرنے کی تنبیہ کی تھی۔

دیوار اور کاغذ پر لکھی ہوئی یہ تحریریں اکبر کی زندگی کا اثاثہ تھیں۔ وہ جب بھی اکیلا ہوتا نیلم کے لکھے لفظ اس کے اردگرد رقص کرنے لگتے، جلنے بجھنے لگتے۔

وہ بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیتا اور ان محبت بھرے لفظوں کو رقصاں دیکھ دیکھ کر سو جاتا۔

پھر اس نے نیلم کی اس تصویر کو جس میں وہ دلہن بنی ہوئی تھی خاصا بڑا کروالیا تھا اور اس دو فٹ چوڑے اور ڈھائی فٹ لمبے خوبصورت فریم کو اپنے بیڈ کے سامنے دیوار پر آویزاں کرلیا۔ وہ لیٹتا تو نیلم کا مسکراتا ہوا پورٹریٹ اس کے سامنے ہوتا۔ نیلم کا حسین چہرہ دیکھتے دیکھتے وہ بے اختیار پکار اٹھتا۔

"نیلم تم کہاں ہو؟"

نیلم کہاں تھی، یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ ان دو تین مہینوں میں وہ مختلف شہروں میں دکھائی دی تھی۔ مختلف لوگوں نے اسے دیکھا تھا۔

کراچی سے گئے ہوئے نیلم کو ابھی ایک ہفتہ ہوا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے۔ سیدپور کا جن سب سے پہلے اسے اس کے شہر لے کر پہنچا تھا۔

نیلم اس شہر میں پلی بڑھی تھی۔ جوان ہوئی تھی۔ اس کے یہاں والدین تھے۔ ڈھیر ساری سہیلیاں تھیں۔ سمن آباد کا وہ گھر جس کے آنگن میں اس نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھا اور اس آنگن سے اولی میں بٹھایا گیا۔ اسکول۔ کالج۔ بچپن کی معصوم شرارتیں۔ جوانی کی شوخیاں۔

یہاں کیا نہیں تھا۔ اس شہر کے پلیٹ فارم پر قدم رکھا تو وہ جھوم سی گئی۔ لاہور سے رخصت ہوئے اگرچہ ابھی زیادہ وقت نہ گزرا تھا لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سال دو سال کے بعد لاہور واپس لوٹی ہے۔ بے شمار یادوں نے اسے آگھیرا۔ ہر طرف سے خوشبوئیں سی آنے لگیں۔

پلیٹ فارم پر اتر کر اس نے سید پور کے جن کی طرف دیکھا۔ وہ اکبر بنا ہوا تھا۔ وہ ہو بہو اکبر تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اکبر نہیں ہے بس وہ اپنی آنکھوں سے مار کھاتا تھا۔

ان آنکھوں کو چھپانے کیلئے اس نے سیاہ چشمہ لگانا شروع کر دیا تھا۔

"قل" نیلم اس سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں۔" سید پور کے جن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

"میں اپنے گھر جاؤں گی۔"

"کہاں کراچی۔" سید پور کے جن نے سوٹ کیس اٹھایا اور آگے بڑھا۔ نیلم اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"نہیں، اپنے ماں باپ کے گھر۔"

"لیکن یہ بات تو راستے میں طے ہو چکی ہے کہ تم اپنے والدین کے گھر نہیں جاؤں گی۔"

"کیا ہو جائے گا اگر چلی جاؤں گی تو۔"

"اب بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ تم اپنے گھر گئیں تو بہت خرابی پیدا ہو جائے گی وہ لوگ تم پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے اور یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اب تم پر میرے سوا کسی کا قبضہ نہیں ہو سکتا۔ ہم اس شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں ٹھہریں گے تم جہاں کہو گی میں تمہیں لے چلوں گا خوب گھومو پھرو، عیش کرو ہم اس لئے کراچی سے نکلے ہیں۔"

یہ سن کر نیلم خاموش ہو گئی وہ جانتی تھی کہ سید پور کا جن بہت ضدی ہے جس بات کی ٹھان لیتا ہے وہ کر کے چھوڑتا ہے۔

ٹیکسی لے کر وہ شہر کے ایک بڑے ہوٹل پہنچے۔ کمرے میں پہنچ کر نیلم نے چائے منگوائی چائے پی کر وہ کچھ دیر آرام کی غرض سے بیڈ پر لیٹ گئی، سید پور کے جن نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور جب وہ واپس پلٹا تو کالا بلا بن چکا تھا وہ اچھل کر بیڈ پر آیا اور نیلم کے خوبصورت قدموں سے لپٹنے لگا۔

دوسرے دن وہ اسے جہانگیر کے مقبرے کی سیر کرانے لے گیا۔ نیلم کا وہاں دل نہ لگا تو وہ اسے راوی کنارے لے گیا۔ کشتی میں بٹھایا۔

سید پور کے جن نے انسانی روپ ضرور دھار لیا تھا لیکن وہ انسان نہ تھا۔ اس لئے اس سے کہیں نہ کہیں غلطی ضرور ہو جاتی تھی۔ کبھی وہ چشمہ لگانا بھول جاتا تو نیلم اسے ٹوکتی۔

اس وقت وہ کشتی کو چپوؤں سے چلاتے چلاتے جن بن گیا تھا جن بن گیا نتیجے میں کشتی خود بخود حرکت میں آ گئی اور اس طرح چلنے لگی جیسے موٹر بوٹ چلتی ہے۔ کنارے پر کھڑے ہوئے لوگوں نے اس کشتی کو بڑی حیرت سے دیکھا جو بغیر چپوؤں کے چل رہی تھی۔

تب نیلم نے گھبرا کر اسے ٹوکا۔ "قمل، یہ کیا کر رہے ہو؟"

سید پور کے جن کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ انسان بن کر اپنے ہاتھوں سے کشتی کھینچنے لگا۔

واپسی سے پہلے سید پور کے جن نے انارکلی کا رخ کیا وہ نیلم کو کچھ شاپنگ کرانا چاہتا تھا۔ نیلم نے انارکلی کے بازاروں میں اپنی پرانی دکان کا رخ کیا یہ کپڑے کی بہت بڑی دکان تھی۔ واجدہ بیشہ یہیں سے کپڑا خریدتی تھی۔ اس دکان کا مالک ریاض اس سے اچھی طرح واقف تھا۔ نیلم نے کچھ سوچ کر ہی اس دکان کا رخ کیا تھا۔

نیلم دکان میں داخل ہوئی تو دکان کا مالک ریاض اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

"آیئے نیلم بی بی، اچھا صاحب بھی ساتھ ہیں۔"

پھر ریاض نے سید پور کے جن کو سلام کیا اور ہاتھ ملانے کیلئے آگے بڑھایا۔

سید پور کے جن نے بڑی خوش اخلاقی سے اس کے سلام کا جواب دیا لیکن پتلون کی جیب سے اپنا ہاتھ نہ نکالا تب ریاض نے جھینپ کر اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا اور نیلم سے مخاطب ہوا۔

"آپ کب آئیں نیلم بی بی؟"

"میں کل آئی اور سنائیں آپ کیسے ہیں۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں، کل ہی تو بیگم صاحبہ سے فون پر بات ہوئی ہے ان کے مطلب کا کپڑا آیا ہوا ہے اس لئے میں نے فون کیا تھا کہ آ کر دیکھ جائیں انہوں نے آج آنے کا وعدہ کیا ہے لیکن بیگم صاحبہ نے آپ کا ذکر نہیں کیا۔"

"بھول گئی ہوں گی۔" نیلم نے یہ کہہ کر سید پور کے جن کی طرف دیکھا جو بت بنا کرسی پر بیٹھا تھا۔

"آپ کو کیا دکھاؤں بی بی۔" ریاض بولا۔

"کوئی نیا کپڑا آیا ہو تو بتائیں۔"

پھر نیلم نے دو سوٹوں کا کپڑا خریدا ادائیگی کی اور وہ دونوں بانو بازار سے نکل آئے۔

بازار کی ایک گلی سے یہ دونوں باہر نکلے تو دوسری گلی سے واجدہ اور فیاض داخل ہوئے۔

سید پور کے جن کو انسانوں کے درمیان رہ کر بے چینی شروع ہو جاتی تھی۔ اندر گلی میں خاصا رش تھا اس کی حالت دگرگوں ہونے لگی۔ اس نے جلدی سے نیلم کا ہاتھ تھاما اور تیزی سے مال روڈ کی جانب نکل گیا پھر ٹیکسی پکڑ کر ہوٹل کا رخ کیا۔

سید پور کا جن نیلم کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے لاہور کا چپہ چپہ اسے دکھا دیا تھا وہ جگہیں بھی دکھا دی تھی جنہیں اس نے لاہور میں رہتے ہوئے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نیلم کے منہ

سے نکلا ہوا لفظ حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ ابھی خواہش کرتی سید پور کا جن فوراً اس کی فرمائش پوری کر دیتا۔ نیلم کے دل کی کلی پھر بھی نہ کھلتی۔ بس وہ اس کا دل رکھنے کے لئے مسکرا دیتی۔

کراچی سے آئے ہوئے اور لاہور میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ سید پور کا جن ہر وقت اس کی تابڑ توڑ فرمائشوں میں لگا رہتا۔ اس وقت بھی وہ ہوٹل کے کمرے میں اس کی تابڑ توڑ فرمائشوں میں مصروف تھا۔ نیلم کرسی پر بیٹھی تھی اور وہ سامنے بیٹھا اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اس وقت وہ شہزادے کے روپ میں تھا اور اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔

"کیوں دیکھ رہے ہو ایسے مجھے کیا کھا جانے کا ارادہ ہے۔"

"نیلم میں تمہیں کھا جانے والی نظروں سے تو نہیں دیکھ رہا۔"

"اچھا پھر۔" نیلم نے ٹوکا۔

"میں تو پیار محبت کی نظر سے دیکھ رہا ہوں۔"

"محبت کی نظر۔" نیلم نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔

"دنیا کا کوئی انسان تمہیں وہ کچھ نہیں دے سکتا جو میں نے تمہیں دیا ہے لیکن پھر بھی تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں آئی۔ نیلم میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں مجھے بتاؤ میں ایسا کیا کروں کہ تم خوش ہو جاؤ۔ اچھا ٹھہرو۔"

پھر سید پور کا جن اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس نے اس کے پیر سے چپل اتار کر ایک طرف رکھے اس کے خوبصورت پیروں کو اس طرح دیکھا جیسے سیلز مین جوتوں کے سائز کا اندازہ کرنے کے لئے دیکھتا۔

سید پور کے جن نے ایک ہاتھ خلاء میں پھیلایا تو اسی لمحے اس کے ہاتھ پر موتیوں کی مالا ظاہر ہو گئی پھر اس نے دوسرا ہاتھ پھیلایا اس ہاتھ پر بھی موتیوں کی ایک لمبی سی مالا آ گئی۔

"نیلم۔ یہ دنیا کی بیش قیمت موتی ہیں جو میں تمہارے ان حسین پیروں کی نذر کر رہا ہوں۔" سید پور کے جن نے یہ کہہ کر موتیوں کی مالائیں اس کے پیروں میں ڈال دیں۔

نیلم نے تھوڑا آگے ہو کر اپنے پیروں کو دیکھا اور ایک جھٹکا دے کر ان موتیوں کو پرے کر دیا۔

"مجھے نہیں چاہئے کچھ۔" اس نے بڑی تمکنت سے کہا۔

تب سید پور کے جن نے اس کے پیر پکڑ لئے اور اپنا سر اس کے قدموں میں رکھ دیا۔

نیلم تڑپ کر کھڑی ہو گئی اس نے غصے سے کہا۔ "یہ کیا کرتے ہو؟"

"پھر میں کیا کروں، کس طرح تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاؤں مجھے بتاؤں میں اور کیا کروں۔"

"مجھے آزاد کر دو۔" نیلم نے بڑے تیکھے لہجے میں کہا۔

یہ سن کر سید پور کے جن کے تیور بگڑ گئے وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اس نے ایک ہاتھ گھما کر نیلم کے منہ

پارہ نیلم تھپڑ کھا کر کرسی سے ٹکرائی اور بیڈ پر گر گئی۔

"آج کے بعد سے تمہارے منہ سے یہ جملہ نہ سنوں اور اگر آئندہ تم نے آزادی کی بات کی تو میں سزا دوں گا کہ لوگ تمہیں دیکھ کر عبرت پکڑیں گے۔ یاد رکھو اب تم نے میرے ساتھ ہی مرنا جینا ہے۔"

نیلم نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ وہ بیڈ پر اوندھے منہ لیٹ کر بہت دیر تک سسکتی رہی۔

اور جب تک وہ روتی رہی تب تک سید پور کا جن ہاتھ جوڑے اس سے بڑی عاجزی سے معافیاں مانگتا رہا۔

یہ دوسرے دن کی بات ہے۔ نیلم اور سید پور کا جن کہیں گھوم کر ہوٹل واپس آئے تھے رات کا وقت تھا یہ لوگ ہوٹل میں داخل ہوئے تو نیلم کی نظر اچانک سامنے پڑی۔

اگرچہ واجدہ اور فیاض کی اس طرف پشت تھی لیکن نیلم کو اپنے والدین کو پہچاننے میں دیر نہ لگی۔

نیلم نے بڑی بے قراری سے آواز دی۔ "ابو۔"

سید پور کے جن نے بھی واجدہ اور فیاض کو دیکھ لیا تھا۔ فیاض حسین اس شہر کا ایک بڑا فلم ڈسٹری بیوٹر تھا۔ وہ اس ہوٹل میں کسی فلمی تقریب میں شریک ہونے آیا تھا۔

اس سے پہلے کہ نیلم بھاگ کر ان دونوں کے نزدیک جاتی یا وہ اس کی آواز سن کر اس کی طرف متوجہ ہوتے سید پور کے جن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

نیلم کا وہ قدم جو اپنے والدین کی طرف اٹھنے والا تھا رک گیا۔

سید پور کے جن نے پھر اسے گھور کر دیکھا تب نیلم کو کچھ ہوش نہ رہا۔

جب اس کو ہوش آیا تو وہ ہوٹل کے کمرے میں تھی خود کو ہوٹل کے کمرے میں پا کر وہ ایک دم تڑپ کر اٹھی اور ہذیانی انداز میں چیخی۔ "ابو، میرے ابو۔"

"نیلم یہ کیا پاگل پن ہے، یہ کیا پاگل پن تھا اگر وہ لوگ تمہاری پکار سن لیتے، پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے تو کیا ہوتا۔"

"اے کاش! وہ میری آواز سن لیتے۔" نیلم نے بڑی حسرت سے کہا۔

"وہ اگر تمہاری آواز سن لیتے، پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے تو کیا ہوتا کچھ نہیں ہوتا بس ایک تماشا ہوتا وہ تمہیں مجھ سے چھین کر نہیں لے جا سکتے تھے اگر وہ ایسا کرتے تو نقصان اٹھاتے اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم مزید اس شہر میں نہیں رہیں گے۔"

نیلم نے کوئی جواب نہ دیا وہ کیا جواب دیتی وہ جانتی تھی کہ سید پور کے جن کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں وہ نیلم کو لاہور لا سکتا تھا تو لاہور سے لے جانے کا حق بھی رکھتا تھا۔

نیلم اپنے شہر میں ایک دھندلی آس کے سہارے چلی آئی تھی کیا پتہ وہاں کیا صورت حال پیش آئے ہو سکتا ہے کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور اس کی جان سید پور کے جن سے چھوٹ جائے۔

والدین سے ملنے اور گھر نہ جانے کا وعدہ جن نے نیلم سے لے لیا تھا اس نے وعدہ کر بھی لیا تھا لیکن یہ سچا وعدہ نہ تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ لاہور میں جب بھی کوئی آزادی کی کرن دکھائی دے گی وہ فوراً اس کے

پیچھے چھوڑ گی۔ اس شخص کی تلاش جاری رکھنے کی کوشش کرے گی کوئی راہ فرار تلاش کرے گی اور ممکن ہے کہ کر بھی لیا تھا۔

اس نے اپنے والدین کو اس شہر میں موجودگی کی خبر بھجوا دی تھی۔

وہ اتوار کی صبح بازار میں شاپنگ کی غرض سے نہ گئی تھی وہ وہاں ریاض کو اپنا چہرہ دکھانے گئی تھی وہ جانتی تھی کہ واجدہ اس دکان پر اکثر چکر لگاتی رہتی ہے یا پھر ریاض خود ہی کسی نہ کسی بہانے کپڑے کی آمد پر اسے فون کر دیتا تھا اسے معلوم تھا کہ ریاض اسے اپنی دکان پر دیکھے گا تو اس کی آمد کا ذکر ضرور کرے گا اس طرح واجدہ اور فیاض حسین کو اس کے لاہور میں ہونے کا علم ہو جائے گا اور ہوا بھی ایسا ہی تھا۔

اس کی یہ ترکیب کامیاب ہو گئی تھی۔ دکان پر پہنچ کر اسے معلوم ہوا تھا کہ واجدہ آج دکان پر آنے والی ہے اگر وہ کچھ دیر اور وہاں ٹھہر جاتی سید پور کا جن اس بازار سے نکلنے کی کوشش نہ کرتا تو دکان پر اس کی واجدہ اور فیاض سے ملاقات یقینی تھی۔ اس دن وہ ایک گلی سے نکلے تھے تو دوسری گلی سے اس کے والدین داخل ہوئے تھے۔

ریاض نے انہیں خوش آمدید کہنے کے بعد سب سے پہلے نیلم کا ذکر کیا۔

"بیگم صاحبہ، نیلم بی بی آئی تھیں ان کے صاحب بھی ساتھ تھے۔ وہ ابھی دو سوٹوں کا کپڑا لے کر گئی ہیں۔"

"نیلم بی بی!" واجدہ نے بڑی حیرت سے کہا اور پھر فیاض کی طرف دیکھا۔

فیاض نے آنکھوں آنکھوں میں واجدہ کو اشارہ کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دکان کے مالک ریاض کو نیلم کے بارے میں کسی بات کا علم ہو۔

پھر انہوں نے باتوں باتوں میں ساری تفصیل جان لی لیکن اس تفصیل میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ نیلم کہاں ٹھہری ہے اور ظاہر ہے اس بات کا معلوم ہونا ممکن نہ تھا۔ واجدہ اور فیاض نے یہ بات سمجھ لی کیونکہ سید پور کا جن اس کے ساتھ تھا اور اس کے سامنے وہ کوئی بات نہیں کر سکتی تھی وہ اس دکان تک آ گئی تھی یہی اس نے خاصا عقلمندی کا کام کیا تھا۔

اس نے کم از کم اس شہر میں اپنی موجودگی کا احساس تو دلا دیا تھا۔

وہ کہاں تھی؟ اس بارے میں جان لینا آسان نہ تھا۔ لاہور کوئی چھوٹا شہر نہ تھا اس شہر میں نیلم کا پتہ چلا لینا کسی طرح ممکن نہ تھا پھر یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ کچھ دن لاہور میں قیام کرے گی یا جن اسے صبح ہی کسی اور شہر کی سیر کرانے لے جا چکا ہو گا۔

گھر پہنچ کر واجدہ نے سب سے پہلے کراچی فون پر بات کی اتفاق سے اکبر نے ریسیور اٹھایا۔

"اکبر، نیلم یہاں لاہور میں ہے۔" واجدہ نے دھماکہ خیز خبر سنائی۔

"کیا وہ آپ کے گھر پہنچ گئی۔"

"نہیں وہ یہاں نہیں آئی اور اب تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے آج شام وہ ایک کپڑے کی دکان پر آئی تھی اس دکان کا مالک ہمارا پرانا واقف ہے اس دکان سے اس نے دو سوٹوں کا کپڑا خریدا اور چلی گئی۔"

"کیا وہ اکیلی تھی؟"

"نہیں اس کے ساتھ سید پور کا جن تھا اور دکان کے مالک نے اسے تمہاری شکل میں دیکھا۔ دکان کا مالک ریاض، نیلم کی شادی میں موجود تھا اس نے تمہیں دیکھا ہوا ہے وہ تمہیں پہچانتا ہے۔"

"اچھا خالہ، آپ میرا انتظار کریں میں لاہور پہنچ رہا ہوں۔"

پھر اکبر دوسرے دن لاہور پہنچ گیا۔

ادھر اکبر لاہور پہنچا ادھر نیلم کو فون کرنے کا موقع مل گیا۔

جب سے نیلم، ریاض کی دکان سے ہو کر آئی تھی اس کے دل میں کھلبلی سی مچی تھی وہ پوری رات سو نہیں سکی تھی وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ اس کے والدین کو اس کے بارے میں معلوم ہو گیا ہو گا۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ نیلم کو کہاں ڈھونڈیں، ہو سکتا ہے انہوں نے اکبر کو بھی فون کر دیا ہو اور اکبر لاہور بھی پہنچ چکا ہو۔

سید پور کا جن ہر وقت اس پر سوار رہتا تھا کبھی وہ شہزادے کے روپ میں ظاہر ہو جاتا تھا کبھی کالا بلا بن جاتا۔ ہوٹل کے کمرے سے باہر نکلتا تو اکبر کی شکل اختیار کر لیتا غرض کسی نہ کسی روپ میں وہ اس کی نگاہوں کے سامنے رہتا۔

ریاض کی دکان سے آنے کے بعد نیلم اس فکر میں تھی کہ کسی طرح گھر فون کر کے بتا دے کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟ وہ موقع کی تلاش میں تھی سید پور کا جن کچھ دیر کے لئے کمرے سے غائب ہو تو وہ فون کرے۔

پھر اسے موقع بھی مل گیا۔ سید پور کا جن نیلم کے ناشتہ کرنے کے بعد سے کمرے میں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا کچھ دیر وہ کمرے میں ادھر ادھر بیٹھتی پھری کبھی لیٹ جاتی کبھی ٹہلنے لگتی، باتھ روم بھی گئی لیکن اسے کہیں اس کی موجودگی کا احساس نہ ہوا۔

کمرے میں کہیں سید پور کا جن موجود نہ تھا۔

تب اس نے جلدی سے ریسیور اٹھا کر آپریٹر کا نمبر ملایا اور اس کو اپنے گھر کا فون نمبر دیا اور فوراً ہی ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

چند سیکنڈ کے بعد گھنٹی بجی اس نے ریسیور اٹھایا آپریٹر نے بتایا کہ بیل جا رہی ہے۔

پھر ادھر سے کسی نے ریسیور اٹھایا اور آہستہ سے "ہیلو۔" کہا۔

اس آواز کو سن کر نیلم کے جسم میں سنسنی پھیل گئی ادھر سے فون اٹھانے والا اکبر تھا۔

"اکبر تم۔"

"نیلم تم۔"

"تم کب آئے۔"

"تم کہاں ہو؟ اپنا پتہ بتاؤ۔"

"اکبر میں....."

نیلم ہوش کا نام اور پتہ بتانے ہی والی تھی کہ اچانک کہیں سے نمودار ہو کر کالے بلے نے نیلم پر چھلانگ لگائی۔ کالے بلے کا کود مچے جیسا وزن وہ برداشت نہ کر سکی نیچے سے نیچے قالین پر گری اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔

"نیلم۔ نیلم خدا کے واسطے اپنا پتہ بتاؤ تمہیں کیا ہوا۔" اکبر نے بے قراری سے کہا۔ "تم کہاں ہو۔"

جواب میں ٹیلیفون پر کالے بلے کی غراہٹ سنائی دی۔

"ہیلو۔ ہیلو تم کہاں ہو نیلم۔" اکبر چیخا۔

نیلم ریسیور پر نہ بتا سکی تو کیا ہوا اکبر نے اس کال سے یہ اندازہ ضرور لگا لیا کہ وہ کہاں ہو سکتی ہے۔ نیلم کسی کے گھر میں نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی کے گھر جن نیلم کو لے کر نہیں جا سکتا تھا۔ یہ فون کسی پبلک بوتھ سے بھی نہیں کیا گیا تھا۔ یہ فون کسی ایسی جگہ سے کیا گیا تھا جہاں نیلم اکیلی تھی جن کہیں گیا ہوا تھا اور یہ جگہ کسی ہوٹل کا کمرہ ہی ہو سکتی تھی۔

اگلے دو دنوں میں اکبر اور فیاض حسین نے مل کر لاہور کے کئی بڑے چھوٹے ہوٹل چھان مارے کاؤنٹر پر نیلم نام کی لڑکی کا پتہ کیا مگر کچھ پتہ نہ چل سکا۔

رات کو ایک بڑے ہوٹل میں کوئی فلمی تقریب تھی فیاض اور واجدہ وہاں چلے گئے اکبر کو بھی انہوں نے لے جانا چاہا مگر اکبر نے انکار کر دیا اس کے سر میں درد تھا اس نے گھر پر رہنا بہتر سمجھا۔

یہاں واجدہ اور فیاض کی ملاقات نیلم سے ہوتے ہوتے رہ گئی۔ دوسرے دن صبح ہی سید پور کے جن نے لاہور چھوڑ دیا۔

فیاض اور اکبر نے لاہور کے تمام قابل ذکر ہوٹل چھان مارے تھے اور اب ایک ہی ہوٹل رہ گیا تھا یہ شہر کا سب سے بڑا ہوٹل تھا۔

اب تک وہ صرف نیلم کا نام بتا کر اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے تھے آج فیاض نے کاؤنٹر پر نیلم کی تصویر رکھی اور اس کے بارے میں معلومات چاہیں۔

ریسپشنسٹ اس تصویر کو دیکھ کر چونک پڑا اور بولا۔ "یہ لوگ آج ہی تو یہاں سے گئے ہیں۔"

پھر اس کی نظر اکبر پر پڑی اکبر کی صورت دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا ایک نظر اس نے فیاض کو دیکھا پھر اکبر کو دیکھا اس کے بعد نیلم کی تصویر پر نظر ڈالی اور گھبرا کر بولا۔ "سر یہ آپ لوگوں کو پوچھ رہے ہیں۔"

"میں وہ نہیں ہوں۔" اکبر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ اس لڑکی کے ساتھ جانے والا میرا ہم شکل ہے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں"

"اوہ۔" ریسپشنسٹ ہونٹ سکیڑ کر رہ گیا۔ "نہیں، سر وہ کچھ بتا کر نہیں گئے۔"

جواب سن کر دونوں کے چہروں پر مایوسی پھیل گئی۔
نیلم کے کپڑے کی دکان پر دیکھے جانے اور فون کی آمد سے اس بات کی توقع ہو گئی تھی کہ وہ اسی شہر میں ہے اور ایک نہ ایک دن مل جائے گی۔
تمام ہوٹلوں کی خاک چھاننے کے بعد نیلم کا پتہ چلا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ لاہور چھوڑ گئے۔
اب وہ کہاں گئے، یہ کون بتا سکتا تھا۔
اکبر دلبرداشتہ ہو کر لاہور سے کراچی واپس آ گیا۔
پھر نیلم اسلام آباد میں دیکھی گئی۔ نیلم کی ایک دوست بینا نے اسے ایک جنرل اسٹور سے نکلتے دیکھا وہ ایک کالی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس چادر سے اس کی پیشانی بھی ڈھکی ہوئی تھی۔
بینا نے اسے دیکھ کر کئی آوازیں دیں مگر وہ رکی نہیں۔
وہ رکتی کیسے؟
جیسے ہی بینا نے اسے پکارا سید پور کے جن نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے تیزی سے کھینچتا ہوا اس گاڑی میں جا بیٹھا جو ہوٹل سے کرائے پر لی گئی۔
پھر نیلم آناً فاناً بینا کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ بینا کو اس کی اس بے اعتنائی پر بڑا دکھ ہوا، شاید ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ آدمی اپنے دوستوں کو بھول جائے۔
تین چار دن کے بعد جب بینا لاہور واپس پہنچی تو اس نے نیلم کے گھر فون کیا واجدہ نے فون اٹھایا، بینا نے واجدہ سے اسلام آباد میں نیلم سے ملاقات کا ذکر کیا اور اس کے رویّے کی شکایت کی۔
فیاض کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ نیلم اسلام آباد میں دیکھی گئی ہے وہ فوراً اسلام آباد پہنچا اس مرتبہ اس نے نیلم کی تلاش فائیو اسٹار ہوٹلوں سے کی۔
ایک ہوٹل میں ان کا پتہ چل گیا لیکن پتہ چلنا بیکار ہی رہا کیونکہ ایک رات پہلے وہ ہوٹل چھوڑ چکے تھے۔
فیاض نے دو تین ہوٹل اور چیک کئے کہ شاید کسی اور ہوٹل میں شفٹ ہو گئے ہوں لیکن یہ تلاش بے سود ثابت ہوئی۔
سید پور کا جن اسلام آباد چھوڑ چکا تھا۔
پھر فیاض کے ایک دوست نے نیلم کو مری میں دیکھا وہ "اکبر" کے ساتھ ایک ہوٹل سے نکل رہی تھی۔
جب فیاض کو یہ معلوم ہوا کہ نیلم مری میں ہے تو اس نے فوراً مری کا رخ کیا۔ بڑے ہوٹلوں سے اس کی تلاش شروع کی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔
مری کے کسی ہوٹل میں ان کا اندراج نہ تھا اس مرتبہ وہ شاید ہوٹل میں نہیں ٹھہرے تھے یا پھر فیاض کا دوست فریب نظر کا شکار ہوا تھا۔
فیاض دو چار دن رہ کر مری سے مایوس لوٹ آیا۔
سید پور کا جن اور نیلم مری میں موجود تھے۔ سید پور کے جن نے اس مرتبہ کسی ہوٹل کا رخ کرنے کے بجائے ایک ایسے بنگلے کا رخ کیا جو ایک خوبصورت مقام پر اور بالکل الگ تھلگ تھا۔ یہ بنگلہ کراچی کے ایک

بزنس مین کا تھا جو اس وقت خالی پڑا تھا۔ یہ بنگلہ سارا سال خالی ہی رہتا تھا کبھی کبھار بزنس مین اور اس کے بیوی بچے ادھر کا رخ کرتے تھے۔ آتے بھی تھے تو دس بارہ دن سے زیادہ نہ رہتے پھر سارا سال یہ بنگلہ مقفل رہتا۔

سید پور کے جن نے اس بنگلے میں اپنا ڈیرہ جمایا۔ یہ بڑا موزوں بنگلہ تھا۔ نیلم کا یہاں رہ کر بیرونی دنیا سے رابطہ ممکن نہ تھا۔ اس بنگلے میں ٹیلیفون تھا۔ نہ آس پاس کوئی گھر تھا۔ بنگلہ بھی کافی اونچائی پر تھا یہاں سے فرار ہو کر (اول تو یہاں سے فرار ہونا ممکن ہی نہ تھا) لوگوں کے درمیان پہنچنا اتنا آسان نہ تھا۔

سید پور کا جن اس پُرفضا مقام پر آکر بہت خوش تھا۔ انسانوں سے دوری اور مکمل تنہائی۔ یہاں وہ اور غور تھے نہ ماموں فرقان، نیاز محمد تھانہ اعلیٰ والا بابا۔ وہ بڑے سکون سے یہاں زندگی گزار سکتا تھا۔

شروع کے ایک دو دن سید پور کا جن مری کے پُررونق علاقے میں گھوما تھا۔ نیلم کو شاپنگ بھی کرائی تھی، ہوٹلوں میں بھی بیٹھے تھے اس کے بعد اس نے نیلم کو انسانوں کے درمیان لے جانے سے احتراز کیا تھا "گھر سے نکلتے اب بھی تھے لیکن سید پور کے جن کی کوشش ہوتی کہ کسی انسان کی ان پر نظر نہ پڑے۔

سید پور کا جن بہت خوش تھا اور کیوں نہ ہوتا پریوں جیسی ایک حسین ترین لڑکی اس کے گھر میں تھی۔ پُرفضا مقام تھا یخ بستہ ہوائیں تھیں، چاندنی راتیں تھیں، خوشبوئیں تھیں، ریشمیں بدن کی مہک تھی۔ کیا نہیں تھا یہاں سب کچھ تھا۔

عذاب میں تو نیلم تھی اور کیوں نہ ہوتی وہ ہر وقت شعلوں میں گھری رہتی تھی، تپش تھی، بدن کو جھلسا دینے والی آگ تھی۔ سید پور کا جن ایک عذاب کی صورت میں اس پر مسلط تھا وہ اپنے پیاروں سے دور تھی اور تنہائی کے دوزخ میں جھلس رہی تھی یہاں کیا تھا کچھ نہیں تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ سید پور کے جن کو نیلم سے بڑی محبت تھی وہ اس کی زلف کا اسیر تھا اس سے بے پناہ عشق تھا، وہ نیلم کو خوش رکھنا چاہتا تھا لیکن آگ اور پانی کا بھی کبھی ملاپ ہوا ہے۔

سید پور کا جن صحرا کی آگ تھا تو نیلم بادل کے ایک ٹکڑے سے برستی بارش۔ آگ، پانی کو چاٹے جا رہی تھی آہیں اور کراہیں رونا اور سسکنا بس یہی شب و روز تھے نیلم کے۔

اس آگ میں جلتے ہوئے اسے کئی ماہ ہو گئے تھے شعلوں نے اس کا بدن چاٹ لیا تھا، روح تک جھلس گئی تھی اس کی بات کوئی سننے والا نہ تھا، وہ کس سے اپنا دکھڑا روتی۔

اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔

تنہائی تیر بن کر اس کے کلیجے میں ترازو ہو گئی تھی۔

وہ تکیے پر اپنا سر پٹک پٹک کر رہ جاتی تھی، آنکھوں سے آنسو بہتے تو رکنے کا نام لیتے۔ سید پور کا جن اسے روتے ہوئے دیکھتا تو فوراً شہزادے کے روپ میں اس کی طرف بڑھتا۔

نرم ملائم رومال سے اس کی آنکھوں کے موتی احتیاط سے جمع کرتا اور کہتا۔

"نیلم روتی کیوں ہو؟"

"نیلم روئے نہیں تو اور کیا کرے؟" نیلم اپنا خوبصورت چہرہ نرم ملائم تکیے میں چھپالیتی۔

"تمہیں کیا دکھ ہے۔" سید پور کا جن انجان بن کر پوچھتا۔

"تم نہیں جانتے قرل مجھے کیا دکھ ہے۔ جانتے ہوئے بھی انجان بنتے ہو۔ یہ سنگدلی کی انتہا ہے۔" وہ غصے سے کہتی۔

"تم مجھ پر حکومت کرتی ہو میرے دل پر راج کرتی ہو۔ جو کہتی ہو وہ ایک لمحے میں ہو جاتا ہے میں نے دنیا کے بیش قیمت ہیرے جواہرات تمہارے قدموں میں ڈال دیئے ہیں۔ تمہاری ہر فرمائش کو میں نے حکم سمجھ کر پورا کیا ہے اور مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" سید پور کے جن نے اس کی زلفوں میں انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں چاہئیں، تمہارے ہیرے جواہرات۔"

"میں نے تمہیں ہیرے جواہرات ہی نہیں دیئے تمہیں محبت بھی دی ہے۔"

"تم نے محبت دی نہیں تم نے کسی کی محبت چھینی ہے۔" نیلم نے اپنی آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔

"اسے بھول جاؤ، اسے اب تم زندگی بھر نہ پاسکو گی۔"

"قرل کیا، میں ہمیشہ تمہاری قید میں رہوں گی، کیا میں کبھی آزاد نہ ہوسکوں گی۔"

"نہیں، کبھی نہیں۔" سید پور کے جن نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"میں مرجاؤں گی۔"

"مر کر بھی چین نہ پاسکو گی۔" وہ ہنسا۔

"کیا تم نے میری روح کو بھی خرید لیا ہے۔" وہ اداسی سے کہتی۔

"ہاں ایسا ہی سمجھو۔"

ان دونوں کے درمیان اسی طرح کی گفتگو جاری رہتی نہ وہ کچھ سمجھتی نہ وہ کچھ اسے سمجھا پاتا۔ وہ دریا کے دو کنارے تھے جو کبھی آپس میں نہیں ملتے لیکن اس آگ کے دریا میں آگ نے کناروں کو ملا رکھا تھا یہاں سے وہاں تک آگ پھیلی ہوئی تھی۔

ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی۔

لاہور میں نیلم کے والدین واجدہ اور فیاض اس آگ میں جھلس رہے تھے۔

تو کراچی میں اکبر اس آگ میں تپ رہا تھا۔

کواڑ کے پیچھے لکھی ہوئی تحریر تین ماہ بعد خاصی دھندلی ہوگئی تھی لیکن ابھی تک موجود تھی وہ باتھ روم میں جاکر گھنٹوں اس تحریر کو دیکھتا رہتا۔

"اکبر میں تمہاری ہوں، مجھے بھول نہ جانا۔"

ان لفظوں کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

اب موسم بدل گیا تھا۔ سردی نے گرمی کے لئے جگہ چھوڑ دی تھی لیکن اکبر کے دل کا موسم نہ بدلا تھا جب اس کی شادی ہوئی تھی تب سے اس کے دل پر ایک گھٹا سی چھائی ہوئی تھی جو کھلتی تھی نہ برستی

تھی۔
ماسوں فرقان گھشن آتے رہتے تھے۔
دادا غفور سے بھی ان کی ملاقاتیں جاری تھیں۔
لیکن کہیں سے ابھی تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آئی تھی۔
وہ رات کو بستر پر لیٹتا تو نیلم کی من موہنی صورت اس کے سامنے آتی وہ خیال ہی خیال میں اس سے باتیں کرنے لگتا خود ہی سوال کرتا خود ہی جواب دیتا۔
نیلم، نیلم کرتے وہ خود ہی نیلم ہو گیا تھا۔
نیلم کو گھر سے گئے ہوئے جب تین ماہ ہو گئے اور اس کی کوئی خبر نہ ملی سب تھک ہار کر بیٹھ گئے تو صابرہ کے دل نے پھر انگڑائی لی۔
اکبر صابرہ کا اکلوتا بیٹا تھا وہ اسے ادھر اُدھر گرے پڑے دیکھتی تو دل ہی دل میں کڑھتی رہتی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اکبر، نیلم کی جدائی کے غم میں خود کو بیمار ڈال دے۔
تب صابرہ نے ایک دن اپنے شوہر سے بات کی۔
"اب کیا کرنا ہے جی؟"
"کس بات کا؟" بابر نے پوچھا۔
"میں اکبر کی بات کر رہی ہوں۔"
"کیا ہوا اسے۔"
"آپ تو بعض اوقات اتنے معصوم بن جاتے ہیں کہ نظر اتارنے کو جی چاہتا ہے۔" صابرہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔
"پھر کھل کر اور صاف صاف بات کریں۔" بابر علی نے ہنس کر کہا۔
"اکبر کی حالت دیکھی ہے آپ نے۔" صابرہ نے بڑے دکھ سے کہا۔
"ہاں روز ہی دیکھتا ہوں۔"
"مجھ سے اس کی شکل نہیں دیکھی جاتی، اس کی صورت دیکھتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ وہ دن بدن سوکھتا جا رہا ہے، چہرے کی رنگت بالکل زرد ہو گئی ہے ہر وقت خلاؤں میں گھورتا نظر آتا ہے۔ اب تو اس نے بولنا بھی ترک کر دیا ہے۔ شوروم سے آتا ہے تو اپنے کمرے میں جا گھستا ہے۔ اس طرح تو یہ لڑکا بالکل تباہ ہو جائے گا۔"
"ہاں میں اس کی حالت دیکھ رہا ہوں، وہ شوروم پر بھی کھویا کھویا بیٹھا رہتا ہے گاہک کچھ پوچھ رہا ہوتا ہے وہ جواب کچھ اور دے رہا ہوتا ہے۔" بابر علی نے فکرمندی سے کہا۔
"پھر اس کے لئے کچھ کریں نا۔"
"میرے ہاتھ میں اگر کچھ ہوتا تو اب تک کر چکا ہوتا اسے نیلم چاہئے میں نیلم کہاں سے لاؤں۔" بابر نے حقیقت بیان کی۔
"آپ کوئی اور نیلم تلاش کیوں نہیں کرتے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اس کی دوسری شادی کردی جائے۔"

"ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے وہ دوسری شادی کیلئے راضی ہو جائے گا؟"

"اسے ہونا پڑے گا۔" صابرہ نے بڑے یقین سے کہا۔

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو اپنی بے وقوفی میں بیٹے سے ہاتھ نہ دھو بیٹھنا۔"

"ایسا نہ کہیے۔" صابرہ نے فوراً اپنا کلیجہ تھام لیا۔ "کیوں یہ فال منہ سے نکالتے ہیں۔"

"تم زبردستی اس کی شادی کردو تو کیا وہ گھر میں رہے گا۔" بابر نے خفگی ظاہر کیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے وہ شادی کے لئے راضی نہ ہوگا۔"

"ہاں میرا تو یہی خیال ہے۔" بابر علی نے صاف گوئی سے کہا۔

"تمہارا خیال غلط ہے۔" صابرہ بڑے یقین سے بولی۔

"پھر اپنے بیٹے سے بات کر کے دیکھ لو۔" بابر علی نے کہا اور رخ پھیر کر سو گیا۔

صابرہ نے ایک دن موقع دیکھ کر اکبر سے بات کی وہ شادی کا نام سن کر ہی تنکے سے اکھڑ گیا۔

"امی، آپ کیا بات کرتی ہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"نیلم کی آس چھوڑ دو وہ چلی گئی ہے وہ اب واپس نہیں آئے گی۔"

"امی ایسی بیوی کی بات نہ کریں، میرا دل نہ توڑیں میرا دل کہتا ہے وہ ایک دن ضرور واپس آئے گی۔" اکبر نے کہا۔

"اکبر کچھ عقل کی بات کر۔" صابرہ نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا۔ "خدا کا شکر ادا کر کہ وہ سید پور کا جن اس گھر کو چھوڑ گیا۔"

"ہاں، وہ اس گھر کو تو چھوڑ گیا لیکن میرا سب کچھ لے گیا۔"

"تیرا کچھ نہیں گیا۔ تجھے نیلم جیسی ہزار لڑکیاں مل جائیں گی وہ کون سی واجدہ کی سگی بیٹی تھی۔ ملازمہ کی اولاد تھی ایسی لڑکیوں کا کیا غم کرنا۔" صابرہ نے نیلم کو اس کے دل سے اتارنے کی کوشش کی۔

"امی، میں آپ کو ایک بات بتادوں اگر نیلم مجھے نہ ملی تو میں زندگی بھر دوسری شادی نہیں کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باتھ روم میں چلا گیا۔

اس نے دروازہ دھاڑ سے بند کیا تو نیلم کی تحریر اس کے سامنے آگئی۔

"اکبر، میں تمہاری ہوں، مجھے بھول نہ جانا۔"

"ہاں نیلم تم میری ہو میں تمہیں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔" اکبر کی آنکھوں میں سیلاب امڈ آیا۔

اگر سید پور کے جن کو بھی محبت کا دعویٰ تھا تو اکبر کا بھی عشق سچا تھا۔ سید پور کے جن نے اپنے عشق میں نیلم کو برباد کر دیا تھا تو اکبر نے اپنے عشق میں خود کو برباد کر لیا تھا۔

عشق وہی سچا ہوتا ہے جس میں عاشق کا خانہ خراب ہو محبوب کا نہیں۔ اگر محبوب تباہ ہو جائے اور عاشق دندناتا پھرے تو اسے کبھی محبت نہیں کہتے خود غرضی کہتے ہیں۔

محبت وہ چراغ ہے جس سے اپنے گھر کو آگ لگتی ہے یہ وہ شمع ہے جو خود جل بجھتی ہے۔
جب سے نیلم اس گھر سے گئی تھی اکبر کی عجیب حالت ہو گئی تھی۔ اس کا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا
وہ ادھر ادھر مارا پھرتا کہیں بیٹھا ہے تو بس بیٹھا خلاء میں گھورے جا رہا ہے۔
سب اس کی حالت دیکھ رہے تھے ماموں فرقان خاص طور سے اس کے لئے پریشان تھے اور چاہتے تھے
کہ جلد سے جلد نیلم کا کھوج مل جائے۔
وہ اپنی دکان پر بیٹھے ہوتے تو اپنی جان پہچان کے گاہکوں سے تذکرہ کرتے رہتے۔ ایک دن انہیں ایک
ایسے بندے کا پتہ چل ہی گیا جو گمشدہ چیزوں اور کھوئے ہوئے انسانوں کا پتہ بتا دیتا تھا۔
وہ اللہ کا بندہ لیاقت آباد میں ہی موجود تھا۔ ماموں فرقان پورے شہر میں ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے اور
بندہ بغل میں موجود تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔
اس بندے کا نام و پتہ لے کر انہوں نے اکبر کو فون کیا اور اسے ہدایت کی وہ دکان پر آ جائے اس کے
لئے ایک خوشخبری ہے۔
اکبر مقررہ وقت پر ماموں فرقان کی دکان پر پہنچ گیا ماموں فرقان نے اسے دیکھ کر فوراً ہی کھڑے
ہو گئے اور بولے۔ "چار نمبر تک چلنا ہے، گاڑی لائے ہو؟"
"جی ہاں۔" اکبر نے کہا اور پھر وہ دونوں مارکیٹ سے نکل کر گاڑی میں آ بیٹھے۔
راستے میں انہوں نے اکبر کو اس شخص کے بارے میں بتایا اکبر بہت خوش ہوا اسے امید ہو چلی کہ اب
ضرور نیلم کے بارے میں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کہاں ہے؟
اس شخص کا نام ضرغام تھا۔ پتہ ٹھکانہ معلوم کرتے بالآخر اس کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔
ماموں فرقان نے دروازے پر دستک دی۔
فوراً ہی اندر سے آواز آئی۔ "آ جاؤ، بھئی کون ہے؟ دروازہ کھلا ہے؟"
وہ دونوں مکان میں داخل ہوئے یہ ایک کمرے کا چھوٹا سا گھر تھا کمرے کے سامنے تھوڑا سا صحن تھا
اور صحن میں ایک طرف غسل خانہ اور باورچی خانہ تھا۔
کمرے میں چارپائی بچھی تھی جس پر میلی سی چادر پڑی تھی۔ ایک کونے میں ٹرنک رکھا تھا ٹرنک کے اوپر
ایک ٹوکری تھی۔ دیوار میں ایک الماری بنی ہوئی تھی اس میں الم غلم چیزیں بھری تھیں۔
ضرغام چارپائی پر لیٹا آرام سے سگریٹ پی رہا تھا۔
وہ دو اجنبیوں کو دیکھ کر فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔
اکبر کو اس شخص کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی وہ ایک اول جلول سا بندہ تھا۔ اسے خود اپنا نام و نشان معلوم
نہ تھا وہ بھلا کسی اور کا کیا پتہ بتائے گا۔
"کیسے آنا ہوا؟" اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی مگر تیز آنکھوں سے دونوں کو باری باری دیکھا۔
"ہم جی، ایک گمشدہ لڑکی کا پتہ معلوم کرنے آئے ہیں۔"
"اچھا۔" اس نے کچھ عجیب سے انداز میں کہا۔
وہ ایک دبلا پتلا آدمی تھا اس کے بال لمبے لمبے تھے۔ وہ چارپائی سے ایک جھٹکے سے اٹھا الماری کے

سامنے کھڑا ہوا پھر اس نے ایک ڈبے میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی۔
اور جب وہ ان کی طرف مڑا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کے ہاتھ میں ایک لمبے پھل کا چاقو تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔

یہ ایک خطرناک چاقو تھا۔

ماموں فرقان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس حرکت کا مطلب کیا ہے وہ اس وقت دکان سے آرہے تھے۔ ان کی جیب میں اس وقت اچھا خاصا کیش تھا۔ ایک لمبے کو ان کے پسینے چھوٹ گئے۔
اکبر کو وہ منحس صورت سے ہی چور سا لگا تھا اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر یقین ہو گیا کہ وہ غلط پھنس گئے ہیں کسی نے ماموں فرقان کو کسی غلط آدمی کا پتہ بتا دیا ہے۔
ابھی وہ دونوں ایک دوسرے کی شکل ہی دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کیا کریں اتنے میں ضرغام نے چاقو کے اشارے سے دونوں کو بیٹھنے کو کہا۔ "آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں۔ چارپائی پر بیٹھ جائیں۔"
ضرغام کی آواز میں کوئی بات نہ تھی جس سے غلط عزائم کا اندازہ ہوتا۔ اس کے لہجے سے خلوص جھانک رہا تھا۔
وہ دونوں نہ چاہتے ہوئے بھی اس میلی چادر پر بیٹھ گئے جو اس کمرے کی واحد چارپائی پر بچھی ہوئی تھی۔
ضرغام نے ٹرنک سے ٹوکری اٹھا کر نیچے زمین پر رکھی اور خود نین کے بکس پر بیٹھ گیا۔
پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔
اس نے چاقو کی نوک کو ہتھیلی کے نیچے کلائی پر رکھ دیا۔ کلائی پر جہاں اس نے چاقو کی نوک گاڑی وہاں موٹے موٹے دانے ابھرے ہوئے تھے شاید یہ چاقو کو بار بار کلائی میں گاڑنے کی وجہ سے ہو گئے تھے۔
چاقو کی نوک کو اس نے کلائی میں گاڑ کر آنکھیں بند کر لیں اور دھیرے سے بولا۔
"لڑکی کا نام بتائیں۔"
"نیلم۔" ماموں فرقان فوراً بولے۔
"عمر کیا ہے؟" ضرغام نے سوال کیا۔
"بیس بائیس سال ہوگی۔" ماموں فرقان نے جواب دیا۔
"جب لڑکی گم ہوئی تو کس رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔"
اس سوال پر ماموں فرقان نے اکبر کو دیکھا اکبر کیا جواب دیتا۔ اس کے نزدیک نیلم اس وقت گم ہو گئی جب وہ خالی گھر میں چلی گئی اس رات کو جن اسے لینے آیا تھا اور ایک بکھی میں اسے بٹھا کر لے گیا تھا اس رات اس نے کس رنگ کے کپڑے پہنے تھے۔ یہ اسے یاد نہ تھا۔
"یاد نہیں۔" اکبر نے جواب دیا۔
"معلوم نہیں۔" ماموں فرقان نے کہا۔
"کس علاقے سے گم ہوئی۔"

"گلشن اقبال سے۔"
"کتنے دن ہو گئے؟"
"تین ماہ۔" ماموں فرقان نے جواب دیا۔
"لڑکی کنواری ہے؟"
"نہیں، شادی شدہ۔" ماموں فرقان نے کہا۔
"شوہر کا نام؟"
"اکبر۔"
"اچھا۔" یہ کہہ کر ضرغام خاموش ہو گیا اس کی آنکھیں مسلسل بند تھیں لیکن پتلیاں متحرک تھیں خود وہ بالکل ساکت تھا چاقو کی نوک کلائی میں گڑی ہوئی تھی اور وہ کسی مجسمے کی طرح بیٹھا تھا۔
کچھ دیر کے بعد اس مجسمے کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی آنکھیں بدستور بند تھیں۔
"میں سرسبز شاداب درخت دیکھ رہا ہوں، یہ کوئی پہاڑی علاقہ ہے ان درختوں میں گھرا ہوا مجھے ایک مکان نظر آ رہا ہے۔"
"نیلم کہاں ہے؟ وہ کہیں دکھائی دے رہی ہے۔"
"نہیں۔"
"کیا نیلم اس مکان کے اندر ہے۔"
"ہاں۔"
"یہ مکان کہاں ہے؟"
"معلوم نہیں۔"
"کوشش کریں، ادھر اُدھر گھوم پھر کر دیکھیں۔"
"اچھا کرتا ہوں۔"
لیکن چند سیکنڈ کے بعد ہی ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں اور نڈھال سا ہو کر پیچھے دیوار سے ٹیک لگا لی اس نے چاقو کلائی سے ہٹا لیا تھا اور دیوار سے لگا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا وہ نیم مردہ سا ہو گیا تھا۔

ماموں فرقان اور اکبر اس کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ ضرغام نے انہیں پریشان ہوتے دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی اور چند منٹ انتظار کرنے کے لئے کہا۔
اکبر نے صحن میں گھڑونچی پر رکھے ہوئے مٹکے سے ایک گلاس پانی نکالا اور ضرغام کو دیا۔
لیکن ضرغام نے ہاتھ کے اشارے سے فوراً گلاس اس کے سامنے سے ہٹانے کے لئے کہا۔
"کیوں۔" اکبر نے تعجب سے کہا۔ "پانی پی لیں آپ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"
"اگر..... میں نے..... پانی..... پیا تو..... مر جاؤں..... گا۔" ضرغام نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

یہ سن کر اکبر فوراً پانی کا گلاس باہر مٹکے کے پاس رکھ آیا۔ تھوڑی دیر بعد ضرغام کی حالت خود بخود

سنبل گئی۔ دیوار سے ہٹ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا کھلا ہوا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا وہ چاقو اس نے الماری کے خانے میں اچھال دیا۔

پھر وہ ٹرنک پر اپنی گردن گھٹنوں میں دے کر بیٹھ گیا اور ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹ لئے۔ اس کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے اور آنکھوں میں جیسے چمک نہ تھی۔ ویران اور اداس آنکھیں۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں۔"

"آپ کو کیا ہوا تھا؟" اکبر نے سوال کیا۔

"ہر عمل کے بعد میں اسی طرح نڈھال ہو جاتا ہوں۔ یہ معمول کی بات ہے۔ میرے جسم سے جیسے جان سی نکل جاتی ہے اسی لئے یہ عمل میں بہت کم کرتا ہوں آپ لوگوں کے چہروں پر پریشانی اور شرافت دیکھ کر میں یہ عمل کرنے کے لئے فوراً راضی ہو گیا پھر معاملہ لڑکی کا بھی تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو میرا کس نے پتہ بتایا تھا۔ خیر جس نے بھی بتایا ہو اس علاقے کا بچہ بچہ مجھے جانتا ہے اس نے پتے کے ساتھ یہ ضرور بتایا ہو گا کہ میں اس عمل کے ڈھائی سو روپے لیتا ہوں۔"

"ہم ڈھائی سو کی جگہ پانچ سو روپے دیں گے بلکہ ابھی لے لیجئے بس ہمیں نیلم کا پتہ بتا دیجئے۔" ماموں فرقان نے جیب سے ایک پانچ سو کا نوٹ نکال کر اوب سے اس کے سامنے پیش کیا۔

لیکن ضرغام جس طرح بیٹھا تھا ویسے ہی بیٹھا رہا۔ اس نے نوٹ پکڑنے کے لئے ہاتھ آگے نہ بڑھایا۔

"میں ڈھائی سو روپے ہی لوں گا لیکن یہ پیسے میں اس وقت لوں گا جب آپ کا کام ہو جائے گا ابھی آپ کا کام نہیں ہوا ہے۔ میں ناکام ہو گیا ہوں ویسے ایسا میرے ساتھ آج تک نہیں ہوا۔ آپ لوگ بتائیں کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ لڑکی، کیا نام بتایا اس کا ہاں نیلم وہ کن حالات میں گھر سے گئی ہے۔"

"بس جی حالات نہ پوچھیں۔" ماموں فرقان نے گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا اور اداس ہو کر بولے۔

"اس کم بخت نے ہماری زندگی اجیرن کر دی ہے وہ ایسا اس کے پیچھے پڑا ہے کہ کسی طرح اس کا پیچھا چھوڑتا ہی نہیں۔ اس کے لئے ہم نے کیسے کیسے جتن نہ کئے خود میں قبرستان میں جا کر اس کے لئے عمل کر چکا ہوں لیکن فائدہ کچھ نہ ہوا۔"

"کوئی آسیب ہے۔"

"آسیب نہیں کوئی آسیب ہوتا تو کب کا جل مرا ہوتا۔ وہ ایک جن ہے بڑا زبردست جن..... کسی کے قابو میں نہیں آتا اب تک تو وہ لڑکی کے ساتھ گلشن والے گھر میں مقیم تھا لیکن اب وہ وہاں سے بھی غائب ہو گیا ہے ساتھ میں لڑکی کو بھی لے گیا ہے۔"

"ہوں۔" ضرغام نے اپنی مردہ آنکھوں سے ماموں فرقان کو دیکھا۔ "تو یہ بات ہے تبھی تو میں کہوں کہ یہ جھٹکے مجھے کیوں لگ رہے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں آپ لوگ کل اسی وقت آ جائیں میں رات کو کچھ کارروائی کرتا ہوں کل آپ لوگ جب آئیں گے تو میرے ہاتھ میں نیلم کا پتہ ہو گا۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں اور اس نوٹ کو اپنی جیب میں ڈال لیں۔ جن بزرگ نے مجھے یہ علم عطا کیا تھا اس نے ہدایت

کی تھی کہ بغیر کام کئے پیسے نہ لینا۔"
ماموں فرقان نے پانچ سو کا نوٹ اپنی جیب میں ڈال لیا اور ممنونیت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔
"اچھا جناب کل حاضر ہوں گے۔"
یہ کہہ کر وہ دونوں اس مکان سے باہر آ گئے۔
"عجیب شخص ہے۔" اکبر نے کہا۔
"ہاں، بہت عجیب ہے۔" ماموں فرقان نے اس کی تائید کی۔
دوسرے دن جب وہ دونوں وقت مقررہ پر ضرغام کے گھر پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ ماموں فرقان نے آہستہ سے ہاتھ سے دروازہ بجایا۔
لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔
ماموں فرقان نے تب دروازے کو آہستہ سے اندر کی طرف دھکیلا دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ وہ فوراً کھل گیا۔ ماموں فرقان نے اندر جھانک کر دیکھا تو ضرغام چارپائی پر لیٹا نظر آیا۔
وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔
ضرغام چارپائی پر بے سدھ پڑا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں، منہ کھلا ہوا تھا لگتا تھا جیسے بہت گہری نیند سو رہا ہو۔
اس کے دائیں ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو اور بائیں ہاتھ میں ایک مڑا ہوا کاغذ تھا۔
"ضرغام صاحب..... ضرغام صاحب۔" ماموں فرقان نے اس کا ہاتھ ہلایا۔
ماموں فرقان نے اس کا ہاتھ چھوا تو وہ ایک دم یخ بستہ محسوس ہوا انہوں نے چونک کر اکبر کو دیکھا اور اپنے جبڑے سختی سے بند کر لئے۔
"ماموں کیا ہوا؟"
ماموں فرقان نے کوئی جواب دیئے بغیر ضرغام کی نبض پر ہاتھ رکھا اور اس کا سینہ ٹٹولا پپوٹے کھول کر دیکھے اور پھر اس طرح پیچھے ہٹے جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔
"ماموں کیا ہوا؟" اکبر نے پھر اپنا سوال دہرایا۔
"یہ مر چکا ہے۔"
"ہیں۔" اکبر کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ "اب کیا ہو گا۔"
"یہ اس کے ہاتھ میں کاغذ کیسا ہے؟" ماموں فرقان نے یہ کہہ کر اس کے ہاتھ سے کاغذ نکالا۔
"جب انہوں نے کاغذ کی تہہ کھولی تو ان کے اندر سناٹا اتر گیا، اکبر نے بھی اس کاغذ کو دیکھ لیا تھا اس کاغذ پر جو کچھ تھا اس نے بھی غور سے دیکھ لیا تھا۔
اس کاغذ پر ایک کالے بلّے کا چہرہ تھا جو منہ پھاڑے غرا رہا تھا۔
ماموں فرقان نے اس کاغذ کو ضرغام کی لاش پر پھینکا اور اکبر کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف کھینچا۔ "اکبر

جلدی کرو یہاں سے نکل چلو۔"

بس پھر وہ اس گھر سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔

گاڑی میں بیٹھے اور ہانپتے کانپتے دکان پر پہنچے۔ ماموں فرقان نے وہ ٹھنڈی بوتلیں منگوائیں اور وہ دونوں ان بوتلوں کو گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگے۔

اب تک انہوں نے ایک دوسرے سے اس موضوع پر بات نہ کی تھی۔ اب وہ بات بھی کیا کرتے جو کچھ سامنے تھا۔ جو کچھ ہوا تھا وہ بھی انہیں معلوم تھا کہ کیا کہر ہوا۔

"ماموں اس لاش کا کیا ہوگا؟" اکبر نے رازداری سے کہا۔

"کوئی محلے والا دیکھ لے گا اور اس طرح اسے قبرستان پہنچا دیا جائے گا۔"

"لیکن ماموں یہ کیا ضروری ہے کہ کوئی پڑوس کا آدمی ضرور اس کے گھر پہنچے اگر کوئی کل تک اس کے گھر میں داخل نہیں ہوا تو اس کی لاش سڑ جائے گی، جانے اس کا انتقال کب ہوا ہو۔"

"پھر کیا کرنا چاہئے۔"

"کیوں نہ تھانے فون کر دیں۔"

"ہم لوگ بھی لپیٹ میں آجائیں گے۔ پولیس ایسے موقع کی تلاش میں رہتی ہے۔"

"ہم اپنا نام پتہ کیوں بتائیں گے فرضی فون ہو گا بس ضرغام کے گھر کا پتہ بتا دیں گے۔"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے تم ایسا کرو اپنے گھر جا کر فون کرو تھانے کے ساتھ ساتھ ایدھی سینٹر کو بھی فون کر دینا پولیس اگر ٹھکانے پر نہ پہنچی تو ایدھی سینٹر کی ایمبولینس ضرور وہاں پہنچ جائے گی۔"

پھر اکبر نے ماموں فرقان کی ہدایت کے مطابق گھر جا کر فرضی نام سے تھانے اور ایدھی سینٹر میں فون کر دیئے۔

دوسرے دن شام کے اخباروں نے ضرغام کی موت کو خوب رنگ آمیزی کے ساتھ چھاپا۔ ایسی ایسی کہانیاں گھڑی گئیں کہ ماموں فرقان اور اکبر دانتوں تلے انگلیاں دبا کر رہ گئے۔

ابھی یہ خبر ٹھنڈی نہ ہوئی تھی کہ ایک ٹھنڈی خبر اور موصول ہو گئی۔

یہ خبر دادا غفور سے متعلق تھی۔

ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ دادا غفور نے ماموں فرقان کو فون کر کے حاضرات کے عمل کے بارے میں بتایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔

"فرقان ..... مجھے کچھ کامیابی ہوئی ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"ابھی میں یہ نہیں بتا سکتا لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ پردے میں کچھ نہ رہے گا ظاہر ہو کر رہے گا۔ میں مسلسل کوشش کر رہا ہوں۔" دادا غفور بہت پرامید تھے۔

"اب تک کیا معلوم ہوا، کیا دکھائی دیا ہے۔"

"ابھی تو بس ایک مکان دکھائی دیا ہے ..... وہ بھی دھندلا دھندلا۔" دادا غفور نے بتایا۔

"اور وہ مکان درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ کوئی پہاڑی علاقہ محسوس ہوتا ہے۔" ماموں فرقان فوراً

بولے۔

"ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں نے اس مکان کو درختوں میں گھرا ہوا دیکھا ہے۔ لیکن تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا۔"

تب ماموں فرقان نے اس عجیب آدمی ضرغام کا ذکر کیا۔

"اوہ۔" ساری بات تفصیل سے سننے کے بعد دادا غفور نے افسردہ لہجے میں کہا۔

پھر دادا غفور نے کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کر کے فون بند کر دیا۔

اور دوسرے دن ان کے انتقال کی خبر آگئی۔

وہ فجر کی نماز پڑھنے فلیٹ سے نکلے تھے کہ اترتے ہوئے ان کا پاؤں پھسل گیا۔ سیڑھیوں پر زیادہ روشنی نہ تھی ..... ان کا پاؤں کیلے کے چھلکے پر پڑا اور وہ لڑھکتے ہوئے نیچے چلے گئے۔ ستر سال سے اوپر کے تھے ..... آخری سیڑھی پر پہنچ کر آخری سانس لی اور کلمہ پڑھ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ماموں فرقان کو دادا غفور کی موت کا بہت صدمہ ہوا۔

اکبر جب قبرستان سے اپنے گھر پہنچا تو شدید ذہنی کھنچاؤ کا شکار تھا۔

اگرچہ اکبر کے پاس اس بات کی کوئی شہادت نہ تھی کہ دادا غفور کی موت میں سیدپور کا جن ملوث ہے لیکن جانے کیوں اس کا دل بار بار اس بات کی گواہی دیتا تھا یہ سب کیا دھرا سیدپور کے جن کا ہے۔

اس جن نے نہ صرف اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی بلکہ اب وہ مجرمانہ کارروائیوں پر اتر آیا تھا..... وہ اب قاتل بن چکا تھا۔

ضرغام کی موت..... موت کہاں؟..... اسے قتل کہنا چاہئے۔ یہ قتل اسی کے ہاتھوں ہوا۔

وہاں تو اس نے اپنی منحوس صورت بھی چھوڑ دی تھی۔

دادا غفور کو بھی اسی نے مارا، وہ کیلے کا چھلکا آخر سیڑھی پر کہاں سے آیا۔ یہ سوال بار بار اس کے سر پر ہتھوڑے برساتا اور اس کا ذہن خود بخود سیدپور کے جن کی طرف چلا جاتا۔

اکبر مغرب کے وقت اپنے گھر میں داخل ہوا تھا اس نے کسی سے بات نہ کی تھی..... وہ سیدھا اپنے بیڈ روم میں چلا گیا تھا اور جوتے اتار کر بیڈ پر دھم سے گر پڑا تھا۔

ذہن پر بوجھ تھا..... خیالات کی یلغار تھی..... نیلم اسے ٹوٹ کر یاد آرہی تھی..... اور اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

جانے کتنی دیر اسی کیفیت میں گزر گئی۔

کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا..... وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔

اچانک کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے ہٹایا اور اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"بیٹے اکبر۔" صابرہ نے دھیرے سے پکارا۔

"جی امی۔" اکبر نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"اندھیرے میں کیوں لیٹے ہو؟"

"امی. میرے لئے اب کیا اندھیرا. کیا اجالا دونوں ایک ہیں۔"

"تم مجھ سے ایسی باتیں مت کیا کرو۔" صابرہ نے بڑی محبت سے کہا۔

"پھر کس سے کروں میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" وہ پریشان ہو کر بولا۔

"اسی لئے کہتی ہوں شادی کر لو۔"

"امی. مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کریں۔" اکبر نے ناراضگی سے کہا۔

"اچھا. اٹھو. تمہارے ابو تمہیں بلا رہے ہیں؟"

"کیا معاملہ ہے؟"

"گھر میں اتنی لمبی رقم پڑی ہے. تمہارے ابو کہتے ہیں اس کا کچھ کرنا ہے۔"

"رقم کیسی رقم ..... " اکبر نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"بھول گئے۔" صابرہ نے اٹھ کر کمرے کی لائٹ جلائی اور پھر واپس آ کر اکبر کے نزدیک بیٹھ گئی۔

اکبر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ارے تمہیں وہ رقم یاد نہیں ... وہ پچیس لاکھ جو ..... "

"اچھا ٹھیک ہے. مجھے یاد آ گیا۔" اکبر نے صابرہ کو آگے نہ بولنے دیا۔ "امی. ان روپوں کو آگ کیوں نہیں لگا دیتیں۔"

"تم اس معاملے پر اپنے ابو سے بات کر لو۔"

"وہ پیسے ہیں کہاں؟"

"سوٹ کیس میں ہیں اور سوٹ کیس پیٹی میں پڑا ہے اور اس کے اوپر لحاف گدے رکھے ہوئے ہیں۔" صابرہ نے بتایا۔

"اچھا ٹھیک ہے. میں منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں. آ کر اس رقم کا حساب کتاب کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اکبر باتھ روم میں چلا گیا۔

باتھ روم میں داخل ہو کر جب اس نے دروازہ بند کیا تو حسب معمول اس کی نظر نیلم کی لکھی تحریر پر پڑی۔ "اکبر میں تمہاری ہوں. مجھے بھول نہ جانا۔"

یہ تحریر روز بروز دھندلاتی جا رہی تھی۔ اس تحریر پر اکبر کی جب بھی نظر پڑتی اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا۔ نیلم کو اس گھر سے گئے ہوئے تین ماہ ہو گئے تھے۔ اور وہ اس کے لئے اب تک کچھ نہ کر سکا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ نیلم جہاں بھی تھی اس مکان میں تھی جو درختوں سے گھرا ہوا تھا وہ مکان دونوں نے دیکھا تھا۔ ضرغام نے بھی اور وادا غفور نے بھی۔

اور دونوں ہی اس مکان کے محل وقوع کو تلاش کرنے کی کوشش میں جاں بحق ہو گئے تھے۔

نہ جانے نیلم کس حال میں ہو گی۔ اس پر کیا بیت رہی ہو گی وہ جن اس پر جانے کیسے کیسے ظلم توڑ رہا ہو گا وہ نازک سی نیلم یہ سب کچھ کہاں تک برداشت کرے گی..... بالآخر ایک دن موت سے ہمکنار ہو جائے گی۔

"نہیں، نہیں۔" اس کا وجود شدت سے چیخ اٹھا۔

"نیلم میری ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوگا وہ مجھے مل کر رہے گی۔ میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔"

منہ ہاتھ دھو کر وہ کمرے سے باہر آیا تو ٹی وی لاؤنج میں بابر اس کا منتظر تھا بابر نے اسے دیکھتے ہی اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔ "ادھر آجاؤ۔ اکبر۔"

"جی ابو" "اکبر، بابر کے برابر بیٹھ گیا۔

"راشدہ ذرا ٹی وی بند کردو۔" بابر علی۔ راشدہ سے مخاطب ہوا۔

راشدہ نے جلدی سے اٹھ کر ٹی وی بند کردیا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ پچیس لاکھ روپے گھر میں پڑے ہیں۔ اس کے بارے میں کیا سوچا۔" بابر نے بات شروع کی۔

"ابو۔ آپ نے کیا سوچا۔" اکبر نے پلٹ کر سوال کیا۔

"اتنی بڑی رقم۔ بے مصرف پڑی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اسے کاروبار میں لگائیں۔"

"نہیں، ابو اس رقم پر ہمارا کوئی حق نہیں ..... وہ حرام کی رقم ہے..... میرے خیال میں تو اسے نذر آتش کردینا چاہئے۔" اکبر نے دو ٹوک فیصلہ دیا۔

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔"

"پھر مجھ سے پوچھنے کی ضرورت کیا ہے۔ آپ جو مناسب سمجھیں کریں۔" یہ کہہ کر اکبر اٹھنے لگا۔

"اچھا، زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ تم ذرا پیٹی سے وہ سوٹ کیس تو نکال کر لاؤ۔"

"جی بہتر۔" اکبر نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔

پھر وہ اٹھ کر اسٹور میں گیا۔ راشدہ اس کے ساتھ تھی۔ دونوں نے مل کر پیٹی کے اوپر پڑا سامان ہٹایا..... پھر پیٹی میں سے لحاف گدے باہر نکالے۔ وہ سوٹ کیس سب سے نیچے تھا۔

اکبر نے جھک کر پیٹی میں سے اسے نکالا..... اور ٹی وی لاؤنج میں واپس آگیا۔

وہ سوٹ کیس اس نے نیچے قالین پر رکھ دیا..... بابر علی صوفے سے نیچے اتر آیا..... وہ قالین پر پاؤں پھیلا کر بیٹھا..... اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس کی چابی تھی..... اس نے سوٹ کیس کے تالے میں چابی گھمائی تالا کھل گیا۔

اکبر، راشدہ اور صابرہ سب کے سب سوٹ کیس کو گھیرے کھڑے تھے۔

بابر علی نے بڑے پیار سے سوٹ کیس کا ڈھکن اٹھایا..... پھر جیسے ہی اس کی نظر سوٹ کیس کے اندر پڑی اس کے چھکے چھوٹ گئے..... وہ کود کر صوفے پر چڑھ گیا۔

راشدہ اور صابرہ کی چیخیں بلند ہوئیں..... وہ دروازے کی طرف سرپٹ بھاگیں۔

اکبر بھی سوٹ کیس کے پاس کھڑا نہ رہ سکا..... وہ جلدی سے صوفے پر چڑھ گیا۔

سوٹ کیس میں رقم نہ تھی..... بلکہ اس کی جگہ ایک کنڈلی مارے سانپ بیٹھا تھا۔ جیسے ہی سوٹ کیس کا ڈھکن کھلا..... اس نے پھنکار کر اپنا پھن پھیلایا اور سرسراتا ہوا سوٹ کیس سے باہر آگیا۔

وہ تو اچھا ہوا کہ اس سانپ کا رخ سونے کی طرف نہیں تھا اگر ہوتا تو ان دونوں کے پاس اس وقت ایسی کوئی چیز نہ تھی جس سے وہ اس کا مقابلہ کرتے۔

اس سانپ کا رخ دروازے کی طرف تھا۔

صابرہ اور راشدہ اس کے پھن اٹھاتے ہی بھاگ کھڑی ہوئی تھیں ..... اور انہوں نے اپنے کمرے میں جاکر جلدی سے دروازہ بند کر لیا تھا۔

وہ سانپ سرسراتا ہوا، دروازے سے باہر چلا گیا۔

سانپ کے کمرے سے نکلنے کے بعد اکبر نے اسٹور سے اپنی ہاکی نکالی اور سانپ کے پیچھے گیا پھر اس نے پورا گھر چھان مارا، گھر کے آگے پیچھے پودوں میں بھی دیکھ لیا لیکن اس سانپ کا پتہ نہ چلا۔

گھر میں کئی دن تک اس سانپ کی دہشت چھائی رہی ..... چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے بس یہی گمان ہوتا کہ سانپ اب یہاں سے نکلا، وہاں سے نکلا۔

خاص طور سے راشدہ اور صابرہ کی بری حالت رہی ..... رات کو انہوں نے اکبر کو اپنے کمرے میں سُلایا۔

خواب میں بھی اس سانپ نے پیچھا نہ چھوڑا، کبھی وہ کھڑکی سے اندر آتا دکھائی دیتا تو کبھی جسم پر رینگتا ہوا محسوس ہوتا۔

ماموں فرقان کو معلوم ہوا تو وہ کہیں سے ایک سپیرا پکڑ لائے۔ اس نے گھر کے لان میں بیٹھ کر دو ڈھائی گھنٹے تک بین بجائی۔

وہ بیچارہ بین بجا بجا کر تھک گیا لیکن کہیں سے سانپ برآمد نہ ہوا۔ ..... گھر میں سانپ ہوتا تو برآمد ہوتا۔ تب کہیں جاکر صابرہ اور راشدہ کے دل کو اطمینان ہوا، اور انہوں نے بات بات پر سانپ سے ڈرنا چھوڑا۔

بابر علی کو رقم کے اس طرح نکل جانے پر بڑا صدمہ تھا۔ وہ اپنے دل میں جانے کیا منصوبے بنائے بیٹھا تھا، جو اس کے دماغ سے لہراتے ہوئے نکل گئے تھے۔

کتنا اچھا ہوتا کہ وہ اس رقم کو فوراً ہی استعمال میں لے آیا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

جبکہ اکبر سوٹ کیس سے رقم غائب ہونے پر بہت خوش تھا۔ وہ پہلے ہی دن سے اس رقم کا خلاف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے فوراً نذر آتش کر دیا جائے۔

بالآخر اس کی خواہش پوری ہوگئی۔ اگرچہ رقم کو نذر آتش کرنے کی نوبت نہ آئی لیکن وہ خود بخود غائب ہوگئی۔

اکبر کی اب عجیب حالت ہوگئی تھی۔

وہ گھر سے شوروم جاتا اور وہاں سے آکر اپنے کمرے میں بند ہوجاتا۔ وہ گھنٹوں نیلم کی تصویر کو تکے جاتا یا باتھ روم میں کھڑے ہوکر نیلم کی تحریر کو دیکھے جاتا۔

وہ اس طرح بیڈ پر لیٹے نیلم کی تصویر کو تکتے ہوئے اسے دیکھتی تو صابرہ سے بیٹے کی حالت چھپی نہ تھی۔ وہ اس طرح

دل کٹ کر رہ جاتا۔

اس کا جی چاہتا کہ نیلم کی اس تصویر کو کمرے سے نکال کر پھینک دے۔

وہ جانتی تھی کہ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے اس نے کبھی ایسا قدم نہ اٹھایا۔

ایک رات اکبر نے نیلم کو خواب میں دیکھا ..... اس نے دیکھا کہ نیلم گھر کے دروازے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ جن نے اسے خود بخود آزاد کر دیا ہے کیونکہ اب نیلم اس کے مطلب کی نہ رہی تھی ..... وہ شدید بیمار ہو گئی تھی۔

اکبر نیلم کو اپنے گھر کے دروازے پر پا کر پھولا نہ سمایا ..... جب وہ گاڑی سے اتر کر اس کے نزدیک آیا تو نیلم دیکھتے ہی دیکھتے ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

اس خواب کے بارے میں وہ سارا دن سوچتا رہا۔ دن بھر نیلم اس کی نظروں میں رہی ..... اس کے خیالوں میں چھائی رہی ..... وہ خیال ہی خیال میں اس سے ہم کلام ہوتا رہا۔

شام کو جب وہ شوروم سے واپس آیا ..... اور گاڑی کھڑی کر کے اپنے کمرے میں پہنچا تو اس نے وہاں کسی کو پایا۔

وہ لڑکی نیلم کی تصویر کے سامنے کھڑی تھی اور تصویر کو محویت سے دیکھ رہی تھی۔

اکبر کی طرف اس کی پشت تھی ..... اس کے لمبے بال نیچے گھٹنے تک گئے ہوئے تھے ..... خوبصورت پُرکشش زلفیں، پتلی کمر، سڈول جسم۔

"کون ہیں آپ؟" اکبر نے پوچھا۔

تب جواب میں اس نے گردن گھمائی ..... اور مسکرا کر دیکھا۔

"ارے نیلم تم۔" یہ کہہ کر اکبر بے قراری سے اس کی طرف بڑھا۔

نیلم کو روبرو پا کر اکبر کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اسے یوں محسوس ہوا جیسے دل حلق کے راستے باہر آجائے گا۔ اس کا رُواں رُواں خوشی سے جھوم اٹھا، چہرے پر شادابی آگئی۔ آنکھیں چمک اٹھیں، ہونٹوں پر پھول کھلنے لگے۔

اس کا مطلب تھا کہ اس نے جو خواب دیکھا تھا، سچا تھا نیلم خود بخود گھر آگئی تھی اسے جن نے آزاد کر دیا تھا۔

وہ اس سے چھ سات قدم کے فاصلے پر تھی مغرب کا وقت تھا، کمرے میں ملگجا سا اجالا تھا۔

اکبر بانہیں پھیلائے نیلم کی طرف بے قراری سے بڑھا اور ابھی دو تین قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ ایک دم رک گیا۔

اسے کمرے میں پا کر اس نے اپنا پورا چہرہ اکبر کی طرف گھمایا۔ جب وہ مکمل طور پر گھوم کر سامنے آگئی تو اکبر کو ٹھٹھک جانا پڑا۔

وہ نیلم نہ تھی، نیلم کا سایہ تھی، پرتو تھی، نقل تھی۔

"ارے، آپ تو سچ مچ دھوکا کھا گئے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "آنٹی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔"

اکبر نے آگے بڑھ کر کمرے کی لائٹ جلائی۔
روشنی میں اکبر نے غور سے اس لڑکی کو دیکھا وہ نیلم تھی بڑی حد تک مشابہ تھی لیکن وہ نقل بر مطابق اصل نہ تھی اس کی آنکھیں نیلم جیسی نہ تھیں۔ ناک اور ہونٹوں کی بناوٹ میں بھی فرق تھا۔ چہرے کی رنگت اور آواز بھی ویسی نہ تھی البتہ اس کی زلفیں نیلم جیسی ضرور تھیں کہ آدمی ایک مرتبہ دیکھے تو بس الجھ کے رہ جائے۔
پہلی نظر میں، وہ نیلم لگتی تھی۔ پھر دوسری نظر سارا بھرم کھول دیتی تھی۔
اب یہ بات تو صاف ہو گئی تھی کہ وہ نیلم نہ تھی۔ نیلم نہ تھی تو وہ اس کے بیڈ روم میں کس طرح آ گئی تھی اسے یہاں تک کس نے پہنچایا تھا، وہ کون تھی، کہاں سے آئی تھی۔
اکبر نے اس سے پہلے اس لڑکی کو کبھی نہ دیکھا تھا وہ رشتے کی تمام لڑکیوں سے واقف تھا صابرہ اور بابر کے دوستوں کی لڑکیوں کو بھی اس نے دیکھا ہوا تھا، راشدہ کی سہیلیوں کو بھی جانتا تھا۔
یہ لڑکی بالکل نئی تھی، اجنبی تھی پر کہاں سے آئی تھی۔
لڑکی، اکبر کے تذبذب کو بھانپ گئی پہلے تو وہ کھلکھلا کر ہنسی، پھر ایک ادا سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا جیسے ہنسی روکنے کی کوشش ہو۔
"میں آپ کے پڑوس سے آئی ہوں، میرا نام سیماں شیخ ہے۔" وہ بے حجابانہ بولی۔
"آپ آفتاب شیخ صاحب کے یہاں سے آئی ہیں؟" اکبر نے سوال کیا۔
"جی ہاں۔" وہ مسکرائی۔
"لیکن اس سے پہلے میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔" اکبر نے سنجیدگی سے کہا۔
"آپ دیکھتے کیسے؟ میں یہاں رہی کب ہوں، میں پہلی مرتبہ کراچی آئی ہوں۔" اس نے بتایا۔
"اوہ۔" اکبر نے حیرت ظاہر کی۔ "کہاں سے؟"
"مریخ سے۔" سیماں نے ہنس کر جواب دیا۔
"جی، کیا فرمایا۔" اکبر نے سنجیدگی سے کہا۔
"او نچا سنتے ہیں کیا، میں مریخ سے آئی ہوں۔"
اب اکبر کو اندازہ ہوا کہ وہ مذاق کے موڈ میں ہے اس لئے اس نے سوچا کہ خاموشی بہتر ہے اس نے کوئی جواب نہ دیا اور یونہی دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔
"چلی جاؤں؟" سیماں نے اسے غور سے دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ "یہی مطلب ہے نا آپ کا۔"
"جی۔ میں نے یہ تو نہیں کہا۔" اکبر نے گھبرا کر کہا۔
"پھر خاموش نگاہوں سے دروازے کی طرف کیوں دیکھا تھا۔"
اب اکبر کو احساس ہوا کہ یہ لڑکی مان نہ مان، میں تیرا مہمان قسم کی چیز ہے اس کے ساتھ دو ٹوک رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔ تبھی بات بنے گی۔

"راشدہ۔" اکبر نے زور سے آواز دی۔

"میں ایسے ہی چلی جاتی ہوں۔ کسی کو بلانے کی کیا ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر سیماں شیخ نے ہاتھ کے انداز میں ہاتھ ہلایا اور مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

ابھی وہ دروازے پر ہی پہنچی تھی کہ راشدہ آ گئی۔ راشدہ کو دیکھ کر سیماں پلٹ آئی اور بڑی بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"سیماں۔ اکبر بھائی سے ملیں تم۔" اس نے سیماں سے پوچھا۔

"بہت بور بھائی ہیں تمہارے۔"

"ارے۔ ایسا تو نہ کہو۔" راشدہ نے اکبر کی حمایت کی۔

"تمہارے بھائی نے مجھے کمرے سے نکال دیا۔" اس نے بن کر کہا۔

"جھوٹ۔ بالکل جھوٹ۔" اکبر نے جلدی سے کہا۔

"تو پھر آپ نے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔" اس نے دلیل دی۔

"میں تو آپ کو اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔" اکبر نے بتایا۔

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ مجھے نیلم کہہ کر پکارا تھا۔" سیماں شیخ کھلکھلا کر ہنسی اور اسے شرمندہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

اکبر کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس قسم کی لڑکی ہے اس کا تنہا بیڈروم میں چلے آنا۔ بے تکلفانہ گفتگو جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ راشدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بے تکلفانہ انداز میں کھڑے ہونا یہ سب باتیں ظاہر کر رہی تھیں کہ اس لڑکی کی فطرت میں بے باکی اور جلد گھل مل جانے کی عادت ہے۔

اکبر نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ راشدہ سے مخاطب ہوئی۔

"اچھا۔ رشی۔ ہم اب چلتے ہیں۔ رات کو آئیں گے۔ کسی اچھی فلم کا کیسٹ منگوا کر رکھنا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"میری امی کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"میری امی کے پاس۔ ڈرائنگ روم میں ہیں۔" راشدہ نے جواب دیا۔

"اچھا۔ اکبر صاحب خدا حافظ رات کو ملاقات ہو گی۔" سیماں نے بڑی بے تکلفی سے کہا اور بل کھاتی ہوئی چلی گئی۔

راشدہ بھی اس کے ساتھ جانے کیلئے مڑنے لگی تو اکبر نے اسے آواز دی۔ "راشدہ۔"

"اکبر بھائی ابھی آئی۔" یہ کہہ کر وہ سیماں کے ساتھ چلی گئی۔

اکبر نے اندازہ کر لیا کہ راشدہ اسے گیٹ تک رخصت کرنے گئی ہے اتنی دیر میں اکبر نے اپنے کپڑے تبدیل کر لئے ابھی وہ منہ دھونے کیلئے باتھ روم میں گھس ہی رہا تھا کہ راشدہ واپس آ گئی۔

"جی۔ جناب۔" راشدہ کے ہونٹوں پر دبی مسکراہٹ تھی۔

"راشدہ۔ یہ کیا چیز تھی؟" اکبر نے سوال کیا۔

"چیز..... چیز نہیں وہ سیماں شیخ تھی۔" راشدہ بولی۔

"یہ میرے کمرے میں کیسے آگئی۔" اکبر نے وضاحت چاہی۔
"میں لائی تھی۔ نیلم بھابھی کی تصویر دکھانے۔" راشدہ نے بتایا۔
"لیکن جب میں کمرے میں آیا تو وہ اکیلی تھی۔"
"میں آپ کی گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر گیٹ کھولنے گئی۔ گیٹ کھول کر واپس آرہی تھی تو امی نے آواز دیدی۔ ابھی میں ان کی بات سن ہی رہی تھی کہ آپ نے آواز لگادی۔"
"اچھا۔ یہ بات تو میری سمجھ میں آگئی کہ وہ میرے کمرے میں کیسے آئی لیکن یہ تھی کون۔"
"آپ کو کیسی لگی۔" سوال کچھ جواب کچھ۔
"انتہائی بکواس۔" اکبر نے اپنی رائے دی۔
"بالکل نیلم بھابھی جیسی تو ہے۔" راشدہ نے ہنس کر کہا۔
"نیلم جیسی تو نہ کہو..... البتہ نیلم کی بھونڈی نقل ضرور ہے۔ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔"
"خیر اب ایسا بھی نہ کہیں۔ امی کو تو وہ بہت پسند آئی ہے۔"
"اچھا تو یہ امی کی دریافت ہے..... ویسے وہ کیا کریں گی اس کا۔" اکبر نے پوچھا۔
"اچار ڈالیں گی اور آپ کو کھلائیں گی۔" راشدہ نے جل کر کہا۔
"اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔" اکبر تھوڑا سا مسکرایا۔
"پھر آپ اس کو کیوں برا کہہ رہے ہیں۔"
"اچھا، بھئی وہ بہت اچھی ہے۔ بالکل چاند جیسی۔"
"ابھی جاکر اس کے لئے کوئی اچھی سی فلم لے آیئے گا وہ رات کو آئے گی۔"
"جہنم میں گئی وہ اور ساتھ میں تم بھی۔"
یہ کہہ کر اکبر باتھ روم میں گھس گیا اور دھڑ سے دروازہ بند کرلیا۔
راشدہ چند لمحے بند دروازے کو دیکھتی رہی پھر مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔
اکبر نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ وہ واقعی صابرہ کی دریافت تھی۔ آفتاب شیخ کا مکان ان کے گھر سے دو تین مکان چھوڑ کر تھا۔ آفتاب شیخ کی بیوی سے صابرہ کی بھی دور دور سے سلام دعا تھی۔ رات کو سڑک پر ٹہلتے ہوئے اکثر اس کی ملاقات بیگم آفتاب سے ہوجاتی تھی۔
یہ دو تین دن پہلے کی بات تھی۔
صابرہ نے گاڑی سے اترتے ہوئے سیماں شیخ کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ ایک لمحے کو تو وہ یہی سمجھی کہ یہ نیلم ہے۔ راشدہ، اس کے ساتھ تھی، وہ دونوں ایسے ہی ٹہلتی ہوئی آگے نکل آئی تھیں۔ سیماں کو دیکھ کر راشدہ بھی ششدر رہ گئی۔
جب سیماں شیخ اپنی ماں کے ساتھ اندر مکان میں چلی گئی تو وہ دونوں ماں بیٹیاں بھی اس کے پیچھے لپکیں بیگم آفتاب نے ان دونوں کا بڑا پرتپاک استقبال کیا، کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ان کے گھر آئی تھیں۔ ورنہ اب تک دور سے ہی سلام دعا ہوتی رہی تھی۔

جب بیگم آفتاب کو یہ معلوم ہوا کہ وہ اس کی بھانجی کے تعاقب میں اندر آئی ہیں تو اسے یہ بات بہت ہی بری لگی۔ جب بیگم آفتاب کو یہ معلوم ہوا کہ وہ عین کی بیوی کی بہو نہیں ہے تو انہیں طریقہ بہت ہوئی۔

صابرہ نے باتوں باتوں میں جلدی جلدی سیماں شیخ کے بارے میں ساری معلومات اکٹھا کرلیں سب سے اہم اطلاع تو ان کے لئے یہی تھی کہ وہ ابھی کسی کی فیس ہوئی ہے۔

یہ اطلاع اس کے لئے بہت قیمتی تھی۔ صابرہ کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے غیب سے اس کی مدد ہوئی ہو۔ اللہ نے اکبر کے لئے دوسری نیلم بھیج دی ہو۔

سیماں کو دیکھ کر وہ بے پناہ خوش ہوئی لیکن یہ محفلہ اتنا آسان نہ تھا۔ صابرہ جو کچھ سوچ رہی تھی۔ اگرچہ وہ اپنی سوچ میں مخلص تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو جیتے جی جہنم سے نکالنا چاہتی تھی۔ پھر بھی سب کچھ آناً فاناً ہو جانے والا نہ تھا۔ اس کے لئے تھوڑے صبر اور منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔

سب سے پہلے تو کسی طرح اکبر کو سیماں کی طرف متلفت کرنا تھا۔ یہ بھی اچھا تھا کہ سیماں شرمیلے مزاج کی لڑکی نہ تھی وہ بڑی صاف گو، بولڈ اور شگفتہ مزاج کی لڑکی تھی۔ بات بات پر قہقہے لگانا اس کا شیوہ تھا۔

اس لئے پہلے مرحلے پر صابرہ نے طے کیا کہ دونوں کی ملاقات کرادی جائے۔ سیماں کو نیلم کے بارے میں بس اتنا بتایا گیا کہ وہ اکبر کی بیوی ہے۔ آج کل اپنے میکے لاہور گئی ہوئی ہے۔ سیماں کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ نیلم سے بہت مشابہ ہے تو فطری طور پر اس کے اندر تجسس جاگا۔ ویسے بھی وہ مہم پسند لڑکی تھی وہ فوراً اکبر کے گھر آگئی۔

پھر راشدہ نے صابرہ کی ہدایت پر سیماں کے ساتھ ایک شرارتی منصوبہ بنایا سیماں شیخ کو ایسی شرارتوں میں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ بلا جھجک راضی ہوگئی اور یوں وہ اکبر کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔

جب صابرہ نے سیماں کو نیلم کے بارے میں بتایا تھا تو اس نے بڑے جوش سے یہ کہا تھا۔ "تمہاری شکل نیلم سے اس قدر ملتی ہے کہ وہ اگر تمہیں دیکھ لے تو دھوکا کھا جائے جیسے ہم خود تمہیں دیکھ کر دھوکا کھا گئے تھے۔"

اور ہوا بھی یہی تھا۔

اکبر واقعی اسے اپنے بیڈروم میں دیکھ کر دھوکا کھا گیا تھا لیکن بس چند لمحوں کیلئے وہ اس طرف پشت کئے کھڑی تھی جب وہ گھوم کر اس کے سامنے آئی تو اکبر نے بیرے اور پتھر میں فرق محسوس کرلیا۔

اکبر کا خیال تھا کہ سیماں ایسے ہی مذاق میں رات کو آنے کا کہہ گئی ہے وہ بھلا کیسے آئے گی لیکن اس وقت اسے حیرت ہوئی جب وہ رات نو بجے اس کے گھر آدھمکی اس مرتبہ اس کی امی بھی ساتھ نہ تھیں۔

یہ لوگ کھانے میں مصروف تھے سیماں اگرچہ کھانا کھا کر آئی تھی لیکن راشدہ نے ہاتھ پکڑ کر اسے کھانے کی میز پر بٹھالیا وہ کھانے کی میز پر بیٹھی تو اس نے یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ کھانا کھا کر گھر سے نکلی تھی اس نے دوبارہ شکم سیر ہو کر کھایا۔ اکبر بیچارہ اس کا منہ دیکھتا ہی رہ گیا۔

کھانا کھانے کے بعد سیماں نے کیسٹ کا پوچھا۔ "کوئی فلم منگائی؟"

راشدہ نے کوئی جواب دینے کے بجائے اکبر کو دیکھا۔ اکبر ابھی کوئی جواب دینے کی سوچ ہی رہا تھا کہ سیماں تھک سے بولی۔ "آؤ۔ راشدہ۔ ہم خود جاکر فلم لے آتے ہیں۔ نزدیک ہی تو ہے دکان۔"

"نہیں۔ آپ نہ جائیں دکان پر۔ میں جاکر لاتا ہوں۔ کون سی فلم دیکھنی ہے۔"

"کوئی اچھی سی انگلش فلم۔" سیماں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"نہیں۔ سیماں۔ ایتابھ کی ابھی نئی فلم آئی ہے وہ دیکھ لیتے ہیں۔"

"چلو جیسی تمہاری مرضی۔" سیماں نے فوراً اس کی بات مان لی اور پھر دھیرے سے راشدہ کے کان میں کچھ کہا۔

سیماں کی بات سن کر راشدہ نے سر ہلایا۔ "اچھا۔ ٹھیک ہے۔"

"اب کیا ہوا؟" اکبر نے راشدہ کو گھور کر دیکھا۔

"ہم لوگ بھی آپ کے ساتھ چلیں گے بہت دن سے آپ نے آئس کریم نہیں کھلائی ہے۔"

"چلو۔ بابا چلو۔" اکبر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن پیدل جانا ہوگا۔"

"نہیں۔ اکبر بھائی ہم پیدل نہیں جائیں گے۔ گاڑی میں۔" راشدہ نے کہا۔

مجبوراً اکبر کو گاڑی نکالنا پڑی پہلے ان لوگوں نے ویڈیو شاپ سے اپنی پسند کی فلم کا کیسٹ لیا پھر یہ لوگ ایک کولڈ اسپاٹ پر پہنچے وہاں آئس کریم کی بجائے قلفی کھائی اور ٹھنڈی بوتل کے مزے لیے سیماں اور راشدہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر تھیں۔ سیماں اسلام آباد سے آئی تھی وہ اسلام آباد کا ذکر کر رہی تھی اور راشدہ اپنے شہر کی تعریفوں میں لگی تھی۔

اکبر خاموشی سے دونوں کی دلچسپ نوک جھونک سن رہا تھا۔

"ارے۔ صاحب آپ بھی کچھ بولیں۔" اچانک سیماں نے اسے ٹوکا۔

"میں کیا بولوں۔" اکبر نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔

"کوئی اچھا سا شعر سنائیں۔" اوھر سے فرمائش ہوئی۔

"شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔" دوٹوک جواب آیا۔

"اور راشدہ تمہیں۔" سیماں، راشدہ کی طرف پلٹ گئی۔

"مجھے تو ہے۔" راشدہ نے ہنس کر کہا۔

"آؤ پھر بیت بازی ہو جائے۔" سیماں نے خوش ہو کر کہا۔

"اے بھائی جلدی سے بوتلیں ختم کریں اور چلیں۔ یہ بیت بازی جاکر گھر کریں۔"

"بور آدمی۔" سیماں نے اگرچہ آہستہ سے کہا تھا لیکن اکبر نے پھر بھی سن لیا۔

وہ خاموش رہا اور کیا کرتا اس منہ پھٹ لڑکی کے منہ لگنا بیکار تھا۔

گھر جاکر فلم دیکھی گئی کچھ دیر صابرہ اور بابر نے وہ فلم دیکھی پھر وہ نیند کا بہانہ کر کے اٹھ گئے ایک گھنٹے کے بعد اکبر کو بھی جمائیاں آنے لگیں فلم ایسی کوئی خاص نہ تھی وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگا تو سیماں شیخ نے اسے روک لیا۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا ہم اکیلے فلم دیکھیں گے کیا؟"

مجبوراً اسے بیٹھنا پڑا وہ جمائیاں لیتا رہا اور فلم دیکھتا رہا۔

فلم ختم ہونے کے بعد اسے سیماں کو اس کے گھر تک چھوڑ کر آنا پڑا۔

راستے میں فلم پر تبصرہ کرتے کرتے اچانک اس نے پتی بدلی اور ایک غیر متوقع سوال اکبر سے کر دیا۔

"آپ کی بیگم کب تک آئیں گی۔"

"معلوم نہیں۔" اکبر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"لڑ کر گئی ہیں کیا۔" وہ کھنکھلا کر ہنسی۔

"یہی سمجھ لیں۔"

"ابھی آپ کی شادی کو کتنے دن ہوئے ہیں۔ ابھی سے لڑائیاں بھی شروع ہو گئیں۔"

"لڑائی کا کیا ہے۔ لڑائی تو پہلے دن سے بھی شروع ہو سکتی ہے۔"

"یہ شادی تو آپ کی پسند کی تھی۔"

"سارے سوالات آج ہی کر لیں گی۔ پھر کبھی سہی۔ اب آپ کا گھر آگیا۔"

"مجھے فلم دکھانے۔ تفنی کھلانے اور گھر تک پہنچانے کا بہت شکریہ۔" سیماں نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

اکبر نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا وہ محض مسکرا کر رہ گیا۔

سیماں کے گھر کے لوگ ابھی جاگ رہے تھے گھنٹی بجاتے ہی گیٹ کھل گیا اور وہ اکبر کو "بائی" کہہ کر اندر چلی گئی گیٹ پر آنے والی اس کی امی تھیں۔

پھر وہ دوسرے دن صبح ہی آدھمکی۔

اکبر ناشتے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ سیماں کی شکل دکھائی دے گئی وہ فوراً ناشتے کی میز سے اٹھ گیا اور سیماں کو سرسری سا "ہیلو" کرتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ابھی وہ کپڑے بدل کر آئینے کے سامنے کھڑا بال سنوار رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے ہلکی سی دستک دی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اکبر کو اس میں سے سیماں کے کپڑوں کی جھلک نظر آگئی۔

اس سے پہلے کہ اکبر اسے کمرے میں آنے کی اجازت دیتا۔ سیماں نے دروازہ کھول دیا اور مسکراتی ہوئی اندر آگئی۔

"اوہو، کہاں کی تیاری ہے؟" وہ آتے ہی بے تکلفی سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"شوروم جا رہا تھا۔" اکبر نے سادگی سے کہا۔

"کیا آپ گاڑیوں کا کاروبار کرتے ہیں۔"

"جی نہیں، ہم فرنیچر کا کاروبار کرتے ہیں۔" اکبر نے جواب دیا۔

"کیا کیا بناتے ہیں۔" سیماں نے ہنس کر پوچھا۔

"بس ایک بیوقوف نہیں بناتے، باقی سب بناتے ہیں۔"

"یہ آپ نے مجھ پر چھینٹا مارا ہے آپ کا کیا خیال ہے میں آپ کو بے وقوف بنا رہی ہوں میں بھلا آپ کو کس لئے بے وقوف بناؤں گی۔" وہ غصے سے بولی۔

"میں نے آپ سے ایسی کوئی بات نہیں کہی میں نے محض مذاق میں ایک بات کہی تھی۔"

"میں جانتی ہوں سب۔"

"یہ راشدہ کہاں ہے؟"

"وہ میرے لئے چائے بنا کر لا رہی ہے۔ تب تک اس نے کہا کہ میں آپ سے بات کر لوں۔"

"مجھ سے۔" اکبر نے حیرت سے اپنے سینے پر انگلی رکھی۔ "مجھ سے کیا بات کرنا ہے بھلا۔"

"ہم آپ کو آج شوروم نہیں جانے دیں گے۔ ہمیں سمندر پر لے چلئے۔"

اور پھر راشدہ اور سیماں نے واقعی اسے شوروم نہ جانے دیا وہ اسے لے کر سمندر پر چلی گئیں۔

سمندر پر جا کر سیماں نے خوب انجوائے کیا اگرچہ وہ پہلی مرتبہ کراچی آئی تھی اور اس نے پہلی مرتبہ سمندر دیکھا تھا لیکن وہ سمندر سے وحشت زدہ نہ ہوئی۔

باکس بے کے ساحل پر بے شمار لوگ موجود تھے۔ لڑکے۔ لڑکیاں۔ مرد۔ عورتیں۔ بچے سب سمندر کی لہروں سے کھیل رہے تھے۔ پہلے تو وہ دور سے سمندر کا نظارہ کرتی رہی پھر راشدہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ہٹ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔

"آؤ۔ سمندر میں چلیں۔"

"ہائے ڈر لگے گا۔"

"ڈر کیسا۔ میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔ سچ بڑا مزا آتا ہے نہانے میں۔"

پھر راشدہ نے سمندر سے اس کا تعارف کرایا جب پانی اس کے پاؤں کو چھوتا ہوا دو تین بار گزر گیا تو پھر وہ اسے لے کر ذرا آگے بڑھی۔

تھوڑی دیر میں سیماں کا سارا ڈر جاتا رہا اور وہ سمندر سے اپنی عادت کے مطابق بے تکلف ہو گئی اب وہ بیٹھ کر سمندر کی لہروں سے کھیل رہی تھی۔

جب بھی پانی کی لہر اس کی طرف آتی تو وہ خوب شور مچاتی، خوب انجوائے کرتی۔

سیماں کو سمندر میں دیکھ کر اکبر کو نیلم بے اختیار یاد آ گئی۔

پھر اسے نیلم کا ہاتھ پکڑ کر سمندر میں بھاگنا یاد آیا پھر ایک بڑی لہر آئی اور اسے اپنے ساتھ بہا کر لے گئی۔ سب نیلم کو سمندر میں ڈھونڈتے رہے جبکہ وہ ہٹ میں بیٹھی ہوئی تھی پھر اکبر کو اس جن سے نیلم کا ہاتھ پکڑنے پر معافی مانگنا پڑی۔

اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑنے پر ایک غیر سے معافی کیسی دل جلانے والی بات تھی۔

"یہ آپ بروقت رونے کیوں رہتے ہیں۔"

اکبر ایک دم چونک اٹھا اس کے سامنے سیماں کھڑی تھی وہ ابھی سمندر سے نکل کر آئی تھی اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے جسم سے چپکے ہوئے تھے۔

"نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اکبر نے ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی اور بولا۔

اتنی دیر میں راشدہ بھی قریب آگئی تھی پھر دونوں نے اس کا ایک ایک ہاتھ تھام لیا سیماں اسے ریت سے اٹھاتے ہوئے بولی۔

"ایسی بات نہیں ہے تو پھر آیئے۔ ہمارے ساتھ سمندر میں۔"

پھر وہ دونوں اس کا ہاتھ پکڑے تقریباً دوڑتی ہوئی سمندر میں لے گئیں۔

سمندر میں جاتے ہوئے جانے کس خیال نے اسے تڑپایا کہ ایک جھٹکے سے اس نے اپنے دونوں ہاتھ ان سے چھڑا لئے اور کنارے کی طرف بھاگا۔

پھر وہ کنارے پر بھی نہیں رکا۔

وہ سیدھا ہٹ کی سیڑھیاں چڑھتا ہٹ میں آیا اور زمین پر بچھی دری پر بیٹھ گیا اس کے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔

اس نے اپنا سر گھٹنوں کے درمیان دبا لیا اور ہاتھوں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیا۔ کپڑوں کی طرح اس کی آنکھوں سے بھی پانی جاری تھا وہ سسک سسک کر رو رہا تھا۔

اسے بے اختیار نیلم یاد آگئی تھی وہ اس کی یاد میں تڑپ اٹھا تھا۔

سیماں نے اکبر کو اس طرح ہاتھ چھڑا کر بھاگتے دیکھا تو اس نے راشدہ سے پوچھا۔

"انہیں۔ کیا ہوا؟"

"پتہ نہیں۔" راشدہ نے جواب دیا۔

"یہ ہٹ میں کیا کرنے گئے ہیں۔" سیماں نے پھر سوال کیا۔

"کچھ نہیں کہہ سکتی۔" راشدہ بولی۔

"آؤ چل کر دیکھیں۔"

"کیا پتہ اندر سے کوئی کھانے پینے کی چیز لینے گئے ہوں۔ ابھی تھوڑا انتظار کر لیتے ہیں پھر چلیں گے اندر۔" راشدہ نے کہا۔

راشدہ کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ ہاتھ چھڑا کر کیوں بھاگا کچھ اسی طرح کا منظر تھا جب نیلم سمندر میں غائب ہو گئی تھی اس وقت ضرور اکبر بھائی کو نیلم یاد آگئی ہوگی اور وہ ضرور اس کی یاد میں آنسو بہا رہے ہوں گے۔

کچھ دیر انتظار کے بعد جب وہ دونوں اندر پہنچیں تو اکبر کے دل کا غبار نکل چکا تھا دل پر جو گھٹا چھائی تھی وہ برس کر جا چکی تھی۔

وہ ان دونوں کو سیڑھیاں چڑھتا دیکھ کر سنبھل کر بیٹھ گیا اور کچھ مسکرانے کی بھی کوشش کی۔

"ہمیں سمندر میں اکیلا چھوڑ کر یہاں کیوں آگئے۔" سیماں نے شکایتاً کہا۔

"سیماں۔ یہ یہاں بیٹھے ضرور کچھ کھا رہے ہوں گے؟" راشدہ نے لائن دی۔

"نہیں۔ میں نے کچھ نہیں کھایا۔ دیکھ لیں ساری چیزیں جوں کی توں بندھی ہیں۔"

"پھر ادھر بھاگ کر کیوں آگئے تھے۔" سیماں پریشان تھی۔

"اکبر بھائی۔ کچھ کھانے پینے کی چیزیں نکالیں۔ بہت بھوک لگی ہے۔" راشدہ نے ٹالنے کی کوشش

کی۔

اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوگئی۔ اکبر نے کھانے پینے کی اشیاء سے پُر بڑا تھیلا کھولا تو یہاں سب کچھ بھول بھال کر کھانے پینے میں لگ گئی۔

کچھ دیر بعد اسے یاد ہی نہ رہا کہ اکبر انہیں سمندر میں چھوڑ کر ہٹ میں آگیا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ لوگ واپس چل پڑے۔

گھر پہنچ کر اکبر نہایا دھویا اور چائے پی کر سوگیا۔

ابھی سوئے ہوئے اسے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ کسی کھٹکے پر اس کی آنکھ کھل گئی اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ وہ دروازہ اندر سے بند کر کے لیٹا تھا۔

پھر اس کی نظر ہاتھ روم کے دروازے پر گئی تو وہ چونک اٹھا ہاتھ روم کا دروازہ کسی نے زور سے کھولا تھا۔ اتنے زور سے کہ وہ دیوار کے ساتھ جا لگا تھا۔ دروازے کی آواز سے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔

دروازے پر نیلم کھڑی تھی۔

وہ اسے دیکھ کر فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"نیلم تم۔"

"ہاں، میں۔" نیلم کمرے میں آگئی اور سنگھار میز کے سامنے بیٹھ گئی۔

اکبر اٹھ کر اس کے نزدیک گیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھنا چاہا تھا تو وہ غصے سے ایک دم کھڑی ہوگئی اور بولی۔

"خوب رنگ رلیاں منائی جارہی ہیں۔"

"نیلم یہ تم کیسی بات کر رہی ہو۔"

"اب آپ کو میری کیا فکر ہوگی۔ آپ کو دوسری نیلم جو مل گئی۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"کیا بات کرتی ہو۔ وہ دوسری نیلم ہے۔ وہ تو تمہارے پاؤں کی دھوون بھی نہیں۔"

"فلمیں دیکھی جارہی ہیں، قلفی کھائی جارہی ہے۔ سمندر کی سیریں ہیں۔ خوب ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ تم مجھے تو بالکل بھول گئے۔"

"میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں، میں تو تمہیں مر کر بھی نہیں بھول سکتا۔"

"پھر مجھے ڈھونڈتے کیوں نہیں۔"

"میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں، کہاں تلاش کروں۔"

"ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے، میں تو پھر انسان ہوں۔"

"کچھ بتاؤ تو سہی تم کہاں ہو، کہاں چھپ گئی ہو۔"

"اکبر میرے چاروں طرف آگ ہے۔ میں مری جارہی ہوں، خدا کے واسطے مجھے ڈھونڈلو۔"

ابھی اکبر کوئی جواب دینے والا تھا کہ اچانک ایک خوفناک آواز کمرے میں گونجی۔

"میاؤں۔"

اکبر نے پلٹ کر دیکھا تو بیڈ پر کالے بلے کو پایا۔

کالے بلے کو دیکھ کر نیلم باتھ روم کی طرف بھاگی، کالے بلے نے بھی بیڈ سے چھلانگ لگائی اور باتھ روم میں داخل ہوگیا۔

باتھ روم کا دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوا۔

تبھی اکبر کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ وہ اب تک خواب دیکھ رہا تھا وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا اس نے اٹھ کر پنکھا تیز کیا۔

کچھ دیر کے بعد جب پسینہ خشک ہوگیا اور دل کی دھڑکن قابو میں آگئی تو وہ اٹھ کر باتھ روم میں گیا تاکہ منہ ہاتھ دھولے۔

دروازہ بند کر کے جب اس نے نیلم کی تحریر پر نظر کی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا وہ تحریر جو وقت کے ساتھ دھندلا گئی تھی اس وقت بالکل تازہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ نیلم ابھی ابھی اس تحریر کو لکھ کر گئی ہو۔

وہ چکرا کر رہ گیا نیلم کو اس نے خواب میں دیکھا تھا یا وہ حقیقت میں یہاں موجود تھی۔

اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

رات کو سیماں اور اس کی امی اور بیگم آفتاب کو صابرہ نے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ اکبر کو جب معلوم ہوا کہ سیماں رات کو ادھر ہوگی تو وہ گھر سے بہانہ کر کے نکل گیا۔

جب سے اس نے نیلم کو خواب میں دیکھا تھا، اسے قرار نہ تھا، دل پر گھبراہٹ طاری تھی اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح وہ نیلم کی تلاش میں نکل جائے۔

گھر سے نکل کر وہ سیدھا ماموں فرقان کے یہاں پہنچا۔ اس نے کھانا بھی وہیں کھایا وہ بہت دیر تک ماموں فرقان سے باتیں کرتا رہا۔

پھر وہ رات گئے وہاں سے لوٹا۔ اس کا دل مطمئن تھا، اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

دوسرے دن جب شام کو سیماں، اکبر کے گھر آئی تو اس کا موڈ بہت خراب تھا وہ اکبر سے حساب لینے آئی تھی کہ وہ کل رات کو کہاں غائب ہوگیا جبکہ وہ لوگ اس کے گھر پر کھانے پر مدعو تھے۔

"اکبر آگئے شور دم سے؟" اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی سوال کیا۔

"وہ تو گئے۔" راشدہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

"گئے..... کہاں گئے؟"

"مری۔" راشدہ نے کہاں اور سیماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "آؤ اندر تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"مری۔" سیماں کو ایک جھٹکا سا لگا۔ "نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" یہ بات اس نے خود کلامی کے انداز میں کہی۔ وہ گم صم سی ہوگئی۔

راشدہ نے محسوس کیا کہ سیماں پر اس خبر نے بجلی سی گرا دی ہے۔ اندر ہی اندر کوئی چیز ٹوٹی ہے۔ ایک بے نام سی اداسی اس کے چہرے پر چھا گئی تھی۔

سیماں نے اس سے ہاتھ چھڑا لیا لیکن راشدہ نے پھر سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب اس نے محسوس کیا کہ سیماں کا ہاتھ نہ صرف صرف ٹھنڈا ہو چکا ہے بلکہ کانپ بھی رہا ہے۔

"سیماں کیا ہوا تمہیں۔ خیریت تو ہے۔" راشدہ نے گھبرا کر پوچھا۔
"کچھ نہیں مجھے کیا ہوگا۔" سیماں کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ آئی۔ "اچھا میں چلتی ہوں۔"

"کیا سیماں تم اکبر بھائی سے ملنے آئی تھیں؟" راشدہ نے سوال کیا۔
"نہیں تو۔" سیماں نے جلدی سے کہا۔ "تم سے ملنے آئی تھی۔"
"پھر مجھ سے ملے بغیر کیوں جا رہی ہو آؤ اندر آؤ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" راشدہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔
"راشدہ، میں پھر آجاؤں گی۔ اس وقت میری کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"
"کیا ہوا تمہاری طبیعت کو ابھی تو تم ٹھیک تھیں۔"
"چکر سے آرہے ہیں۔" سیماں نے صاف گوئی سے کام لیا۔
"آؤ میں تمہیں اچھی سی چائے بنا کر پلاتی ہوں۔ تمہارے چکر ابھی ٹھیک ہو جائیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے پھر سیماں کے جواب کا انتظار نہ کیا۔ اسے کھینچتی ہوئی اپنے ساتھ اندر لے گئی۔
راشدہ نے سیماں کو ڈرائنگ روم میں نہ بٹھایا بلکہ لاؤنج میں نہ اپنے کمرے میں بٹھایا وہ اسے سیدھی اکبر کے بیڈ روم میں لے گئی۔
بیڈ کے سرہانے اس نے دو تین تکیے رکھ دیئے اور بولی۔ "تم آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاؤ میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"
سیماں بڑی فرمانبرداری سے تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور سامنے نیلم کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگی۔
راشدہ چائے بناتے ہوئے الجھی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ ان دنوں میں جو کچھ ہوا تھا اکبر اور سیماں کی ملاقاتوں کے جو اثرات مرتب ہوئے تھے۔ وہ بہت حوصلہ افزاء تھے۔ سیماں بڑی تیزی سے اکبر کی طرف بڑھی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اکبر شادی شدہ ہے اس کے باوجود لاشعوری طور پر وہ اس کے قریب ہوتی چلی گئی تھی۔ ایک لڑکی دوسری لڑکی پر فتح حاصل کرنا چاہتی تھی میدان مار لینے کے جذبے نے اسے آگے بڑھایا اور پھر وہ واقعی اکبر کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔
اکبر اگر مری نہ گیا ہوتا اور اس کی توجہ سیماں کی طرف ہو گئی ہوتی تو سیماں کا اکبر کی محبت میں گرفتار ہونا بجا تھا بلکہ دونوں ماں بیٹی کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔
مشکل یہ تھی کہ راشدہ اپنے بھائی اکبر کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ سیماں کی صورت میں ان لوگوں نے جو اس کے دل پر تیر چلایا تھا وہ رائیگاں گیا تھا۔
اکبر نے سیماں کو محبت کی ایک نظر بھی عطا نہ کی تھی حالانکہ وہ نیلم کی بڑی حد تک ہم شکل تھی لیکن اسے نقل نہیں چاہئے تھی۔ اسے اصل درکار تھی۔ اسی لئے وہ سیماں کو خاطر میں لائے بغیر مری چلا گیا تھا۔
راشدہ دیکھ رہی تھی کہ اکبر کے مری چلے جانے سے سیماں پر خاطر خواہ اثر ہوا ہے۔ وہ شاید اس کی

محبت میں گرفتار ہوگئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو اسے حقائق بتا دینے چاہئیں تاکہ وہ سنبھل جائے اور یہ جان لے کہ اکبر کا دل فتح کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

ابھی تک سیماں کو نیلم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ بس یہی بتایا گیا تھا کہ وہ لاہور گئی ہوئی ہے۔ صابرہ اور راشدہ کی غیر معمولی دلچسپی دیکھ کر سیماں نے اپنے طور پر نیلم کے بارے میں یہ بات فرض کرلی تھی کہ اکبر اور نیلم کے تعلقات خوشگوار نہیں ہیں۔ نیلم لڑ کر میکے چلی گئی ہے اور اب یہ دونوں ماں بنی چاہتی ہیں کہ نیلم کا قصہ پاک کردیا جائے اور سیماں کو اس کی جگہ دے دی جائے۔

سیماں کو اکبر پہلی نظر میں اچھا لگا تھا اس لئے وہ انجام سے بے خبر محبت کی آگ میں کود پڑی تھی۔

راشدہ چائے کے دو کپ ہاتھ میں تھامے کمرے میں داخل ہوئی تو سیماں، نیلم کی تصویر کو گھور رہی تھی۔ راشدہ نے اسے غور سے دیکھا اور اسے اندازہ ہوا کہ سیماں کی محض آنکھیں نیلم کی تصویر کی طرف ہیں، ذہن کہیں اور ہے۔

"لو سیماں چائے پیو۔" راشدہ نے ایک کپ اس کی طرف بڑھایا۔

"آں۔" سیماں، راشدہ کی آواز سن کر جیسے چونک اٹھی۔ اس نے گھبرا کر کپ پکڑ لیا۔

وہ دونوں خاموشی سے چائے پیتی رہیں۔ راشدہ سوچ رہی تھی کہ وہ سیماں کو بتانے کیلئے کہاں سے آغاز کرے اور سیماں یہ سوچ رہی تھی کہ راشدہ اس سے کیا بات کرنا چاہتی ہے۔ کرنا چاہتی ہے تو کرتی کیوں نہیں۔

"اکبر مری کیوں گئے ہیں؟" سیماں نے بالآخر گفتگو کا آغاز کیا۔

"نیلم کے لئے۔" راشدہ نے فوراً کہا۔

"نیلم کے لئے!" سیماں کی سمجھ میں بات نہ آئی۔ "نیلم تو لاہور میں ہے؟"

"لیکن اکبر بھائی کا خیال ہے کہ وہ مری میں ہے؟"

راشدہ نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"میں سمجھی نہیں۔" سیماں نے خالی کپ میز پر رکھا اور ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"سمجھ میں تو آج تک ہماری بھی نہیں آیا کہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟"

"کیا کہنا چاہتی ہو راشدہ، جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو۔"

"ایک بات بتاؤ؟ سیماں تمہیں اکبر بھائی کیسے لگتے ہیں۔"

"صاف صاف بتا دوں۔"

"ہاں بتاؤ۔"

"میں انہیں چاہنے لگی ہوں۔" سیماں نے گہری نظروں سے راشدہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

راشدہ نے یہ سن کر گہرا سانس لیا۔ اس نے سیماں کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ صحیح نکلا۔ تب راشدہ ایک عزم کے ساتھ کھڑی ہوئی اس نے سیماں کا ٹھنڈا ہاتھ پکڑا اور بولی۔

"آؤ میرے ساتھ۔"

وہ اسے لے کر باتھ روم کی طرف بڑھی۔

"کہاں لئے جارہی ہو مجھے۔" سیماں حیرت زدہ تھی۔

"آؤ تو۔" راشدہ اسے لے کر باتھ روم میں داخل ہوئی اور پھر اس نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا۔

دروازہ بند کرنے پر سیماں کچھ بولنے ہی والی تھی کہ اس کی نظر نیلم کی لکھی ہوئی تحریر پر پڑی۔

"اکبر میں تمہاری ہوں۔ مجھے بھول نہ جانا۔"

"یہ کیا ہے؟" سیماں نے پریشانی ہو کر پوچھا۔

"آؤ میں تمہیں بتاتی ہوں، یہ سب کیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ سیماں کو باتھ روم سے نکال لائی اور وہ دونوں بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

"سیماں کیا تمہارا جن بھوتوں پر یقین ہے۔" راشدہ نے پوچھا۔

"ہائے جن بھوتوں سے مجھے تو بڑا ڈر لگتا ہے۔" سیماں نے جواب دیا۔

"کیا تم جانتی ہو کہ جن خوبصورت لڑکیوں پر عاشق ہو جاتا ہے۔"

"ہاں میں جانتی ہوں ہماری امی کے دور کے رشتے داروں میں ایک واقعہ ہو چکا ہے۔ ایک جن نہ صرف لڑکی پر عاشق تھا بلکہ اس نے اس لڑکی سے شادی کرنے کے لئے اپنا رشتہ بھجوایا اور رشتہ نامنظور کرنے پر سنگین نتائج کی دھمکی دی۔ والدین مجبوراً اس رشتے پر راضی ہو گئے پھر اس لڑکی کی باقاعدہ بارات آئی، نکاح ہوا، شادی کی تمام رسمیں ادا کی گئی اور لڑکی کو رخصت کر دیا گیا۔ اس جن نے بستی سے ہٹ کر ایک مکان لے لیا اب وہ لڑکی اس جن کے ساتھ رہتی ہے ماں باپ کے علاوہ اس لڑکی سے ملنے کوئی نہیں جا سکتا۔" سیماں نے بتایا پھر وہ خوف سے لرز کر بولی۔ "ہائے راشدہ یہ کیسی دل ہلانے والی بات ہے۔"

"ایسی ہی دل ہلانے والی بات اس گھر میں بھی ہوئی ہے۔"

"نہیں بھئی۔" سیماں فوراً سمٹ کر بیٹھ گئی۔ "کیا کہہ رہی ہو تم۔"

"ہاں میں تمہیں تفصیل سے ساری بات سناتی ہوں۔" راشدہ نے کہا۔ "ہماری بھابھی نیلم پر ایک جن عاشق ہے۔"

پھر راشدہ نے قصے کو ٹرین سے شروع کیا اور شادی کے بعد ان چار مہینوں میں جو بھی واقعات رونما ہوئے ان کا تفصیل سے ذکر کیا۔ سیماں اس ساری کہانی کو دم بخود ہو کر سنتی رہی۔ جب قصہ ختم ہوا تو سیماں کے چہرے کی رنگت اڑ گئی۔

اس نے خوفزدہ ہو کر نیلم کی تصویر کو دیکھا پھر سنگھار میز کے آئینے میں خود کو دیکھا اس کی شکل نیلم سے کافی ملتی تھی۔ اس نے سوچا اکبر تو اس پر عاشق ہوا نہیں لیکن اگر کہیں جن نے اسے دیکھ لیا تو ہو سکتا ہے وہ اسے بھی اپنے ساتھ لے جائے۔

اس تصور نے اس کی سٹی گم کر دی۔

پھر جو وہ اس گھر سے بھاگی تو اس نے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔

دو تین دن بعد معلوم ہوا کہ سیماں واپس اسلام آباد چلی گئی حالانکہ اس کا یہاں کافی دن رہنے کا پروگرام تھا۔

صابرہ کو بڑی حیرت تھی کہ سیماں نے اچانک گھر میں آنا کیوں بند کر دیا اور کیوں اتنی جلدی کراچی چھوڑ گئی۔ راشدہ نے صابرہ کو کچھ نہیں بتایا تھا اور اس نے سیماں کو بھی قسم دی تھی کہ وہ یہ قصہ کسی اور کو نہ بتائے۔

صابرہ، اکبر کے مری جانے کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ بابر کا خیال تھا کہ یہ سب صابرہ کی وجہ سے ہوا ہے۔

"لیکن میں نے کچھ نہیں کیا، میں نے اس سے کب کہا کہ وہ مری چلا جائے۔" صابرہ نے صفائی پیش کی۔

"تم نے اس پر سیماں کو جو مسلط کر دیا تھا۔" بابر نے خفگی سے کہا۔

"یہ سب میں نے اس کے بھلے کے لئے کیا تھا۔" صابرہ بولی۔

"سیماں کی وجہ سے نیلم کی یاد نے شدت اختیار کر لی اسی لئے وہ چلا گیا۔"

"اب کیا ہوگا۔" صابرہ نے گھبرا کر کہا۔

"مجھے کیا معلوم۔" بابر لاتعلقی سے بولا۔

"آپ نے اسے مری جانے کی اجازت کیوں دی۔" صابرہ الجھ پڑی۔

"میں اگر اسے اجازت نہ دیتا تو بھی وہ چلا جاتا۔"

"ایسا کریں آپ خود مری چلے جائیں وہ جانے کہاں بھٹک رہا ہوگا۔" صابرہ نے تشویش سے کہا۔

صابرہ ماں تھی، اکبر اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی تشویش بجا تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا لختِ جگر اس طرح مارا مارا پھرے۔ وہ سیماں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ اس نے سیماں کو غیبی امداد جانا تھا اسے قوی امید تھی کہ اکبر، سیماں کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ پھر آگے شادی کی بات چلائی جائے گی لیکن اکبر بھی خوب چیز تھا اس نے سیماں کو نظر بھر کر بھی نہ دیکھا اور جوں جوں سیماں اس کی طرف بڑھتی چلی گئی توں توں وہ نیلم کے قریب ہوتا گیا۔

نیلم اسے شدت سے یاد آنے لگی وہ اسے دیکھنے کے لئے تڑپ اٹھا۔

ضرغام اور داداغفور سے جو معلومات نیلم کے بارے میں ملی تھی اس کے مطابق نیلم درختوں سے گھرے ایک مکان میں تھی اور یہ کوئی پہاڑی علاقہ تھا۔

اگرچہ یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی تھی کہ نیلم کس پہاڑی مقام پر ہے۔ یہ گھر پاکستان کے کسی بھی پہاڑی مقام پر ہو سکتا تھا لیکن قیاس یہ کہتا تھا کہ یہ مکان مری میں ہے۔

ماموں فرقان سے جب اکبر نے اس معاملے پر بات کی تو انہوں نے بھی یہی اندازہ لگایا کہ نیلم مری میں ہو سکتی ہے اس قیام کی اگرچہ کوئی ٹھوس بنیاد نہ تھی محض ایک خیال تھا اور یہ خیال بار بار ذہن میں اس لئے آتا تھا کہ نیلم آخری بار مری میں دیکھی گئی تھی۔

اکبر نے اس مسئلے پر زیادہ نہ سوچا اس نے اللہ کا نام لیا اور مری کی طرف پرواز کر گیا۔

مری پہنچ کر اس نے ایک اچھے ہوٹل کا انتخاب کیا اور سامان رکھ کر باہر نکل آیا۔ اس کے پاس سامان ہی کیا تھا ایک سفری بیگ تھا جس میں چند جوڑوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

پہلے دن اس نے کچھ نہ کیا صرف مری کی اکلوتی سڑک پر ادھر سے ادھر گھومتا رہا۔ وہ ایک ایک لڑکی کا چہرہ غور سے دیکھتا اور آگے بڑھ جاتا۔ اس نے ہوٹلوں کے چکر بھی لگائے لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی اس کا خیال تھا کہ شاید اس طرح کہیں نیلم دکھائی دے جائے۔

رات کو تھک ہار کر وہ اپنے ہوٹل لوٹ آیا۔ ہوٹل سے اس نے کراچی باہر کو فون کیا۔ اپنے خیریت سے مری پہنچنے کی اطلاع دی اور جس ہوٹل میں ٹھہرا تھا اس کا نام اور کمرہ وغیرہ بتایا پھر دن بھر کی کارگزاری بیان کی اور دوبارہ فون کرنے کا وعدہ کر کے ریسیور رکھ دیا۔

کمرے کی لائٹ بجھا کر وہ بیڈ پر لیٹا تو اسے بستر کانٹوں بھرا محسوس ہوا۔

وہ سونے کی کوشش میں کروٹیں بدلنے لگا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی پھر اس نے اٹھ کر لائٹ جلا دی اور کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

ٹہلتے ٹہلتے اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو شیشے کی کھڑکی میں سے چاند نے اپنا چہرہ دکھایا پورا چاند تھا۔ ایک سحر انگیز منظر تھا۔ وہ کھڑکی کھول کر چاند کو تکنے لگا۔

چاند کو دیکھتے دیکھتے ایسے ہی اس کے دل میں خیال آیا کہ کیا پتہ نیلم بھی اس وقت چاند کو دیکھ رہی ہو۔ کاش کوئی ایسا ذریعہ بن جائے کہ وہ نیلم تک پہنچ سکے۔

اکبر کا خیال سو فیصد درست تھا۔

نیلم واقعی کھڑکی میں کھڑی چاند کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ چاند اور چاندنی سے نیلم کو ہمیشہ سے دلچسپی تھی۔ چاندنی اس پر سحر پھونک دیتی تھی۔ اس کے جسم کے سمندر میں چاندنی راتوں میں جوار بھاٹا سا آجاتا تھا۔

لاہور میں وہ چاندنی راتوں میں دیر تک ٹہلا کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ کھڑکی میں کھڑی یہی سوچ رہی تھی۔ اس کو لاہور یاد آرہا تھا پھر لاہور سے اس کا ذہن شادی اور کراچی کی طرف منتقل ہو گیا۔ کراچی شہر یاد آیا تو اکبر کا چہرہ ابھرا۔

وہ چاند میں اس کا چہرہ تلاش کرنے لگی اور چاند دیکھتے دیکھتے اتنی محو ہو گئی کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ قرل اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا ہے۔

سید پور کے جن نے جب اپنا جلتا ہوا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا تو وہ یکدم چونک اٹھی۔

"اوہ، میں نے محویت توڑ دی، چاند میں ڈوبی ہوئی لگتیں شاید۔" وہ ہنسا۔

نیلم نے کوئی جواب نہ دیا وہ خاموشی سے واپس پلٹی اور بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

"میرا یہ مطلب تو نہ تھا۔" سید پور کا جن بولا۔

"کافی دیر سے کھڑی تھی کھڑے کھڑے تھک گئی میں۔" نیلم نے وضاحت کی۔

"کھڑے کھڑے تھک گئیں یا میرا کھڑکی کے قریب آنا پسند نہ آیا۔" قرل نے طنز کیا۔

"میں کھڑکی میں کھڑی اکبر سے تو بات نہیں کر رہی تھی۔" نیلم نے طنز کا جواب طنز میں دیا۔

"چاند کو تو دیکھ رہی تھیں" قرل نے سوال کیا۔

"ہاں دیکھ رہی تھی۔"

"کیا پتہ چاند میں محبوب کی شکل دکھائی دے رہی ہو۔" سید پور کے جن نے تیر چلایا۔

"کاش ایسا ہوتا۔" نیلم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تمہاری تو چاہتا ہو گا۔ اکبر کسی طرح یہاں پہنچ جائے۔"

"کاش وہ پہنچ سکتا۔" نیلم ضد پر اتر آئی۔

"خیر اس کا یہاں پہنچنا تو اتنا مشکل نہیں لیکن وہ یہاں پہنچ کر کرے گا کیا؟"

"وہ مجھے یہاں سے اپنے ساتھ لے جائے گا۔" نیلم نے اسے جلایا۔

"وہ۔" یہ کہہ کر سید پور کے جن نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"وہ تمہیں کہاں لے جائے گا۔ میرے سامنے وہ کل کا لونڈا ہے تمہیں لے جانے کے بجائے کہیں خود نہ پھنس جائے۔"

"تم اس کا کیا بگاڑ لو گے۔" نیلم غصے میں آ گئی۔

"یہ تو آنے والا وقت بتائے گا ابھی سے کیا کہوں۔" سید پور کے جن نے ہنس کر کہا۔

"اتنا تکبر نہ کرو۔ مت بھولو کہ کبھی کبھی چیونٹی بھی ہاتھی کو مار گراتی ہے۔ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ تمہاری بھی کوئی کمزوری ہو گی۔"

"یہ تم نے ٹھیک کہا واقعی میری ایک کمزوری ہے۔" "وہ کیا" نیلم نے چونک کر پوچھا۔

"تم میری کمزوری ہو۔" سید پور کے جن نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ "اور تمہاری وجہ ہی سے میں نے اکبر کو برداشت کیا ہے ورنہ کب کا میں اسے اپنے راستے سے ہٹا چکا ہوتا۔"

"تم اسے کیا راستے سے ہٹاؤ گے۔ ایک دن وہ ضرور تمہیں راستے سے ہٹا دے گا۔" نیلم بھی جذباتی ہو گئی۔

"تمہارا یہ خواب قیامت تک پورا نہ ہو گا۔"

"یہ خواب نہیں ہے قرل۔ میرے دل کی آواز ہے۔ ظلم جب بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں..... اگر قسمت میں فنا لکھا ہے تو مٹ جاؤں گا۔ تمہارے لئے مٹ جاؤں گا نیلم۔" سید پور کے جن نے اس کا ہاتھ چھو کر کہا۔ "اور مٹ کر اپنی خوش نصیبی پر ناز کروں گا۔"

"بہت محبت ہے مجھ سے۔" نیلم نے متاثر ہوئے بغیر پوچھا۔ "ہاں، بہت۔" وہ بولا۔

"سچی محبت ہے۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں بادل سے برستی بارش کی طرح سچی۔" قرل نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"میرا کہا مانو گے۔" نیلم نے سوال کیا۔

"ہاں ایک بات کے سوا جو کہو گی کر گزروں گا، کر کے دکھا دوں گا۔" وہ بولا۔

"پھر تو یہ محبت نہ ہوئی خود غرضی ہوئی۔"

"اب تم جو بھی سمجھو۔ جو بھی کہو میں تم سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"آخر کب تک قید رکھو گے مجھے۔ قتل۔"

"تا قیامت۔" سید پور کے جن نے مسکرا کر کہا اور پھر پہنچے پہنچے ہاتھ لمبا کر کے لائٹ بجھا دی۔

ادھر سید پور کے جن نے لائٹ بجھائی ادھر اکبر نے اپنے کمرے کی لائٹ بجھائی اور بیڈ پر لیٹ کر کروٹیں بدلنے لگا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے جانے کس وقت اس کی آنکھوں میں نیند کی دیوی اتر آئی۔

سوتے سوتے اس نے ایک بھیانک خواب دیکھا۔

اس نے نیلم کو شعلوں میں گھرا دیکھا۔ نیلم کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی ہے اور وہ آگ آگ پکارتی ادھر اُدھر بھاگ رہی ہے۔

دریا کا کنارا ہے۔ نیلم ادھر ہے۔ اکبر ادھر ہے۔ دریا میں خطرناک جانور تیر رہے ہیں۔

"اکبر مجھے بچاؤ۔ اکبر مجھے بچاؤ۔"

نیلم کی دلخراش چیخیں اسے سنائی دیتی ہیں تو وہ خونخوار جانوروں کی پروا کیے بغیر دریا میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔

"میں آرہا ہوں۔ نیلم۔" وہ زور سے چیختا ہے۔

وہ جیسے ہی دریا میں چھلانگ لگاتا ہے وہ پانی میں گرنے کے بجائے ریت پر گرتا ہے۔ دریا اچانک خشک ہو جاتا ہے۔ وہ دوسرے کنارے پر نیلم کو دیکھتا ہے اب وہ اسے نہیں دکھائی دیتی۔

تب وہ گھبرا کر "نیلم نیلم۔" پکارتا ہے۔

پھر اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

کمرے میں اندھیرا ہوتا ہے اور اس کے چہرے پر چادر پڑی ہوتی ہے وہ فوراً بیڈ پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہوتے ہیں اور دل تیزی سے دھڑک رہا ہوتا ہے۔

وہ اٹھ کر پانی پیتا ہے۔

پھر اسے نیند نہیں آتی۔ رات کا باقیہ حصہ وہ آنکھوں میں کاٹ دیتا ہے۔

صبح نماد ھو کر ناشتہ کیا اور ہوٹل سے نکل گیا اس نے بازار کا ایک چکر لگایا۔ پھر اس نے درختوں سے بھرے مکان کی تلاش شروع کر دی۔

دوپہر تک وہ ایک ایسے مکان کی تلاش میں سرگرداں رہا جو درختوں سے گھرا ہوا اور دور تک اس کے آس پاس کوئی مکان نہ ہو۔

ایسے کئی مکان اس نے دیکھے۔ کئی بنگلوں کے دروازے بھی اس نے کھٹکھٹائے مگر مایوسی ہوئی۔

دوپہر کو واپس ہوٹل آگیا اس نے کھانا کھایا۔ تھکا ہوا تھا کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹا تو نیند آگئی۔

سہ پہر کو اٹھا چائے پی پھر بازار کا ایک چکر لگایا۔

اس کے بعد اس نے اس مرتبہ مخالف سمت کا رخ کیا۔ اس نے ادھر کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

درختوں سے گھرے اس مکان کی تلاش میں اسے شام ہو گئی۔ اندھیرا ہونے سے پہلے وہ اپنے ہوٹل

لوٹ آیا ابھی وہ بیڈ پر لیٹا آرام ہی کر رہا تھا کہ کراچی سے کال آگئی۔
پہلے بابر نے بات کی۔ اس نے نیلم کے بارے میں پوچھا اکبر نے جہاں جہاں اسے تلاش کیا تھا بتایا پھر صابرہ نے فون لے لیا اس نے اکبر کو قسمیں دیں کہ وہ فوراً کراچی واپس آجائے صابرہ کو اس کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی وہ اس کی طرف سے بہت پریشان تھی، فکر مند تھی۔
اکبر نے اپنی ماں کو تسلی دی اور بتایا کہ وہ فکر نہ کرے میں یہاں بالکل خیریت سے ہوں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بہت جلد کراچی لوٹ آؤں گا۔
دوسرے دن اس نے پھر نیلم کی تلاش شروع کر دی۔
اور وہ جو کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔
سچ کہتے ہیں حرکت میں برکت ہوتی ہے۔ سفر کرنے سے منزل قریب ہوتی ہے۔
ڈھونڈتے ڈھونڈتے بالآخر وہ ایک ایسے مکان کے پاس پہنچ گیا جو درختوں سے گھرا ہوا تھا اونچائی پر تھا اور اس کے آس پاس دور تک کوئی مکان نہ تھا۔
اس چھوٹے سے خوبصورت مکان کو دیکھ کر اکبر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔
اگرچہ اس بات کی کوئی گارنٹی نہ تھی کہ یہ وہی مکان ہے جہاں نیلم قید ہے کیونکہ ایسے تنہا مکان وہ کئی دریافت کر چکا تھا۔ ان کے دروازے کھنگھٹا چکا تھا۔ ان مکانوں کے دروازوں سے نیلم برآمد نہ ہوئی تھی لیکن اس مکان کو دیکھ کر اکبر کا دل جانے کیوں بلیوں اچھلنے لگا تھا۔
یہ مکان نیچے سڑک سے بالکل نظر نہ آتا تھا ایک دم الگ تھلگ تھا اور اس طرح درختوں میں چھپا ہوا تھا جیسے بادلوں میں چاند۔
اس وقت دن کے بارہ بج رہے تھے۔
نیلم مکان کے اندر اپنے بیڈ پر اداس لیٹی تھی۔ سید پور کا جن اس وقت کمرے میں نہ تھا پھر اچانک وہ تیزی سے شناسے کے روپ میں کمرے میں داخل ہوا اور نیلم کے نزدیک بیڈ پر بیٹھ گیا نیلم فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"اب کیا ہے؟" نیلم نے بیزاری سے کہا وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس کے کمرے سے گیا تھا۔
"وہ آگیا ہے۔" سید پور کے جن نے اطلاع دی۔
"کون؟" نیلم نے پوچھا۔
"جسے تم ہر وقت یاد کرتی رہتی ہو۔" سید پور کے جن نے وضاحت کی۔
"اکبر، میرا اکبر۔" نیلم نے خوش ہو کر کہا وہ فوراً کھڑی ہو گئی اور بولی۔ "کہاں ہے وہ؟"
"باہر کھڑا ہے؟" قرل نے بتایا۔
"قرل تمہیں میری قسم ہے تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔" نیلم نے سید پور کے جن کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"اگر تم چاہتی ہو کہ وہ زندہ سلامت چلا جائے تو اس سے کہو وہ یہاں سے فوراً واپس چلا جائے۔"
"کیا میں اس سے مل سکتی ہوں۔" نیلم نے پوچھا بلکہ التجا کی۔

"ہاں مل سکتی ہو، لیکن آخری بار آج کے بعد سے تم کبھی اکبر سے نہیں مل سکو گی۔ یہ یاد رکھنا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" نیلم نے بڑی اداسی سے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

ابھی وہ دروازے کے نزدیک ہی پہنچی تھی کہ دستک کی آواز سنائی دی۔

نیلم نے دروازہ کھولے بغیر پوچھا۔ "کون ہے؟"

اکبر نے فوراً نیلم کی آواز پہچان لی وہ بے قرار ہو کر بولا۔ "میں ہوں اکبر، نیلم دروازہ کھولو۔"

تب نیلم نے دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کیا کھلا گویا مقدر کھل گیا۔ نیلم کو دیکھ کر اکبر کا دل دھڑکنا بھول گیا۔

وہ بانہیں پھیلا کر نیلم کی طرف بڑھا۔ "میری نیلم۔"

نیلم اس کی بانہوں میں جانے کا انجام جانتی تھی وہ اس طرح پیچھے ہٹی جیسے وہ اکبر نہ ہو سیدپور کا جن ہو۔

"اکبر تم یہاں کیوں آئے ہو؟" نیلم نے بڑے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

اکبر کی پھیلی ہوئیں بانہیں پھیلی رہ گئیں۔ اس کے ہونٹوں کی ہنسی پھیکی پڑ گئی۔ نیلم کے سرد رویے نے اسے اندر ہی اندر بڑی تکلیف پہنچائی اس کا خیال تھا کہ جیسے ہی نیلم اسے دیکھے گی سب کچھ بھول کر اس کے قریب آجائے گی۔

نیلم اسے دیکھ کر ایسا ضرور کرتی لیکن وہ سیدپور کے جن سے اچھی طرح واقف تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اکبر کو کسی قسم کا نقصان پہنچ جائے۔ اسے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ اکبر، سیدپور کے جن کی قید سے اسے آزاد نہیں کرا سکے گا۔ وہ اس کی محبت میں یہاں تک آگیا تھا۔ اتنا بہت تھا۔ نیلم اپنی محبت کو کسی قیمت پر نقصان پہنچے دینا نہیں چاہتی تھی۔

اسی لئے وہ اس کے ساتھ بے رخی سے پیش آئی تھی اس سے سرد رویہ روا رکھا تھا۔

"نیلم میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ چلو، دیکھو نیلم میں تمہیں نہیں بھولا ہوں۔ تم نے لکھا تھا کہ میری ہو، تم اگر میری ہو تو اب میرے ساتھ چلو۔"

اکبر کی یہ بات سن کر نیلم کا کلیجہ ہل گیا اس کا بے اختیار جی چاہا کہ وہ اکبر کا ہاتھ پکڑے اور کہے ٹھیک ہے اکبر، چلو میں واقعی تمہاری ہوں۔

لیکن ایسا وہ صرف سوچ سکتی تھی کر نہیں سکتی تھی اور جو وہ کر سکتی تھی وہ اس نے کر دیا۔

اس نے اپنے محبوب کو بچا لیا۔ اس نے اپنے شوہر کو بچا لیا۔ اس نے اکبر کو اپنی قسم دے کر واپس لوٹا دیا۔ اکبر واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ مرنے مارنے پر تلا ہوا تھا لیکن نیلم جانتی تھی کہ قرل اور اکبر کا کوئی مقابلہ نہیں۔ اکبر اس کے سامنے چیونٹی کی طرح تھا جسے وہ اپنی ایک چٹکی میں مسل سکتا تھا۔

اس نے اکبر کو سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔

اکبر اس گھر سے مایوس ہو کر لوٹ آیا۔ پھر اس نے ہوٹل سے اپنا بیگ اٹھایا اور واپس کراچی کیلئے چل پڑا۔

اکبر بچہ نہ تھا، بے وقوف نہ تھا، وہ ساری باتیں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اسے یہ بات اچھی معلوم تھی کہ نیلم نے اس کے ساتھ سرد رویہ کیوں رکھا، کیوں قسمیں دے کر اسے یہاں سے جانے کو کہا۔ وہ جانتا تھا کہ سید پور کے جن سے ٹکر لینا آسان نہ تھا۔ بڑے بڑے لوگ اس سے شکست کھا کر میدان چھوڑ گئے تھے۔ وہ بیچارہ کس کھیت کی مولی تھا۔

اکبر کے لئے یہ خوشی کیا کم تھی کہ اس نے کئی ماہ بعد نیلم کا چہرہ دیکھ لیا تھا، اس نے وہ مکان دیکھ لیا تھا جہاں نیلم قید تھی۔ وہ کراچی جا کر نیلم کی رہائی کیلئے کچھ کر سکتا تھا۔

کراچی ایئر پورٹ پر جب وہ گاڑی سے باہر آیا تو ایک قلی نے لپک کر اس کے ہاتھ سے بیگ لینا چاہا، اکبر نے اپنے بیگ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔

تب اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

اکبر نے بڑی حیرت سے کہا۔ "نیاز بابا آپ۔"

نیاز محمد اس کے سامنے کھڑا تھا..... اور جس حالت میں وہ اس کے سامنے کھڑا تھا وہ اکبر کو حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی تھا۔

وہ لال قمیض پہنے تھا، وہ قلی بنا ہوا تھا۔

"بابا، یہ سب کیا ہے، آپ..... آپ....."

"میں قلی کیوں بنا ہوا ہوں، یہ پوچھنا چاہتے ہو۔" نیاز محمد نے سوال کیا۔

"جی، میں یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ میں سزا کاٹ رہا ہوں، بس کچھ دن اور رہ گئے ہیں۔" نیاز محمد بولا۔

"سزا؟" اکبر اور حیران ہوا۔ "کس بات کی سزا؟"

"سید پور کے جن سے شکست کھانے کی سزا۔" نیاز محمد نے مغموم لہجے میں کہا۔

"یہ سزا آپ کو کس نے دی؟" اکبر نے پوچھا۔

"میرے مرشد..... اللی والے بابا نے۔" نیاز محمد نے بڑی عقیدت سے کہا۔

"اوہ۔" اکبر کو یاد آیا جب وہ ماموں فرقان کے ساتھ اللی والے بابا سے ملنے گیا تھا تو انہوں نے سزا کا ذکر کیا تھا..... اس وقت وہ لوگ خوف کے مارے نیاز محمد کے بارے میں کوئی سوال نہیں کر سکے تھے۔ ماموں فرقان کا تو جی بھی چاہا تھا کہ وہ اللی والے بابا سے پوچھیں، نیاز محمد کو آپ نے کیا سزا دی لیکن پھر انہوں نے مداخلت بیجا سمجھ کر سوال نہ کیا۔

"یہ کس قسم کی سزا ہے؟" اکبر، نیاز محمد سے سوال کر سکتا تھا، اس نے سوال کیا۔

"جب میں شکست کھا کر اپنے مرشد کے سامنے پہنچا تو وہ جلال میں آ گئے۔ انہوں نے مجھ سے میری

قوت پرواز چھین لی اور حکم دیا جا مسافروں کے سامان اٹھا ..... بس تبھی سے میں قلی بنا ہوا ہوں
میں سامان اٹھانے کے پیسے بھی نہیں لے سکتا لہٰذا سامان میں اٹھاتا ہوں اور پیسے ایک بوڑھے قلی
کو دلوا دیتا ہوں ..... یہ قیض بھی اسی کی ہے۔ "

"بابا میں کیا کروں؟" اکبر نے بڑے مایوس لہجے میں کہا۔

"کیوں کیا ہوا ..... آؤ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" نیاز محمد فکر مند ہو گیا۔

اکبر اور نیاز محمد اسٹیشن سے باہر نکل آئے اور ایک چائے کے ہوٹل میں جا بیٹھے۔

"اکبر، ہم تو اندھے ہو گئے ہیں، ہمیں سب کچھ دکھائی دیتے ہوئے بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا اصل میں اندر کی آنکھ کا کچھ اور ہی مزہ ہے ..... ایک بار کھل کر بند ہو جائے تو اس اذیت کا تم اندازہ نہیں کر سکتے ..... اب تم خود ہی بتاؤ کہ کہاں سے آ رہے ہو؟ میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جان سکتا۔"

"مری سے ....." اکبر نے فوراً بتایا۔

"گھومنے گئے تھے۔" نیاز محمد نے سوال کیا۔

"نہیں بابا، وہ سید پور کا جن، نیلم کو یہاں سے لے اڑا ہے ..... وہ آج کل مری میں ہے۔" یہ کہہ کر اکبر نے ساری داستان تفصیل سے نیاز محمد کو سنا دی۔

نیاز محمد نے ساری داستان سن کر ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس قدر خبیث ہے ..... مجھے اگر معلوم ہوتا کہ اس قدر چالاک اور اس قدر ذلیل جن ہے تو اسے ذرا بھی موقع نہ دیتا ..... جلا کر راکھ کر دیتا۔"

"پر بابا، اب کیا ہو؟" اکبر نے اداس لہجے میں کہا۔ "آپ سے ملاقات ہونے کے بعد امید بندھ گئی تھی کہ اس کمینے سے نجات مل جائے گی لیکن مقابلہ ہارنے کے بعد آپ ایسے غائب ہوئے کہ آج نظر آئے ہیں ..... پھر الٰہی والے بابا سے توقع تھی کہ وہ ضرور کچھ کریں گے لیکن انہوں نے غفور داد کی طرف بھیج دیا اور خود غائب ہو گئے اب تو بیچارے غفور داد بھی نہ رہے ..... ماموں فرقان کے بس کا معاملہ نہیں ..... اب میں کروں تو کیا کروں ..... جاؤں تو کہاں جاؤں ..... اس سرزمین پر کوئی ایسا انسان نہیں جو اس خبیث جن کو قابو میں کرے اور میری نیلم مجھے دلوا دے۔"

"ہاں، ہے کیوں نہیں، ایسا انسان۔" نیاز محمد نے بڑے یقین سے کہا۔

"کہاں ہے وہ ..... کون ہے وہ۔"

"تم تو اچھی طرح جانتے ہو انہیں۔"

"نام بتائیں۔" اکبر نے بے قراری سے پوچھا۔

"میرے مرشد ..... الٰہی والے بابا۔"

"وہ ہیں کہاں؟ الٰہی کے نیچے تو بندر بیٹھے ہیں اور وہ خود غائب ہیں۔"

"مجھے اپنے مرشد کا پیغام ملا ہے، اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔"

"پیغام..... کیا پیغام۔" اکبر نے پوچھا۔

"ایک تو میری سزا سے متعلق ہے..... میری سزا جلد ختم ہونے والی ہے۔"

"اور دوسرا۔" اکبر نے سوال کیا۔

"دوسرا تم سے متعلق ہے۔" نیاز محمد نے بتایا۔

"وہ کیا؟" اکبر نے پوچھا۔

"املی والے بابا..... خود تمہارے گھر پہنچیں گے ان کا چلّہ مکمل ہونے والا ہے اور یہ چلّہ انہوں نے صرف سید پور کے جن کے لئے کاٹا ہے..... بس اکبر اب تم خوش ہو جاؤ..... تمہاری زندگی میں بہار آنے والی ہے۔"

یہ نیاز محمد بھی عجیب آدمی ہے..... اکبر نے سوچا..... پہلی مرتبہ وہ اسے کلفٹن پر ملا تھا اس وقت اکبر پر شدید مایوسی طاری تھی اور وہ دیوار پر ہیٹھا رو رہا تھا کہ نیاز محمد نے آکر اس کے دل میں خوشی کی جوت جگادی تھی..... اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا..... وہ مری سے شدید مایوسی کے عالم میں لوٹا تھا کہ پلیٹ فارم پر نیاز محمد مل گیا تھا اور پھر اسے نوید مسرت دے رہا تھا..... اس کے دل سے مایوسی کے بادل ہٹا رہا تھا..... وہ اندھیرے میں جگنو بن کر چمکا تھا..... نیاز محمد اس کے لئے خوش بختی کی علامت بن گیا تھا۔

"جاؤ، اب تم گھر جاؤ اور ہمارا انتظار کرو۔" نیاز محمد نے کہا۔

"کیا املی والے بابا کے ساتھ آپ بھی آئیں گے۔" اکبر نے پوچھا۔

"اگر مرشد نے میری قوت پرواز بحال کر دی اور مجھے میری آنکھیں لوٹا دیں تو پھر میں ضرور ان کے ساتھ آؤں گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو جیسا آپ چاہتے ہیں..... اچھا اب میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر اکبر کھڑا ہو گیا۔

جب وہ اپنے گھر پہنچا تو اس کے چہرے پر شادابی تھی۔

اور کیوں نہ ہوتی..... نیاز محمد نے اسے ایسی نوید دی تھی کہ اس کے دل میں انار چھوٹنے لگے تھے۔ ایک مرتبہ وہ پھر خوابوں کی دنیا میں چلا گیا تھا۔

وہ نیلم کو اپنے نزدیک تر دیکھ رہا تھا..... معطر باد صبا چلتی تھی..... کلیاں چٹک رہی تھیں..... پھول مہک رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں رنگین خواب بسے ہوئے تھے۔

کبھی کبھی وہ چونک جاتا تھا..... ڈر جاتا تھا..... سہم جاتا تھا..... اس نے نیلم کے سلسلے میں اتنے فریب کھائے تھے..... اتنی اذیتیں اٹھائی تھیں وہ یہ سوچ کر دہل جاتا تھا کہ وہ پھر سے کہیں فریب نہ کھا رہا ہو۔

لیکن اس مرتبہ کوئی فریب نہ تھا، شاید سچی خوشیاں اسے ملنے والی تھیں۔

اس نے اپنے گھر والوں اور ماموں فرقان کو مری کا حال سنا دیا تھا اور اسٹیشن پر قلی کی صورت میں ملنے والے نیاز محمد سے ملاقات کا ذکر بھی کر دیا تھا۔

اس ڈر پر سب کا دل خوش ہونے کو چاہا مگر جانے کیوں ہر شخص نے خوشی کا اظہار کرنے سے احتراز کیا اس لئے کہ خوشیاں انہیں راس نہیں آتی تھیں کام بنتے بنتے بگڑ جاتا تھا۔

آنے والے وقت کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا جانے کیا ہو اس لئے عمل از وقت خوش ہونے سے ان لوگوں نے پرہیز کیا البتہ اچھے دن آنے کی دعا ضرور مانگی۔

نیاز محمد نے اہلی والے بابا کے بارے میں کوئی حتمی خبر نہیں دی تھی کہ وہ کب آئیں گے شاید یہ بات اسے خود بھی معلوم نہیں تھی وہ بیچارہ تو معتوب تھا اہلی والے بابا کا اتنا پیغام ہی مل گیا تھا یہ اس کے لئے بہت تھا۔

اور نیاز محمد نے اہلی والے بابا کے بارے میں اکبر کو بتا دیا تھا کہ وہ گھر پہنچیں گے یہ پیغام اس کی زندگی میں جان ڈال دینے کے لئے کافی تھا ..... اس لئے پیغام لانے والے سے نیاز محمد نے سوال کیا اور نہ اکبر نے نیاز محمد سے دونوں اپنی جگہ انتظار کر رہے تھے۔

پھر وہ انتظار ختم ہوا۔

ایک دن صبح ہی گھنٹی بجی، خیال ہوا کہ دودھ والا آیا ہے ..... راشدہ نے گیٹ کھول کر دودھ کی دیگچی آگے بڑھانا چاہی لیکن پھر وہ فوراً ہی جھجھک کر پیچھے ہٹ گئی اور گیٹ بند کر کے اندر سے بولی۔

"جی آپ کون ہیں؟"

"بیٹا میں نیاز محمد ہوں، اکبر کو اٹھا کر باہر بھیجو۔"

نیاز محمد کا نام سن کر راشدہ چونکی اور پھر "اچھا" کہہ کر تیزی سے گھر کے اندر آئی۔

اکبر کے کمرے میں پہنچ کر اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ "اکبر بھائی، اکبر بھائی اٹھیں۔"

"بھئی کیا مصیبت آگئی۔" وہ جھنجلا گیا۔

"مصیبت نہیں خوشی آئی ہے۔" راشدہ نے مسکرا کر کہا۔

"خوشی آئی ہے؟" اکبر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، وہ اٹھ کر آنکھیں ملنے لگا۔

"باہر نیاز بابا آگئے ہیں..... جلدی جایئے وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔" راشدہ نے جلدی جلدی بتایا۔

نیاز محمد کا نام سن کر گویا اس میں اسپرنگ لگ گئے وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا..... اور بھاگتا ہوا گیٹ تک پہنچا ..... گیٹ کھول کر دیکھا تو سامنے نیاز محمد کھڑا تھا..... مسکراتا ہوا نیاز محمد۔

"نیاز بابا آپ کیسے ہیں..... آپ اندر آجائیں۔" اکبر نے اس کے لئے راستہ چھوڑا۔

نیاز محمد چھوٹے گیٹ سے اندر آگیا۔ اندر آیا تو اسے سید پور کے جن سے اپنا مقابلہ یاد آگیا ایک لمحے میں کئی رنگ اس کے چہرے پر آکر گزر گئے۔

"بابا آپ کی سزا کا کیا ہوا؟"

"سزا ختم ہو گئی اور میرا قلب بھی مجھے واپس مل گیا۔" نیاز محمد نے اپنی زبان میں بات کی۔

"اٹلی والے بابا کہاں ہیں۔ وہ نہیں آئے؟" اکبر کو تشویش ہوئی۔

"وہ آنے والے ہیں۔ انہوں نے پہلے مجھے بھیج دیا ہے۔ تاکہ جہاز جہاز کو سلام کروں۔"

"لیکن یہاں تو کوئی جہاز جہاز نہیں ہے۔ سلام تھرمامیٹر ہے۔"

"یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔" نیاز محمد نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ پھر وہ لان میں داخل ہو گیا اور لان کے بیچوں بیچ اس جگہ جا کر رک گیا جہاں اس نے سید پور کے جن کا مقابلہ کرتے ہوئے رسد سمجھا تھا۔ پھر وہ اس جگہ سے ہوتے اتار کر دفنہ گیا۔ اس کا منہ شمال کی طرف تھا۔

"میرے لئے کیا حکم ہے؟" اکبر نے پوچھا۔

"بس تم گھر میں جا کر آرام کرو۔" نیاز محمد نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

"آپ ناشتہ وغیرہ نہیں کریں گے۔"

"نہیں۔ اکبر میں مرشد کے آنے سے پہلے اپنا کام مکمل کر لینا چاہتا ہوں۔ وہ اس گھر میں تین دن تک رہیں گے۔ ان تین دنوں میں نیلم کسی بھی وقت آزاد ہو کر آ جائے گی یا یوں سمجھ لو کہ وہ خبیث نیلم کو یہاں لانے پر مجبور ہو گا۔"

"کیا آپ نے اٹلی والے بابا کو بتا دیا کہ اس وقت نیلم کہاں ہے۔"

"مجھے انہیں کچھ بتانے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ وہ بڑا آدمی ہیں ان کی نظر دور تک دیکھتی ہے وہ چاہیں تو سیاروں پر بھی نظر ڈال سکتے ہیں۔ خیر تو میں تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ نیلم کے گھر میں آنے کے بعد تم لوگوں کو یہ گھر خالی کرنا پڑے گا یہاں بس میں اور مرشد رہیں گے دیکھو ایک بات اور تمہیں سمجھا دوں جب مرشد یہاں آ جائیں تو ان سے سوالات مت کرنا۔ یہ بات اپنے گھر والوں کو بھی بتا دینا انہیں کچھ معلوم کرنا ہو گا تو وہ خود سوال کریں گے ..... سوال کرنا انہیں پسند نہیں ہے وہ خاموش طبع آدمی ہیں اسی لئے دنیا سے چھپے بیٹھے ہیں ..... اب تم گھر میں جاؤ اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔"

"نیاز بابا کیا میں گیٹ کھول دوں۔"

"وہ کس لئے۔" نیاز محمد نے پوچھا۔

"اٹلی والے بابا آئیں گے تو انہیں گھنٹی بجانا پڑے گی، پھر گیٹ کھولنے تک انہیں انتظار کی زحمت اٹھانا پڑے گی۔" اکبر بولا۔

"میرے مرشد نے کبھی انتظار نہیں کیا۔" نیاز محمد نے بے نیازی سے کہا۔ "اور بند دروازے ان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے ..... ویسے تم چاہو تو گیٹ کھول دو۔"

اکبر نے گھر کا پورا گیٹ کھول دیا ..... اور گھر میں داخل ہو کر گھر کا دروازہ بند کر لیا۔

گھر کا دروازہ بند ہوتے ہی نیاز محمد اٹھا پھر وہ کچھ پڑھتا ہوا سات قدم آگے چلا پھر رک گیا۔ آسمان کی طرف منہ کر کے اس نے ایک پھونک ماری کچھ تو قف کیا اور پھر کچھ پڑھتا ہوا دائیں جانب چلا سات قدم چلنے کے بعد رکا آسمان کی طرف منہ اٹھا کر پھونک ماری چند لمحے رکا اس کے بعد پھر دائیں جانب سات قدم

چلا اس طرح وہ ایک مربع کی شکل بناتا وہیں پہنچ گیا جہاں سے چلا تھا۔
ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے لان صاف نظر آتا تھا۔ اکبر نے جب بھی جھانک کر دیکھا نیاز محمد اسے چلتا ہوا، پڑھتا ہوا، پھونک مارتا ہوا نظر آیا۔
اکبر نے نیاز محمد کے آتے ہی ماموں فرقان کو فوراً فون کر دیا۔ وہ بھی بس پہنچنے ہی والے تھے۔
نیاز محمد کے یہاں پہنچنے کے ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد ماموں فرقان آگئے وہ اپنے گھر والوں کو بتا آئے تھے کہ اب وہ تین چار دن تک اکبر کے گھر پر ہی رہیں گے۔
ماموں فرقان کھلے گیٹ میں داخل ہوئے تو انہوں نے دور ہی سے نیاز محمد کو عمل کرتے دیکھ لیا تھا لہٰذا وہ اس کی طرف نہیں گئے وہ سیدھے گھر میں گئے۔
گھر میں لوگوں کی عجیب حالت تھی۔ صابرہ خاص طور سے پریشان تھی وہ جن کی ستائی ہوئی تھی لہٰذا اب وہ بہت ڈرنے لگی تھی۔ ماموں فرقان کا چہرہ دیکھ کر گھر والوں کی کچھ ڈھارس بندھی۔ ماموں فرقان نے پہلے اکبر کو علیحدہ لے جا کر اس سے بات کی اس نے نیاز محمد سے جو گفتگو ہوئی تھی وہ من و عن دُہرا دی تب ماموں فرقان نے گھر والوں کو تسلی دی اور کہا۔
"بھئی اس طرح پریشان ہو کر میز کے گرد بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ ایک لمبا عمل ہے دو تین دن میں کچھ ظاہر ہو گا تم لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاؤ۔ یہ بات ذہن میں لاؤ ہی مت کہ باہر کچھ ہو رہا ہے۔"
ماموں فرقان کے کہنے پر، سمجھانے اور تسلی دینے پر ان لوگوں کی پریشانی کچھ کم ہوئی تب صابرہ اور راشدہ کچن میں گئیں اور ناشتے کا بندوبست کرنے لگیں۔
بابر نے اخبار اٹھایا..... اکبر باتھ روم میں نہانے گھس گیا اور فرقان ماموں ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے نیاز محمد کو دیکھنے لگے۔
وہ ابھی تک سات سات قدم چلتا مربع میں گھوم رہا تھا۔
ٹھیک دن کے بارہ بجے املی والے بابا نے اس گھر کے دروازے پر قدم رکھا۔
وہ ایک کالے رنگ کی چادر اپنے جسم پر لپیٹے ہوئے تھے ان کے دونوں بازو ننگے تھے بڑی بڑی لال آنکھیں..... ہاتھ میں کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا اور دو انچ موٹا کالا سا ڈنڈا تھا۔
املی والے بابا نے گیٹ میں داخل ہوتے ہی لان کی طرف رخ کیا وہ کسی روبوٹ کی طرح مشینی انداز میں چل رہا تھا۔
نیاز محمد کے قریب پہنچ کر انہوں نے وہ کالا ڈنڈا اسے دے دیا اور کچھ نہ بولے۔
وہ ڈنڈا لے کر نیاز محمد نے زمین پر نشان بنانا شروع کیا۔ گھاس پر ایک سات قدم کا مربع ابھر آیا پھر اس مربع کے درمیان نیاز محمد نے ایک چھوٹا دائرہ بنایا اور مربع سے نکل کر کھڑا ہو گیا۔
املی والے بابا لکڑی کی کھڑاویں پہنے ہوئے تھے۔ وہ انہوں نے نشان زدہ علاقے سے باہر ہی چھوڑ دیں اور چھوٹے دائرے پر برا جمان ہو گئے وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھے اور انہوں نے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ لئے۔

نیاز محمد نشان زدہ ملاقے سے باہر الٹی والے بابا کی کھڑاویں اپنی گود میں لے کر بیٹھ گیا۔
ماموں فرقان اور اکبر وقفے وقفے سے کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرتے رہے تھے۔ انہیں نیاز محمد مصروف عمل دکھائی دیتا تھا۔
ابھی تک الٹی والے بابا کا ظہور نہ ہوا تھا۔ بارہ بجے کے بعد جو اکبر نے کھڑکی کا پردہ کھسکایا تو اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ الٹی والے بابا نہ صرف آگئے ہیں بلکہ انہوں نے آسن بھی جمالیا ہے اور کچھ پڑھنے میں مصروف ہیں۔ اکبر نے جلدی سے ماموں فرقان کو بتایا۔ "وہ آگئے ہیں۔"
"ارے کب۔" ماموں فرقان ڈرائنگ روم کی طرف لپکے۔
پھر باری باری سب نے الٹی والے بابا کا نظارہ کیا۔
کچھ پڑھتے پڑھتے اچانک الٹی والے بابا نے آنکھیں کھولیں تو صابرہ ڈر کر ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔
ان کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر اسے کالا بلا یاد آگیا۔ صابرہ فوراً ڈرائنگ روم سے چلی گئی۔
الٹی والے بابا پڑھتے ہوئے اسی طرح آنکھیں بند کرتے اور کھولتے رہے۔ نیاز محمد ان کی کھڑاویں گود میں رکھے بہت سعادت مندی سے نشان زدہ ملاقے سے باہر بیٹھا رہا۔
دن گزرا پھر رات بھی گزر گئی۔
سب گھر کے لوگ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے رہے ان کے دلوں پر خوف طاری تھا۔ اکبر اور ماموں فرقان وقفے وقفے سے کھڑکی سے ان کا نظارہ کرتے رہے۔
ماموں فرقان نے کوئی تین بجے کے قریب صابرہ اور راشدہ کو زبردستی سونے کے لئے بھیج دیا۔ چار بجے تک باہر بیٹھا رہا پھر اسے بھی ماموں فرقان نے آرام کرنے کے لئے کہا۔
اکبر اور ماموں فرقان ساری رات نہ سوئے۔
الٹی والے بابا دن کے بارہ بجے جس آسن میں بیٹھے تھے۔ سارا دن اور ساری رات وہ اسی طرح بیٹھے رہے۔ انہوں نے کچھ کھانے کو مانگا نہ پینے کو۔
البتہ نیاز محمد نے صرف دوپہر کا کھانا کھایا رات کا کھانا اس نے بھی نہ کھایا۔
دوسرے دن بارہ بجے پورے چوبیس گھنٹے کے بعد الٹی والے بابا نے چائے طلب کی اور وہ بھی بغیر دودھ اور شکر کی۔
نیاز محمد نے اکبر کو گھر سے بلا کر چائے کا کہا اور پھر بولا۔
"جس کپ میں مرشد کو چائے دینی ہے پہلے وہ خالی کپ مجھے دکھاؤ۔"
اکبر نے صابرہ سے کہہ کر گھر میں جو سب سے قیمتی کپ تھا وہ منگوایا اسے اچھی طرح دھلوایا اور نیاز محمد کے سامنے پیش کر دیا۔
نیاز محمد نے اس خالی کپ پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور پھر اکبر کو اسے واپس کر دیا تھوڑی دیر بعد اکبر نے اس کپ میں بغیر دودھ اور چینی کی چائے نیاز محمد کے حوالے کر دی۔
چائے پینے کیلئے الٹی والے بابا نے اپنا مخصوص انداز نشست تبدیل کیا گھونٹ گھونٹ کر کے انہوں نے چائے پی ۔ چائے پینے کے بعد پھر انہوں نے اپنا آسن جمایا اور تیزی سے کچھ پڑھنے لگے۔

پھر یہ عمر تک کچھ پڑھتے رہے۔ نیاز محمد حسب معمول ان کی کھڑکیوں عقیدت سے گود میں لئے بیٹھا رہا۔

آدھ گھنٹے بعد بابا نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

انہوں نے گھور کر نیاز محمد کو دیکھا اور بولے۔ "جا گیٹ کھول وہ آئی ہے۔"

یہ سن کر نیاز محمد تیزی سے گیٹ کی طرف بھاگا۔ ماموں فرقان اور اکبر نے اسے گیٹ کی طرف بھاگتے دیکھا تو وہ گھر سے نکل آئے۔

نیاز محمد نے جلدی سے گیٹ کھولا تو نیلم گیٹ پر کھڑی تھی اس کی عجیب حالت تھی وہ چھپکلی کی طرح ایک دم زرد ہو رہی تھی۔

جیسے اس کے بدن کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو۔

"اس کے سر پر ایک جگ ٹھنڈا پانی ڈالو۔" الٰہی والے بابا نے وہیں بیٹھے بیٹھے حکم دیا۔

یہ سن کر اکبر فوراً گھر کے اندر گیا اور ایک جگ ٹھنڈا پانی لے آیا وہ جگ اس نے ماموں فرقان کے حوالے کر دیا اور خود گھر کی دہلیز پر کھڑا رہا۔ ماموں فرقان نے اس مرتبہ بہت سختی سے تنبیہ کر دی تھی کہ نیلم کو دیکھ کر وہ اپنے حواس میں رہے گا ـــــ وہ اس وقت تک اس کے نزدیک نہیں جائے جب تک اسے اجازت نہ مل جائے۔ نیلم کو گیٹ پر دیکھ کر اکبر کا روم روم خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ اس کی جی چاہا تھا وہ بھاگ کر نیلم کے نزدیک جانا چاہتا تھا لیکن اسے ماموں فرقان کی تنبیہ یاد آ گئی۔

ماموں فرقان جلدی سے ٹھنڈے پانی کا جگ لے کر گیٹ کی طرف بڑھے۔

نیلم گیٹ کے اندر آ چکی تھی اور نیاز محمد گیٹ بند کر چکا تھا۔

"رک جاؤ۔" الٰہی والے بابا نے زور سے کہا۔

ان کا حکم سن کر ماموں فرقان اپنی جگہ جم گئے ـــــ نیلم کا بڑھتا قدم بھی رک گیا نیاز محمد بھی کھڑا ہو گیا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ الٰہی والے بابا نے کس کو رکنے کے لئے کہا۔

"نیلم تم اپنی جگہ سے ہلو گی نہیں۔" الٰہی والے بابا نے حکم دیا۔ "اور فرقان تم اس کے سر پر پانی ڈال دو۔"

ماموں فرقان جلدی سے آگے بڑھے انہوں نے پتھرائی ہوئی نیلم کے سر پر ٹھنڈے پانی کا جگ خالی کر دیا۔ پانی پڑتے ہی اس کے سر سے "چھن چھن" کی آواز آئی جیسے جلتے توے پر پانی گرے۔

پانی اس کے سر سے بہتا ہوا جسم پر گیا۔ جسم پر پانی پہنچتے ہی ایک دم اس کے جسم سے دھواں سا اٹھا اور نیلم تیوار کر زمین پر گر پڑی وہ تو ماموں فرقان اس کے نزدیک ہی تھے انہوں نے فوراً اسے سنبھال لیا ورنہ نیلم اگر یہ اور راست زمین پر گرتی تو اس کا سر پھٹ جاتا۔

"اسے ادھر لے آؤ۔" الٰہی والے بابا نے حکم دیا۔

تب ماموں فرقان اور نیاز محمد نے مل کر نیلم کو اٹھایا اور الٰہی والے بابا کے سامنے لٹا دیا۔

وہ بیہوش ہو چکی تھی۔

الٰہی والے بابا نے اس کی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا اور ماموں فرقان سے مخاطب ہو کر بولے۔

"ایک بالٹی کھولتا ہوا پانی درکار ہے۔"

"ابھی لایا۔" یہ کہہ کر ماموں فرقان گھر کے اندر بھاگے۔

انہوں نے دونوں چولھوں پر پانی گرم کرنے کے لئے رکھوا دیا گرمی تھی تھوڑی دیر میں پانی ابلنے لگا۔ ماموں فرقان نے سارا پانی ایک پلاسٹک کی بالٹی میں الٹا اور گھر سے باہر آگئے۔

اٹلی والے بابا، نیلم کی پیشانی پر ہاتھ رکھے کچھ پڑھنے میں مشغول تھے۔ نیلم کی آنکھیں بالکل بند تھیں۔

ماموں فرقان نے کھولتے پانی کی بالٹی اٹلی والے بابا کے نزدیک رکھ دی تب انہوں نے ڈونگے بھر بھر کر نیلم کے جسم پر پانی ڈالنا شروع کیا۔

گرم پانی کا پڑنا تھا کہ نیلم بلبلا گئی اس کا جسم بن جل مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ پانی کے ہر ڈونگے پر اس کا جسم بری طرح تڑپ رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں اور چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔

اٹلی والے بابا نے اس کے پورے جسم پر پانی ڈالا جسم کا کوئی حصہ نہ چھوڑا اس کا جسم تڑپتا رہا مگر اس کی انہوں نے پروا نہ کی جبکہ ماموں فرقان اس تڑپتے جسم کو دیکھ نہ سکے انہوں نے منہ پھیر لیا۔

سب سے زیادہ بری حالت تو اکبر کی تھی۔

وہ ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے نیلم کو دیکھ رہا تھا اس کے تڑپتے جسم کو دیکھ کر اکبر کے دل پر چھری سی چل رہی تھی یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا ہو اور اسے سختی سے بھینچ رہا ہو۔

تب ہی کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اس نے مڑ کر دیکھا تو بابر تھا۔ وہ اسے اندر لے گیا اور ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا پردہ بند کر دیا۔

اکبر اضطرابی کیفیت میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ماموں فرقان کمرے میں آئے اور بولے۔ "چلو تمہیں اٹلی والے بابا بلا رہے ہیں۔"

"مجھے۔" وہ حیرت زدہ ہو کر بولا اور فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جب اکبر، ماموں فرقان کے ساتھ گھر سے باہر آیا اور اس نے لان پر نظر ڈالی تو نیلم کو سر جھکائے اٹلی والے بابا کے سامنے بیٹھے پایا اور اس کے گرد برف سی پڑی تھی یہ وہ پانی تھا جو اس کے جسم سے بہہ کر جم گیا تھا۔

اکبر ان کے نزدیک پہنچا تو انہوں نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا اور مسکرا کر بولے۔

"اکبر اپنی بیوی کو لے جاؤ..... وہ خبیث اب اس پر کبھی قابض نہیں ہو سکے گا۔"

یہ سن کر اس نے بڑی ممنونیت سے اٹلی والے بابا کو دیکھا اور تشکر کے طور پر اس نے ان کا ہاتھ تھامنا چاہا وہ ان کے ہاتھ کو چومنا چاہتا تھا۔

اٹلی والے بابا نے اپنا ہاتھ فوراً پیچھے کھینچ لیا اور مسکرا کر کہا۔

"بھائی میرا نہیں اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑو اور اب تم لوگ جس قدر جلد ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ لیکن

فرقان تم یہیں رہو گے۔ "

ماموں فرقان پہلے ہی ان لوگوں کو جانے کے لئے تیار کر رکھا تھا اب جیسے ہی جانے کا حکم ہوا اکبر دو منٹ میں نیلم سمیت سب کو گاڑی میں بٹھا کر ماموں فرقان کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اکبر کے جانے کے بعد ماموں فرقان، الٰہی والے بابا کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

الٰہی والے بابا نے انہیں کچھ پڑھنے کو بتایا اور بولے۔ "تم گھر میں جا کر اندر سے سارے دروازے بند کر لو..... اور جو میں نے بتایا اسے پڑھنا شروع کر دو..... یاد رکھو گھر سے باہر کسی قیمت پر نہ نکلنا نہ دروازہ کھولنا بے شک تم گھر میں آگ لگی ہوئی کیوں نہ دیکھو۔ "

"جی بہتر۔ " ماموں فرقان نے بہت سعادت مندی سے کہا۔ وہ ایک تجربے کار آدمی تھے، عملیات سے واقف تھے اس لئے ان سے کسی ایسی بات کی توقع نہ تھی جس سے بگاڑ پیدا ہوتا۔

الٰہی والے بابا نے کچھ دیکھ کر ہی انہیں یہ ذمہ داری سونپی تھی۔

ماموں فرقان فوراً گھر کے اندر چلے گئے۔ انہوں نے گھر کا ایک ایک دروازہ اور کھڑکی بند کر لی..... پھر انہوں نے وضو کر کے عصر کی نماز پڑھی اور تسبیح لے کر وہ پڑھنے لگے جو الٰہی والے بابا نے بتایا تھا۔

باہر الٰہی والے بابا کے حکم کے مطابق نیاز محمد گیٹ بند کر چکا تھا اور اس وقت وہ حصار کے اندر الٰہی والے بابا کے دائیں جانب بیٹھا انگلیوں پر کچھ پڑھ رہا تھا۔

الٰہی والے بابا آلتی پالتی مارے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے نہایت اطمینان اور پرسکون انداز میں آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔

ان کے اندر کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان آنکھوں سے وہ جہاں تک چاہے دیکھ سکتے تھے۔

چند لمحوں بعد ان کے چہرے پر جو اطمینان تھا وہ غائب ہو گیا اس کی جگہ سختی نے لے لی..... ان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی، وہ مستعد ہو کر بیٹھ گئے۔

تب ہی گھر کا گیٹ ایک دھماکے سے کھلا اور دو سفید گھوڑوں والی بگھی گیٹ میں داخل ہوئی بگھی اندر آ کر رک گئی۔

الٰہی والے بابا نے اپنی جلالی آنکھیں کھول دیں اور گھور کر بگھی کی طرف دیکھا۔

بگھی سے بڑی شان سے سید پور کا جن برآمد ہوا وہ اس وقت شہزادے کے روپ میں تھا وہ بگھی سے اتر کر دو قدم آگے چلا اور پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے الٰہی والے بابا کو مسکرا کر دیکھا۔

"بہروپیا آ گیا۔ " الٰہی والے بابا نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

"نیلم کہاں ہے؟ " سید پور کے جن نے سوال کیا اس کے لہجے میں بڑا تحکم تھا۔

"نیلم جس کی تھی اس کے حوالے کر دی گئی..... تم اسے بھول جاؤ۔ "

"نیلم میری ہے، میں اسے نہیں بھول سکتا یہ ٹھیک ہے کہ تم نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے اسے یہاں کھینچ بلایا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ..... "

"بہروپئے تو اپنے اصل روپ میں تو آ۔" الٰہی والے بابا نے اسے اپنی بات پوری نہ کرنے دی۔

"پھر کیا ہوگا۔"

"تیرا غرور پاش پاش ہوگا۔ یہ ہوگا۔ تو نے بہت تباہی پھیلائی ہے۔ بہت لوگوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ بس اب یہ کھیل ختم ہوا میں جانتا تھا کہ تو آئے گا ضرور..... اب تو آگیا ہے تو یاد رکھ واپس نہ جا سکے گا۔"

یہ سن کر سید پور کے جن نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "بابا تو میرا کیا کرلے گا۔"

"میں جہاں بیٹھا ہوں اس کے نیچے تجھے دفن کر کے جاؤں گا۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے تو جہاں بیٹھا ہے وہ تیری اپنی قبر بن جائے۔"

"تو مجھے جانتا نہیں ہے ورنہ ایسی بات کبھی نہ کہتا۔"

"واقف تو خیر تو بھی مجھ سے نہیں ہے۔"

"تو اب واقف کرادے۔" الٰہی والے بابا نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"یہ تیرے برابر تیرا سپاہی بیٹھا ہے۔ اس سے پوچھ۔" سید پور کے جن نے ہنس کر کہا۔ "یہ بتائے گا تجھے میں کیا ہوں۔"

"تو جو ہے میرے سامنے ہے۔ میں نے نیلم کو تیرے چنگل سے نکال لیا ہے اب تیری باری ہے..... تیری موت تجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔"

"اچھا تو پھر سنبھل۔" یہ کہہ کر سید پور کے جن نے دونوں بازو پھیلائے۔

الٰہی والے بابا تو دو دن سے سنبھلے بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے وہ چالیس دن کا ایک پُراثر وظیفہ پڑھ چکے تھے۔ پھر ان کی مدد کو نیاز محمد موجود تھا۔ ماموں فرقان بھی اس معرکے میں حصہ لے رہے تھے اور وہ کیل کانٹوں سے لیس "قلعہ بند" بیٹھے تھے۔ غرض الٰہی والے بابا کی وفاقی لائن بہت مضبوط تھی۔

جب سید پور کے جن نے انہیں سنبھلنے کو کہا تو وہ صرف زیر لب مسکرائے اور انہوں نے اپنی نظریں سید پور کے جن پر گاڑ دیں۔

سید پور کے جن نے دونوں بازو پھیلا کر اپنے ہاتھ اوپر کر لئے اور پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین کی طرف جھکاتا چلا گیا۔ اور جیسے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پاؤں چھوئے تو اس کے جسم سے ایک شعلہ برآمد ہوا۔

شعلہ برآمد ہوتے ہی اس کا بہروپ ختم ہوگیا۔ وہ شہزادے سے کالا بلا بن گیا اپنے روپ میں آگیا۔

بلا بنتے ہی پیچھے کھڑی دو گھوڑوں والی بگھی ایک لمحے میں غائب ہوگئی۔

اور کھلا ہوا گیٹ خود بخود بند ہوگیا۔

سید پور کے جن کے جسم سے جو شعلہ برآمد ہوا تھا وہ جس چیز سے مس ہو رہا تھا اس میں آگ بھڑک

اٹھتی تھی۔

سرسبز پودے اور ہری ہری گھاس اس طرح جل رہی تھی جیسے سوکھا ہوا بھس۔ گھاس سے بھرے لان میں آگ تیزی سے بڑھ رہی تھی پھیل رہی تھی جیسے لان میں پیٹرول بہایا جا رہا ہو۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس شعلے نے گھر کے در و دیوار میں آگ لگا دی۔ کھڑکیاں اور دروازے سوکھی لکڑی کی طرح جلنے لگے۔

اب پورا گھر شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ وہاں بادل بن گیا تھا۔ ماموں فرقان گھر کے در و دیوار جلتے دیکھ رہے تھے لیکن ان کے چہرے پر کوئی گھبراہٹ نہ تھی۔ وہ جانماز پر بیٹھے بڑے آرام سے الٰہی والے بابا کا بتایا ہوا وظیفہ پڑھ رہے تھے۔

اس آگ نے گھر کے تمام پودوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا لیکن الٰہی والے بابا جس چبوترہ حصار میں بیٹھے تھے۔ آگ اس حصار کی حد سے آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔

الٰہی والے بابا نے بہت تیزی سے کچھ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں غصہ آگیا تھا۔ اب ان کے اندر بھی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ ان کے اندر جو آگ بھڑکی تھی۔ وہ مصنوعی نہ تھی۔

پھر وہ پڑھتے پڑھتے کھڑے ہو گئے۔ اپنی لال آنکھوں سے شعلوں میں دیکھا۔ اسے تلاش کرنے میں الٰہی والے بابا کو زیادہ دیر نہ لگی۔

وہ شعلوں میں گھرا بڑے آرام سے بیٹھا اپنے پاؤں چاٹ رہا تھا۔ الٰہی والے بابا کو کھڑے ہوتے دیکھ کر وہ چوکنا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں کان کھڑے کئے اور الٰہی والے بابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

بس آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا غضب ہو گیا۔

الٰہی والے بابا اسی لمحے کے منتظر تھے۔ ان کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوندیں اور وہ کالے بلّے کی آنکھوں میں جذب ہو گئیں۔ کالا بلّا تیورا کر پیچھے گرا اور زمین پر لوٹنے لگا۔ اس کی دونوں آنکھوں سے خون جاری ہو گیا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سید پور کے جن کی لگائی ہوئی آگ سرد پڑ گئی۔ وہ جس تیزی سے لگی تھی اسی تیزی سے بجھ گئی تھی۔ گھر کی کسی چیز کو نقصان نہ پہنچا۔ در و دیوار ویسے کے ویسے تھے۔ جو پودے جل گئے تھے وہ بھی سرسبز و شاداب نظر آ رہے تھے۔

لیکن کالے بلّے کی بری حالت تھی۔ اس کی آنکھوں سے خون جاری تھا اور وہ زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا اس نے رحم طلب نگاہوں سے الٰہی والے بابا کی طرف دیکھا اور ان کے دماغ میں بولا۔

"بابا مجھے معاف کر دو۔ یہ بجلیاں میرے جسم سے نکال لو۔ یہ مجھے جھلسائے دے رہی ہیں۔ میں اب کبھی ادھر پلٹ کر نہیں آؤں گا۔ نیلم کو بھول جاؤں گا۔ اس گھر کو بھول جاؤں گا۔"

"سید پور کے جن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ معافیاں مانگنے کا وقت گزر گیا۔ اب ان بجلیوں پر میرا اختیار نہیں رہا۔ یہ اپنا کام ختم کر کے ہی دم لیں گی۔"

"بابا جی، مجھ پر رحم کرو۔ میں تباہ ہو جاؤں گا۔"

"تم تو بڑی شان سے بگھی میں سوار ہو کر یہاں آئے تھے۔ شہزادے بنے ہوئے تھے اب دوبارہ شہزادہ بن کر دکھاؤ تو جانوں۔"

"بابا جی، میں تباہ ہو رہا ہوں۔ مجھے بچالو۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

"تم تو بڑے زبردست جن ہو۔ اب تم اپنی طاقت کا مظاہرہ کیوں نہیں کرتے۔" املی والے بابا نے غصے سے پوچھا۔

"بابا جی، میں بار گیا۔ میں آپ کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لوں گا۔"

"میرے پاؤں تک پہنچے تو تمہیں ٹھوکر کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔"

سید پور کا جن، کالے بلّے کے روپ میں روتا تڑپتا رہا۔ معافیاں مانگتا اور گڑگڑاتا رہا لیکن املی والے بابا پتھر بنے اپنی جگہ کھڑے رہے وہ جانتے تھے کہ انہوں نے کسی پر ظلم نہیں کیا ہے۔ انہوں نے ایک ظالم سے اس کے ظلم کا حساب لیا ہے۔

کچھ دیر کے بعد ظلم مٹ گیا۔ ظلم کا کلیہ ہی یہ ہے کہ بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔

پھر املی والے بابا نے نیاز محمد کو حصار سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ماموں فرقان کو باہر بلایا۔ ماموں فرقان باہر آئے تو انہوں نے نیاز محمد سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"وہ میرے مرشد سے ٹکر لینے چلا تھا۔ ان کا ایک وار نہ سہہ سکا۔ بڑا شہزادہ بن کر آیا تھا خود کو بڑا زبردست جن کہتا تھا۔ مرشد کے آگے ایک لمحہ نہ ٹھہر سکا۔ وہ باہر پڑا ہے آؤ آکر دیکھ لو۔" نیاز محمد نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

ماموں فرقان نے یہ سن کر فوراً خدا کا شکر ادا کیا اور بھاگے ہوئے باہر گئے۔

انہوں نے اسے دیکھا۔ وہ بے کسی کی صورت میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور خون آنکھوں سے نکل کر چہرے پر جم گیا تھا۔ کچھ خون زمین پر بھی گرا ہوا تھا۔

پھر املی والے بابا نے حصار چھوڑ دیا۔ وہ نہ صرف دائرے سے نکل آئے بلکہ سات قدم والا چوکور حصار بھی چھوڑ دیا۔ ان کی ہدایت کے مطابق جہاں وہ بیٹھے تھے وہاں ایک گڑھا کھودا گیا۔ یہ گڑھا ماموں فرقان نے اپنے ہاتھوں کھرپی سے کھودا۔

جب گڑھا کھد گیا تو املی والے بابا نے کالے بلّے کو دُم سے پکڑ کر اٹھایا اور گڑھے میں ڈال دیا۔ پھر کچھ پڑھ کر انہوں نے مٹی گڑھے میں پھینکی اس کے بعد کھرپی ماموں فرقان کے ہاتھ میں دیدی۔

ماموں فرقان نے ساری مٹی گڑھے میں ڈال کر اسے بند کر دیا۔

گڑھا بند کرنے کے بعد ماموں فرقان نے ایک لمبا سانس لیا اور گہرا سانس لیا۔ کتنی مصیبتوں کے بعد یہ دن دیکھنے کو ملا تھا انہوں نے ایک مرتبہ پھر خدا کا شکر ادا کیا۔

اور بڑی احسان مندی سے املی والے بابا کو دیکھنے لگے۔

"نیاز چلو۔" املی والے بابا نے نیاز محمد سے کہا۔

"بابا جی، آپ کا بہت شکریہ۔" ماموں فرقان نے بڑی ممنونیت سے کہا۔

"ہمیں اس طرح کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن اس خبیث نے اس قدر اودھم مچایا ہوا تھا

کہ اس کی سرکوبی کے لئے ہمیں اپنی جگہ سے نکلنا پڑا۔ اب یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بچوں کو بلالو۔ ہم اب جاتے ہیں۔" اہلی والے بابا نے قدم آگے بڑھایا۔

نیاز محمد نے ان کی کھڑاؤں سیدھی کیں۔ اہلی والے بابا نے کھڑاویں پہنیں اور کھٹ کھٹ کرتے تیزی سے گھر سے نکل گئے۔ نیاز محمد ان کے پیچھے بھاگتا چلا گیا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد ماموں فرقان نے ایک نظر گڑھے کو دیکھا جو اب گھاس ملی مٹی سے پر ہو چکا تھا۔ اس بند گڑھے کو دیکھ کر ان کا روواں روواں خوشی سے جھوم رہا تھا۔

پھر اس گھر پر خوشی ٹوٹ کر برسی۔

اور کیوں نہ برستی۔ ظلم کا ایک عہد ختم ہو گیا تھا۔ اب دردناک عذاب سے نجات مل گئی تھی۔

ہر شخص نے اس دن کے لئے خواب دیکھ رکھے تھے۔ نجات کا دن آیا تو سب کی آنکھوں میں اپنے اپنے خواب جاگ اٹھے۔ کچھ خواب اکبر کے تھے، تو کچھ خواب اکبر کی بہن اور اس کی ماں کے تھے۔

راشدہ ان سب میں پیش پیش تھی۔ وہ اس دن کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ شادی کی پھر سے تمام رسمیں ادا کی جائیں گی۔

راشدہ کی اس رائے سے سب کو اتفاق تھا۔ ایک اتفاق نہیں تھا تو اکبر کو۔ ظاہر ہے شادی کی دوبارہ رسمیں ادا کئے جانے کی وجہ سے نیلم اور اس کے درمیان فاصلے بڑھ جانے تھے۔

اکبر کے لئے تو اب ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔

ماموں فرقان نے نیلم کو گھر روک لیا۔ وہ لڑکی والے بن گئے۔ رات ہی کو لاہور فون کر دیا گیا۔ فیاض اور واجدہ دوسرے دن کراچی پہنچ گئے۔ وہ دونوں ماموں فرقان کے یہاں ٹھہرے۔ انہوں نے بارات کی آمد کے سلسلے میں اخراجات کی ذمہ داری لینا چاہی لیکن ماموں فرقان نے انہیں ایسا نہ کرنے دیا۔ بارات کے تمام اخراجات انہوں نے نہ صرف خود اٹھائے بلکہ نیلم کو ایک سونے کا سیٹ بھی اپنی طرف سے تحفے میں دیا۔

بارات میں تیس چالیس آدمی تھے۔ جلدی جلدی جو لوگ ساتھ آ سکے، انہیں ساتھ لے لیا گیا۔ ماموں فرقان نے گھر کے سامنے شامیانہ لگوا دیا۔ ایک چینی ریستوران سے کھانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔

جب بارات رخصت ہوئی اور نیلم کو ایک سجی سجائی کار میں بٹھایا گیا تو احساس نہ ہوتا تھا کہ نیلم کی چار ماہ پہلے شادی ہو چکی ہے بلکہ یہ احساس ہوتا تھا کہ نیلم کی آج ہی شادی ہوئی ہے اور وہ واجدہ، فیاض کے بجائے جیسے ماموں فرقان کی بیٹی ہے۔

ماموں فرقان اس کے رخصت کرتے وقت کچھ اس طرح اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لائے تھے اور نیلم بھی کچھ اسی انداز میں ان سے لپٹ کر روئی۔

اس "شادی" میں دادا غفور کی کمی شدت سے محسوس کی گئی۔ کاش! وہ آج زندہ ہوتے تو نیلم کو دلہن بنے دیکھ کر کس قدر خوش ہوتے۔

بارات گلشن واپس پہنچی۔ یہ گھر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ بابر نے اس روشنی پر دل کھول کر پیسہ

خرچ کیا تھا۔

دلہن کے گھر آنے پر راشدہ اور صابرہ نے اپنے خوب ارمان نکالے۔ ہر وہ رسم ادا کی گئی جس کے کیے جانے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

راشدہ نے اپنی تمام سہیلیوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ گھر میں خوب ہنگامہ رہا۔ ہر چہرہ جگمگا رہا تھا۔ ہر ہونٹ پر تبسم تھا۔ قہقہے تھے۔ ایک رنگ و نور کی بارش تھی۔ رُواں رُواں خوشیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

خدا خدا کر کے وہ وقت بھی آیا جب اکبر کو اندر جانے کا "ویزا" ملا۔

اکبر کے دل کی عجیب حالت تھی۔ خوشی سے دھڑکتے دل کو اس نے قابو میں کرنے کی کوشش کی لیکن وہ قابو میں نہ آیا تب وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوا۔

لرزتی انگلیوں سے اس نے دروازہ بند کیا اور جب پلٹ کر دیکھا تو نیلم گھونگھٹ نکالے جھکی ہوئی بیٹھی نظر آئی۔ خوشی سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

آنکھوں میں آنسو بھرے تو نیلم دھندلا گئی۔ اکبر نے فوراً اپنی آنکھیں صاف کر لیں۔ اب وہ ایک لمحے کے لئے بھی نیلم کو اپنی آنکھوں سے دور کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ دل میں طوفان چھپائے بیڈ پر بیٹھا پھر اس نے دھیرے سے نیلم کا گھونگھٹ الٹ دیا۔

نیلم شرمانا بھول گئی۔ اس نے اپنی حسین آنکھوں سے اکبر کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ دل میں جذبات کا سمندر تھا۔ ایک طوفان تھا جو روح کی گہرائیوں سے اٹھ رہا تھا۔

دونوں بولنا چاہتے تھے۔ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن زبانیں جیسے گنگ ہو گئی تھیں۔

اکبر نے نیلم کا ریشم جیسا گورا ہاتھ تھاما اور اپنی دونوں آنکھوں سے لگایا۔ نیلم تڑپ کر اس کے نزدیک آ گئی۔

"اکبر..... مجھے اپنے سینے میں چھپا لو۔"

اکبر نے اسے اپنی محبت کے حصار میں لے لیا۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ اب ہونٹوں نے بولنا سیکھ لیا تھا۔

"اکبر تم کس قدر عظیم ہو۔" نیلم بے تحاشہ رو رہی تھی۔ "تم نے میرے لئے کس قدر دکھ اٹھائے۔"

"نہیں نیلم ایسا نہ کہو۔ دکھ میں نے نہیں تم نے اٹھائے ہیں۔" اکبر نے اس کی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ "اور اب ان دکھوں کا ذکر ہی کیا۔ جو ہوا تھا ہوا۔ اب ان خوشیوں بھرے لمحوں کو ماضی کی یاد میں ضائع مت کرو۔ گزرے ہوئے وقت کو ایک بھیانک خواب کی طرح بھول جاؤ۔ آؤ۔ اب ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔ ایسی زندگی جو خوشیوں سے بھری ہے، پھولوں سے بھری ہے۔"

پھر اس رات سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔

یہ آغاز کس قدر حسین تھا۔ ایسی کئی حسین راتیں آئیں اور گزر گئیں۔ زلفیں کھلتی رہیں، آنکھوں سے کاجل پھیلتا رہا، ہونٹوں پر لالی مچلتی رہی، خوشبو بھرے لمحے تیزی سے دامن چھڑاتے رہے.....

[illegible]۔

یہ آج کی رات کا کمال ہے۔

نیلم، اکبر [illegible] ممی پاپا [illegible] باوجود ہے۔

[illegible] ہاتھ [illegible] سے [illegible]۔

[illegible] کونے سے [illegible] پیچھے [illegible]۔

صبح ساجدہ اٹھنے کے بعد لان میں آئی تو سب سے پہلے اس نے اسے دیکھا۔ وہ لان میں تو کل شام تک نہ تھا جہاں آج صبح کونے میں پودا اُگا ہوا تھا۔

کل شام تک یہاں کچھ نہ تھا۔ کل ہی لان صاف کر کے بیج بوئے تھے۔ یہ کل رات یہاں اُگا تھا۔ یہاں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ وہ ایک رات میں اتنا بڑا کیسے ہو گیا۔

اسے اندر آ کر اکبر کو وہ بتانا چاہا مگر اکبر کلاس میں تھا۔ اب اکبر سے پہلے [illegible] کی اہمیت نہ تھی جتنی لان میں ہونے والے واقعہ کی تھی۔

اس نے ساری بات ساجدہ کو بتائی تو وہ حیرت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لان میں لے آیا۔ وہ حیرانی و پریشانی اس کے ساتھ خاموشی سے چلی آئی۔

جب اس نے لان کے درمیان اشارہ کیا تو ساجدہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"یہ کیا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

یہ صورتحال [illegible] دیکھ کر فوراً ذہن میں آتا تو یہ بات گھر کے کسی فرد سے چھپی نہ رہ سکی۔ آخر نیلم اور اکبر کو بھی اطلاع پہنچی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ باہر آئے۔

"ارے ...... اسے یہاں کس نے لگایا۔" نیلم نے اسے دیکھ کر حیرت سے کہا۔

"کسی نے لگایا نہیں ہے یہ خود بخود اگا ہے۔" ساجدہ نے اسے بتایا۔

ابھی یہ لوگ دور ہی دور سے نظارہ کر رہے تھے۔ پھر اکبر آگے بڑھا نیلم اس کے ساتھ تھی۔

وہ ایک دو فٹ اونچا پودا تھا۔ اس کے پتے زرد اور لمبے تھے۔ نیچے سے اوپر تک ایک تنا تھا۔ سب سے اوپر ایک پھول کھلا ہوا تھا۔ وہ ایک گول سا پھول تھا۔ کالا گہرا سرخی مائل۔ اس پھول میں دو سے تین سرخ دھبے تھے اور پھول کے اوپر دو کانٹے نکلے ہوئے تھے۔

پھول کو قریب سے دیکھ کر ایک دم احساس ہوتا تھا کہ اس پھول کی شکل کسی بچے کے چہرے سے ملتی جلتی ہے۔ صرف یہی انکشاف نہیں ہوا بلکہ ایک اور حیرت میں ڈالنے والی بات بھی معلوم ہوئی۔

سورج مکھی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سورج کے ساتھ ساتھ اپنا رخ تبدیل کرتا رہتا ہے لیکن یہ پھول جو بچے کی شکل کا تھا نیلم کو دیکھ کر اپنا رخ تبدیل کر رہا تھا۔

نیلم جدھر جاتی۔ یہ پھول اس کی طرف اپنا منہ پھیر لیتا۔

پہلے تو اکبر نے اسے محض واہمہ سمجھا لیکن اپنے وہم کی تصدیق کرنے کیلئے اکبر نے نیلم کو اس پودے کا طواف کرنے کو کہا تو اس کا وہم یقین میں بدل گیا۔

نیلم جیسے جیسے گھوم رہی تھی ویسے ویسے وہ بلّے نما پھول اپنا رخ تبدیل کر رہا تھا۔
یہ دیکھ کر نیلم سہم گئی۔ وہ خوفزدہ ہو کر چند قدم پیچھے ہٹی اور پھر بھاگتی ہوئی گھر میں چلی گئی۔ اب اس بلّے نما پھول کا چہرہ دروازہ کی طرف ہو گیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ٹکٹکی باندھے دروازے کو تک رہا ہو۔ اس پھول میں بنے ہوئے برابر برابر لال دھبے اب صاف آنکھیں معلوم ہو رہی تھیں۔
نیلم کے اندر چلے جانے کے بعد اکبر نے راشدہ سے کہا کہ وہ اس پودے کے گرد چکر لگائے۔ راشدہ نے ڈرتے ڈرتے اس پودے کا طواف کیا لیکن وہ بلّے نما پھول ٹس سے مس نہ ہوا۔ پھر اکبر نے صابرہ کو اس کے گرد پھرایا۔ خود گھوما اپنے باپ سے چکر لگوایا لیکن اس پھول نے جنبش نہ کھائی۔ اس کا رخ مسلسل دروازے کی طرف رہا۔
اب اس بات کا سو فیصد یقین ہو چکا تھا کہ اس "نیلم مکھی" پھول کا رخ محض نیلم کو دیکھ کر تبدیل ہوتا ہے۔ یہ بات شروع شروع میں تو نیلم اور گھر کے دوسرے افراد کے لئے الجھن کا باعث بنی۔ نیلم سہمی سہمی سی رہی۔ اس نے اس پودے کے سامنے آنے سے حتی الامکان احتراز کیا لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ اس کی عادی ہوتی گئی۔
دو سال گزرنے کے بعد یہ پودا ایک عام سا پودا بن گیا۔ سب لوگ اس کے عادی ہو گئے۔ ان دو سالوں میں اس پودے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ پہلے دن جیسا رہا۔ نہ اس کا قد بڑھا اور نہ پھول پتوں میں اضافہ ہوا۔
وہی ایک پھول اور اس پھول میں دو سرخ بڑے بڑے دھبے جیسے وہ دھبے نہ ہوں، کسی کی آنکھیں ہوں۔ عاشق کی آنکھیں، دید کو ترسے نین۔
وہ مر گیا تھا لیکن مر کر بھی شاید وہ نہیں مرا تھا۔ وہ اس پودے کے روپ میں زندہ تھا اور "نیلم مکھی" ہو گیا تھا۔
آج بھی جب لوگ اس گھر میں آتے ہیں تو "نیلم مکھی" کا یہ پودا ان کے لئے حیرت کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ گھر جو کبھی اس جن کے حکم پر خالی کیا گیا تھا، اب "خالی گھر" نہیں رہا۔ اب یہ خوشیوں بھرا گھر ہے۔ یہاں خوشیاں ٹوٹ کر برستی ہیں۔ ظلم کا عذابناک دور کب کا ختم ہو چکا ہے۔

(ختم شد)